۷۸۶

سلسلہ مواعظِ اشرفیہ نمبر ۶

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

نظامِ شریعت

از افاضات

حکیم الاُمّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحؒ

مرتبہ

منشی عبد الرحمٰن خاں

مکتبہ اشرف المعارف چہلیک ملتان شہر

ٹیلیفون نمبر ۲۶۷۵

نقش جدید

بار اوّل ———————— ۱۱۰۰
قیمت ———————— سات روپے چودہ پیسے
اشاعت ———————— فروزی ۱۹۶۷ء

ناشر

مکتبہ اشرف المعارف چہلیک ملتان شہر

طابع

ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس۔ لاہور

ترتیب

۱۔ الشریعت ـــــــــــ ۱۳
۲۔ نفی الحرج ـــــــــــ ۷۸
۳۔ حق الاطاعت ـــــــــــ ۱۳۱
۴۔ اتباع المنیب ـــــــــــ ۱۸۳
۵۔ شرط الایمان ـــــــــــ ۲۶۳
۶۔ شعب الایمان ـــــــــــ ۲۹۵
۷۔ الغالب للطالب ـــــــــــ ۳۳۷
۸۔ الاعتصام بحبل اللہ ـــــــــــ ۳۹۱
۹۔ الیسر مع العسر ـــــــــــ ۴۵۵
۱۰۔ تکمیل الاسلام ـــــــــــ ۵۲۷
۱۱۔ تجارتِ آخرت ـــــــــــ ۵۵۹
۱۲۔ تقویم الزیغ ـــــــــــ ۶۱۷
۱۳۔ الوعد والوعید ـــــــــــ ۶۷۱

تفصیل

نمبر شمار	مضمون	صفحات	نمبر شمار	مضمون	صفحات
	ا۔ الشریعت		۱۰	صراطِ مستقیم	۴۳
۱	نعمت شریعت	۱۵	۱۱	فقر و غنا	۴۹
۲	دائمی اور سچی دوستی	۱۹	۱۲	نعمتِ شریعت	۵۱
۳	حقیقتِ نور	۲۵	۱۳	رعایتِ مصالح	۵۴
۴	ثمراتِ طاعت	۲۷	۱۴	محبت اور شریعت	۶۰
۵	روحِ اعمال	۳۰	۱۵	راحت اور شریعت	۶۴
۶	اہمیتِ راحت	۳۱	۱۶	اتباعِ شریعت	۶۸
۷	مناسبتِ قلب	۳۳	۱۷	فیضِ صحبت	۷۰
۸	صورتِ راحت	۳۷	۱۸	ضرورتِ تقلید	۷۴
۹	علامتِ راحت	۳۹	..	..	..

	۲۔ نفی الحرج		۱۹	مصاحبت کی صورت	۱۲۵
۱	تمہید	۷۹		۳۔ تحقیق الاطاعت	
۲	استنباط	۸۰	۱	شریعت و طریقت	۱۳۳
۳	عقلاء کے اشکالات	۸۰	۲	ظاہر و باطن	۱۳۵
۴	جہلاء کے اشکالات	۸۴	۳	گناہوں کی جڑ	۱۳۸
۵	باطنی دولت	۸۵	۴	قرآن کا اثر	۱۴۳
۶	طریق علاج مصائب	۸۹	۵	علم اور جہل	۱۴۶
۷	دین داروں کا اشکال	۹۰	۶	مقام علماء	۱۴۹
۸	جواب اشکال	۹۲	۷	تبلیغ دین	۱۵۲
۹	خاصیت اعمال	۹۳	۸	حب مال	۱۵۶
۱۰	دین اور دشواری	۹۷	۹	حب رسول ﷺ	۱۵۷
۱۱	اسرار شریعت	۹۸	۱۰	حکماء و فلاسفہ	۱۵۹
۱۲	برکت صحبت	۱۰۱	۱۱	حقیقت طاعت	۱۶۴
۱۳	دشواری کی حقیقت	۱۰۵	۱۲	اسباب محبت	۱۶۷
۱۴	آئینہ شریعت	۱۱۰	۱۳	طریق اصلاح	۱۶۸
۱۵	درستی اعمال کی ضرورت	۱۱۱	۱۴	تقاضائے عظمت	۱۷۴
۱۶	معاش اور شریعت	۱۱۴	۱۵	طریق تعلیم	۱۷۸
۱۷	صورت اصلاح	۱۱۹	۱۶	۴۔ انابۃ المنیب	
۱۸	ہمت اور محبت	۱۲۳	۱۷	ناصحین کو نصیحت	۱۸۵

۲	علماء کو نصیحت	۱۸۷	۲۰	معیارِ اتباع	۲۴۲
۳	مقام اتہام سے بچنا	۱۹۱	۲۱	کشف و کرامات کی حقیقت	۲۴۶
۴	دنیاداروں کو نصیحت	۱۹۵	۲۲	مذہب کا طریقہ	۲۵۱
۵	سفارش اور اس کی	۱۹۷	۲۳	متبوع کی شناخت	۲۵۳
	حقیقت		۲۴	سلف اور خلف کا فرق	
۶	علماء اور دنیا	۲۰۱	۲۵	تقلید شخصی کی ضرورت	۲۵۹
۷	حقوق والدین	۲۰۶		۵- شرط الایمان	
۸	اتباع کے معنی	۲۰۷	۱	تمہید	۲۶۵
۹	علماء پر اتہام	۲۰۹	۲	وجوہ اطاعت	۲۶۶
۱۰	قانون کی صحیح تفسیر	۲۱۳	۳	مظہر صفاتِ حق تعالیٰ	۲۶۷
۱۱	اتباع علماء کی ضرورت	۲۱۶	۴	سلامت فطرت کا	۲۶۹
۱۲	جدید مرض	۲۱۹		مقتضیٰ	
۱۳			۵	بیعت کے معنی	۲۷۱
۱۴	اتباع میں غلو	۲۲۴	۶	وسعتِ رحمت	۲۷۲
۱۵	بزرگی کے معیار	۲۲۵	۷	حسنِ تربیت	۲۷۳
۱۶	علماء کی کوتاہی	۲۲۹	۸	حقانیتِ اسلام	۲۷۶
۱۷	حق تعالیٰ کا اتباع	۲۳۲	۹	ظاہری و باطنی دولتِ ایمان	۲۸۰
۱۸	لباس کی اہمیت	۲۳۷		شرطِ ایمان	۲۸۳
۱۹	دین کا اختصار	۲۳۹	۱۰	آج کل کی حالت	۲۸۶

۱۱	صورت وحقیقت کا فرق	۲۸۸		۷۔ الغالب للطالب	
۱۲	فقدانِ عظمتِ شریعت	۲۹۰	۱	اہمیتِ حدیث	۳۳۹
۱۳	ایمان کے درجات	۲۹۲	۲	وسعتِ رحمت	۳۴۰
	۶۔ شعب الایمان		۳	مقامِ ادب	۳۴۲
۱	مسئلہ مساواتِ نساء	۲۹۷	۴	معرفتِ حق	۳۵۰
۲	عورت کی حکومت	۳۰۰	۵	ہجومِ خطرات	۳۵۲
	کے نتائج۔		۶	مقامِ دوست	۳۵۷
۳	عورتوں کا عذر لنگ	۳۰۲	۷	اہتمامِ صحبت	۳۶۰
۴	مغفرت کی ضرورت و	۳۰۵	۸	درجاتِ اتباع	۳۶۴
	صورت		۹	اتباعِ سنت	۳۶۷
۵	مذہب اور تمدن	۳۰۶	۱۰	عمل اور مقصودیت	۳۷۰
۶	شرائطِ مغفرت	۳۰۹	۱۱	ضرورتِ طلب	۳۷۲
۷	انضباطِ اوقات	۳۱۲	۱۲	شانِ محقق	۳۷۷
۸	مسئلہ استیذان	۳۱۳	۱۳	تقاضائے اتباعِ سنت	
۹	ایک اہم کوتاہی	۳۱۵		۸۔ الاعتصام بحبل اللہ	
۱۰	اشاعتِ اسلام کا سبب	۳۱۸	۱	تمہید	۳۹۵
۱۱	اسلام سے نفرت کا سبب	۳۲۳	۲	تعدد، تبدد، تردد کی	۳۹۸
۱۲	اصلاحِ نفس کی تدابیر	۳۲۶		صورت	
۱۳	ذکر اللہ کی اہمیت	۳۳۳	۳	بقائے دین کی صورت	۴۰۲

۴	دین کی مقصودیت	۴۰۷	۵	شانِ کیفیاتِ انبیاء	۴۷۰
۵	اتفاق کی صورت اور حقیقت	۴۰۹	۶	اقتضاداتِ بشریہ کا کمال	۴۷۶
			۷	حقوق العباد کی اہمیت	۴۸۱
۶	مقام ازالہ و امالہ	۴۱۵	۸	عالم ارواح کی نسبت	۴۸۶
۷	بخل	۴۱۶	۹	شفقتِ رسول ﷺ	[illegible]
۸	شرک باللہ	۴۱۸	۱۰	احتمالاتِ تعلیمیہ	۴۹۲
۹	کفار کا توکل	۴۲۳	۱۱	قبض و بسط	۴۹۸
۱۰	قیام علی الحق	۴۲۶	۱۲	نافع توجہ	۵۰۰
۱۱	اصلاح کی ضرورت	۴۳۰	۱۳	معراج یونس ؑ	۵۰۵
۱۲	اسلام اور تلوار	۴۳۱	۱۴	حقیقت معراج	۵۱۱
۱۳	روحی طاقت	۴۳۴	۱۵	احکام کی عظمت	۵۱۵
۱۴	چراغ خداوندی	۴۳۸	۱۶	قرب الی اللہ و قرب الی النار	۵۲۱
۱۵	حقیقی مقام	۴۴۱			
۱۶	حبل اللہ	۴۴۷	۱۷	فضیلت شب برات	۵۲۳
	۹۔ الیسر مع العسر			۱۰۔ تکمیل الاسلام	
۱	تمہید	۴۵۷	۱	تمہید	۵۳۱
۲	بشریت و ملکیت	۴۵۸	۲	سامعین کی اغراض	۵۳۲
۳	شفقتِ نوح ؑ	۴۶۳	۳	وعظ کی غرض	۵۳۴
۴	لطافت مزاج عارفین	۴۶۸	۴	ہمارا دعویٰ اسلام	۵۳۵

۵	مقصودِ اسلام	۵۲۹	۸	فریب آمیز صورتیں	۵۸۸
۶	اسلام کی حقیقت	۵۴۳	۹	مساجد کی حالت	۵۹۰
۷	عوام کی غلطی	۵۴۶	۱۰	سرمایہ کاری	۵۹۲
۸	اعمال کی تلخیص	۵۵۰	۱۱	چندہ اور ہدیہ کی	۵۹۵
[illegible]	[illegible]ں کی کوتاہیاں	۵۵۱		بے احتیاطیاں	
۱۰	اسلام اور امن	۵۵۳	۱۲	ہدیہ کے آداب	۵۹۷
۱۱	اسلام میں معاملات	۵۵۴	۱۳	آدابِ چندہ	۶۰۳
	و معاشرت		۱۴	دعوت الی المدین	۶۰۷
۱۲	ہمارے امراض اور اُن کا	۵۵۷	۱۵	واسطۂ قرب	۶۱۲
	علاج			**۱۲۔ تقویم الزیغ**	
	۱۱۔ تجارتِ آخرت		۱	ضرورتِ تدبیر	۶۱۹
۱	ترقی کی حقیقت	۵۶۵	۲	وعظ سننے کا مقصد	۶۲۳
۲	حدیث و تاریخ میں	۵۶۷	۳	ایک مشترک مرض	۶۲۴
	تفاوت		۴	تلاشِ جہت کے اسباب	۶۲۹
۳	انحطاط و انطباق	۵۶۸	۵	صراطِ مستقیم	۶۳۱
۴	ہمدردانِ قوم کی حالت	۵۷۰	۶	آسمان اور سائنس	۶۳۲
۵	ایثار اور فرعون	۵۷۴	۷	وحی اور حدیث	۶۳۵
۶	سامان تدبر	۵۷۸	۸	اہمیتِ حدیث	۶۳۷
۷	قابلِ اصلاح رسوم	۵۸۳	۹	موضوعِ قرآن	۶۳۹

۱۰	اساس احکام شرعیہ	۶۴۳	۸	انسان اور عشق	۶۹۴
۱۱	ابتلا رد الحاد و بدعات	۶۴۷	۹	علاج النفس	۶۹۸
۱۲	مقام علماء	۶۴۹	۱۰	ایک جدید فرقہ	۷۰۳
۱۳	اسبابِ تنزل	۶۵۱	۱۱	حکمتوں کی تفصیل	۷۱۱
۱۴	رفع اختلاف کی صورت	۶۵۶	۱۲	لطف و قہر	[illegible]
۱۵	ایصالِ ثواب کی صورت	۶۶۰	۱۳	مشروعیت احکام صیام	۷۲۰
۱۶	اکرام مسلم	۶۶۲	۱۴	دین کی حقیقت	۷۲۴
۱۷	نجاست کی صورت	۶۶۵	۱۵	انعامِ الٰہی	۷۲۷
۱۸	کامل کی پہچان	۶۶۹	۱۶	تفسیر رحمۃ للعالمین ؐ	۷۳۳
	۱۳- العید والوعید		۱۷	اہمیت ذکر رسول ؐ	۷۳۹
۱	احکام کی حکمتیں	۶۷۳	۱۸	خدمتِ والدین کی اہمیت	۷۴۸
۲	غلبۂ حال کا اثر	۶۷۸			
۳	قران بین التمرین	۶۸۰	۱۹	اہتمامِ مغفرت کی ضرورت	۷۵۳
۴	فرعون اور ایمان	۶۸۴			
۵	طبعی اور عقلی محبت کا فرق	۶۸۷	۲۰	چند اشکالات کے جواب	۷۵۵
۶	طبعی و عقلی خوف کا فرق	۶۹۰	۲۱	خلاصہ بیان	۷۶۰
۷	غلبۂ حال	۶۹۳			

الشریعت

وجوب اتباع شریعت کے متعلق یہ وعظ ۱۰ر ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ
بروز یک شنبہ مطبع نظامی کانپور پٹکاپور میں کھڑے ہوکر ارشاد
فرمایا۔ جو ۲ گھنٹے ۲۵ منٹ میں ختم ہوا۔ حاضری قریبًا ۵۰۰ تھی
احمد عبدالعلیم لکھنوی نے اُسے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل
علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیّاٰت اعمالنا من
یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد
ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان محمدا
عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ
وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم
بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ
مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

نعمتِ شریعت یہ چند آیتیں ہیں سورۂ جاثیہ کی۔ ان میں حق تعالیٰ نے ایک نعمت کا ذکر فرمایا ہے، جو عطا کی گئی ہے۔ اولاً و بالذات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً و بالتبع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو۔ اور چونکہ اس نعمت کو نعمت نہیں سمجھا جاتا بلکہ بجائے نعمت کے مصیبت و کلفت سمجھا جاتا ہے اس لئے اس وقت اس کو اختیار کرنا ضروری ہوا۔ اب یہاں تک مذاق بگڑا ہوا ہے کہ اتنی بڑی نعمت کی قدر نہیں بلکہ اس کو مصیبت اور کلفت سمجھ کر اُس سے بچنے کی فکر ہے۔ جیسے کوئی مریض دوا کو مصیبت سمجھے اور اس سے بڑھ کر ناشکر وہ ہے جو غذائے لطیف کو مصیبت سمجھے۔ اُس کو بہت اچھی اور لطیف غذا دی جاتی ہے اور وہ اُس سے منہ بند کرتا ہے تو ایسے شخص کے اعتقاد کو درست کرنا اور خیال کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔

وہ نعمت کیا ہے جسے کلفت سمجھا جاتا ہے۔ وہ شریعت ہے جو اسی عنوان سے اس آیت میں مذکور ہے اور باعتبار اختلاف احوال مکلفین کے اس کے دو درجے ہیں۔ دوا اور غذا اور دونوں میں کوئی تعارض نہیں بلکہ وہ ایک ہی چیز ہے جو بعض کے اعتبار سے دوا ہے اور دوسرے بعض کے اعتبار سے غذا۔ اور غذا تو نعمت ہوتی ہی ہے مگر دوا بھی واقع میں نعمت ہے۔ کیوں کہ مریض کے حق میں دوا ہی ذریعہ ہے غذا کا کیونکہ دوا کا مقصود مریض کے لیے یہی ہے کہ نعمتوں کا نعمت ہونا اس کو محسوس ہو۔ موٹی بات ہے کہ ایک کو دودھ ہضم نہ ہوتا ہو یا گوشت ہضم نہ ہوتا ہو اور اُن میں لذت اور قوت اور فرحت سب ہے مگر ایک شخص کو ضعف معدہ کی وجہ سے ہضم نہیں ہوتا تو اس کی کیا تدبیر کی جائے گی۔ اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ خوب کھاوے اور دست آویں۔ یہ مذاق ہے وہ جو یہ تدبیر کرے۔

ہمارے وطن میں ایک بوڑھے تھے کھاتے جاتے اور قے کرتے جاتے اور منہ صاف کر کے پھر کھاتے۔ حالانکہ اس کی یہ تدبیر نہ تھی بلکہ اُن کو دوا سے اپنی اصلاح کرنی چاہیے تھی۔ تو ایسے شخص کے حق میں دوا بھی نعمت ہے۔ اسی طرح شریعت بعض کے اعتبار سے دوا ہے مگر چونکہ ذریعہ غذا کا ہے اس لیے اُس کے حق میں بھی نعمت ہے اور جن کے حق میں غذا ہے اُن کا نعمت ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

اب سمجھنا چاہیے کہ شریعت دوا کس کے حق میں ہے اور غذا کس

کے حق میں ۔ سو دوا تو اُس کے حق میں ہے جو ابھی کلفتِ مجاہدہ میں ہے اور غذا اُس کے حق میں ہے جو مجاہدہ کے بعد لذتِ مشاہدہ میں ہے اور لوگ اس مجاہدہ سے ہی گھبراتے ہیں اور جو اس کا قصد بھی رکھتے ہیں وہ منتظر بڑھاپے کے ہیں حالانکہ اُس وقت آدمی قریب قریب معطل ہو جاتا ہے۔ پھر اخلاق ذمیمہ جو شباب میں راسخ ہو چکے ہیں وہ جدا مزاحمت کرتے ہیں۔ کیونکہ جو خصلتیں جوانی میں جم چکتی ہیں وہ بڑھاپے میں بھی نہیں جاتیں۔ مگر پھر بھی لوگ کہا کرتے ہیں کہ جوانی میں کھانے پینے کے دن ہیں۔ جب بڑھاپا آئے گا تو اللہ اللہ کریں گے۔

یہ غلطی ہے دو وجہ سے۔ اوّل تو جس چیز کی عادت جوانی میں نہ ہو وہ بڑھاپے میں یوں بھی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے بڑھاپے میں قوت وہمت نہیں رہتی۔ کسل بڑھ جاتا ہے۔ مشکل سے ٹھیل ٹھیل کے اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے نماز فرض کے لئے مشکل سے اٹھا جاتا ہے۔ ایک بزرگ کہتے تھے کہ یہ قول کہ ؎

دریغا کہ عمر جوانی گئی جوانی گئی زندگانی گئی

ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زندگانی کیوں کر گئی۔ کیونکہ بڑھاپا آنے سے اور آرام سے بیٹھے رہتے ہیں۔ لڑکے بالے یا نوکر چاکر پنکھا جھل رہے ہیں پاؤں دبا رہے ہے۔ مگر جب بڑھاپا آیا تو واقعی سمجھ میں آگیا کہ جوانی گئی زندگانی گئی کیونکہ نہ کھانے کی حلاوت نہ پینے کا مزہ، نہ سونے کا چین نہ جاگنے کا لطف اگر دماغ میں پیوست غالب ہے تو سب لوگ سو رہے ہیں۔ یہ رات بھر

اختر شماری میں مشغول ہیں نیند ہی نہیں آتی۔ اور اگر رطوبت غالب ہے تو ہر وقت آنکھیں بند ہیں اونگھ رہے ہیں۔ اٹھنا چاہتے ہیں مگر اٹھا نہیں جاتا پھر اس کے علاوہ کہیں ناک میں درد ہے کہیں کان دکھتا ہے۔ کبھی ٹانگ میں درد ہے کبھی برسات کی ہوا لگ کر کمر میں درد ہے۔

جیسے مولانا رومیؒ نے ایک بوڑھے کی حکایت لکھی ہے کہ وہ ایک طبیب کے پاس گیا اور اس نے کہا کہ میرے سر میں درد ہے۔ طبیب نے کہا کہ بڑھاپے سے۔ اس نے کہا کہ زکام بھی ہے۔ اس نے کہا بڑھاپے سے۔ اس نے کہا بلغم بھی سینہ پر جما ہوا ہے۔ اس نے کہا یہ بھی بڑھاپے سے ہے۔ اس نے کہا کھانا بھی اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ اس نے کہا یہ بھی بڑھاپے سے۔ غرض اس بوڑھے نے جو کہا اس کے جواب میں طبیب نے یہی کہا کہ یہ بھی بڑھاپے سے۔ یہ سن کر وہ بوڑھا بہت غصے ہوا اور ایک دھول ماری طبیب کے۔ تیری طب میں یہی رہ گیا ہے کہ بڑھاپے سے۔ اس نے کہا کہ میاں صاحب میں تمہاری دھول مارنے کا برا نہیں مانتا۔ تم معذور ہو یہ بھی بڑھاپے سے ہے۔

واقعی طبیب کامل تھا کہ سمجھ گیا کہ یہ ناحق کا غصہ بھی بڑھاپے سے ہے۔ بہرحال یہ تو زندگانی کا لطف گیا اور وہ جو جوانی میں لوگوں کے دلوں میں وقعت تھی۔ باستثناء اہل اللہ کے وہ بھی چلی گئی کیونکہ ان کی دوستی سچ مچ کی دوستی ہے۔ کیونکہ وہ محض دین کی وجہ سے ہوتی ہے اور اوروں کی دوستی محض اغراض کی وجہ سے ہے۔ جب بڑھاپا آیا تو بڑے میاں اپنی ہی اغراض

پوری نہیں کر سکتے تو اور کی کیا پوری کریں گے۔ تو جب واسطہ نہیں رہا تو دوستی بھی ختم ہو گئی۔

دائمی اور سچی دوستی

اہل اللہ کو جو مستثنیٰ کیا ہے مراد اُس سے وہ ہیں جو واقع میں اہل اللہ ہیں اور جو واقع میں اہل اللہ نہیں اور اپنے کو صورت میں اہل اللہ کی پیش کرتے ہیں۔ اُن کی دوستی تو دنیا داروں سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ یہ دعوے کرتے ہیں تقدس کا۔ پھر ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں۔ بعض تو خود اپنے کو غلطی سے اہل اللہ سمجھ رہے ہیں مگر واقع میں وہ اہل اللہ نہیں ہیں اور اُن کی غلطی کی بنا یہ ہے کہ چار جاہل عوام معتقد ہو گئے اور انہوں نے حضور حضور، مولانا مولانا، شاہ صاحب شاہ صاحب کہنا شروع کر دیا، تو یہ سمجھے کہ میں بھی کچھ ہوں گا جب ہی تو یہ معتقد ہوئے ہیں۔ کیونکہ جو معتقد ہوئے ہیں وہ پاگل تو ہیں نہیں۔ کچھ سمجھ ہی کے معتقد ہوئے ہیں۔ سبحان اللہ! اچھا استدلال ہے۔ اگر مخلوق کی عقیدت پر دار و مدار ہے بزرگی کا تو کیوں صاحب سب ہی تو معتقد نہیں غیر معتقدین بھی تو ہیں ان کی بد اعتقادی سے کیوں نہ استدلال کیا جائے۔ سچ یہ ہے کہ نہ خوش اعتقادی کوئی چیز ہے نہ بد اعتقادی۔ ضابطہ یہ ہے کہ دیکھ لے کہ خدا کے ساتھ اپنا معاملہ کیسا ہے۔ اگر خدا کے ساتھ معاملہ اچھا نہیں ہے تو ساری دنیا کا غوث و قطب کہنا کوئی چیز نہیں۔ غرض عوام کا اعتقاد کچھ نہیں ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

اپنا گوہر کسی صاحب نظر کو دکھلانا چاہیئے۔ صرف چند گدھوں کی تصدیق سے عیسیٰ نہیں ہو سکتے۔

چند جاہلوں کے معتقد ہونے سے عیسیٰ نہیں ہو سکتے۔ اگر کچھ ہے تو کسی صاحب نظر کو دکھلاؤ۔ اگر وہ تصدیق کر دے تو ٹھیک ہے ورنہ محض جہلاء کے اعتقاد سے کچھ نہیں ہوتا۔ جہلا کا اعتقاد کیا ہے پڑ رہے تو ان کا اعتقاد تو اس پر ہے کہ جو ہماری مرضی کے موافق ہو وہ ٹھیک ہے اور جو مرضی کے خلاف ہو تو فیہ کلام۔ جب ان کا یہ مدار اعتقاد ہے تو اس فکر میں پڑنا ہی لاحاصل ہے۔ مخلوق تو ہزاروں ہے اور ہر ایک کی خواہش دوسرے کے معارض تو پھر کس کس کو راضی کرے۔

ہمارے حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک شخص تھا۔ اس کے پاس ایک ٹٹو تھا اور بیوی بچے اور کنبہ رکھتا تھا اس کو سفر پیش آیا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ ایک جانور ہے اور کئی سوار ہیں، باری باری سب مل کے اترتے چڑھتے جائیں گے۔ چنانچہ پہلے وہ خود سوار ہوا اور اپنے سیانے لڑکے کو اور بیوی کو پیادہ لے کے چلا۔ چلتے چلتے ایک گاؤں میں گزر ہوا۔ گاؤں والوں نے اسے سوار دیکھ کے کہا کہ تجھے سوار ہوتے شرم نہیں آتی کہ بچہ پیادہ اور عورت جو قابل رحم ہے وہ پیادہ اور ہٹا کٹا ہو کے سوار ہے۔ اس نے کہا بات تو ٹھیک ہے بس خود اتر پڑا اور بیوی کو سوار کر دیا۔ دوسرے گاؤں میں پہنچا۔ گاؤں والوں نے دیکھ کے کہنا شروع کیا کہ جورو کا غلام ہے کہ سائیس کی طرح گھوڑے کی

رسی پکڑے چلا جا رہا ہے۔ ارے کم بخت تجھ پر کیا مار آئی۔ تو نے اپنا وقار کیوں کھویا۔ اُس نے کہا یہ بھی سچ ہے آؤ اب کے سب مل کے سوار ہوں۔ چنانچہ وہ اس حالت میں ایک تیسرے گاؤں میں پہنچا۔ وہاں لوگوں نے کہا کہ ارے کیسا ظالم ہے کہ جانور پر سب کو ایک دم سے لاد دیا ہے۔ ارے ایک دفعہ گولی مار دے۔ ترسا ترسا کے مارنے سے کیا فائدہ۔ اُس نے کہا یہ بھی معقول۔ فرداً فرداً بھی بیٹھ چکے۔ عورت کو بھی تنہا سوار کر چکے، سب مل کے بھی بیٹھ چکے اب صرف یہی احتمال باقی ہے کہ کوئی بھی سوار نہ ہو۔ چنانچہ سب مل کے پیادہ پا چلے۔ اب پانچویں گاؤں پر گذر ہوا۔ وہاں لوگوں نے اس حالت میں دیکھ کر کہا، دیکھو ناشکری خدا نے سواری بھی دی تو اُس کی قدر نہیں۔ ارے اگر ایک سواری تھی تو سب مل کے باری باری چڑھتے اترتے چلے جاتے۔ اُس نے کہا کہ اب کسی طرح الزام سے نہیں بچ سکتے۔ اب وہی کرو جو اپنے جی میں آوے اور کسی کے کہنے کی پروا مت کرو۔ بس پھر وہ سب اُترتے چڑھتے چلے گئے۔

تو خدا نے اُسے اس تجربہ سے عقل دے دی کہ وہی کرو جس میں راحت ہو اور کسی کے طعن و تشنیع کی پروا مت کرو، جیسے بزرگوں پر کفر تک کے فتوے لگتے ہیں اور وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور کسی کے کہنے کی پروا نہیں کرتے امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کند با خلق عالم کار نیست

ہاں بھائی بُت پرستی کرتا ہوں تمہارا اجارہ ہے؟ میں کہتا ہوں ہم تو کیا ہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہو سکتا ہے۔ ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

سارے کمال آپ میں موجود اور کوئی صفت ایسی نہیں جو علی وجہ الکمال آپ میں موجود نہ ہو اور اس کو مخالفین نے بھی تسلیم کیا تھا۔ چنانچہ بہت جگہ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے۔

یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَھُمْ فَھُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ۔

آپ کو اس طرح پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو۔ دوسری آیت میں بطور استفہام انکاری کے فرمایا ہے کہ کیا اپنے رسولؐ کو نہیں پہچانا۔ جو اس کا انکار کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ باوجود پہچان لینے کے انکار کرتے ہیں۔ غرض سب اچھی طرح جانتے تھے۔

اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں کفار نے حضورؐ کو نماز پڑھتے دیکھا ایک جگہ اونٹ ذبح ہوا تھا اُس کی اوجھڑی پڑی تھی تو آپس میں مشورہ کیا کہ کون شخص یہ اوجھڑی سجدے کی حالت میں آپ پر لا کر رکھ دے۔ روایت میں ہے فَقَامَ اَشْقَی الْقَوْمِ یعنے جو سب سے زیادہ شقی اور بدبخت تھا وہ تیار ہو گیا۔ کفر میں بھی درجے ہوتے ہیں کوئی مڈل کوئی انٹرنس اور کوئی ایف اے اور کوئی بی اے۔ تو اُن میں جو سب سے بڑا کافر تھا یعنی بی اے

تھا اُس نے کہا میں جاؤں گا۔ چنانچہ وہ گیا اور اوجھڑی اٹھا لایا اور آپ کے کمر مبارک پر رکھ دیا۔ آپ سجدے ہی میں پڑے رہے کہ اتنے میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور اس اوجھڑی کو ہٹایا اور کفار کو خوب خوب کہا اور کھری کھری سنائیں اور آپ نے بھی نماز کے بعد بد دعا شروع کی یا تو وہ اس حرکت پر آپس میں ہنستے تھے اور مضحکہ کرتے اور مذاق اڑاتے تھے جیسے اوباشوں کی عادت ہوتی ہے۔ جب بددعا کے کلمات سنے تو سب کا رنگ فق ہو گیا۔ ساری ہنسی بھول گئے کیونکہ یہ یقین تھا کہ جیسا فرما رہے ہیں ویسا ہی ہو گا ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

تو غرض اتنے تو معتقد مگر زبان سے آپ کو مجنون، کاہن، شاعر، ساحر وغیرہ ناشائستہ الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ گو دل میں وہ آپ کو سچا سمجھتے تھے مگر زبان سے تو یہ کہتے تھے۔ جب حضورؐ کے ساتھ یہ معاملہ ہوا تو اور کوئی کیوں یہ توقع کرے کہ وہ طعن و تشنیع سے بچ جائے گا۔

غرض بعض مصنوعی اہل اللہ تو دھوکہ میں ہیں کہ انہیں شبہ ہے کہ ہم بھی بزرگ ہیں اور ہوتے ہیں وہ اہل دنیا اور بعض خود دھوکہ میں نہیں مگر دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ تو اُن سب کی دوستی بھی محض دنیا ہی کے واسطے ہوتی ہے غرض بہت کم لوگ ہیں جو خدا کے واسطے محبت کرتے ہیں اور یہ محبت کبھی زائل نہیں ہوتی۔ اعتقاد تو جاتا رہتا ہے مگر محبت رہتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بدمعاش لڑکا ہے اور باپ ایک

عرصہ تک نیک چلن سمجھتا رہا اور اُس کی نیک چلنی پر اُس کا اعتقاد تھا۔ مگر اب کسی وجہ سے اُسے اُس کی بدمعاشی کا علم ہوا۔ تو دیکھئے اعتقاد تو جاتا رہا مگر محبت باقی ہے بلکہ اُس وقت تو کچھ فکر نہ تھی اور اب اور فکر بڑھ گئی کہ ہائے یہ بگڑ گیا۔ چاہتے ہیں کہ یہ درست ہو جاوے۔ اس کے لئے کہیں بزرگوں سے دعا کرا رہے ہیں کہیں تعویذ لکھوا رہے ہیں کہیں عزیزوں اور دوستوں سے مشورہ کر رہے ہیں کہ اس کی درستی کے لئے کیا تدبیر کی جاوے یہی حالت ہے حُب فی اللہ کی کہ محبوب بگڑ بھی جاوے تب بھی محبت باقی رہتی ہے بلکہ اس حالت میں اور بڑھ جاتی ہے۔ ورنہ کیا پڑی ہے کہ اُس کے لئے دُعا کرے یا اہتمام کرے۔

بس اس معیار پر دیکھ لیجئے کہ محبت خدا کے لئے ہے یا اپنی اغراض کے لئے ہوتی ہے۔ تو ایسے لوگ جوانی تک دوست رہتے ہیں اور جب بوڑھا پا آیا تو اب جانتے ہیں کہ بڑے میاں سے اب کام نہیں نکل سکتا تو سب نے چھوڑ دیا بلکہ یہ خود غرضی یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے مال میں تصرف کرتا ہے تو ورثا کو یہ بھی ناگوار ہوتا ہے اور اولاد اور بیوی بھی ناک بھوں پڑھاتی ہے کہ جتنا کم خرچ ہو اتنا ہی اچھا کہ ہمارے لئے بچ جاوے گا۔ بلکہ بعض جگہ جہاں معذور ہو جاتے ہیں مثلاً اندھے ہو گئے تو اس وقت نوکر چاکر بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ پکارتے ہیں اور وہ سنتے ہیں مگر جواب نہیں دیتے کہ یہ ہمارا کیا کر لیں گے اور ہنستے ہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ اب احتمال نہیں ہے جوانی آنے کا جو بدلہ لیں۔ اب وارثوں کی خوشامد

کرتے ہیں کہ اُن سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ تو غرض بعض اپنے مال سے بھی بوڑھاپے میں منتفع نہیں ہو سکتے۔ تو کیا آپ اس بڑھاپے کے منتظر ہیں۔ میاں بڑھاپا آئے گا تم اُس وقت کام ہی کے نہیں رہو گے۔

جوانی میں طاعات کرنے میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب جوانی میں طاعات کا خوگر ہو جاوے گا تو بڑھاپے میں عادت کی وجہ سے آسانی ہو جاوے گی۔ اسے تو ہر شخص عقل سے سمجھ سکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ جب بوڑھاپا اتنا آجاوے کہ کچھ نہ کر سکے، تو اُس کے لئے حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص صحت کی حالت میں نیک عمل کرتا ہو اور مرض میں نہ کر سکے یا حالتِ اقامت میں کرتا ہو سفر کی وجہ سے نہ کر سکے تو فرشتوں کو حکم کیا جاتا ہے کہ اس حالت میں بھی عمل پورا لکھنا۔ یہاں تو پنشن آدھی دی جاتی ہے اور وہاں پوری پنشن دی جاتی ہے بلکہ اور ایک ضمیمہ بھی اس پنشن کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ کیا ہے وہ عمل نہ کرنے کی حسرت کا اجر۔ کہ پڑے سو رہے ہیں اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کا ثواب بھی لکھا جا رہا ہے۔ یہ جوانی کے عمل کی برکت ہے ورنہ یہ ثواب کیسے ملتا۔ یہ دلیل نقلی سے معلوم ہوا۔ غرض دلیل سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ جوانی کے عمل سے بوڑھاپے کا تدارک ہو سکتا ہے۔

حقیقتِ نور تیسری بات ذوقی عارفین کے سمجھنے کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اعمال میں ایک برکت خاصہ ہے جس سے قلب میں نور پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نور وہی ہے جس کے لئے تہجد کے وقت

رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی۔ اللھم اجعل فی قلبی نوراً اے اللہ میرے قلب میں نور پیدا کر دے۔ وفی سمعی نوراً اور میرے کانوں میں نور پیدا کر دے وفی بصری نوراً اور میری آنکھوں میں نور پیدا کر دے وَفِی مُخِّی نُوْرًا اور میرے گودے میں نور پیدا کر دے۔ وَفِی عَظْمِی نُوْرًا اور میری ہڈیوں میں نور پیدا کر دے۔ وَفِی شَعْرِی نُوْرًا اور میرے بالوں میں نور پیدا کر دے۔ وَفِی عَصَبِی نُوْرًا اور میری رگوں اور پٹھوں میں نور پیدا کر دے وَفِی لَحْمِی نُوْرًا اور میرے گوشت میں نور پیدا کر دے۔ وَفِی دَمِی نُوْرًا اور میرے خون میں نور پیدا کر دے۔ اور یہاں تک کہ اَعْظِمْ لِی نُوْرًا۔ بڑھا اس نور کو میرے لئے وَجَعَلْنِی نُوْرًا۔ مجھے سراپا نور کر دے وَاجْعَلْ مِنْ فَوْقِی نُوْرًا اور میرے اوپر نور کر دے۔ وَجْعَلْ مِنْ تَحْتِی نُوْرًا اور میرے نیچے نور کر دے وَعَنْ یَمِیْنِی نُوْرًا میرے داہنے نور کر دے عَنْ شِمَالِی نُوْرًا اور میرے بائیں نور کر دے۔ اسی کا ترجمہ مولانا رومیؒ نے کیا ہے ؎

نور داء در یمین و یسر و تحت و فوق
بر سر و بر گردنم مانند طوق

وہ نور لالٹین کی روشنی نہیں بلکہ ایک کیفیت خاصہ ہے کیوں کہ حقیقت نور کی یہ ہے کہ ظَاھِرٌ بِنَفْسِہٖ وَمُظْھِرٌ لِغَیْرِہٖ (یعنے خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کر دے) اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ تعالیٰ نور دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا) میں بھی نور کے یہی

معنے ہیں۔ نور کے معنے چمک دمک نہیں ہیں۔ تو یہ ہوئی نور کی حقیقت کہ خود بیّن ہوتا ہے اور دوسرے حقائق کو بیّن کر دیتا ہے اور قلب کے اندر اس نور کے پیدا ہونے سے ظلمت دفع ہوتی ہے کونسی ظلمت، ظلمت کِبر کی، ظلمت کینہ کی، ظلمت حسد کی، ظلمت کبر کی، ظلمت غصہ کی، ظلمت معصیت کی وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کے اندر نشاط تازگی، شگفتگی اور فرحت پیدا ہو جاتی ہے تو ایسا شخص بڑھاپے میں بھی نکمہ نہیں ہوتا۔

ثمراتِ طاعت

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص دوامًا تلاوت قرآن کرتا ہے۔ بوڑھاپے میں اُس کے حواس خراب نہیں ہوتے۔ بوڑھاپے میں عمومًا حواس خراب ہو جاتے ہیں اُس سے بچنے کی تدبیر تلاوت قرآن ہے۔ اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ باوجود بوڑھاپا آجانے کے بھی اُن کے حواس قائم رہتے ہیں۔ جیسے مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کہ سو برس سے سن متجاوز تھا مگر حواس ویسے ہی تھے۔ یہ سب تلاوت قرآن کی برکت تھی۔ اسے عقلاء نہیں جانتے اہل اللہ جانتے ہیں کہ راز اس میں کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خود قوی تر مے شود خمر کہن ‌ ‌ ‌ خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

پُرانی شراب تیز ہو جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو۔

یعنے پُرانی شراب تیز ہو جاتی ہے۔ تو یہ بوڑھے میاں پہلے سے بھی تیز ہو جاتے ہیں۔ اس میں راز یہ ہے کہ اُس وقت اہل مشاہدہ ہیں اور

مشاہدہ کے معنے توجہ تام کے ہیں۔ یہ توجہ ہی وہ حظ ہے کہ بڑھاپے کا بھی ضعف نہیں معلوم ہوتا۔

جیسے ایک بوڑھا آدمی ہو اور وہ مر رہا ہو۔ اس نے اپنے بیٹے کو جو کہیں سفر میں ہے خط لکھا کہ تم فوراً چلے آؤ اور بیٹا آ گیا۔ یا تو بڑے میاں کا یہ حال تھا کہ کروٹ بھی کوئی اور بدلواتے۔ یا بیٹے کی صورت دیکھتے ہی فرط خوشی سے چارپائی پر سے خود بخود اٹھ بیٹھے۔ تو جب بیٹے کے مشاہدہ میں یہ اثر اور یہ قوت ہے تو محبوب حقیقی کے مشاہدہ میں یہ اثر کیسے نہ ہوگا بلکہ اس سے بڑھ کر ہوگا۔ اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ہر چند پیر وخستہ دبس ناتواں شدم

ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں جس وقت تیرے چہرہ پر نظر کرتا ہوں جواں ہو جاتا ہوں۔

بس یہ حالت ہوتی ہے کہ کسل اور سستی نہیں رہتی۔ یہ اثر تو شباب میں طاعت کرنے کا عاجل میں ہے اور آجل میں یہ اثر ہے کہ حدیث میں ہے شَابٌّ نَشَأَ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ یعنے جس کی جوانی کی نشوونما خدا کی طاعت میں ہوئی وہ قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا۔ اس روز دھوپ اس شدت کی ہوگی کہ بھیجے پکنے لگیں گے۔ زمین تانبے کی ہو جائے گی۔ یعنے جس طرح تانبا فوراً گرمی کو قبول کر لیتا ہے اور مٹی دیر میں اور کم گرمی کو قبول کرتی ہے۔ تو زمین باوجود مٹی کے تانبے کی سی ہو جائے گی کہ تپنے لگے گی اور آفتاب

سوا نیزہ پر آجاوے گا۔یعنی بانس برابر سر سے اونچا ہو گا۔ زمین کی قابلیت وانفعال بڑھ جائے گی اور آفتاب کی فاعلیت بڑھ جائے گی تو اُس وقت کیا حال ہو گا گرمی کا۔ دیکھو اس وقت کتنی دُور ہے۔ حکماء تو کہتے ہیں کہ چوتھے آسمان پر ہے اور اس پر کچھ دلائل بھی پیش کرتے ہیں مگر اُن کے مقدمات مخدوش ہیں۔ جن سے یہ حکم کرنا بَنَاءُ الفَاسِدِ عَلَى الفَاسِدِ ہے اور شریعت نے کوئی اس کا فیصلہ نہیں کیا مگر بظاہر نصوص سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب پہلے آسمان پر ہے۔ گو کوئی دلیل محکم اس پر بھی نہیں۔ بہرحال پہلے آسمان پر ہو تب بھی بہت دور ہوا کہ پانچ سو برس کی راہ ہے تو اتنے بُعد پر بھی دیکھ لیجئے تھوڑی سی دھوپ میں کیا حال ہوتا ہے۔ تو اُس روز جب کہ قرب کے سبب آفتاب کی فاعلیت اور زمین کی قابلیت بڑھ جائے گی گرمی کی شدت کا کیا حال ہو گا۔ پھر کوئی بچاؤ بھی نہ ہو گا۔

لَا تَرٰى فِيهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا

کہ وہاں نہ ناہمواری ہو گی نہ کوئی ٹیلہ ہو گا۔ نہ کوئی چھت یا دیوار ہو گی کہ اُسی کے سایہ میں بیٹھ جائیں۔ ایسے وقت میں سایہ کی کتنی قدر ہو گی۔ تو ایسی بڑی نعمت کی جس کی بدولت عرش کا سایہ تمہارے قبضہ میں ہے، قدر نہیں جانتے۔ افسوس کہ تم اپنی قدر نہیں جانتے کہ تم کیا ہو۔ نفس و شیطان کے پنجہ میں پھنس کر اپنی قدر کھو دی۔ تم وہ ہو کہ عرش بھی تمہارے قبضہ میں ہے بایں معنی کہ ایسی تدبیریں تمہارے ہاتھ میں ہیں کہ اُن سے عرش کا سایہ تم کو مل سکتا ہے۔ حدیث شریف میں چند اعمال کا ذکر ہے ان میں یہ بھی ہے کہ وہ

جوان جس نے طاعۃ اللہ میں نشو و نما پائی قیامت کے روز اُسے عرش کا سایہ ملے گا۔ تو اُس جوانی کی یہ فضیلت ہے کہ اس کے واسطے سے عرش کا سایہ نصیب ہوا۔ غرض ایسی نعمت ہے جوانی۔ جسے تم اس میدانِ امید میں برباد کر رہے ہو کہ جب بوڑھاپا آئے گا عمل کر لیں گے۔ خوب سمجھ لو کہ جب تم سے جوانی میں نہ ہوا تو بوڑھاپے میں کیا ہوگا۔

روحِ اعمال اگر فرض کیجیے ہمت کر کے کیا ہی تو یہاں دو چیزیں ہیں ایک عمل اور ایک اُس کی روح۔ روح کیا ہے؟ وہ طمانیت ہے جس سے قلب کو حلاوت اور راحت ہوتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے کہ اعمال کی بھی روح ہے اور اموال کی بھی روح ہے۔ اس وجہ سے کہ دکان کھولنے، کارخانہ کھولنے اور جائداد حاصل کرنے سے مطلب کیا ہے یہی نا کہ راحت سے زندگی بسر ہو۔ تو اصل سب کی چین ہوا لیکن افسوس ہے کہ جس طریق سے تم اعمال کرتے اور اموال حاصل کرتے ہو اس سے چین نہیں حاصل ہو سکتا ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی کایں رہ کہ تو میروی بترکستان ست

جس رستہ پر تم جا رہے ہو۔ مجھے امید نہیں کہ اس سے کعبہ پہنچو کیونکہ یہ رستہ کعبہ کا نہیں ترکستان کا ہے۔

اسی طرح وہ لوگ اموال و متاع کے ذریعہ سے چین حاصل ہونے کے خیال سے اس کے بڑھانے کی فکر میں منہمک رہتے ہیں۔ حالانکہ مال کی خاصیت ہے کہ جوں جوں بڑھتا ہے پریشانی بڑھتی ہے۔ ہر وقت

ادھیڑ بن رہتی ہے کہ اور بڑھے یا گھٹنے نہ پائے۔ اہل عرفان کا قول ہے

وَمَنْ يَحْمَدِ الدُّنْيَا لِعَيْشٍ يَسُرُّهُ
فَسَوْفَ لَعَمْرِي عَنْ قَلِيْلٍ يَلُوْمُهَا

جو شخص کسی مسرت بخش عیش دنیا کی مدح کر رہا ہے وہ عنقریب اس کی مذمت کرے گا۔ ابھی حس جاتی رہی ہے جب حس ہو گی تو معلوم ہوگا۔ آج دو حالتیں ہیں دنیا کی ایک بڑھنا ایک گھٹنا۔ دونوں حالتوں کے متعلق خوب کہا ہے ؎

اِذَا اَدْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً
وَاِنْ اَقْبَلَتْ صَارَتْ كَثِيْرًا هُمُوْمُهَا

دنیا جاتی ہے تو حسرت کو اپنی جگہ چھوڑ جاتی ہے اور آتی ہے تو پریشانیوں کو ساتھ لاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کو چھوڑ دو مطلب یہ ہے کہ اس میں روح پیدا کر لو یعنی وہ تدبیر کرو جس سے روح پیدا ہو وہ تدبیر روح پیدا ہونے کی میں بتا دوں گا۔

اہمیتِ راحت

یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ روح اعمال و احوال کی یہ ہے کہ قلب کو چین ہو جاوے۔ اب یہ ثابت کرنا رہ گیا کہ یہ کاہے سے ہوا کرتا ہے۔ اسے دلیل سے قبل تجربہ سے بتلاتا ہوں کہ بڑھاپے میں جس چیز سے چین ہوتا ہے، وہ جوانی کا عمل ہے۔ شیخ عبدالحق محدث رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر تم کو یہ منظور ہو کہ بڑھاپے میں آسودہ رہو تو جوانی میں گناہوں کو چھوڑ دو خصوصاً دو چیزوں کو ایک

حسن پرستی اور دوسری خوش آوازی میں مشغول ہونا۔ ان دونوں سے بالخصوص بہت بچو ورنہ بوڑھاپا آوے گا اور قلب میں بے چینی پیدا ہو گی۔ اور یہ بات کیوں پیدا ہو گی اسے ہم نہیں جانتے۔ وہ تجربہ کا دعوے کرتے ہیں جیسے شیخ سے عقیدت ہو وہ اُن کی پکائی ہوئی کھاوے ورنہ خود پکاوے۔ اب تجربہ کے بعد دلیل سے کہتا ہوں کہ چین کی تدبیر کیا ہے۔

مسئلہ عقلیہ ہے کہ چین قلب کے متعلق ہوتا ہے جوارح کا چین بھی دراصل قلب کا چین ہے کیونکہ ہاتھ پاؤں اور ڈیل میں درد ہو، تو قلب بے چین ہوتا ہے نہ کھانے میں مزہ آتا ہے نہ دریا کی سیر میں لطف آتا ہے غرض کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔ تو چین کیا ہوا قلب کا سکون یعنی دل کا قرار پا جانا۔ اور چین کا مقابل ہے بے چینی۔ جب چین سکون ہوا تو بے چینی بے سکونی ہوئی اور بے سکونی حرکت ہوئی کیوں کہ حرکت سکون کے مقابلہ میں ہے تو سکون اور چین انقطاع حرکت کا نام ہوا۔ اور انقطاع حرکت کب ہوتا ہے جب کوئی چیز اپنے مرکز پر پہنچ جائے۔ کیونکہ حرکت مرکز پر پہنچنے کیلئے ہوتی ہے۔

مثلاً ڈھیلے کا مرکز زمین ہے۔ اگر اُس کو اچھال دو تو وہ پھر بلندی سے پستی کی طرف رجوع کرے گا۔ کیوں کہ پستی اور زمین اُس کا مرکز ہے۔ اور اس وقت تک حرکت کرتا رہے گا۔ جب تک زمین تک جو اُس کا مرکز ہے نہ پہنچ جاوے۔ اور بیچ میں کوئی مکان، دیوار یا چھت اُسے روکنے والی ہے تو رُک جائے گا مگر تقاضا ہی رہے گا کہ کسی طرح نیچے اترے چنانچہ

جب یہ حجاب زائل ہو جائے گا فوراً اتر آوے گا۔ تو جو ڈھیلے زمین پر نہیں ہیں وہ بے چین ہوتے ہیں۔ دیکھو پتھر کو زمین سے اٹھاؤ تو وزنی معلوم ہوتا ہے یہ وزن کیا ہے۔ اصل میں تقاضا ہے کہ مرکز سے نہ اٹھاؤ کیونکہ جب ہاتھ سے چھوٹتا ہے وہیں پہنچ جاتا ہے۔ اور مرکز کیا ہے جہاں قرار ہو۔ اب قلب کا مرکز دیکھئے کیا ہے۔ سو مرکز کے دو مرتبے ہیں۔ ایک حسی، ایک معنوی۔ حسی تو مشاہدہ سے متعین ہو جاتا ہے اور معنوی خاصیت سے معلوم ہو گا۔ سو مرکز کی خاصیت ہے محبوبیت یعنی مرکز مطلوب کو کہتے ہیں چنانچہ مطلوب ڈھیلے اور پتھر کا زمین ہے۔ اسی طرح جو قلب کا محبوب ہو گا وہ قلب کا مرکز ہے اور محبوب کون ہوتا ہے جس سے مناسبت ہو۔ تو قلب کو جس سے مناسبت ہو گی وہی محبوب ہو گا اور وہی اس کا مرکز ہو گا۔

میں نے ایک باپ سے سنا ہے کہ مجھ کو جو فلاں بڑے بیٹے سے محبت زیادہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ میرا سا ہے یعنے مجھے اس سے مناسبت ہے ——

مناسبتِ قلب

اب دیکھنا یہ ہے کہ قلب کو کس چیز سے مناسبت تام ہے۔ سو برہان اور وجدان سے ثابت ہو چکا ہے کہ قلب کو پوری مناسبت صرف حضرت حق سبحانہ سے ہے اور اسی مناسبت کی نسبت شہادت دی ہے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ان اللہ خلق آدم علی صورتہٖ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ یہاں صورت کے معنی شکل نہیں بلکہ وہی مناسبت ہے جسے صوفیہ

نے ایک خاص عنوان سے کہا ہے (جسے علماء خشک نہیں قبول کرتے) کہ انسان مظہر ہے حق تعالیٰ کا اس لفظ مظہریت سے چونکتے ہیں اور حقیقت میں یہ عنوان تفسیر ہے اسی حدیث کی اور بدون اس تفسیر کے سخت اشکال پڑتا ہے جس سے بچنے کے لئے بعضوں نے ضمیر کا مرجع بنایا ہے آدم کو یعنی آدم کو آدم کی صورت پر پیدا کیا یعنے جیسی صورت آدم کے لئے مناسب تھی اس صورت پر پیدا کیا مگر بعض روایات میں بجائے صورتہ کے صورۃ الرحمٰن آیا ہے۔ اسے کیا کریں گے۔ اس کے جواب میں انہوں نے اسے روایت بالمعنی باجتہاد الراوی بنایا ہے۔ میں کہتا ہوں کیوں تکلف کرتے ہو جو تفسیر صوفیہ کرام نے بیان کی وہ نہایت بے تکلف اور سہل ہے۔

یہ دیکھئے کہ صورت کسے کہتے ہیں۔ اگر کہو چہرہ کی شکل کو کہتے ہیں اچھا مانا مگر یہ دیکھنا ہے کہ اس کو کیوں کہتے ہیں۔ صورت کی حقیقت کیا ہے۔ سو حقیقت صورت کی ظہور ہے۔ چنانچہ یہ بھی محاورہ ہے۔ صورۃ المسئلۃ کذا اور یوں بھی کہتے ہیں اس کام کے بننے کی کیا صورت ہے۔ تو یہاں صورت کے معنی ظہور کے ہیں اور چہرہ کو بھی صورت ظہور ہی کے معنے کی وجہ سے کہتے ہیں کہ اس سے ظہور ہوتا ہے حقیقت انسانیہ کا اور یہ حقیقت وہ ہے جس کو انا سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ روح ہے جسے حکماء نفس ناطقہ کہتے ہیں اور وہ ایک مخفی چیز ہے چونکہ روح ایک مخفی چیز تھی جسے کالبد نے ظاہر کر دیا اس لئے کالبد کو صورت کہہ دیا۔ تو اصل معنی صورت کے ظہور کے ہوئے اب سمجھئے کہ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ کے معنے علیٰ ظہورہٖ ہوئے یعنی

خدا نے اپنے ظہور پر آدم کو پیدا کیا یعنے آدم کو پیدا کر کے اپنے صفات کو ظاہر کر دیا کہ خدا سمیع بھی ہے بصیر بھی ہے متقن بھی ہے محکم بھی ہے۔ ان ہی صفات کا کچھ حصہ انسان کو دے کر اپنے صفات کمالیہ کو ظاہر کر دیا گو اور مخلوق سے بھی صفات کا ظہور ہوتا ہے مگر انسان سے بوجہ اجمع للکمالات ہونے کے زیادہ ظہور ہوتا ہے۔ اسی واسطے اس کو مظہر اتم کہتے ہیں۔ صوفیہ نے کیا کیا۔ وہی انہوں نے بھی کہا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں صرف اصطلاح بدل دی۔ یہ اُن کا لطیفہ ہے کہ اپنے اسرار کو عوام سے بچانے کے لئے اصطلاحیں مقرر کر لی ہیں ورنہ وہ قرآن وحدیث سے جدا ہو کر کوئی نئی بات نہیں کہتے۔ ہاں علماء خشک جو اُن کی اصطلاح نہیں سمجھ سکتے ان پر اعتراض کر دیتے ہیں جو واقع میں اُن پر نہیں ہوتا بلکہ اپنی فہم پر ہوتا ہے۔ ع

اصطلاحاتے است مر ابدال را

اور محققین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ طالب کے سامنے تو ان نکات کو ظاہر کر دیتے ہیں لیکن معاند کے سامنے اعتراضات سن کر بھی خاموش رہتے ہیں بلکہ اپنے متوسلین کو بھی اظہار سے منع کر دیتے ہیں۔ کما قال الشیرازی رح ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی

بگزار تا بمیرد در رنج خود پرستی

یعنی مدعی اور ظاہر پرست کے سامنے عشق اور مستی کے اسرار مت بیان کرو۔ ان کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو۔

وجہ یہ کہ انہیں جوش نہیں آتا۔ جوش آتا ہے عازم اظہار کو۔ اسی لئے کیمیا گر

کو کبھی جوش نہیں آئے گا۔ اگر کوئی اس کا انکار کرے تو وہ اور خوش ہوگا کہ چلو اچھا ہوا، لوگوں کے ہجوم سے بچے اور پولیس کے خوف سے بچے اور جو کیمیا گر نہیں ہے محض دکان دار ہے اور لوگوں کو دھوکا دینا چاہتا ہے، وہ طرح طرح کی کوششوں سے اپنا کیمیا گر ہونا ثابت کرے گا۔ اسی طرح اہل اللہ جب دیکھتے ہیں کہ معتقد کم ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں کہ چلو خلوت بالمحبوب کی دولت نصیب ہوئی ؂

چہ خوش وقتی و خرم روزگارے
کہ یارے بر خورد از وصل یارے

کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ عاشق محبوب کے وصل سے منتفع ہو۔

ایک اور عاشق نے کہا ہے ؂

چہ خوش است با تو بزمی بنہفتہ ساز کردن
درِ خانہ بند کردن سرِ شیشہ باز کردن

کیا اچھا ہے خفیہ مجلس تیرے ساتھ اختیار کرنا کہ دروازہ بند کر کے گفتگو میں مشغول ہونا۔

اس سے زیادہ خوشی کا کیا مقام ہوگا کہ محبوب کا وصل ایسے موقع سے حاصل ہو کہ کوئی پکارنے تک نہیں۔ کیا محبوب کے وصل کے وقت کوئی یہ چاہے گا کہ کوئی آ کر پکارے ارے فلانے۔ اس وقت تو یہ چاہے گا کہ ایک چار گھنٹے کے لئے ساری دنیا مجھ کو چھوڑ دے تو کام بن جاوے اور

بھی جیسے نقدہ حرمتہ کی ضرورت ہے البتہ معتقدین کے کم ہونے سے
فکر ہوگی کہ ایک اسامی کم ہوگئی۔ بہرحال مظہر اتم حق تعالیٰ کا انسان ہے کیونکہ
انسان کو حق تعالیٰ سے مناسبت تامہ ہے اور یہی مناسبت سبب تھا
محبوبیت کا اور محبوبیت صرف مرکز میں ہوتی ہے تو معلوم ہوا اور ثابت
ہوگیا کہ قلب کا مرکز صرف ذات حق ہے اور اسی سے قلب کو قرار اور
چین حاصل ہوسکتا ہے۔

صورت راحت بس یہی ایک صورت ہے چین کی کہ خدا سے دل لگاؤ
اسی کو فرماتے ہیں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ
بِذِکْرِ اللّٰہِ یعنے جو لوگ ایمان والے ہیں اور اُن کے دلوں کو چین ہوتا ہے خدا
کے ذکر سے۔ اور اس میں حصر اس لئے نہیں کہ خدا ہی کے ذکر سے چین ہوتا ہے
کیونکہ مخاطب ابھی سمجھ رہا تھا کہ چین اور چیزوں سے ہوتا ہے تو اُسے بالفعل
تو صرف اتنا ہی بتا دیا کہ چین خدا کے ذکر سے بھی ہوتا ہے۔

سبحان اللہ! کیا تدریجی تعلیم ہے کہ مخاطب قبول ہی کرلے۔ اگر ابتداہی
سے حصر کے طور پر فرماتے تو ایک قسم کا معارضہ ہو جاتا۔ یہ نہیں کیا پہلے یہ بتایا
کہ اور چیزوں سے چین ہونے کی ہم نفی نہیں کرتے مگر خدا کے ذکر سے بھی چین
ہوتا ہے۔ جب مخاطب نے یہ سمجھ لیا کہ خدا کے ذکر سے بھی چین ہوتا ہے
تو آگے فرمایا اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کہ آگاہ ہوجاؤ اور خبردار
ہوجاؤ کہ خدا ہی کے ذکر سے دلوں کو چین ہوتا ہے اور کسی چیز سے چین نہیں
ہوتا۔ پہلے جملہ میں تو بذکر اللہ جو ظرف ہے تطمئن کا اپنی جگہ پر ہے یعنی مؤخر

ہے اور آگے بذکر اللہ کی تقدیم فرمائی تاکہ حصر کو مفید ہو کہ تقدیم ما حقہ التاخیر مفید حصر ہوتا ہے اور پھر اس کو الا حرف تنبیہ سے مؤکد بھی کر دیا کہ ہوشیار ہو جاؤ کہ خدا ہی کی یاد سے دلوں کو چین ہوتا ہے۔ اس کی دلیلیں میں ابھی سب بیان کر چکا ہوں۔ اس لئے اُن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اسی کا ترجمہ مولانا رومی نے کیا ہے ؎

گر گریزی بر امید راحتے　　ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

اگر راحت کی امید پر تو بھاگنا چاہے تو وہاں بھی کوئی آفت پیش آجاوے۔

جہاں جا کے پناہ لوگے کہیں چین نہیں ملے گا کہیں کوئی آفت آئے گی اور کہیں کوئی مصیبت کہیں دوستوں کی طرف سے پریشانیاں پیش آئیں گی۔ اور کہیں دشمنوں کی طرف سے ؎

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست
جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

یہ ترجمہ ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کا۔ غرض آرام کی چیز صرف یہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ جب خدا سے تعلق ہو جاتا ہے جو مرکز ہے قلب کا تو پھر حرکت نہیں ہوتی قلب کو اور یہی سکون ہے۔ اب اگر دنیا کی تدبیریں بھی کر وگے۔ مگر قلب کو مرکز پر رکھو گے تو پھر پریشانی نہیں ہوگی جیسے پرکار کا ایک پرہ مرکز پر ہوگا اور ایک دائرہ کے محیط پر حرکت کرے گا تو جو حصہ مرکز پر ہوگا وہ حرکت نہیں کرے گا۔ کیونکہ مرکز نقطہ حقیقی ہوتا ہے

اور حرکت وضعیہ میں نقطہ مرکزیہ کو حرکت نہیں ہوتی۔ ایک پہیہ بہت بڑا ہے اور اُس کے اندر ایک اور ہے اُس سے چھوٹا پھر اُس سے چھوٹا، پھر اُس سے چھوٹا۔ تو حرکت سب کو ہوگی۔ جو بڑا ہے اُس کو زیادہ اور جو چھوٹا ہے اُس کو کم۔ اگر ان سب محیطوں کا جو مرکز ہے اُسے بالکل حرکت نہ ہوگی۔

اب سمجھئے کہ ایک باطن قلب ہے جو مرکز پر ہے اور ایک ظاہر قلب ہے جو محیط پر دورہ کرتا ہے۔ باطن قلب خدا کی یاد میں مشغول ہے اور ظاہر قلب کمانے میں مصروف ہے بلکہ اس محیط پر چلنے والے کو یہی حکم ہے کہ چلاؤ ورنہ دائرہ قطع کیسے ہوگا۔ وہ دائرہ کیا ہے بیوی بچوں کا نان و نفقہ۔ قلب کے اسی ظاہر اور باطن کے متعلق متنبی کہتا ہے ؎

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِيَ التَّائِهِ
وَهَوَى الْأَحِبَّةِ مِنْهُ فِي سَوْدَائِهِ

یعنی ملامت کرنے والیوں کی ملامت قلب کے اردگرد ہے
اور احباب کی محبت سویدائے قلب میں ہے۔

پس سویدائے قلب جو اندرون قلب ہے وہ غیر متحرک ہے جب اس میں خدا کا ذکر اور محبت جم جائے گی تو پھر حرکت نہیں ہوگی۔

علامتِ راحت

اس کی علامت یہ ہے کہ خوشی اور غم دونوں حالتیں یکساں ہوں گی۔ خوشی ہے تو الحمدللہ اور غم ہے تو الحمدللہ۔ کیونکہ وہاں نہ غم مطلوب ہے نہ خوشی مطلوب ہے۔ مطلوب

تو اُن کی رضا ہے ۔

بس زبون وسوسہ باشی ولا　　گر طرب را باز دانی از بلا

یعنی اگر تم خوشی کو بلا سے ممتاز سمجھتے ہو تو ابھی وساوس میں مبتلا ہو۔ ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

خوشی بھی انہیں کی ہے اور غم بھی انہیں کا ۔

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من

دل فدائے یار دل رنجانِ من

تیری ناراضگی بھی مجھے پسند ہے میرے دل دکھانے والے یار پر دل فدا ہے ۔

محبوب کی رضا مقصود ہے جس طرح اُس سے مصافحہ کرنے سے فرحت ہوتی ہے اسی طرح اس کی چپت میں بھی فرحت ہوتی ہے۔ چپت میں چوٹ تو ضرور لگے گی کیونکہ معشوق اچھا خاصا کھاتا پیتا ہٹا کٹا تھا۔ اُس کا ہاتھ بھی بہ دہشت ہی ہوگا۔ اور اُس سے چوٹ بھی ضرور لگے گی۔ مگر چوٹ سر پر لگے گی دل پہ نہیں لگے گی۔ اسی سے یہ چپت میں بھی خوش ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اگر معشوق کہے کہ اگر تمہارے چوٹ لگتی ہو تو لاؤ میں تمہیں چھوڑ کر رقیب کو اسی طرح چپت لگاؤں دباؤں تو وہ اس کا یہ جواب دے گا ۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کے نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو۔ دوستوں کا

سر سلامت رہے تو خنجر آزمائیے۔

کہ جب ہم موجود ہیں تو رقیب کو کیوں مارتے ہو ؎

سر بوقت ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے
کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

تو جس کے قلب میں خدا کا تعلق جم جاتا ہے۔ اس کو کسی حال میں غم نہیں ہوتا۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

فراق اور وصل سے کیا مطلب دوست کی رضا مطلوب ہونی چاہیئے۔ اس لیئے کہ اس کے سوا تمنا کرنا قابل افسوس ہے۔
یعنی وصل کو بھی مطلوب نہیں سمجھتے۔ اگر کوئی کہے کہ وصل تو مطلوب ہی ہے اس کے مطلوب نہ سمجھنے کے کیا معنے؟ جواب یہ ہے کہ وصل مزعوم عند السالک کو مطلوب نہیں سمجھتے جسے سالک مطلوب سمجھتا ہے کیونکہ سالک غیر کامل کو ان حقائق کی خبر نہیں ہوتی جب تک شیخ کامل کی تقلید نہ ہو۔ ایسا سالک محض اپنے علم سے کام لیتا ہے اور یہاں علم و فضل کا مٹانا ضروری ہے۔
اسی کو مولانا نے ایک حکایت میں بیان کیا ہے کہ ایک نحوی صاحب جنہیں اپنی نحو دانی پر ناز تھا سفر کے ارادہ سے کشتی پر سوار ہوئے۔ راستہ میں ملاح سے پوچھا کہ میاں تم نے کچھ نحو بھی پڑھی ہے۔ اُس نے کہا نہیں کہنے لگے افسوس تم نے آدھی عمر کھوئی۔ اس کے بعد کشتی کسی گرداب میں آگئی اور

چکر کھانے لگی۔ ملاح نے پوچھا میاں کچھ تیرنا بھی جانتے ہو۔ انہوں نے کہا، نہیں! اُس نے کہا، افسوس تم نے ساری ہی عمر کھوئی۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ع

محو می باید نہ نحو ایں جا بداں

تو یہاں تو اس کی ضرورت ہے۔ یہاں نرا ظاہری علم وفضل کافی نہیں اس سے محقق نہیں ہوتا۔ اور اگر علم وفضل کی وجہ سے محقق ہو بھی تو وہ دلائل کا محقق ہے وجدان کا محقق نہیں ہے۔ دلائل کیا چیز ہیں اندھے کی لکڑی کہ اُس کے سہارے سے ٹٹول ٹٹول کے چل رہا ہے۔ جہاں وہ لکڑی ٹوٹ گئی بس کچھ بھی نہیں۔

تو اسی طرح اُس نے اپنے علم سے وصال کی تعریف گھڑی کہ وصال کسے کہتے ہیں کہ کچھ کیفیت ہونے لگے، کچھ سنسناہٹ ہونے لگے، جی لگنے لگے۔ اگر جی لگا تو سمجھے ہاں وصل ہو گیا اور اگر جی نہیں لگتا اور وساوس کا ہجوم ہو گیا تو سمجھا کہ بس مردود ہو گیا۔ تو اس کو غلطی یہ ہوئی کہ کیفیات کو وصل اور وساوس کو فراق سمجھا۔ حالانکہ یہ قبض وبسط ہے فراق ووصل نہیں ہے

قبض وبسط

قبض وبسط دونوں وصل ہی کی قسمیں ہیں۔ چنانچہ جس طرح محبوب کا پاس بلا کے بٹھانا وصل ہے اسی طرح یہ حکم دینا کہ جاؤ آم لاؤ یہ بھی وصل ہے۔ یہ نہیں کہ آموں کی جستجو میں جو وقت صرف ہوا اور محبوب سے جدا رہنا پڑا یہ فراق ہو گیا۔ کسی شاعر نے کہا تھا ؎

اُس کے کوچہ سے جب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں
تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں ... دوسرے نے

جواب دیا..... اُن کے کوچہ سے کب اٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں
وہ ہوسناک ہیں جو رو بقفا جاتے ہیں

مگر یہ اُس اٹھنے میں ہے جو از خود ہو۔ وہ حقیقت میں خلاف ہے لیکن اس کے علاوہ ایک مرتبہ اور ہے۔ وہ یہ کہ معشوق خود اٹھاوے تو یہ اٹھنا عین وفاداری ہے۔ مثلاً اگر معشوق کہے آم لاؤ تو فوراً چلا جائے اور اگرچہ لغتہً یہ زمانہ فراق کا ہوگا۔ مگر اہلِ عقل کے نزدیک یہ زمانہ اس وصال سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ اس میں تو محبوب کے ناراض ہوجانے کا بھی جو کہ حقیقی فراق ہے اندیشہ ہے۔ اور اس میں اُس کے ناراض ہونے کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ جتنی دیر آم لانے میں لگے گی اتنی دیر تک اُس کے راضی رہنے کا یقین ہے۔ تو جو عاشق ہے وہ اس حالت میں بھی مزے میں ہے اور نہایت خوش ہے کہ محبوب کی رضا تو حاصل ہے۔ اس حالت میں وہ عاشق ضرور یہ کہے گا ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

اور یہ وہ فراق ہے کہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی گوارا فرمایا کیا آپ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ فراق صوری یعنی توجہ الی الغیر مطلقاً بھی نہ ہو مگر آپ کو ارشاد ہوا۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ قُمْ فَاَنْذِرْ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاتْلُ عَلَیْهِمْ۔

کہ کفار کے پاس جائیے اور انہیں انذار و تبلیغ فرمایئے اور کلام الٰہی سنایئے اور اس پر آپ اٹھے اور خلوت میں بجائے محبوب حقیقی سے مناجات کرنے کے مشرکین و کفار سے خطاب فرماتے ہیں۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِفۡعَلُوۡا کَذَا وَلَا تَفۡعَلُوۡا کَذَا

اے لوگو اللہ کی عبادت کرو اور بت پرستی چھوڑ دو —!

گو آپ کی توجہ محبوب حقیقی کی جانب سے اُس وقت بھی منقطع نہیں ہوئی تھی مگر ایک گونہ حجاب تو تھا۔ کیونکہ ایک تو براہ راست محبوب کا دیکھنا اور ایک آئینہ کے اندر اُس کا چہرہ نظر آتا۔ تو حق تعالیٰ کے دیکھنے کی مثال ایسی ہے کہ پہلے تو خود محبوب کو بلا واسطہ دیکھ رہے تھے اور اب بواسطہ مرأت کے دیکھ رہے ہیں گو توجہ اب بھی تام ہے مگر بلا حجاب نہیں کیونکہ مرأت حجاب ہے گو شفاف ہے اور وہاں حجاب تو حجاب خود اپنی ذات کا حائل ہونا بھی گوارا نہیں۔ حضرت بو علی قلندرؒ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

ہمارے اور محبوب کے درمیان آنکھ اور کان کا بھی کیوں واسطہ ہو اس سے بھی غیرت آتی ہے۔ غرض یہ حجاب تھا جسے حق تعالیٰ کے ارشاد سے گوارا کیا گو وہ حجاب اُن کی رضا سے تھا مگر وصال بلا حجاب کے مقابلہ میں تو فراق ہی تھا۔ تو دوسرے مومنین کیوں نہ اس فراق کو گوارا کریں ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق

ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

میرا میلان وصل کی طرف اور اُن کا فراق کی طرف۔ اُس کے مطلب کی خاطر میں نے اپنا مقصد ترک کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ عاشق قبض و بسط میں کچھ فرق نہیں کرتا نہ قبض میں گھبراتا ہے نہ بسط میں ناز کرتا ہے کیونکہ یہ سب وصال ہی کی حالتیں ہیں اور گو ظاہر قلب محیط پر دائرہ ہے جو دنیا کے کاموں میں مشغول ہے مگر باطن قلب جو مرکز پر ہے وہ مشغول ہے تسلیم و رضا میں۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے کسی حالت میں بھی تغیر نہیں ہوتا اور کسی مصیبت سے نہیں گھبراتا۔ یہاں تک کہ مرنے سے بھی نہیں گھبراتا۔ اس واسطے کہ اُس وقت بھی مطلوب تو پاس ہی ہے۔ بلکہ موت کا وقت تو وہ ہے کہ پرکار کا باہر کا پرہ جو محیط پر تھا وہ بھی اندر کے پرہ کے قریب آرہا ہے کیونکہ تمام افکار دنیا خود بخود منقطع ہو رہے ہیں۔ تو اور خوشی کی بات ہے کہ یہ جسم ہیولانی جو ایک گونہ حجاب تھا اٹھا جاتا ہے۔ اس کو ایک بزرگ وقت نزع کے اس طرح فرما رہے تھے ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　جسم بگزارم سراسر جاں شوم

وہ وقت آیا کہ میں ظاہر ہو جاؤں۔ جسم چھوڑ کر سراسر جاں ہو جاؤں۔

اور اسی کے ساتھ یوں بھی کہہ رہے تھے ؎

چیست توحید آنکہ از غیر خدا　　فرد آئی در خلا و در ملا

توحید یہ ہے کہ غیر خدا سے ہر خلوت و جلوت میں یکسو رہے۔

غرض اسی خوشی میں جان دے دی۔ ابن الفارض رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے صاحب کشف و صاحب حال تھے۔ جب اُن کا زمانہ وفات قریب آیا تو آٹھوں جنتیں اُن پر منکشف ہوگئیں۔ یہ دیکھ کر انہوں نے منہ پھیر لیا اور غلبہ حال میں یہ فرمایا کہ

اِنْ کَانَ مَنْزِلَتِیْ فِی الْحُبِّ عِنْدَ کُمْ
مَاقَدْرَاَیْتُ فَقَدْ ضَیَّعْتُ اَیَّامِیْ

کہ اگر محبت کا صلہ یہی ملا تو ساری عمر ہی برباد ہوئی۔ پھر کہتے ہیں وہ جنتیں مستور ہوگئیں اور خاص تجلی کا ظہور ہوا اور روح پرواز کر گئی۔ گویا وہ حالت تھی جیسے ایک اور بزرگ کہتے ہیں ؎

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد
تا نہ بینم رُخ تو رُوح رمیدن ندہم

اگر جان نکالنے کے لئے ملک الموت آئے۔ جب تک تیرا
دیدار نہ کرلوں، جان دینا نہ چاہوں۔

غرض جس شخص کی یہ حالت ہو وہ کس قدر چین میں ہوگا۔

صراطِ مستقیم میں راہب نہیں بناتا نہ میں کارخانے چھوڑتا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتاتا ہوں کہ ظاہر قلب سے دنیا کے کام کرو اور باطن قلب کو خدا کی طرف متوجہ کرو۔ باقی یہ مطلب نہیں ہے کہ بیوی کو طلاق دے دو اور بچوں کو عاق کر دو اور کوٹھری میں بیٹھ جاؤ۔ کیا سارا جہاں چھوڑ کر بس اللہ میاں کوٹھری میں ہیں۔ نعوذ باللہ اُن کا تو کوئی مکان نہیں وھو معکم اینما کنتم وہ

تو ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں۔ ہاں تم ہی اُن سے دُور ہو اس لئے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ یعنی ہم تم سے بہت نزدیک ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ اَنْتُمْ اَقْرَبُ اِلَیْنَا۔ کہ تم ہم سے بہت نزدیک ہو۔ اس لئے کہ تم تو دُور ہو اور وہ نزدیک ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ قرب و بعد تو نسب متکررہ میں سے ہے۔ جب ایک دوسرے سے قریب ہوگا تو دوسرا بھی اس سے قریب ہوگا۔ ایک بعید ہوگا تو دوسرا بھی بعید ہوگا۔ مگر یہ قرب حسی میں ٹھیک ہے۔ یہاں قرب کے معنی قرب علمی کے ہیں قرب جسمی کے نہیں ہیں۔ پس مراد محض یاد اور توجہ ہے۔ تو اس اعتبار سے وہ قریب ہیں۔ یعنی تمہاری طرف متوجہ ہیں۔ اور تم بعید ہو یعنے تم اُن کی طرف متوجہ نہیں۔ پس اگر تم ذرا اُن کی طرف متوجہ ہو تو پھر اُن کا قرب تمہیں معلوم ہو۔

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظؔ از میاں برخیز

عاشق اور معشوق میں کوئی پردہ نہیں۔ تو خود ہی حجاب ہے۔ اے حافظؔ درمیان سے علیحدہ ہو۔

حضرت بایزید بسطامی رحؒ نے حضرت حق جل و علا شانہٗ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا۔ یَا رَبِّ دُلَّنِیْ عَلٰی اَقْرَبِ الطُّرُقِ اِلَیْكَ یعنے مجھے اپنے تک پہنچنے کا سب سے مختصر راستہ بتائیے کہ بس اس سے سیدھا اور مختصر نہ ہو۔ سبحان اللہ خواب میں بھی یہی دھیان ہے۔ جواب میں فرماتے ہیں دَعْ نَفْسَكَ وَتَعَالَ۔

اپنے نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ۔

کیسا سہل راستہ ہے یعنی اپنے نفس کے تقاضے پر عمل چھوڑ دو یعنے اپنی رائے کو، اپنے ارادہ کو اور مصالح کو چھوڑ دو۔ بس ان مصالح نے ہی تو خراب کیا ہے ہر بات میں۔ غرض ہر بات میں پالیسی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں چین نہیں اور اللہ والوں کو اس لئے تکلیف نہیں کہ اُن کے سویدائے قلب میں پالیسی اور غرض نہیں ہے۔

حضرت بہلول نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہو اُس کی خواہش کے موافق ہوتا ہو۔ پھر اُسے کاہے کی تکلیف۔ حضرت بہلول نے کہا کہ حضرت یہ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ ہنسنے لگے اور کہا کہ اس پر تو تمہارا بھی ایمان ہے کہ بدون خدا کے ارادہ کے کچھ نہیں ہوتا۔ جب یہ سمجھ گئے تو اب یہ سمجھ لو کہ جس نے اپنی خواہش ہی نہ رکھی ہو اور اپنی مرضی کو بالکل خدا کی مرضی میں فنا کر دیا ہو تو جو کچھ ہوگا وہ خدا کی مرضی کے موافق ہی تو ہوگا۔ اور اُس کی مرضی بھی وہی ہے جو خدا کی مرضی ہے بس وہ اُس کی خواہش کے موافق بھی ہوگا۔ اُس کا کوئی خاص ارادہ ہی نہیں۔ نہ یہ کہ ابھی مر جائیں نہ یہ کہ دس برس زندہ رہیں کہ ذرا بیمار ہوئے اور دھڑکا پیدا ہوا کہ ہائے ابھی تو ایک ہی برس گزرا ہے ابھی نو برس اور باقی ہیں۔ نہ یہ خواہش کہ غریب ہو کر رہیں نہ یہ خواہش کہ امیر ہو کر رہیں۔ جیسے زاہدوں کی یہ خواہش ہوتا ہے کہ کمل ہی ملے دوشالہ نہ ملے۔ اگر دوشالہ ملا تو ناک منہ چڑھ گیا۔ اور دنیا دار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوشالہ ملے۔ اگر کمل ملے گا تو اُس کا ناک منہ چڑھ گیا۔ سو غور کرو تو تم کیا اور تمہاری مرضی ہی کیا۔ اگر کمل دیں کمل اوڑھو۔ اگر دوشالہ دیں دوشالہ اوڑھو

اگر غریب بنائیں خوشی سے اُسے گوارا کرو اور اگر بادشاہ بنائیں بادشاہ بن جاؤ
ایک جوڑا روز بدلنے کو دیں ایک جوڑا روز پہنو اور اگر ایک جوڑا ایک برس
میں دیں تو ایک برس میں پہنو۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو اُن کے شیخ نے ایک کرتہ دیا تھا۔ وہ اُسے ساری عمر پہنے رہے۔ جب پھٹ جاتا تھوڑے پر سے گدڑے چیتھڑے جوڑ بٹور کر دھوتے اور دھو کر پیوند لگا لیتے تھے۔ وہ کرتہ اب بھی موجود ہے اور زائرین نہایت عقیدت سے اُسے آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ اور بادشاہوں کے تخت و تاج کا پتہ بھی نہیں۔ اور نہ کوئی انہیں پوچھتا ہے۔ وجہ یہ کہ وہ عطیہ تھا سرکاری۔ اور گو یہ بھی عطیہ سرکاری ہے مگر بادشاہ اُسے عطیہ سرکاری نہیں سمجھتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا ہے ہم نے حاصل کیا ہے۔ ہمیں اس کا استحقاق ہے اس خودی کی وجہ سے وہ مٹا دیا گیا اور اس میں یہ برکت عطا کی گئی کہ وہ اب تک باقی ہے۔

فقر و غنا اگر کوئی کہے کہ وہ عمر بھر کیوں ایک کُرتہ پہنے رہے اگر بدل ڈالتے تو کیا وہ عطیہ نہ ہوتا۔ تو بات یہ ہے کہ اُن کو دوسرا میسر ہی نہ تھا باوجودیکہ ابراہیم لودی بادشاہ اُن کے مرید تھے مگر کبھی بادشاہ کی نذر قبول نہیں کی۔ کہ یہ بیت المال کا ہے جو عامہ مسلمین کا ہے۔ بادشاہ کو اُس میں تصرف جائز نہیں ہے۔ اگر چاہتے تو بہت کچھ لے لیتے اور بڑے بڑے عالیشان محل تیار کر لیتے ابراہیم بادشاہ کی بہن بھی حضرت سے مرید تھیں اور اس درجہ کی بیوی تھیں کہ آپ فرماتے تھے کہ اگر عورتوں کو خلیفہ بنانا مشائخ کا معمول ہوتا تو میں ابراہیم کی بہن

کو خلافت دیتا اُن سے بھی کبھی نذر قبول نہیں فرمائی کہ اُن کے یہاں بھی وہی بادشاہ کا پیسہ ہے جو بیت المال کا ہے۔

ایک مرتبہ آپ کے یہاں ایک بزرگ تشریف لائے۔ وہ اُن کو ایک میلا اور پھٹا سا کرتہ پہنے دیکھ کر سمجھے کہ یہ بنتے ہیں۔ اور شبہ کی بات بھی تھی کہ جس شخص کا بادشاہ مرید ہو اُس کو کاہے کی کمی ہے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ بعض لوگ زاہدوں میں داخل ہونے کو پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتے ہیں۔ یہ شیخ سمجھ گئے کہ مجھ پر تعریض ہے۔ اُن سے علیحدگی میں عرض کیا کہ میں بنتا نہیں ہوں بلکہ میرے پاس اس کرتے کے سوا اور ہے نہیں۔ بڑی تنگی سے بسر ہوتی تھی اور فاقے ہوتے تھے۔

اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ آپ کے گھروں میں سے آپ کے پیر کی بیٹی تھیں اگر کچھ ہوتا تو کیا آپ اُن سے دریغ فرماتے۔ اُن کی یہ حالت تھی کہ فاقے ہوتے تھے اور جب کئی فاقے گزر جاتے تو بیوی کہتیں کہ حضرت اب تو تاب نہیں، فرماتے گھبراؤ نہیں جنت میں عمدہ عمدہ کھانا پک رہا ہے۔ وہ بھی ایسی نیک تھیں کہ اس وعدہ پر راضی ہو جاتیں۔ غرض شیخ کی تو عسرت کی یہ حالت تھی۔

اور ایک حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی حالت تھی کہ آپ ایسا کپڑا پہنتے تھے کہ اتنا قیمتی کپڑا خلیفہ وقت بھی نہیں پہن سکتا تھا۔ حشم و خدم اور عمدہ و لطیف غذائیں اور مرغ پلاؤ وغیرہ سے سابقہ رہتا۔ اور جہاں یہ تھا وہاں یہ بھی یقینی تھا کہ اگر دونوں کی حالتوں کو ایک دوسرے سے بدل دیا جاتا تو دونوں خوشی سے قبول کر لیتے۔ غرض عارف کی یہ شان ہونی چاہیے کہ وہ جس

حال ہمارا کہیں زندہ رہے، ماریں تو مر جاوے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو

دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

یعنی زندگی عطا فرمائیں تو آپ کی مہربانی ہے اور اگر آپ قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں۔ دل آپ پر آگیا ہے جو کچھ آپ تصرف کریں میں آپ سے راضی ہوں۔

نعمتِ شریعت

حاصل یہ ہے کہ اپنے ارادہ کو فنا کر دو۔ اور یہاں ایک اشکال ہے کہ صاحب جب ارادہ کو فنا کر دیں تو نماز کا اور روزہ کا بھی ارادہ فنا کر دیں۔ سو سمجھ لو کہ ارادہ کو فنا کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ جو ارادہ حق کے خلاف ہو اُسے فنا کر دو اور جو ارادہ حق کے موافق ہو وہ تو مطلوب ہے اور نماز و روزہ کا ارادہ مرضی حق کے موافق ہے اُس کو فنا مت کرو۔

غرض یہ ہے چین کی جڑ اور روح جو اس کو جوانی میں حاصل کرے گا جو کہ اس وقت درجہ ... میں دوا ... ہو گی تو بوڑھاپے میں آرام سے رہے گا اور چین سے بسر کرے گا۔ اور بحکم غذا بھی ہو جائے گی اور یہ اوپر ثابت ہو چکا ہے دوا بھی نعمت ہے اور غذا بھی نعمت ہے کیونکہ دوا مجاہدہ ہے اور غذا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بغیر مجاہدہ کے نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ مجاہدہ بھی نعمت ہے۔ اس مقام پر جس نعمت کا ذکر ہے اُس کے یہی دو درجے ہیں۔ بعض کے لئے دوا بعض کے لئے غذا۔ یہ سب اسی کی تمہید تھی۔ تمہید میں قدرے طول ہو گیا مگر

خیر، میں مقصود میں بھی کیا بیان کرتا۔ اس میں بھی یہی بیان کرتا۔ بہر حال حق تعالیٰ نے ایک نعمت مرحمت فرمائی۔ اوّلاً جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً آپ کے غلاموں کو۔ جسے لوگ تکلیف اور مصیبت سمجھتے ہیں۔

مجھے اپنے بچپن کی ایک حکایت یاد ہے کہ ایک بار میں مسہل پینے سے گھبرا رہا تھا تو والد صاحب نے فرمایا کہ تم مسہل پی لو تمہیں ایک روپیہ دیں گے چنانچہ اس روپیہ کی لالچ میں وہ مسہل پی لیا لیکن جب عقل آئی اس وقت معلوم ہوا کہ مسہل پینے سے انکار کرنے میں کس قدر غلطی پر تھا کیوں کہ وہ دراصل میرے ہی آرام کے لئے تھا۔

اسی طرح جب ہمیں عقل آوے گی تو اس نعمت کی قدر ہو گی کہ بڑی چیز ہے۔ اگر دوا ہے تب بھی نعمت ہے کیونکہ صحت اسی سے ہے اور غذا کا لطف صحت ہی سے ہے۔ غذا مطلوب بالذات ہے تو دوا مطلوب بالعرض ہے۔ بہر حال دوا ہو یا غذا ہر حال میں نعمت ہے۔ اور وہ نعمت کیا چیز ہے اب میں اس کا نام بتائے دیتا ہوں۔ وہ نعمت وہ ہے جس کے نام سے لوگ گھبراتے ہیں یعنی شریعت۔ اب تو شریعت کا نام سنا اور ڈرے کہ بس بھائی خدا خیر کرے اب حکم ہو گا کہ کھاؤ نہیں، پیو نہیں ہنسو مت، بولو مت۔ ایک عنایت فرما نے مجھ سے فرمایا کہ شریعت کا خلاصہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ نہ ہنسنے کی جگہ ہنسو اور نہ رونے کی جگہ روؤ۔ گلا گھونٹا ہوا رکھو۔ میں نے کہا، آپ جیسے سمجھ دار جب خلاصہ نکالیں گے تو واقعی پھر تو یہی خلاصہ ہو گا شریعت کا۔

ایسے بد مذاق لوگوں کی بالکل اس چمار کے لڑکے کی مثال ہے کہ ایک

راجہ تھا گنوار سا۔ اس کی ایک لڑکی تھی۔ اُس کی شادی وہ کسی سے نہیں کرتا تھا کیونکہ اُسے یہ خبط تھا کہ کوئی میرے برابر کا نہیں ہے۔ بڑے بڑے راجاؤں کے پیام پھیر دیتا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ شدت کی آندھی چلی اور زور کے بگولے میں ایک چمار کا لڑکا اڑ کر راجہ کی چھت پر گرا۔ لوگوں کو اور راجہ کو یہ تعجب ہوا کہ یہ لڑکا یہاں کہاں سے اور کیوں آیا۔ عقلا کو بلایا گیا اور پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ اُنہوں نے سوچ کے کہا کہ یہ غیبی آدمی ہے جو اس لڑکی کے ساتھ شادی کے واسطے بھیجا گیا ہے۔ جب عالم شہادت میں کوئی آدمی شادی کے قابل نہ نکلا تو عالم غیب سے اُس کو بھیجا گیا۔

حکم دیا اُسے حمام میں لے جاؤ اور کپڑے بدلواؤ۔ جب اُسے حمام میں لے چلے وہ بڑا چلایا۔ راجہ نے حکماء سے پوچھا کیا ہے یہ چلاتا کیوں ہے انہوں نے کہا حضور یہ عالم غیب سے تازہ آیا ہے۔ ابھی ہم لوگوں سے مانوس نہیں ہے۔ اس سے گھبراتا ہے۔ اُسے زبردستی حمام میں لے جا کر گرم پانی سے نہلایا۔ جب کپڑے پہنانے کا قصد کیا گیا تو کپڑے دیکھ کر اور گھبرایا اور بہت چلایا۔ راجہ نے پھر حکماء سے پوچھا۔ انہوں نے کہا۔ اُس نے ابھی دنیا کی چیزیں نہیں دیکھی ہیں۔ اچھا اس کے سامنے بہت سے جواہرات لائے جائیں۔ یہ اُن سے مانوس ہوگا۔ چنانچہ بہت سے جواہرات چمکتے چمکتے اُس کے آگے لا کے رکھے گئے تو وہ پریشان ہوا اور لگا چلانے۔ سب سے اخیر میں حکماء کی یہ رائے ہوئی کہ اچھا خود شہزادی کو اُس کے سامنے بٹھا دیا جائے کہ شاید اسے اُدھر رغبت ہو۔ اور یہ قرار پکڑے۔ جب شہزادی سامنے لائی گئی

تو اب تو اُس کے چلانے اور پریشان ہونے کی کوئی حد و انتہا ہی نہ رہی بہت ہی رویا چلایا۔ اب حکماء نے کہا کہ اچھا اُسے آزاد کر دیا جاوے۔ جب یہ اس عالم سے مانوس ہوگا تب شادی کی جاوے۔

چنانچہ وہ آزاد ہوتے ہی سب کپڑے اتار اور اپنی لنگوٹی باندھ مخلّی بالطبع ہو کر اپنے گھر کی طرف بھاگا اور گھر پہنچ کر اپنی ماں کو لپٹ گیا اور اس طرح اپنی سرگزشت سنانے لگا کہ مجھے ڈاکو پکڑ لے گئے بھتے میری میا۔ مجھے ایک کوٹھری میں بند کیا (یہ حمام کا خاکہ ہے) تب بھی میں نہ مرا میری میا۔ پھر تتا تتا پانی (یعنی گرم گرم) انہوں نے مجھ پر ڈالا تب بھی میں نہ مرا میری میا۔ پھر انہوں نے مجھے کفن پہنایا (یہ جوڑے کی قدر کی ہے) تب بھی میں نہ مرا میری میا۔ پھر وہ جلتی بلتی آگ لائے (یہ جواہرات کا نقشہ ہے) تب بھی میں نہ مرا میری میا پھر وہ ایک ڈائن کو بلائے (یہ شہزادی ہے) کہ مجھ کو کھا جائے۔ تب بھی میں نہ مرا میری میا۔

بس جو مذاق اس چمار کے لڑکے کا تھا وہ مذاق ہم لوگوں کا ہے کہ شریعت جیسی حسین شہزادی کو ڈائن سمجھ کر اُس سے گھبراتے اور بھاگتے ہیں اجی شریعت تو ایسی حسین ہے

رعایتِ مصالح

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

افسوس ہم نے اسے چھوڑ کے دنیا کو محبوب بنایا ہے جس کی یہ

حالت ہے ؎

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد چوں باز کنی مادر مادر باشد

یعنی سمجھے کہ یہ بڑی حسین اور نوجوان ہوگی مگر جب چادر اٹھا کے دیکھا تو وہ نانی اماں سے بھی بڑھی تھی۔ اب سمجھ لیجئے کہ آپ نے کس کو چھوڑا اور کس کو لیا ؎

بقولِ دشمن پیمانِ دوست بشکستی
ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

دشمن کے کہنے سے دوست سے تعلق توڑا۔ دیکھ کہ کس سے تو کٹا اور کس سے جڑا۔

وجہ یہ ہے کہ شریعت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور نہ اس کا حسین چہرہ دیکھنے کے لیے آنکھ بنوائی۔ اس لئے دنیا کی برائیاں نہیں دکھائی دیتیں۔ اجی اندھا اس سے زیادہ کیا دیکھتا ہے کہ ڈبل نرم نرم ہو۔ بس یہ حسن ہے اس کے نزدیک اور چاہے چہرہ پر آدھ سیر قیمہ بھرنے کی ضرورت ہی ہو اور چاہے ایسا ہو کہ جیسے اُپلے میں کوّا ٹھونگیں مار گیا ہو۔ آنکھیں درست کرائیں تو اصل حسن کی پہچان ہو۔ ورنہ آنکھ میں یہ دھندا اور جالا کاہے کا ہے۔ غرض نفس کا ہے اور اتباع ہوا کا ہے۔ شریعت نے تو حقیقی مصالح کی ذمہ داری لی ہے، خاص آپ کی موافقتِ نفس کا تو ٹھیکہ نہیں لیا۔ حکمت کے اقتضا سے جیسا مناسب ہوگا، شریعت ویسا حکم کرے گی۔ حکیم تو وہی ہے جو مرض کے مناسب نسخہ تجویز کرے نہ کہ مریض کے نفس کے مناسب۔ اور جو مریض کی مرضی کی رعایت

کرے گا۔ وہ اصل میں طبیب نہیں ہے وہ فیس اینٹھنے والا ہے۔ جو کہ آپ کی مرضی کے موافق نسخہ لکھ کر آپ کو خوش کر کے فیس لینا چاہتا ہے۔ بہت لوگ علماء میں بھی ایسے ملیں گے کہ فیس لے کر مستفتی کی مرضی کے موافق فتوے لکھ دیتے ہیں۔

میں نے ایک ہزار روپیہ کا فتویٰ دیکھا جس میں سگی خوش دامن کا نکاح داماد سے حلال لکھا تھا۔ آپ کو تعجب ہوتا ہو گا کہ قرآن میں جس کی حرمت کی تصریح ہے، اُس کی حلت کا فتویٰ کیسے لکھ دیا اور لوگوں نے اسے مان کیسے لیا، اجی کمال تو جب ہی ہے کہ جب لوگ مان بھی لیں۔ کیونکہ فتویٰ تو لوگوں کے اعتراض سے بچنے کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ جب اعتراض سے بچاؤ نہ ہوا تو وہ فتویٰ ہی کیا ہوا۔ اور پھر ہزار روپیہ کون دیتا۔ ایسے فتوے لکھنے والے بڑے ذہین ہوتے ہیں ——،

قصہ یہ تھا کہ ایک داماد ساس پر فریفتہ ہو گیا تو اُس نے ایک مفتی سے کہا کہ کیا ترکیب کروں کہ اُس سے نکاح کر سکوں۔ اُس نے کہا ہزار روپیہ دو ترکیب میں بتا دوں گا۔ چنانچہ اُس نے ہزار روپے دیئے۔ ہزار روپیہ لے کر اُس نے کیا ترکیب کی کہ یہ لکھا کہ ساس اُس کو کہتے ہیں جو منکوحہ کی ماں ہو پہلا مقدمہ۔ منکوحہ اُس کو کہتے ہیں جس کا نکاح شریعت کے موافق ہوا ہو دوسرا مقدمہ عموماً عورتیں کلماتِ شرک و کفر اپنی زبان سے جاری کرتی ہیں جس سے مرتد ہو جاتی ہیں اور مرتدہ کا نکاح درست نہیں ہوتا اس لئے قبل نکاح تجدید ایمان ضروری ہے تیسرا مقدمہ۔ یہ مشرکہ تھی کہ عادت کے موافق کلمات شرک و کفر زبان پر لاتی تھی

چوتھا مقدمہ۔ اور اُسے تجدید ایمان نہیں کرائی گئی پانچواں مقدمہ۔ لہذا نکاح شرعاً نہیں ہوا کہ مشرکہ سے مومن کا نکاح نہیں ہوتی۔ جب یہ منکوحہ نہ ہوئی اُس کی ماں ساس بھی نہیں ہوئی۔ رہ گئی حرمت مصاہرت سو یہ ابو حنیفہؒ کی گھڑت ہے، جو حدیث کے خلاف ہے۔ اس لئے حدیث کے مقابلہ میں ہم ابو حنیفہؒ کا قول نہیں مانتے۔ اے لیجئے بس وہ حرمت مصاہرت سے بھی بری ہو گئی انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اسی طرح میں نے اور طرح طرح کے فتوے دیکھے ہیں تو کیا یہ لوگ طبیب ہیں۔ صاحب طبیب تو وہی ہے جو اپنی مرضی کا نسخہ لکھے اور مریض کو اُس کے پینے پر مجبور کرے چاہے فیس ملے یا نہ ملے۔ اسی طرح بہت سی باتیں شریعت کی بھی جو آپ کے خلاف ہوں گی آپ کو ناگوار ہوں گی۔

مثلاً کسی شخص کی عادت رشوت لینے کی ہے۔ جب اُسے یہ معلوم ہوگا کہ رشوت لینا حرام ہے تو کس قدر ناگوار ہوگا کہ ہزار روپے کا نقصان ہوا اگر اتفاق سے اسی لینے والے کو کہیں رشوت دینا پڑے تو اُس وقت اس قانون کی خوبی سمجھ میں آجاوے۔ اگر کوئی اس سے ہزار روپے رشوت کے لے کر فتویٰ سُنے اور واپس کر دے تب اس سے کوئی پوچھے کہ شریعت کا حکم کیسے ہے یہ کہے گا کہ سبحان اللہ! کیا کہنا ہے شریعت کا۔ بھلا ایسے خود غرض کا کیا فیصلہ اپنی اغراض سے قطع نظر کر کے فیصلہ کرو تو ہم مانیں گے۔ اس سے تو معلوم ہوا کہ محض غرض کے بندے ہو۔ بلکہ اگر کوئی غرض سے بھی قطع نظر کرے اور وہ عقل سے اپنی مصالح کا فیصلہ کر لیا کرے تو یہ فیصلہ بھی قابل اعتبار نہیں کیوں کہ وحی کے آگے

عقل کیا چیز ہے۔

غرض شریعت سے ناگواری کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کی خوبیاں دیکھنے کے لئے آنکھ نہیں ہے۔ اگر آنکھ ہو تو معلوم ہو جائے کہ شریعت میں کہیں حق تعالیٰ نے اپنی غرض پوری نہیں کی ہے ؎

من نہ کردم خلق تا سودے کنم — بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

میں نے مخلوق کو اپنے نفع کے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ بندوں پر سخاوت کرنے کے لئے پیدا کیا۔

آپ کے مصالح کی ایسی رعایت ہے کہ شاید آپ خود بھی نہ کر سکتے۔

مثلاً شریعت نے یہ بتایا کہ پھل آنے سے پہلے باغ کی فصل بیچنا حرام ہے گو یہ فیصلہ مالک باغ کو ناگوار ہے کہ پھل آنے سے پہلے تو باغ پانچ سو کو بکتا تھا اور اب پھل آئے اور کم آئے تو اڑھائی سو کو بیچنا پڑا لیکن خریدنے والے سے پوچھو کہ وہ شریعت سے کتنا خوش ہے کہ پانچ سو جس باغ کے دیتا تھا ڈھائی سو میں مل گیا۔

اسی طرح ایک شخص نے ایک بیٹی اور ایک دُور کا عصبہ چھوڑا۔ آدھی میراث بیٹی کو ملے گی اور آدھی عصبہ کو۔ اس میں بیٹی کو بڑا ناگوار ہوا کہ میں خاص بیٹی اور میرے باپ کا مال۔ یہ دُور کا رشتہ دار اسے خواہ مخواہ دے دیا مگر اس عصبہ سے پوچھو تو وہ کہے گا سبحان اللہ! شریعت میں حقائق کی کیا رعایت ہے کہ دُور دُور کی قرابت کو بھی اس قدر مانا ہے۔

تو اب ایک ہی حکم ہے مگر دو آدمیوں میں سے اپنی اپنی اغراض کی وجہ

سے ایک کو ناگوار ہے اور ایک کو گوارا ہے۔ اب ہم کس کے فیصلہ کو ان دونوں میں سے مانیں ؎

تَرَکْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰی جَمِیْعًا!
کَذٰلِکَ یَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِیْرُ

یعنی لات اور عزّیٰ دونوں کو چھوڑ دیا۔ ہم ان دونوں میں سے کسی کا فیصلہ نہیں مانیں گے۔ کیوں کہ یہ دونوں خود غرض ہیں۔ ہم تو وحی کا فیصلہ مانیں گے کیونکہ وہاں شائبہ غرض کا نہیں ہے۔ اس لئے وہی قابل اعتبار ہے۔ وحی کا فیصلہ یہ ہے کہ شریعت قانون عام ہے جو مصالح عامہ کی رعایت کرتا ہے جیسے سرکاری قانون۔

مثلاً سڑک پر پیشاب کرنا جرم ہے۔ اب ایک شخص کو زور کا پیشاب لگا وہ کہاں جائے۔ وہاں تو یہ حکم ہے پیشاب مت کرو اور یہاں پیشاب نکلا جارہا ہے۔ تو وہ شخص کیا کہے گا کہ بڑی سختی کا قانون ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ پیشاب کی تو اجازت ہوتی مگر اس کی بدبو سے بچنے کے لئے کوئی ایسی دوا ڈال دی جاتی کہ دماغ بے حس ہو جاتے۔ اس لئے کسی کو بدبو نہ معلوم ہوتی بھلا کون اسے پسند کرے گا کہ اس گدھے کے پیشاب کے واسطے سب کو بے حس بنادے۔

اسی طرح شریعت نے بھی مصالح عامہ کی رعایت سے قانون بنایا ہے تم اس میں مصالح خاصہ اور وہ بھی نفسانیہ ڈھونڈتے ہو۔ اور شریعت کا اچھا معلوم ہونا مصالح عامہ کی رعایت سے یہ تو حکماء و عقلاء کی نظر میں ہے اور ایک

نظر ہے عشق و محبت والے کی اُس کو اس سے اچھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دوست کا قانون ہے۔ یہ حکماء کی نظر سے بڑھ کر ہے۔

جیسے کوئی طوائف اپنے کسی عاشق سے یہ کہہ دے کہ تم لنگوٹی باندھ کر رام نرائن کے بازار میں پھرو۔ یہ اُس سے نہیں پوچھے گا کہ بی اس میں تمہارا کیا فائدہ بلکہ فوراً اِدھر اُدھر دوڑنے لگے گا۔ اگر کوئی کہے بھی گدھے یہ کیا ہے ہتو وہ کہے گا قَالَ الْجِدَارُ لِلْوَتَدِ لِمَ تَشُقُّنِیْ قَالَ الْوَتَدُ اُنْظُرْ اِلٰی مَنْ یَدُقُّنِیْ

ایک شخص دیوار میں کیل ٹھونک رہا تھا تو دیوار نے کیل سے شکایت کی کہ میں نے کیا کیا جو میرے جگر کو شگافتہ کر رہی ہے۔ کیل نے جواب دیا کہ اس سے پوچھو جو مجھے ٹھونک رہا ہے۔ تو حکماء و عقلاء احکام کے لم کے درپے ہوں گے اور جو عاشق ہو گا وہ یہ کہے گا کہ حکمت اُس سے پوچھو جس نے یہ قانون مقرر کیا ہے مجھ کو کچھ بحث نہیں بس مولوی صاحب کو یہی جواب اختیار کر لینا چاہیے ؎

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

محبت و شریعت

غرض یہی علماء کو بھی مناسب ہے۔ میں اُن کو نصیحت کرتا ہوں کہ اگر حکم و اسرار معلوم بھی ہوں تو پوچھنے پر تو ہرگز مت بتاؤ۔ چاہے یہی گمان کریں کہ انہیں نہیں آتا اور پوچھنے والے بھی خوب سمجھ لیں کہ جاننے والے بھی بہت ہیں مگر تمہارے غلام نہیں ہیں کہ تمہیں سب بتا دیا کریں۔

جیسے طبیب کہ جانتا سب ہے کہ تین ماشہ گل بنفشہ کیوں لکھا اور چھ ماشہ گل گاؤزبان کیوں لکھا مگر کوئی مریض پوچھنے لگے تو وہ نہیں بتائے گا۔ اگر وہ کہے کہ

معلوم ہوتا ہے تمہیں طب نہیں آتی۔ ہاں صاحب نہیں آتی تمہیں پسند ہو پیو ورنہ مت پیو۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

یعنی کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو مگر ہم تمہارے کہنے سے نہیں بتاتے۔ اور حقیقت میں مصلحت اور حکمت پوچھنے کی ضرورت ہی کیا۔ محبوب کا حکم سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ محبوب سمجھ کر اُس کے حکم کی علت دریافت کرنا عشق کے بالکل ہی خلاف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جاؤ ہم عاشق ہی نہیں پھر ہم پر وظائف عشق بھی واجب نہیں۔ تو صاحب تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے عشق تو لوازم ایمان سے ہے جب تم نے آمنا کہا تو عشقنا کا التزام بھی کر لیا۔

جیسے کوئی شخص کہے مجھ پر نان و نفقہ بی بی کا کیسے واجب ہو گیا میں نے تو اس کا التزام نہیں کیا تھا۔ صرف قبلت النکاح کہا تھا ہر شخص یہی کہے گا جب قبلت کہا جب ہی شوہری کے حقوق کے ملتزم ہو گئے پس اسی طرح جب لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہا پس عاشق ہو گئے کیونکہ اس کلمہ سے مؤمن ہو گئے اور مومن کے بارہ میں ارشاد ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔

جو لوگ خدا پر ایمان لائے وہ خدا کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں تو تصدیق ایمانی کے ساتھ ہی سارے کے سارے عاشق ہو گئے۔ اب آپ عشق سے انکار کریں تو کیا ہوتا ہے۔ جب عاشق ہونا ثابت ہو گیا تو عشق کے

حقوق ادا کرو۔ بس کان مت ہلاؤ اور سیدھے محبوب کے حکم پر چلتے رہو۔ اگر کوئی اس انقیاد کا قصد کرے تو اوّل اوّل تو تکلّف ہوتا ہے پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے تو اس کے ترک میں تکلّف ہوتا ہے۔ جس طرح دوا عادت پڑنے سے غذا ہو جاتی ہے اگر کوئی کہے کہ دوا کیوں کر غذا ہو جاتی ہے، تو میرے پاس اس کی لا جواب مثال موجود ہے۔

دیکھئے حضرت تمباکو سلمہ اللہ تعالیٰ کہ کوئی اس سے مشکل سے بچا ہوگا۔ کہیں اکلاً اور کہیں شرباً اس کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ شروع کرتے وقت کیسی متلی ہوتی تھی کیسی ابکائیاں آتی تھیں چکر آتا تھا مگر جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر یہ جناب سب سے زیادہ مرغوب ہو جاتے ہیں۔ روزے میں سب کو تو پانی اور شربت کی فکر ہوتی ہے مگر انہیں نہ پھلکیوں کی پروا، نہ شربت کی پروا، نہ افطاری سے مطلب۔ ارے بھئی حقہ دے دو ایک پان دے دو۔ ایسی مکروہ چیز کیسی محبوب ہوئی۔ اے اللہ تمباکو کی تو اتنی محبت اور شریعت کی اتنی بھی نہیں۔ ارے بھئی تمباکو ہی سمجھ لیا ہوتا۔ تمباکو تو کیا ہوتا، آخر کسی طرح بھدّے لوگوں کو سمجھاؤں بھی۔ اگر خمیرہ گاؤ زبان نہیں سمجھتے تو خمیرہ تمباکو ہی سمجھو۔ بہرحال اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ عادت ڈال لو تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے۔

بعض بزرگوں کو کسی تکلیف کے وقت نماز کو اٹھنے میں ناک منہ چڑھاتے دیکھ کر اگر یہ شبہ ہو کہ عادت پڑ جانے کے بعد اُن پر کیوں اثر ہے۔ بات یہ ہے کہ اُن کے دل پر اثر نہیں صرف جسم پر ضعف کی وجہ سے اثر ہے اور دل میں نہایت خوش ہیں ـــــــ ،

اس کی مثال بھی میرے پاس موجود ہے اور وہ نظیر حضرت تمبا کو کی دوست مزرع ہیں کہ ناک بہہ رہی ہے، آنسو جاری ہیں، سی سی کر رہے ہیں مگر کھائے چلے جاتے ہیں۔ کیوں صاحب اگر تکلیف ہے تو کیوں کھاتے ہو۔ بات یہ ہے کہ تکلیف منہ کو ہے مگر زبان اور حلق کو تو مزہ آتا ہے۔ اس لئے منہ کی تکلیف گوارا ہے۔ تو اب سمجھ میں آگیا کہ لذت والم دونوں ایک ہی وقت میں جمع ہو سکتے ہیں اسی طرح امتثال امر محبوب میں گو بدن کو تکلیف ہو مگر دل اور روح شادان ہے اور اس عادت کا یہ اثر ہے کہ اگر ایک نماز بھی قضا ہو جائے گو بدن کو آرام ملا کہ پڑے سوتے رہے مگر قلب کو جو تکلیف ہے اس کے آگے یہ آرام کچھ بھی نہیں۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود　　　گر ز باغِ دل خلالے کم بود

یعنی اگر باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے اس وقت دیکھو اُن کے غم کو۔ پھر اس میں بھی دو درجے ہیں۔ زاہد کو تو غم ہوتا ہے مطلقاً عمل فوت ہو جانے کا اور عارف کو غم ہوتا ہے باختیار خود فوت ہو جانے کا اور بلا اختیار فوت ہونے کا کچھ غم نہیں ہوتا کیونکہ دوست نے اس میں یوں ہی تصرف کیا۔ مگر یہ بات عام لوگوں کے سنانے کی نہیں کیونکہ یہ اگر قصداً بھی سو گئے اور نماز قضا کر دی، تو حیلہ نکال لیں گے کہ محبوب کی یوں ہی مرضی تھی۔ تو یہ مرضی مرض والوں کے لئے نہیں کیونکہ وہ خود مَرَضی (بفتح الراء) ہیں۔ یعنے مرض والے۔

بہر حال تکلیف طبعی سے جسم کو پریشانی ہوتی ہے مگر روح کو نہیں ہوتی بلکہ اُن اعمال سے ایسی مناسبت ہو جاتی ہے کہ وہ غذائے روح بن جاتی ہیں کہ اگر

وہ نہ ملیں تو پریشانی ہوتی ہے۔ صرف شروع میں کسی قدر تکلیف ہوتی ہے۔ جیسے مشاہدہ سے پہلے مجاہدہ کی ضرورت ہے یا غذا سے پہلے دوا کی حاجت ہوتی ہے پھر تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے ——— تو حضرت ایسی چیز ہے شریعت جس سے ڈرتے ہیں لوگ حالانکہ اس میں ہمارے کل مصالح دینیہ و دنیویہ کی بیحد رعایت کی ہے۔

راحت اور شریعت

سار ی مصلحتوں سے بڑھ کر تو چین ہے جو بدون اتباع احکام شریعت نصیب ہی نہیں ہو سکتا

اگر کوئی شخص کہے کہ بدون اتباع احکام کے بھی چین نصیب ہو سکتا ہے کیونکہ چین تو بقول تمہارے تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتا ہے۔ پس اگر ہم ہر وقت خدا کو یاد کریں اور اتباع شریعت نہ کریں تو تعلق مع اللہ تو حاصل ہو گیا۔ پس چین سے رہیں گے تو خوب سمجھ لو کہ مطلق تعلق سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسے تعلق میں چین کا گمان بے حسی ہے۔ فی الواقع اس میں بے چینی مضمر ہے جو مرنے کے بعد کھل جائے گی۔

جیسے ایک سرحدی گنوار ہندوستان میں آیا۔ ایک حلوائی کی دکان پر جا کر حلوا لیا۔ اس نے دام مانگے۔ یہ وہاں سے بھاگا۔ وہ حلوائی بھی پیچھے بھاگا۔ جب وہ اتنا بھاگا کہ قریب تھا کہ پکڑ لے آپ نے وہ حلوا جھٹ منہ میں رکھ لیا کہ جاؤ نہ ہمارا نہ تمہارا۔ وہ پکڑ کے پولیس میں لے گیا۔ تھانیدار کوئی رحم دل تھے۔ انہوں نے بجائے چالان کرنے کے یہ سزا دی کہ گدھے پر سوار کر کے اور اعلان کے لئے ڈھول کے ساتھ شہر سے باہر نکال دینے کی سزا دی۔ لونڈوں نے جو اسے گدھے پر سوار دیکھا تو وہ بھی تماشہ کے طور پر ساتھ ہو لئے۔ یہ ہندوستان کی

سیر سے فارغ ہو کر اپنے ملک پہنچے۔ وہاں لوگوں نے اُن سے پوچھا کہ آغا ہندوستان رفتہ بودی چہ طور ملک ست؟ ہندوستان کیسا ملک ہے۔ آپ نے کہا خوب ملک ست۔ بڑا اچھا ملک ہے۔ پوچھا گیا بچہ طور؟ تو آپ فرماتے ہیں۔ در ہندوستان حلوا خوردن مفت ست۔ حلوا مفت کھانے میں آتا ہے۔ سواری خر مفت ست گدھے کی سواری مفت ملتی ہے۔ ڈم ڈم مفت است۔ باجا مفت ملتا ہے فوجِ طفلاں مفت است۔ لڑکوں کی فوج مفت ملتی ہے۔ ہندوستان خوب ملک ست۔

تو جیسے ان حضرت کو یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ جشنِ خدم عزت کا سامان تھا یا یہ نہایت ذلت کی سزا تھی۔ اسی طرح اُن کو نہیں معلوم کہ یہ چین ہے یا بے چینی لیکن کہاں تک ؎

فَسَوْفَ تَرَى إِذَا انْكَشَفَ الْغُبَارُ أَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ أَمْ حِمَارُ

عنقریب دیکھے گا تو جب آنکھوں سے غبار اُتر جائے گا کہ تمہارے بدن کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔

جب حقیقت منکشف ہو گی اُس وقت معلوم ہو گا کہ چین تھا یا بے چینی جیسے اُس آغا کو جب ان سب باتوں کی حقیقت معلوم ہوئی ہو گی تو کس قدر شرمندہ ہوا ہو گا اسی طرح انہیں بھی مرتے وقت معلوم ہو جائے گا کہ وہ لذت تھی یا بے لذتی۔ غرض جو تعلق و نسبت مطلوب اور سرمایہ راحت ہے تو وہ ہے جو جانبین سے ہو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (راضی ہو گیا اللہ اُن سے اور وہ راضی ہو گئے اُس سے) وہ نسبت ہی نہیں جو صرف ایک ہی طرف سے ہو۔

جیسے کسی شہر میں ایک پردیسی طالب علم تھے۔ اُن کے دیس کے کوئی آدمی اُن سے ملنے گئے۔ انہوں نے پوچھا میاں طالب علم کس رنگ میں ہو۔ کہنے لگے کہ شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں۔ پوچھا کیا سامان ہوا۔ کہنے لگے ہاں آدھا کام تو ہو گیا آدھا باقی ہے۔ پوچھا کس طرح۔ کہنے لگے میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں۔ خوب آدھا ہو گیا تو یہ اُلّو پن ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ بزعم خود صاحب نسبت ہیں جو ملکہ یادداشت بہم پہنچا کر اپنے کو مقبول سمجھتے ہیں مگر اتباع شرع نہ ہونے کے سبب اُن کے زعم کا حاصل یہ ہے کہ ہم تو راضی ہیں مگر اللہ میاں راضی نہیں۔ خوب سمجھ لو کہ اُن کے راضی ہونے کا معیار صرف احکام کا اتباع ہے۔ اگر اسی حال میں موت آگئی تو سب کھل جائے گا کہ یہ تعلق اُن کو پسند نہ ہونے کے سبب تمہاری نظر میں کس قدر خوار ہو گا۔ بقول سعدیؒ ؂

چو در چشم شاہد نیاید زرت   زر و خاک یکساں نماید برت

جب محبوب کی نظر میں تیرا سونا نہ آئے تو تیرے نزدیک سونا اور خاک برابر ہے۔

آپ نے ہزار روپے محبوب کو بھیجے کہ وہ خوش ہو مگر معلوم ہوا کہ وہ خوش نہیں ہوا اور اس نے نہیں لیا اور انہیں واپس کر دیا۔ کسی نے کہا کہ گھر میں بھیج دو تو بیوی کو دے گے پھر سمجھو بھائی میں کیا کروں گا ایسے منحوس روپیہ کو۔ اسی طرح جب معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ اس تعلق سے راضی نہیں ہوئے تو اس تعلق کو کیا سمجھو گے۔ تعلق وہی ہے کہ دونوں جانب سے ہو اور یہ تعلق علاوہ اتباع شریعت کے ہو نہیں سکتا

تو دیکھئے شریعت کتنی بڑی چیز ہوئی۔ حق تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا۔

ثُمَّ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

فرماتے ہیں یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی اور ہم نے اُن کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں اور ہم نے اُن کو دنیا جہان والوں پر فوقیت دی۔ اور ہم نے اُن کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیلیں دیں۔ سو انہوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا بوجہ آپس کی ضدا ضدی کے۔ آپ کا رب اُن کا آپس میں قیامت کے روز اُن امور میں فیصلہ کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے

اس کے بعد فرماتے ہیں ثُمَّ جَعَلْنٰكَ ـــــ الخ یعنے پھر آپ سے پہلے بنی اسرائیل کو کتاب وغیرہ عنایت کی تھی۔ اس کے بعد ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔

اتباع شریعت

من الامر میں من بیانیہ ہے کہ وہ شریعت وطریقہ خاص کیا ہے۔ وہ امر دین ہے پس اس کا اتباع کیجیے۔ لقب کتنا لطیف ہے شریعت! یعنی جس عنوان سے علماء اتباع دین کا امر کرتے ہیں وہی عنوان آیت میں وارد ہو گیا جس سے صریحاً مدعا علماء کا ثابت ہو گیا۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

اور ان جاہلوں کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجیے۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ طرز بیان ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ولا تتبع غیرھا کہ غیر شریعت کا اتباع نہ کیجیے بلکہ یوں فرمایا کہ جہلاء کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجیے۔ اس میں یہ بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں وہ خواہشیں نہیں ہیں وہ ہوائے نفسانی ہیں۔ اس لیے وہ عمل کے قابل نہیں۔ الذین لا یعلمون سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ قید احترازی ہے یعنی الذین یعلمون کی اہوا کا اتباع جائز ہے بلکہ یہ قید واقعی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ واقع میں علماء ہی نہیں ہیں جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہشیں پیش کرتے ہیں بلکہ وہ تو جہلا ہیں۔

جیسے یوں کہتے ہیں کہ مفسدوں کے بہکانے میں نہ آنا۔ تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ غیر مفسدین کے بہکانے میں آجانا۔ نہیں مطلب یہی ہے کہ بہکانے والے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں ان سے بچتے رہنا۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لو۔

اور الذین لا یعلمون کا مفعول جو ذکر نہیں فرمایا، سبحان اللہ! اس میں عجیب رعایت ہے۔ اگر مفعول ذکر فرماتے تو وہ امر الدین ہوتا تو ایک گونہ مصادرہ ہو جاتا کیونکہ امر دین ہی میں تو کلام ہو رہا ہے۔ تو اس صورت میں یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اس لیے مذموم ہے کہ وہ اہوا ہے۔ اور اہوا اس لئے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا فعل ہے۔ اس لیے یہاں مطلق علم کی نفی کر دی کہ اہوا اس لئے مذموم ہے کہ وہ ایسوں کا فعل ہے، جو بالکل ہی جاہل ہیں۔

یہ دعویٰ کہ جو شخص شریعت کا متبع نہ ہو وہ بالکل جاہل ہے اتنا بڑا ہے کہ سارا عالم اس میں مقابل ہے جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کو پورا یقین ہے کہ یہ ساری دنیا کو جاہل بنانا اتنی پکی بات ہے کہ اس میں ذرا احتمال خلاف کا نہیں ورنہ آپ کو جھجک ضرور ہوتی کہ کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھے۔ اور اس وقت گو ظاہر میں آپ نہیں تشریف رکھتے مگر آپ کا علم و فیض تو ہے، جیسے آفتاب پر ابر آ جاوے تو آفتاب نظر سے پوشیدہ ہے مگر اس کی روشنی تو ہے بلکہ چوندھوں کے لئے تو یہ ابر بھی رحمت ہے کہ براہ راست وہ اس کا تحمل نہ کر سکتے۔ اسی طرح بعضے لوگ ایسے ہیں کہ اگر حضورؐ کے زمانہ میں ہوتے تو یقیناً یہ حضور کی اتباع سے عار کرتے اور اس سے وہ کفر میں پڑ جاتے۔ تو اچھا ہوا کہ ابر آ گیا ورنہ ان چوندھوں کی بڑی مشکل ہوتی۔ بہرحال اب وہ آفتاب کی روشنی ابر سے بھی چھن رہی ہے۔ اس موقع پر میں مولانا کا یہ شعر پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ   چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی آفتاب رخصت ہو گیا اور میں اسے اس لئے پسند نہیں کرتا کہ آفتاب رخصت نہیں ہوا۔ وہ تو اب بھی درخشاں ہے صرف ابر کے نیچے چھپ گیا ہے بلکہ یہ شعر اس موقع پر مناسب ہے ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان ست

خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

ابھی وہ ابرِ رحمت موتی بکھیر رہا ہے۔ خم و خمخانہ بارونق ہے۔ اور مولانا نے وہ شعر کسی دوسرے موقع پر فرمایا ہے۔ غرض حضورؐ کے غلام حضورؐ سے فیض لینے والے اب بھی موجود ہیں جو اب بھی اس دعویٰ کو ثابت کرنے کو تیار ہیں کہ جو متبع شریعت نہ ہو وہ جاہل ہے۔

فیضِ صحبت میں خود تو دعویٰ نہیں کرتا مگر دین کے محاسن پر نظر کر کے کہتا ہوں کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عاقل ہو مگر عالم نہ ہو اور نہ کسی محقق کی صحبت میں رہا ہو۔ اُس کو کسی محقق کی صحبت میں چھ مہینے کے لئے بھیج دو۔ خدا کی قسم اس چھ مہینے میں وہ محقق یہ ثابت کر دے گا اور اس عاقل کی زبان سے اقرار کرا لے گا کہ میں احمق ہوں اور اس وقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا۔ اگر اس سے زیادہ دلیل کوئی چاہے تجربہ کر لو۔ کہ چھ مہینے کی رخصت لو پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھو۔ اُس وقت دیکھ لوگے کہ یہ شخص آئے گا تو اپنے کو عاقل کہتا ہوا مگر جائے گا یہ کہتے ہوئے کہ میں احمق ہوں۔ نہیں بلکہ پہلے احمق تھا کیونکہ اب تو اس محقق کی برکت سے عقل آجاوے گی۔ تب معلوم ہو گا کہ اھُو اھُو

اَلَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ کا مدلول کیسا یقینی ہے کہ جو چیز شریعت کے مقابلہ میں ہے

وہ جہل ہے۔

میں حالانکہ کچھ بھی نہیں مگر جونپور کے ایک شاعر صاحب میرے یہاں آئے جو عربی تہذیب سے آراستہ تھے۔ میں تو ادنے سے ادنے، ادنے سے ادنے ہوں۔ اسی طرح دس بیس دفعہ ادنی کی اضافت ادنی کی طرف کی جائے۔ بہر حال میں کچھ بھی نہیں ہوں مگر چند روز رہنے کے بعد جب وہ واپس گئے تو وہاں جا کر انہوں نے ایک رسالہ لکھا۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ عمر بھر جسے ہم تہذیب سمجھا کیے وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ وہ تہذیب ہی نہیں تھی۔

خیر وہ تو مر گئے ایک اور دہلی کے طبیب بھی آئے چند روز یہاں رہنے سے وہ بھی یہ کہنے لگے کہ جن کو ہم اب تک کمالات سمجھتے تھے سارے نقائص نکلے اور جنہیں ہنر سمجھتے تھے وہ سب عیوب تھے۔ تو اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر شبہ ہو تجربہ کر لیجیے۔ اس لئے فرمایا اَھْوَاءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ جاہلوں کا اتباع نہ کیجیے۔

یہاں اتباع شریعت کے متعلق ایک نکتہ ہے جسے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے اور اطلاق مضر ہے کیونکہ اطمینان اور چین بدون تقیید کے نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہونگے تو فلانے طبیب کا علاج کریں گے۔ تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے۔ بیماری کا خوف نہیں ہوگا اور نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا کہ کس کا علاج کریں اور اگر تقیید نہیں ہے تو پھر ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں۔ اگر آج ذرا سا تغیر پیش آیا

ایک طبیب سے رجوع کیا۔ دوسرا تغیر پیش آیا دوسرے سے رجوع کر لیا تیسرا پیش آیا تیسرے سے رجوع کر لیا۔ تو اس میں دل کو چین نہیں ہوگا۔ اور ہر وقت یہ فکر رہے گی کہ اب کے تغیر میں کس طبیب سے رجوع کریں گے۔ غرض تقلید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے چاہے وہ طبیب دانش مند بھی نہ ہو۔ مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہو جائے گا اور اگر وہ تقلید حقائق کے موافق ہو تو سبحان اللہ! کیا کہنا ہے۔

اگر شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونے کا بھی دعویٰ نہ ہوتا جیسا کہ مدلول ہے وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ کا تب بھی اتباع شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا اور اب تو جب کہ شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونا ثابت کر دیا گیا تو اس اتباع کا ضروری و مصلحت و موجب طمانیت ہونا اور بھی ثابت ہو گیا۔ آگے وعید ہے۔

إِنَّهُمْ لَن يُغْنُوا عَنكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ـــــــــــ

یہ لوگ خدا کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آ سکتے یعنی گو یہ آج مددگار بننے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر خدا کے یہاں ذرا کام نہیں آ سکتے۔ اس پر اہل حق کو تردد ہو سکتا تھا کہ اتباع کے بعد ہم تو اکیلے رہ گئے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔

وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۖ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ

اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا۔

اس سے تردد رفع ہو گیا کہ اہل اہوا اگر ہم سے الگ ہو گئے تو کچھ پروا نہیں کیونکہ

خدا تو ہمارے ساتھ ہے۔ آگے مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں اور شریعت میں جو صفتیں ہیں انہیں بتاتے ہیں

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ٥

قرآن یا شریعت عام لوگوں کے لیے دانش مندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت ہے

ھذا بصائر۔ بصائر جمع بصیرت کی ہے۔ بصیرت کہتے ہیں باطنی روشنی کو جیسے بصر کہتے ہیں۔ نگاہ یعنی ظاہری روشنی کو تو شریعت بصائر ہے یعنی باطن کو روشن کرنے والی ہے۔ وھدی ہے اور سراپا ہدایت ہے کہ اس سے راستہ نظر آتا ہے اور مقصود تک پہنچا دیتی ہے ورحمۃ اور رحمت ہے جو کہ مقصود ہے۔ گویا شریعت تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ ہے جو چند سال پہلے بھی ذہن میں آیا تھا مگر اُسے بھول گیا تھا۔ اس وقت پھر یاد آگیا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ راہ رو کو انہیں تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ جب آدمی مقصود تک جانا چاہتا ہے تو اُس کے لئے ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک طریق ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے مقصود تک پہنچ سکتے ہیں اور ایک بصر یعنی نگاہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے راستہ نظر آوے حق تعالےٰ کے قربان جائیے کہ شریعت کو تبلاتے ہیں کہ یہ ایسا قانون ہے جو تینوں کو جمع کئے ہوئے ہے هٰذَا بَصَآئِرُ یہ آنکھیں بھی ہیں وھدی اور راستہ بھی اسی کے ذریعہ سے طے ہوتا ہے۔ ورحمۃ اور رحمت ہے یعنی مقصود بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! بصیرت، طریق، مقصود اسی ایک شریعت

میں ہیں۔

اب رہا یہ کہ بصائر کو جمع کیوں لائے اور ہدی و رحمۃ کو مفرد کیوں لائے اس میں نکتہ یہ ہے کہ راستہ چلنے والے تو بہت ہوتے ہیں اور سب کی آنکھیں الگ الگ ہوتی ہیں اس لیئے اس کو جمع لائے اور راستہ ایک ہی ہوتا ہے اور مقصود بھی سب کا ایک ہی ہوتا ہے اس لیئے وہاں مفرد لائے۔ پھر آگے فرماتے ہیں یہ کہ رحمت تو ہے مگر ہر شخص کے لیئے نہیں بلکہ لقوم یوقنون ہ یقین کرنے والوں کے لیئے۔

ضرورتِ تقلید یقین کے دو درجے ہیں ایک تقلیدی اور ایک تحقیقی۔ تقلیدی تو یہ کہ احکام کو بلا دلیل مان لو۔ پھر اُن احکام کی برکت سے تحقیقی یقین ہو جائے گا۔ جیسے شروع میں الف بے کو محض استاد کی تقلید سے مان لیتے ہو۔ اس کے بعد اسی تقلید کی بدولت بڑے بڑے دیگر علوم کے محقق بن جاتے ہو۔ اگر شروع ہی میں یہ پوچھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیشہ جاہل ہی رہو گے۔ اسی لیئے پہلے کسی محقق کی تقلید کرو۔ پہلے ہی سے محقق بننے کی کوشش مت کرو ؎

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی
تا راہ بیں نہ باشی کے راہ بر شوی

اور طریقہ محقق بننے کا یہی ہے کہ پہلے تقلید کرو ؎

در مکتبِ حقائق پیشِ ادیب عشق ۔۔!
ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

آج یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ہی سے اباجان بن جائیں۔ ابھی ماں کا دودھ
بھی نہیں چھوٹا مگر باوا بننے کا شوق ہے۔ اجی پہلے باوا تو بن لو یعنے چار پائی
کے پایہ کے برابر تو ہو لو پھر باوا بننا۔ ابھی تو پسر ہو۔ خوب پسر پسر کے سو با کرو
جب بڑے ہو گے تب باوا بھی بن جاؤ گے۔ میں تو جاہل کندہ ناتراش مگر یہ ضرور
پوچھیں گے کہ کیوں صاحب اس حکم میں کیا راز ہے اور اس کی کیا حکمت ہے
میاں پہلے کام تو شروع کرو پھر خود معلوم ہو جائے گا۔
کوئی بادشاہ کے پاس جاتے ہی یہ کہنے لگے کہ میں آپ کے خزانہ کی
پڑتال کروں گا ذرا کنجیاں دے دیجئے تو وہاں سے ظاہر ہے کہ نکال دیا جائیگا۔
اگر خزانہ دیکھنا ہے تو پہلے بادشاہ کی خدمت کرو۔ ممکن ہے کہ وہ خوش ہو کے
خود کہیں جاؤ اسے ہمارے خزانے دکھلا لاؤ۔ اسی طرح یہ اسرار جو خزائن ربی
ہیں یہ درخواست سے نہیں معلوم ہوتے بلکہ اطاعت سے حاصل ہوتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیأ ‌ ‌ ‌ بے کتاب و بے معید و اوستا

جب وہ خوش ہوں گے تو وہ علوم عطا کریں گے جو نہ کتابوں سے حاصل
ہو سکتے تھے نہ اُستادوں سے۔ بہر حال یقین کے دو درجے ہیں۔ ایک یہ کہ تقلید
سے یقین حاصل کیا جائے اور ایک یہ کہ تحقیق سے اور جو یقین ابتدا میں تقلید سے
حاصل ہو گا وہ انتہا میں تحقیق ہو جائے گا۔
خلاصہ تمام بیان کا یہ ہے کہ ہم میں اتباع شریعت کی بے حد کمی ہے اس
کا تدارک کرو اور جو کام کرو پہلے شریعت سے تحقیق کر لو۔ مگر تحقیق ایسے سے
کرو جو سچی بات بتلا دے اور جو خود اپنی خواہش نفسانی کو شریعت کے اندر ٹھونسے

اور زبردستی غیر دین کو مصالح اور پالیسی کی وجہ سے دین بنا دے وہ واقع میں عالم ہی نہیں وہ تو جاہل ہے۔ اُس سے مت پوچھو ورنہ وہ اپنے ساتھ تمہیں بھی گمراہ کرے گا۔ اگر کہو کہاں ہے۔ جو سچی بات بتلا دے تو ڈھونڈو ڈھونڈنے سے سب مل جاتا ہے۔ طبیب کیسے مل جاتا ہے۔ اسی طرح سچا صاحب شریعت عالم بھی مل سکتا ہے۔ بہر حال جو کام کرو پہلے استفتاء کرو۔ اور جو عالم ہیں، انہیں چاہیے کہ قرآن وحدیث پر عمل کریں اور جو عامی ہیں وہ علماء سے دریافت کر کے عمل کریں خواہ اس میں دنیا کا نفع ہو یا نقصان۔ جب ایسا کرو گے تو پھر چند روز میں دیکھو گے کہ خود بخود برکات ظاہر ہوں گے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مصالح کو چھوڑو اور شریعت پر عمل کرو۔ اگر کوئی کہے کہ یہ خلاصہ تو پہلے ہی بیان ہو سکتا تھا پھر اس قدر تفصیل کی کیا ضرورت تھی۔ تو بات یہ ہے کہ تفصیل سے بہت سی زائد باتیں بھی معلوم ہو گئیں اور مضمون کی دل میں وقعت بھی بڑھ گئی۔ ورنہ محض خلاصہ سے اتنا دل نشین نہ ہوتا۔ بہر حال خدا سے دُعا کیجیے کہ ہم سب کو اتباع شریعت کی توفیق عطا فرمائے آمین!

نفی الحرج

آسانیِ دین کے متعلق یہ وعظ ۱۹ محرم الحرام ۱۳۳۱ھ بروز یکشنبہ
مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں ہوا، جو تین گھنٹوں میں ختم ہوا۔ مولانا
سعید احمد صاحب تھانوی نے
قلمبند فرمایا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ اس نے تم کو ممتاز فرمایا اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا پہلے بھی اور اس میں بھی تاکہ تمہارے لئے رسول گواہ ہوں۔ اور تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو۔ سو تم لوگ نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو۔ وہ تمہارا کارساز ہے سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار ہے

تمہید

یہ آیت جو میں نے پڑھی ہے اس میں سے صرف جزو اول کا بیان کرنا مقصود ہے اور اُس کا تعلق جمعہ کے مضمون سے ہے چنانچہ عنقریب معلوم ہو جائے گا اور یہی وجہ ہوئی اس کے اختیار کرنے کی۔ کیونکہ کوئی نیا مضمون اس وقت ذہن میں نہیں آیا دو وجہ سے۔ ایک تو اس لئے کہ کوئی مقام نہیں بدلا۔ نیز زمانہ بھی دوسرے وعظ کا پہلے کے قریب ہے تو زمان و مکان دونوں متحد ہیں۔ اور ایسے موقع پر مجمع بھی اکثر ایک ہی ہوتا ہے تو سامعین بھی متحد ہیں۔ اور اس خاص موقع کے اعتبار سے سامعین کے مناسب حال جو مضمون تھا۔ وہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اب کسی دوسرے مضمون کی ضرورت ذہن میں نہیں آئی۔ لہذا اُسی گزشتہ مضمون کے متعلق ایک مضمون کو بیان کرتا ہوں اور میں نے بانی جلسہ سے عرض کیا تھا کہ ایک ہی جگہ دو بیان سے کیا فائدہ ہوگا مگر کوئی فائدہ بتلایا نہیں گیا۔ میں نے یہ بھی پوچھا کہ آخر کیا بیان کروں۔ تو یہ کہا گیا کہ اسی مضمون کے متعلق بیان کر دیا جاوے جو جمعہ کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر اُس کی بھی

تعیین نہ بتلائی گئی مگر خود ہی اُس کے مناسب مضمون میرے ذہن میں آگیا۔ اور ہرچند کہ ارتباط مضمون کے لحاظ سے مناسب یہ تھا کہ اسی آیت کی تلاوت اس وقت بھی کی جاتی جو کہ جمعہ کو پڑھی گئی تھی اور اس میں سے یہ مضمون نکل بھی سکتا تھا جو آج بیان ہو گا۔ مگر اُس میں سے استنباط کرنا پڑتا اور استنباط اس طور سے ہوتا کہ اس آیت کے اخیر میں ہے وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ اور عفو اثر ہے رحمت کا اور سہولت بھی رحمت ہی کا اثر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ سہولت کی رعایت کرتے ہیں اور کسی خاص جزو دین کے ساتھ خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ دین کی ہر بات میں سہولت مرعی ہے تو استنباط اس طرح ہو سکتا مگر اس آیت میں استنباط کی ضرورت تھی اور یہاں صریح ہے پھر چونکہ قرآن سب ایک ہی ہے۔ اس لئے اس آیت کو بھی یہی سمجھا جاوے گا کہ وہی ہے اس لئے تلاوت کے لئے اس آیت کو ترجیح دی۔ مضمون کا حاصل یہ ہے اور اسی سے دونوں مضمونوں میں تعلق بھی قائم ہو جائے گا۔

عقلاء کے اشکالات

جمعہ کے روز میں نے بیان کیا تھا کہ جو کچھ مصیبت آتی ہے ہمارے اعمال کی خرابی سے آتی ہے اور اس کا علاج اعمال کی درستی ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہمارے اوپر یہ مصائب دینی سستی کی وجہ سے ہیں پس دین کو درست کیا جائے۔

اس پر ایک اشکال بعض لوگوں کے دل میں وارد ہوا کرتا ہے۔ وہ یہ کہ مرض کا سبب اور اس کا علاج دونوں معلوم ہو گئے مگر اتنی بات رہ گئی کہ تدبیر کبھی آسان ہوتی ہے کبھی دشوار۔ تو جو تدبیر بتلائی گئی ہے اُس میں قابل غور یہ بات ہے کہ

وہ آسان ہے یا دشوار۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ سخت دشوار ہے۔ پس دوا تو بتلائی مگر ایسی جو امریکہ سے ملے گی۔ اس تجویز کی تو وہ مثل ہوگئی کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔

دین کی اب بلاشبہ ایسی حالت ہوگئی کہ بالکل تباہ ہو رہا ہے۔ مگر ساتھ ہی دیندار بننا بھی سخت دشوار ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اس کا مشاہدہ بھی ہو رہا ہے۔ چنانچہ دیندار کو سخت دقتیں پیش آتی ہیں۔ مال میں تو یہ کہ سود حرام ہے۔ قمار (یعنی جوا) حرام ہے۔ رشوت حرام ہے۔ یہاں تک تو زیادہ وحشت نہیں ہوتی۔ کیونکہ بہت لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سود بھی نہیں لیتے، رشوت کا مال بھی نہیں کھاتے۔ تو ان چیزوں سے اپنے دین کو بہت لوگ محفوظ سمجھتے ہیں۔ لیکن ان میں وسعت اتنی ہے کہ بہت دور تک ان کا اثر پہنچتا ہے۔ اکثر لوگ سود صرف اس کو سمجھتے ہیں کہ روپیہ دے کر سوا روپیہ لے لیں۔ رشوت اس کو سمجھتے ہیں کہ ظلم کر کے کام کے عوض میں لیں۔ قمار اس کو سمجھتے ہیں کہ چٹ پٹ ہو جائے۔ مگر حقیقت میں یہ ابواب بہت وسیع ہیں۔ پس جو لوگ ناواقف ہیں ان سے یہ تو کہا ہی جائے گا کہ واقفیت پیدا کرلو۔ اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ ہر معاملہ فاسدہ ربوا ہے علیٰ ہذا رشوت نام ہے ہر غیر متقوم چیز پر عوض لینے کا اور یہ بات جلدی سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ یہ تو ابواب فقہ کے متعلق ہے۔ مگر میں ایک مختصر سا رسالہ بتاتا ہوں جس میں رشوت کے متعلق اچھی تقریر آپ کو معلوم ہوگی اور اس رسالہ کا نام ازالۃ الغشوہ ہے جو تحذیر الاخوان کا ایک جزو ہے۔ یہ ایک رسالہ سود کے متعلق ہے۔ علیٰ ہذا قمار میں بھی بڑی وسعت ہے۔ تو جان کا بیمہ وغیرہ یہ

سب قمار میں داخل ہیں۔ تو آمدنی کی اکثر صورتیں آج کل سود یا رشوت یا قمار میں داخل ہیں۔ تو جو دیندار بننا چاہے اس کو ہر جگہ دقت اور رکاوٹ پیش آتی ہے۔

مثلاً ایک شخص نے اپنے ورثہ کے لئے کچھ روپیہ جمع کرنا چاہا کہ دس دس روپیہ سالانہ دیا جاوے اور کسی کمپنی میں داخل کرتا رہے تاکہ ورثا کو دو ہزار روپے اس کے بعد مل جائیں۔ اتفاق سے ایک مولوی صاحب سے جو پوچھا تو انہوں نے ناجائز کہہ دیا۔ یا دوسری صورت نکالی کہ پرامیسری نوٹ خرید لے تھے۔ ایک دوسرے مولوی صاحب نے اس کو بھی ناجائز بتلا دیا گویا مولویوں نے عہد کر لیا ہے کہ ہر بات کو ناجائز ہی کہو۔ اسی سے لوگ متوحش ہیں۔ علیٰ ہذا اور ابواب آمدنی کے بکثرت حرام ہیں۔

یہ تو مال کی دشواریاں تھیں اب جاہ کی کیفیت سنیئے۔ کسی مولوی صاحب کی زبانی سن لیا تھا کہ مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ (جس شخص نے کسی قوم کی شباہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہوگا) اس پر کسی نے عمل بھی کر لیا اور کوٹ پتلون پہننا چھوڑ دیا مگر اب حالت یہ ہے کہ کوئی عزت نہیں کرتا نہ پلیٹ فارم پر نہ کہیں۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ اچھی دینداری اختیار کی کہ عزت وجاہ ہی جاتی رہی سقوں جولاہوں تک کو اس شخص کے مقابلہ کی جرأت ہوگئی۔ یہ جاہ پر اثر پڑا۔ علیٰ ہذا ہر امر میں دیندار کو دقت ہی پیش آتی ہے۔ اور ایک یہ اثر ہوا کہ دینداری اختیار کرنے سے پہلے تو سارے جاڑے تندرست رہتے تھے۔ اب جو صبح کے وقت اٹھے اور وضو کرنا پڑا تو ساری سردی چھینکیں ہی آتی رہتی ہیں۔

ایک مولوی صاحب ہمارے دوست للت پور میں تھے۔ ایک رئیس

کے یہاں لڑکوں کو پڑھاتے تھے اور نماز بھی پڑھایا کرتے۔ اتفاق سے اُن لڑکوں کو زکام ہوگیا۔ تو اُن لڑکوں کی ماں مولوی صاحب کو کوسا کرتی تھی کہ اچھی نماز پڑھوائی کہ بچے بیمار ہی ہوگئے۔

اسی طرح روزہ ہے کہ بعض موسموں میں نہایت سخت ہوتا ہے کہ بجز پکّے دیندار شخص کے ہر شخص رکھ نہیں سکتا۔ اگر ایسا روزہ دوسری قوموں میں ہوتا تو ضرور وہ اس کو دوسرے موسم میں بدل لیتے۔

چنانچہ ایک مسلمان رئیس کسی بڑے انگریز حاکم سے ملنے کے لئے گئے۔ تو اُس انگریز حاکم نے پوچھا کہ نواب صاحب ہم آپ کو دُبلا پاتے ہیں اس کی کیا وجہ۔ مسلمان رئیس نے جواب دیا کہ گرمی کا موسم ہے اور آج کل ہمارے یہاں رمضان کا مہینہ ہے ہم روزہ رکھتے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے کہ آپ اپنے علماء سے کیوں نہیں درخواست کرتے کہ کمیٹی کر کے دوسرے موسم میں منتقل کر دیں۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہمارا دین کمیٹی پر نہیں۔

تو روزہ میں یہ دقت پیش آئی کہ گرمی کے دن پہاڑ ہوتے ہیں۔ پیاس کے مارے ہونٹ خشک ہیں مگر کھانا پینا بند ہے۔ یہ بھی کوئی مولوی صاحب فتوٰی نہیں دیتے کہ بجائے گرمی کے جاڑوں میں روزہ رکھ لینا۔

اب حج کی سنیئے۔ حج کرنے کے لئے جو گئے تھے وہاں کہیں آب و ہوا کے اختلاف سے بیمار ہو گئے۔ کہیں کسی کو بدوؤں نے کوٹا پیٹا۔ اب جو واپس آئے تو سب سے کہتے ہیں کہ حج کرنے مت جاؤ۔ بڑی مصیبت کا سفر ہے۔ ان سب دشواریوں کو دیکھ کر اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ اشکال واقع ہوتا ہے کہ علاج تو

ٹھیک ہے مگر تلخ اتنا ہے کہ مرجانا سہل ہے تو وہ مثل ہوتی کہ پنچوں کا کہنا سر پر مگر پرنالہ ادھر ہی کو اترے گا۔ ایسے ہی مولویوں کا کہنا سر پہ مگر ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

جب یہ اشکال ہے تو ہم دیندار کیسے بنیں۔ یہ تو عقلاء کو اشکالات پیش آتے ہیں۔

جہلائے کے اشکالات

ایک جہلا کو اشکال پیش آتا ہے کہ جب نماز وغیرہ دینداری کے کام شروع کیے مالی نقصان ہونا شروع ہوگیا۔ آج بھینس مرگئی کل بیل مرگیا۔ دو چار دن کے بعد بیٹا مرگیا۔

ایک بڈھا دیہاتی تھا کہ بیٹے اُس کی پروانہ کرتے تھے۔ ایک مولوی صاحب نے اُس سے کہا کہ کم بخت نماز تو پڑھ لیا کر۔ پہلے ہی دن نماز پڑھی تھی کہ بھینس مرگئی اُس کے بیٹوں نے کہا کہ باوا نماز مت پڑھا کرو۔ اُس نے کہا تو پھر میری خوب خدمت کرو۔ انہوں نے وعدہ کیا۔ اب جب ذرا خدمت میں کوتاہی کرتے، وہ دھمکاتا کہ میں پھر نماز شروع کردوں گا۔ وہ ڈر جاتے اور خدمت شروع کردیتے

مدرسہ جامع العلوم میں بعض خیر خواہوں نے یہ تجویز کی تھی کہ لوگوں کے گھروں میں مدرسہ کے نام سے گھڑے رکھ دیئے جائیں کہ اُس میں روز ایک چٹکی آٹے کی ڈال دیا کریں۔ چند روز میں بآسانی طلبہ کے لئے بہت سا آٹا جمع ہو جائے گا۔ اُن ہی گھروں میں سے ایک گھر میں اتفاق سے ایک لڑکا مرگیا اُنہوں نے مدرسہ کو گھڑا پھینک دیا کہ اس کی نحوست سے لڑکا جاتا رہا۔

اس پر مجھے ایک حکایت حیدرآباد کی یاد آئی کہ ایک بزرگ سے پیر پہ پیر رکھ کر لیٹنے کی نسبت ایک شخص نے پوچھا کہ سنا ہے کہ یہ طریقہ منحوس

ہے حالانکہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اس طرح بھی لیٹتے تھے اور بعض احادیث میں اس طریقہ سے ممانعت بھی آئی ہے مگر ممانعت اس ہیئت کی ہے کہ جس میں بے پردگی ہو جاوے۔ اُن بزرگ نے جواب دیا کہ ہاں بھائی منحوس تو ہے ہی اور ایک ہی کیا ساری سنتیں اور احکامِ شرعیہ منحوس ہیں۔ رشوت حرام کر دیا۔ یہ ایک کھلی نحوست ہے کہ مال نہ بڑھ سکا زکوٰۃ واجب کر دی، یہ بہت ہی بڑی نحوست ہے کہ جو جمع کیا تھا اُسے فضول خرچ کرا دیا۔

نیز کبھی احکامِ شرعیہ کے ماننے والے کا امتحان بھی ہوتا ہے کہ یہ محبت سے احکام مانتا ہے یا محض دنیوی نفع کے لئے۔ نیز کبھی حق تعالیٰ کو اس فرمانبردار پر یہ رحمت کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ دنیا کے ضرر سے اس کو بچاتے ہیں۔

باطنی دولت

اس کے متعلق مجھے ایک حدیث یاد آئی کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی میں حاضر ہوا اور کہا اِنّی احبک یا رسول اللہ کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اعلم ما تقول کہ جو کہہ رہے ہو سمجھ کر کہو (مطلب یہ کہ میری محبت آسان چیز نہیں۔ اس میں بڑی آزمائش ہوتی ہے۔) اُس نے عرض کیا کہ واقعی محبت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ فاعد للفقر تجفافاً (یعنی فقر و فاقہ کے لئے اپنے پاکھر کو تیار کر لے) اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے اُس کی طرف فقر و فاقہ اس طرح آتا ہے جیسا کہ سیلاب نشیب کی طرف دوڑ کر آتا ہے جو میری حالت ہے وہی تمہاری ہو گی اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی قیامت کے

دن اُس کے ہمراہ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہوگا) اور اگر حضور جیسی حالت کسی کو نہ بھی پیش آئے تو حضورؐ کے محب کو اس حالت سے محبت تو ضرور ہوگی۔ تو وہ اُس کے آنے پر ہر وقت تیار تو رہے ہی گا۔ نیز جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں جب یہ شخص خدا کا محبوب ہوگا تو وہ اس کو مضرات سے ضرور بچائیں گے۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے خاص بندوں کو دنیا سے اس طرح بچاتے ہیں جیسے تم اپنے استسقاء کے مریض کو پانی سے بچاتے ہو۔ اس لئے دیندار کو ایک بددین کے برابر تموّل تو ہرگز نہیں ہوگا مگر اس کو ایک دوسری دولت ایسی ملے گی کہ یہ تموّل اُس کے سامنے گرد ہے اور وہ وہی دولت ہے جس نے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے تخت سلطنت چھڑا دیا مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ تخت چھوڑ دینا دولت باطنی کے ساتھ ہر ایک کو ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ اہل باطن دل سے تو ہمیشہ اُس کو چھوڑ ہی دیتے ہیں یعنی اُس کی طرف اُن کو رغبت نہیں ہوتی۔ پھر جو منتہی ہوتے ہیں وہ ظاہر میں اس کو نہیں چھوڑتے کیونکہ وہ متحمل ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اُس کے متحمل تھے۔ مگر اب عموماً طبائع اس کے متحمل نہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی کی جیب کمزور ہو اور اُس میں دس اشرفیاں اور دس روپے بھرے ہوئے ہوں تو روپے کو نکال کر جیب سے الگ کر دینگے اور اگر کسی کی جیب مضبوط ہے اُس کو نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح ایسے بندی کو بھی اسباب ظاہرہ کا ترک کرنا زیبا نہیں جس سے آثار ترک کا تحمل نہ ہو سکے۔ ایسے ہی موقع پر عالمگیر کا شعر ہے ؎

شنیدم ترک منصب کرد عاقل خاں بناد انی
چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اسی وجہ سے ہمارے حضرت قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ نوکری خود نہ چھوڑو۔ جب توکل غالب آجائے گا تو سارے اسباب خود بخود چھوٹ جائینگے مگر چھوڑنے میں جلدی نہ کرے کہ پھر ندامت ہوتی ہے۔

غرض باطنی دولت والے کو نعمتوں سے کبھی رغبت نہیں رہتی لہٰذا وہ معنے تارک ہی ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات ترک صوری میں بھی مصلحت ہوتی ہے اور چونکہ رغبت نہیں ہوتی اس لئے یہ شخص چھوڑ کر پچھتاتا بھی نہیں بلکہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر پھر ملتی تو اور نفرت زیادہ ہوتی۔

جناب حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سلطنت چھوڑنے کے بعد ایک وزیر آیا کہ آپ کے سلطنت چھوڑ دینے سے لوگوں کو قلق ہے فرمایا الحمد للہ مجھے قلق نہیں۔ فقیری میں بہت راحت ہے۔ اُس نے پوچھا فقیری میں کیا راحت ہے۔ میں تو دیکھتا ہوں کہ سارا کام آپ کو خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ نہ کوئی نوکر نہ کوئی خادم۔ اس میں تو سخت تکلیف ہے۔ جب اُس نے بہت ہی اصرار کیا تو آپ نے اپنا ایک ظاہری تصرف دکھلایا کہ سمندر کے قریب جا کر ایک سوئی اُس میں پھینک دی اور فرمایا کہ اے سمندر کی مچھلیو! میری سوئی سمندر میں گری ہے نکال کے دے دو۔ صدہا مچھلیاں چاندی سونے کی سوئیاں منہ میں لئے ہوئے کھڑی ہوگئیں۔ آپ نے فرمایا وہی سوئی لوہے کی میری لادو۔ ایک مچھلی آئی اور وہی سوئی لے کر رکھ گئی۔ اُس وقت وزیر کو معلوم ہوا کہ اس فقیری سے حضرت

ابراہیم کو اتنی عظیم الشان سلطنت حاصل ہو گئی ہے کہ ہر چیز اُن کے کہنے میں ہے اور یہ اُن کے مذاق کے موافق آپ نے ایک مثال دکھلا دی ورنہ اصل دولت کے سامنے یہ کیا چیز ہے۔

ایک دوسرا واقعہ اور ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے وضو کے لئے پانی لینے کو ڈول کنوئیں میں ڈالا تو ڈول چاندی سے بھرا ہوا آیا۔ دوسری مرتبہ سونے سے بھرا ہوا آیا۔ تیسری مرتبہ جواہرات سے۔ تو آپ نے آسمان کی طرف منہ کر کے عرض کیا کہ میری تو نماز کا وقت جا رہا ہے اس وقت امتحان نہ لیجئے۔ مجھے پانی کی ضرورت ہے اس سونے چاندی کو لے کر میں کیا کروں گا۔

تو ان دونوں حکایتوں سے یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ یہ حضرات دنیا کو چھوڑ کر پچھتائے نہیں بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا جتنی زیادہ ہوتی ہے اسی قدر زیادہ کوفت ہوتی ہے۔ آخر کار چھوڑنی پڑتی ہے۔ تو اصل تارک تو اہل تمول ہی ہیں اور تارکین میں سے کوئی بھی تارک نہیں کیونکہ اُن کی اول سے یہی رائے ہوتی ہے کہ دنیا اس قدر جمع نہ کی جائے جس کو چھوڑنا پڑے۔ آخری رائے یہی ہوتی ہے کہ اس کو چھوڑ کر ہلکا ہونا چاہیے۔

گو بعض کے لئے خدا تعالیٰ کو منظور ہی یہ ہوتا ہے کہ دنیاوی تعلقات میں بھی پھنسے رہیں تاکہ مخلوق کو نفع پہنچے اور اُن کی ظاہری و باطنی حالت کو درست کیا جائے جیسے کہ حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ مگر یہ حضرات باوجود ان تعلقات کے بھی دنیا کی طرف دل سے مشغول نہیں ہوئے۔ حضرات خلفاء کی یہ حالت تھی کہ پھٹے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور رعب تھا کسریٰ و قیصر پر۔ تو اس قسم کا تعلق جو ان حضرات

کو دنیا سے ہوتا ہے وہ تو عین عبادت ہے اُس سے چنداں کلفت نہیں ہوتی بموجب کلفت و باعث خسارہ تعلق دنیاوی ہوتا ہے خیر یہ گفتگو تو استطرادی تھی۔

طریق علاجِ مصائب

اصل گفتگو یہ تھی کہ علاج تو مصائب کا دینداری ہے مگر اس علاج اور تدبیر پر یہ اشکال پیش آتا ہے کہ یہ تو سخت دشوار ہے کوئی آسان طریقہ بتلاؤ۔ اور اسی پر ایک دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ وہ آسان تدبیر بتلا دے کون کیونکہ ہم شارع تو ہیں نہیں جو اس کو بدل دیں اور اگر بدلیں بھی تو ہمارے بدلنے سے ہوتا کیا ہے۔ حق تعالیٰ اس دین کے تو محافظ ہیں۔ اگر ہم بدل بھی دیں گے۔ تو مسلمان خود اس کو نہیں مانیں گے اور اگر کہو کہ خیر تم بھی مجبور ہو خدا تعالیٰ ہی کو آسان علاج بتلانا چاہیے تھا۔ تو اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ جس کو جرأت ہو خدا تعالیٰ سے جا کر عرض کرے ہمیں اس کے جواب کی ضرورت نہیں مگر چونکہ ہم خدا تعالیٰ کے غلام ہیں اور غلام سے آقا پر اعتراض سنا نہیں جاتا اس لئے ہم بھی جواب بتلاتے ہیں۔ مگر پہلے ایک سوال ہم آپ سے کرنا چاہتے ہیں پھر تمہارے اس سوال کا جواب خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

اگر کسی مریض کے لئے طبیب نے ایک نسخہ تجویز کیا ہو کہ اس کے مرض کے لئے وہی مناسب ہو اور مریض یہ کہے کہ حکیم صاحب یہ تو بہت دشوار اور سخت علاج ہے کوئی آسان تدبیر بتلائیے۔ غور کر کے فرمائیے کہ حکیم صاحب اس کو کیا جواب دیں گے۔ ظاہر ہے کہ نسخہ چاک کر کے پھینک دیں گے اور کہیں گے معلوم ہوتا ہے تجھ کو مریض ہی رہنا پسند ہے جو ذرا سی دشواری سے گھبراتا ہے۔ حکیم صاحب کو معالج ہونے کے لحاظ سے مرض کے مناسب تجویز

کرنی چاہئے سہل ہو یا سخت۔ اور مریض کو اگر اپنا مرض زائل کرنا مقصود ہے، تو اُس مناسب تجویز پر عمل کرنا چاہئے۔ اگر سہولت و سختی پر اُس کی نظر ہوگی تو حکیم مجبور اس کے کہ اپنا نسخہ واپس لے لے گا اور کیا کرے گا۔

یہ تو حق تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ انہوں نے آپ کی اصلاح میں دریغ نہیں کیا ورنہ اُن کو کیا غرض پڑی تھی جو کوئی دیندار بنے اپنے لئے بے دین بنے تو اپنے لئے۔ جو اعمال تجویز کئے گئے ہیں وہ بالخاصہ ہمارے امراض کے لئے مفید ہیں۔ اب کسی کو شفا ہی کی ضرورت نہ ہو تو اس کا کیا علاج۔ اور طالب شفا کو اس پر نظر کرنی کب زیبا ہے کہ یہ سہل ہے یا دشوار۔ اُس کو تو یہ دیکھنا چاہئے کہ میرے مرض کے لئے بھی یہ مفید ہے یا نہیں۔

تو اب عقلاء کو تو شک رہا نہ ہوگا کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ذاتی ہوتی ہے کہ اس کی جگہ دوسری چیز وہ نفع نہیں دے سکتی۔ تو ان اعمال کا بھی ایک خاصہ ہے جو بدون اُن کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اگرچہ یہ بنا فاسد ہے کیونکہ متدین خوش عقیدہ خود خواص اشیاء ہی کا اس درجہ میں قائل نہیں کہ وہ اُن کی خاصیت ذاتی ہو جس کا انفکاک نہ ہو سکے یا عموم نہ ہو سکے لیکن مدعیان عقل فلسفی طبع لوگوں پر تو یہ حجت ہے۔ اس لئے الزام کے طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ جب یہ عذر علاج جسمانی میں کبھی نہیں کیا جاتا تو علاج روحانی میں سہولت و دشواری پر کیوں نظر ہوتی ہے۔

دینداروں کا اشکال

البتہ متدین لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ تو اعمال کی خاصیت بدلنے پر قادر ہیں۔ ایک دشوار

سے دشوار عمل کی خاصیت ایک آسان عمل میں پیدا کر سکتے ہیں۔ طبیب ظاہری چونکہ تبدیل خاصیت سے مجبور ہے اس لیئے وہ بجز اس کے کہ مریض طالب سہولت کو جواب دے دے اور کیا کر سکتا ہے مگر حق تعالیٰ تو قادر ہے۔ اس لیئے وہ سوال باقی ہے۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ بے شک خاصیت کے بدلنے پر قادر ہیں مگر جن حکمتوں کی وجہ سے وہ خاص ایک عمل میں رکھے ہیں بدلنے کی صورت میں وہ خاص حکمتیں باقی نہ رہتیں۔ اس سے آگے سرحد ملی ہوئی ہے قدر کی۔ اس میں ہم زیادہ گفتگو نہیں کر سکتے۔ مگر ایک نظیر سے آپ اس کو کسی قدر سمجھ سکتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفۃ الارض بنانے کے لیئے پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے عرض کیا تھا کہ یَسْفِکُ الدِّمَاءَ تو حق تعالیٰ نے فرشتوں کو دو جواب دیئے۔ ایک تو حاکمانہ جواب دیا کہ اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے) میرے معاملات کی تمہیں کیا خبر۔ ع

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

میں اپنے معاملات کا تم لوگوں سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ اور دوسرا جواب حکیمانہ دیا کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا الآیہ (اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو سب چیزوں کا) کہ تمام اوصاف اور اسماء اور خواص اشیاء کے جن سے کہ ان کو کام پڑنے والا تھا تعلیم فرما دیئے تاکہ وہ ان اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہوں۔ خواہ وہ تصرف کسی قسم کا ہو۔ کیونکہ تصرف ایک تو جمادات وغیرہ میں کریگا۔ اور ایک تصرف کرے گا خود انسان میں کہ اس کی اصلاح کرے گا۔ اور یہ ظاہر ہے

کہ اصلاح وہی کر سکتا ہے جو خوب اچھی طرح محل اصلاح کے اوصاف و خواص سے واقف ہو۔ غرض سب سکھلا کر پھر فرشتوں پر پیش کیا اور پھر فرشتوں سے فرمایا کہ۔ اَنۡبِئُوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ؕ اگر تم سچے ہو ان کے نام بتلاؤ اور اسماء کی تخصیص محض ذکری ہے مقصود مع اوصاف و خواص بتلانا ہے۔ پھر فرشتوں نے حق تعالیٰ سے اپنے عجز کا اقرار کیا اور کہا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا الآیہ (آپ تو پاک ہیں ہم کو علم نہیں مگر وہی جو آپ نے ہم کو سکھلایا ہے) پھر حق تعالےٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم ان کے نام بتلاؤ۔ قال یآدم انبئھم باسمائھم (حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم تم بتلاؤ ان کو ان چیزوں کے نام) پس آدم علیہ السلام نے سب بتلا دیا فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ۔ جب آدم علیہ السلام نے نام بتلا دیئے تو قال الم اقل لکم الآیہ۔ حق تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ خلافت کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ان کو تعلیم فرمائی۔

جواب اشکال

اب اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جو چیزیں آدم علیہ السلام کو بتلائیں اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیتے تو وہ بھی اسی طرح بتلا سکتے تھے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ دو طلبہ کو امتحان میں اس طرح شریک کریں کہ ایک کو تو اول پندرہویں مقالہ کی شکل اول خلوت میں سکھلا دیں اور دوسرے سے اسی شکل میں بغیر سکھلائے ہوئے امتحان لیں۔

اس شبہ کا جواب سننے کے قابل ہے کہ یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تنہائی میں اسماء وغیرہ بتلائے تھے اور جب ثابت

نہیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے سامنے ہی بتلایا ہو۔ اور یہی احتمال خدا تعالیٰ کے لطف کے اعتبار سے راجح ہے۔ تو اب وہ مثال صحیح نہیں ہو سکتی بلکہ اب اس کی مثال ایسی ہو گئی کہ پندرہویں مقالہ کی شکل اوّل دونوں طلبا کے سامنے بیان کی گئی اور امتحان کے وقت ایک تو بوجہ مناسبت بتلا سکا اور دوسرا نہیں بتلا سکا تو اعتراض جو وارد ہوتا ہے اوّل صورت میں ہوتا ہے اور اُس پر منع کافی ہے اور اگر وہ احتمال بالفرض راجح نہ بھی ہو مگر احتمال تو ہے ہی کہ فہرست سب کے سامنے پیش ہوئی اور پھر بھی حضرت آدم علیہ السلام نے تو بتلا دیا اور فرشتے نہ بتلا سکے کیوں کہ ہر علم کے واسطے استعداد کی ضرورت ہے اور اوّل علوم کی استعداد بشر ہی میں تھی مثلاً بھوک کی حقیقت کہ جبرئیل علیہ السلام نہیں سمجھ سکتے تو فرشتے باوجود سننے کے بھی بوجہ عدم استعداد اس کی حقیقت نہ بتلا سکے۔ تو حق تعالیٰ نے اس امتحان سے یہ بتلا دیا کہ تم میں وہ استعداد نہیں اور وہی شرط تھی خلافت کی۔

اب ایک شبہ اور رہا کہ جب آدم علیہ السلام نے اُن کو بھی بتلا دیا تو وہ ضرور سمجھ سکے ہوں گے تو اُن میں بھی استعداد ثابت ہو گئی مگر یہ محض لغو اعتراض ہے کیونکہ بتلانے کے لئے مخاطب کا سمجھ لینا لازم نہیں اور اس لئے انباء فرمایا عَلَّمَہُم نہیں فرمایا تعلیم کے معنی ہیں سمجھا دینے کے اور انباء کے معنی ہیں اخبار کے یعنی تقریر کر دی گو مخاطب نہ سمجھا ہو۔ بہرحال استعداد کی ہر علم کے لئے ضرورت ہوتی ہے

خاصیتِ اعمال

اس تقریر پر یہ بھی اعتراض پڑتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ خاصیت ہی بدل دیتے اور وہ استعداد ملائکہ ہی میں پیدا کر دیتے تو وہ بھی تو سمجھ لیتے ——— جواب یہ ہے کہ خاصہ اُس کو کہتے ہیں کہ اُس ذات کے

علاوہ کسی اور ذات میں نہ پایا جاوے ورنہ خاصہ نہ رہے گا۔ تو استعداد جو خاصۂ بشر ہے ملائکہ میں کیسے پائی جا سکتی ہے۔ اور اگر کہو کہ اوّل ہی فرشتوں کو بشر کر کے خلیفہ کر دیتے تو یہ مسئلہ تقدیر کا ہے۔ اس میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کو بشر کیوں نہیں کیا۔ اس کی نسبت صرف یہی کہا جاوے گا کہ ؎

حدیث مطرب و می گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

مطرب و مے کی بات کر، زمانے کے راز نہ تلاش کر کہ کسی نے حکمت سے اس معمہ کو نہیں کھولا۔

اور یہیں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شفقت ہے کہ مسئلہ قدر میں گفتگو کرنے سے منع فرمایا کیونکہ اس میں سوالات کا انقطاع نہیں ہوتا تو اس کو حضورؐ نے اوّل ہی میں فرما دیا۔ ع

اوّل ما آخر ہر منتہی است

غرض جو کام بڑے بڑے عقلا ٹھوکریں کھا کر کرتے حضورؐ نے اوّل میں ہی بتلا دیا۔ پس اسی طرح اس سوال کا جواب ہم نہیں دے سکتے کہ خاصیت اعمال کی بدل دیتے جیسے وہاں فرشتوں کو بشر کر دینے کا اعتراض تھا۔ تو غرض یہ ہے کہ ہر گناہ کی ایک خاص خاصیت حق تعالیٰ نے پیدا کر دی اور اس کا ایک علاج مقرر کر دیا۔ تو اب یہ اعتراض لغو ہے کہ جو خاصہ نماز کا ہے وہ بدون نماز ہی کے کر دیتے تو یہ اشکال بھی مندفع ہو گیا۔ بس اب معلوم ہوا کہ اوّل امراض کا علاج انہیں اعمال میں ہے۔ اب وہ مثال توضیح کے لئے طبیب کی کافی ہو گئی کہ جیسے طبیب علاج

کو خاص دوا میں منحصر کرتا ہے اور اس پر اعتراض کرنا لغو ہے اسی طرح خدا تعالیٰ پر یہ شبہ کرنا لغو ہے۔ تو یہ اعتراض کہ خدا تعالیٰ نے اصلاح کو ان ہی موجودہ احکام میں منحصر کیوں کیا نہ خدا پر ہو سکتا ہے نہ مولویوں پر۔ کیونکہ اوّل تو مولوی احکام کو مشروع ہی کیوں کرتے اور اگر کرتے تو اُن کے کرنے سے ہوتا ہی کیوں۔ بلکہ ایسا ہوتا جیسا کہ ایک رند نے کسی واعظ سے یہ سُن کر کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی کہا تھا کہ بارہا کردیم و شد۔ اعمال کی صورت تو ہو جاتی مگر واقع میں اُن کی روح تو نہ ہوتی۔ البتہ اس کا خدا کو بے شک اختیار تھا مگر اب تو وحی بھی منقطع ہو گئی۔ اب تو احتمال ہی نہیں اور وحی کے وقت بھی کیوں ہوتا۔

لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ۔

اگر دین حق اُن کے خیالات کے تابع ہو جاتا تو تمام آسمان اور زمین میں فساد کر تے۔

وہ قانون ایسا ہوتا جیسے بہت سے ڈاکو جمع ہو کر کہیں کہ ہم سے مشورہ کر کے قانون بناؤ کہ ڈکیتی کو جائز کہہ دو تو مجلس وضع قانون کی یہ کہے گی کہ اگر قانون تمہاری خواہش کے تابع ہو تو تمام عالم میں فساد ہو جاوے گا۔ اسی طرح خدا تعالےٰ فرماتے ہیں تو معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ میں تبدل تو ہو نہیں سکتا۔ تو یہ ہوس تو گئی مگر صرف یہ اشکال رہا کہ یہ دشوار تو ہے۔

یہ ہے اشکال جو بہت بڑا عقبہ ہے اور یہی مانع ہے مسلمانوں کو اتباع شریعت سے۔ مسلمان دلائل سے مان تو ضرور جاتے ہیں خصوصاً انقلاب عالم کو دیکھ کر اکثر عقلاً اقرار بھی کرنے لگتے ہیں کہ شریعت کے چھوڑنے کی ساری

خرابی ہے ۔ مگر اقرار بھی اسی وقت تک ہے جب تک کہ الفاظ ہی الفاظ ہیں ۔ کچھ کرنا نہیں پڑا کیونکہ الفاظ تو شیریں ہی ہیں باقی کرنے کے نام صفر۔

مجھے الفاظ پر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک شخص مرا ۔ اس کا ایک بے وقوف بیٹا تھا ۔ جب وہ باپ مرنے لگا تو اس نے سوچا کہ یہ ہے بیوقوف اور آئیں گے تعزیت کرنے والے ۔ خدا جانے ان کے ساتھ کس بے تمیزی سے پیش آوے گا اس لئے اس کو مناسب دستورالعمل سکھلا دینا مناسب ہے ۔ پس اُس نے وصیت کی کہ جو شخص آئے اس کو اونچی جگہ بٹھلانا اور اس سے نرم و شیریں باتیں کرنا اور اس کو قیمتی کھانا کھلانا اور بھاری کپڑے پہن کر اس سے ملنا ۔ اتفاقاً ایک شخص پہنچا آپ نے حکم دیا کہ ان کو اونچی مچان پر بٹھلاؤ اور خود جوڑا بدلنے گئے بھاری بھاری توشک اور دریاں لپیٹ کر تشریف لائے ۔ اب مہمان جو بات کرتا ہے اس کے جواب میں گڑ اور روئی ارشاد ہوتا ہے ۔ پھر کھانے کے وقت گوشت آیا ۔ ذرا سخت تھا ۔ مہمان نے شکایت کی تو آپ فرماتے ہیں میاں کے لئے پچاس روپیہ کا کتا کاٹ ڈالا آپ کو پسند ہی نہیں آیا ۔ مہمان حیران کہ ہر فعل عجیب ہے ۔ وجہ پوچھنے پر سب کی توجیہ فرمائی ۔ چنانچہ گڑ اور روئی کی وجہ نرم اور شیریں الفاظ کی وصیت بتلائی ۔

تو جیسے اُس نے معنی سے قطع نظر کر کے صرف نرمی اور شیرینی پر دلالت کرنے والے الفاظ یاد کر لئے تھے ایسے ہی ہمارے بھائیوں نے محض الفاظ یاد کر لئے کہ مذہب ضروری چیز ہے ۔ اس میں پختگی کرنی چاہیے مگر میں ڈرتا ہوں کہ جب اُن کو عمل کے لئے کہا جاوے گا اس وقت خامی ظاہر ہو اور پھر وہی سوال دشواری

کا پیش کریں۔ اس لئے ضروری ہے کہ عمل کے وقت کی دشواری کے متعلق ان کو بتلایا جاوے کہ آیا دین دشوار ہے یا نہیں۔

دین اور دشواری

سو ایک جواب تو معروض ہو چکا کہ اگر دشوار بھی ہو تو خواص مطلوبہ ضروریہ کی تحصیل کے لئے قبول کرنا چاہیے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ واقع میں دین میں دشواری ہی نہیں۔ یہاں اسی جواب کو فرماتے ہیں کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ نہیں کی تم پر دین میں کچھ تنگی۔ (اور کیسی بے فکری سے کہتے ہیں۔ آخر خدا ہیں نا۔ اگر کوئی بندہ ہوتا تو ایسے موقع پر کہ ایک عالم دشواری کا مدعی ہو خدا جانے کتنی تمہیدوں کے بعد جواب دیتا۔ یہاں ایک دم سے نہایت پر زور لہجہ میں حرج کی نفی فرما دی۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بڑا انجینیر جر ثقیل سے ایک بڑے بھاری بوجھ کو اٹھا رہا ہو اور ایک گنوار کہے کہ اس کو یہیں رہنے دو کہ مصلحت ہے تو وہ نہایت لاپروائی سے کہے گا کہ نہیں یہ وہیں جاوے گا اور خدا کی تو بڑی شان ہے اُن کو وجوہ بتلانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب اہل تحقیق اپنی خاص شان میں ہوتے ہیں تو محض عوام کے نہ ماننے کی ضرورت سے اسرار و نکات و وجوہ نہیں لایا کرتے ہاں کبھی اُن کے پرپُرزے بھی بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے بھی کہیں کہیں اور بیان کئے ہیں۔ اس لئے محققین نے کہا ہے کہ ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی | بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

یعنی مدعی اور ظاہر پرست کے سامنے عشق اور مستی کے اسرار مت بیان کرو۔ ان کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو۔

بخلاف غیر محقق کے کہ اُس پر جب اعتراض ہوتا ہے وہ بھڑک اٹھتا ہے اور زور شور کی تقریر شروع کر دیتا ہے اور محقق بھڑکتا نہیں بلکہ سارے جوابوں کو طے کر کے اوپر پہنچتا ہے اس لئے بعض اوقات جواب ہی نہیں دیتا پس جواب نہ دینے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یا تو جواب سے نیچے ہو کہ جواب تک نہ پہنچا ہو یا اوپر ہو کہ اُس سے بھی عبور کر گیا ہو محقق کی یہی شان ہوتی ہے۔ پس خدا تعالیٰ کا کلام کہیں تو حکیمانہ ہے اور کہیں حاکمانہ اور یہ حاکمانہ طرز زیادہ شفقت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ حکیمانہ جواب میں ذرا اجنبیت ہوتی ہے۔

جیسے ایک تو طبیب کہے کہ یہ فلاں وجہ سے مضر ہے اس کو نہ کھاؤ اور ایک باپ کہے کہ خبردار اس کو مت کھاؤ اور اگر وہ وجہ پوچھے تو کہے گا کہ بکو مت! بس مت کھاؤ۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ بڑا سخت باپ ہے تو غلطی ہے بلکہ وہ بڑا شفیق باپ ہے۔ تو حاکمانہ انداز بڑی شفقت کی دلیل ہے۔ تو حق تعالیٰ حاکمانہ فرماتے ہیں۔ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ (نہیں کی تم پر دین میں کچھ تنگی) تو اصل میں تو مجھے اس کا بیان کرنا ہے۔ مگر اس سے پہلے ایک ایسا جملہ حق تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ اگر اس کو ذہن میں رکھ لیں تو پھر جواب میں تفصیل ہی کی ضرورت نہ رہے۔

اسرارِ شریعت وہ جملہ یہ ہے هُوَ اجْتَبٰكُمْ کہ اس نے تم کو مخصوص بنا لیا ہے مقصود یہ کہ کیا ہمارے خاص ہو کر تم ہماری بات نہ مانو گے۔ ایک تو مخصوص کہنے میں یہ اثر ہوتا ہے۔ دوسرے خود مخصوص ہونے میں ایک خاص مناسبت بھی ہو جاتی ہے جس سے خود بھی وہیں پہنچنے لگتا ہے جہاں پہنچانا مقصود ہے

جیسے ایک نوکر کہ وہ گھر کا کام کرتا تھا اور پوچھ پوچھ کر کرتا تھا۔ اس کے بعد آپ نے اس کو خاص کر لیا کہ وہ آپ کے گھر کے مشورے بھی سنتا ہے، تو اُس کو احکام کے اسرار بھی معلوم ہونے لگے ہیں تو خصوصیت میں یہ خاصہ ہے خاص کر جو کہ خدا کا مخصوص ہے اُس کی تو علوم میں یہ حالت ہو جاتی ہے وَیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (اور اُس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اُس کو گمان بھی نہیں ہوتا) اور علوم باطنہ میں یہ حالت ہو جاتی ہے ؎

بینی اندر خود علومِ انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

اپنے اندر انبیاء کے علوم دیکھے گا بغیر کتاب اور مددگار و استاد کے۔

اور یہ تفسیر نہیں ہے مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ کی محض مثال ہے۔ لیکن اگر کوئی اس لطیفہ کو آیت کے عموم کی تفسیر بھی کہے تو گنجائش ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں) میں اس کے عموم سے رزق سے فیض علمی مراد لیا ہے۔ اور ایک دوسری آیت میں بھی رزق کو دنیا کے رزق سے عام لیا ہے۔ یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ۔ تو اسی طرح اگر کوئی اس آیت میں بھی رزق سے علم مراد لے لے تو جائز ہے۔ نیز مشاہدہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ کے مخصوصین علوم میں خود وہاں تک پہنچتے ہیں۔ جہاں اہل نظر نہیں پہنچتے۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں بلکہ پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا مگر مولانا کا علم اُن کے رسائل سے ملاحظہ فرما لیجئے۔

ایک مرتبہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک مضمون نیا بیان کیا۔ کسی نے حاضرین میں سے کہا کہ یہ مضمون تو ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی بیان فرمایا تھا۔ ارشاد فرمایا کہ جہاں سے ہم کہتے ہیں وہاں ہی سے وہ فرماتے تھے مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کے برابر کھلتا تھا ہمارے لئے سوئی کے ناکے کے برابر کھلتا ہے۔ تو جب یہ بات ہے تو اب ایسے شخص کو دلائل کی کیا ضرورت ہے مجھے علم مکسوب اور علم موہوب پر ایک مثال یاد آئی۔

ایک سیاح امیر عبدالرحمٰن کی فراست کی حالت بیان کرتے تھے کہ میں نے ایک رقعہ چند مشوروں پر مشتمل تنہائی میں لکھ کر پیش کرنے کے ارادہ سے جیب میں رکھ لیا۔ قبل اس کے کہ میں پیش کرتا انہوں نے خود ہی سب مضامین کا جواب دے دیا کہ بعض خیر خواہوں کی ایسی ایسی رائے ہے مگر اس کا یہ جواب ہے۔ مجھ کو حیرت ہوئی جب دربار برخاست ہوا تو میں نے کہا کہ امیر صاحب کیا آپ کو کشف ہوتا ہے انہوں نے فرمایا کہ نہیں میں کیا صاحب باطن ہوں جو کشف ہو گا عقل سے ادراک ہو جاتا ہے۔ اور عقل اور کشف میں تھوڑا ہی فرق ہے کہ کشف مشابہ ٹیلیفون کے ہے کہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے اور عقل مشابہ ٹیلیگراف کے کہ ذرا غور سے معلوم ہوتا ہے واقعی عجیب مثال ہے کلام الملوک ملوک الکلام۔

تو حق تعالیٰ ان کو گویا ٹیلیفون سے بتلا دیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ٹیلیفون میں تو خارج متکلم کی آواز ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ آواز سے پاک ہیں۔ تو علم بالکنہ کا جو نتیجہ ہوتا ہے ان کو حاصل ہو جاتا ہے پس ہُوَا جْتَبَاکُمْ کو اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے مقدم فرمایا۔ اور اس میں یہ بتلا دیا کہ اگر اسرار شریعت جاننا چاہتے ہو

تو خدا کے برگزیدہ ہو۔ اور خدا کا برگزیدہ ہونا تو بڑی بات ہے، بزرگوں کے پاس بیٹھنے بلکہ اُن کا چہرہ دیکھنے سے بہت شبہات کا حل ہو جاتا ہے۔ مولانا رومی نے سچ فرمایا ہے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اے محبوب! تیری زیارت ہر سوال کا جواب ہے۔ بآسانی ہر مشکل کا تو حل ہے۔

برکتِ صحبت میرے ایک ہم وطن جو کہ اس وقت انگلستان میں ہیں۔ وہ مجھ سے نقل کرتے تھے کہ میں ایک وقت باندہ میں تھا۔ وہ انگریزی میں بڑے ذی استعداد ہیں۔ اور نوکری میں ایسے خوش اقبال کہ جب کوشش کی فوراً ہی چار پانچ سو کے نوکر ہو گئے مگر بے استقلالی کے سبب اُن کو کبھی نوکری سے انتفاع نہ ہوا۔ غرض ذکی بہت ہیں مگر علم دین سے واقف نہیں۔ اس لئے یہ واقعہ ہوا کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام کی تاریخ دیکھ رہے تھے اور رمضان کا روزہ بھی تھا۔ اس میں تھا کہ ایک جگہ گئے اور کسی کافر بادشاہ کے پاس پیام بھیجا کہ یا اسلام لاؤ یا جزیہ دو ورنہ قتال ہے۔ اُن کو شبہ ہوا کہ بس اسلام کی یہ قیمت ہے کہ بجائے اسلام کے جزیہ پر راضی ہو گئے۔ حالانکہ اسلام کی تو وہ قیمت ہے کہ ؎ قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اپنی قیمت دو جہان بتلائی ہے۔ نرخ بڑھایئے کیوں کہ ابھی ارزاں ہے۔

یہ محض شریعت کی رحمت عامہ ہے کہ اسلام پر جبر نہ کر کے جزیہ قبول

کر لیا اور ان لوگوں کے حقوق برابر رکھے اور یہ شبہ ایسا بڑھا کہ اسلام کی حقانیت ہی کا انکار دل میں جم گیا۔ پھر خیال آیا کہ جب اسلام ہی کچھ نہیں ہے، تو روزہ کیا چیز ہے۔ آخر پانی پی لیا۔ اس کے بعد رنج ہوا کیونکہ اسلام بہت مدت کا رفیق تھا۔ شام کو حسب معمول ایک دوست کے پاس پہنچے۔ انہوں نے افطار میں شرکت کے لئے بلایا۔ تو انہوں نے کہا کہ میری ایسی حالت ہے کہ اگر تم کو معلوم ہو جاوے تو پاس بھی نہ بٹھلاؤ۔ انہوں نے کہا کہ بحث بریں نیست کہ تم کافر ہو گئے ہو گے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے باقی اس کا اثر باہمی دوستی پر کیوں ہو بہ حکمت تالیف کے لئے کہا۔ جب کھا پی چکے انہوں نے حقیقت پوچھی معلوم ہونے پر کہا کہ ہماری خاطر سے تم مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے مل لو۔ یہ ہنسے کہ مولوی صاحب بجز قرآن وحدیث کے ان حقائق فلسفیہ کو کیا جانیں اور میرے شبہات کا کیا جواب دیں گے مگر جس چیز کے نہ جاننے کو یہ نقص سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

ہم نے جو پڑھا سب بھلا دیا مگر دوست کی بات ہی کا تکرار کرتے ہیں۔

یہ شعر میں نے خود مولانا کی زبان سے سنا ہے۔ حقیقت میں علم تو یہی ہے ایک صوفی فرماتے ہیں ؎

علم نبود غیر علم عاشقی ما بقی تلبیس ابلیس شقی

اور وہی کہتے ہیں ؎

اَیُّھَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَۃِ کُلَّمَا حَصَّلْتُمُوْہُ وَسْوَسَۃٌ

اے اہل مدرسہ! تمہاری تمام تحصیل کا حاصل وسوسہ ہے۔

پس یہ تو اپنے اس علم پر فخر کرتے ہیں مگر عام لوگ اس کو ذلیل کہتے ہیں کہ یہ کیا جانیں سوائے قرآن و حدیث کے۔ حالانکہ تمام دنیا کے فلسفی قرآن و حدیث کے آگے گرد ہیں۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بڑے بڑے فلسفی آئے مگر سب ساکت تھے۔

غرض انہوں نے غایت تحقیر سے کہا کہ مولانا کیا جانیں۔ انہوں نے کہا تم میری ہی خاطر سے جاؤ تو سہی۔ انہوں نے کہا کہ خیر تمہاری خاطر چلا جاؤں گا۔ آخر گئے اور ادب کے سبب زیادہ رستہ پیدل قطع کیا اور اسی حالت ہجوم اعتراضات میں پہنچے اور خوب منصوبے سوچ رکھے تھے کہ یہ کہوں گا وہ کہوں گا۔ جا کر کہا، السلام علیکم! مولانا نے سلام لے کر فرمایا۔ بولو کیا شبہ ہے۔ بیان کرتے تھے کہ اب جو اعتراض سوچتا ہوں اس کا جواب ذہن میں موجود۔ اب مولانا تو تقاضا فرما رہے ہیں اور یہ گم سم حیران۔ خلاصہ یہ کہ کچھ بھی نہ رہا۔ قلب صاف ہو گیا۔ آخر میں انہوں نے عرض کیا کہ مجھ کو بیعت کر لیجئے۔ کہتے ہیں کہ مجھ سے عمل میں تو بڑی بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں لیکن عقائد کے متعلق کبھی کوئی وسوسہ تک اس روز سے نہیں آیا۔ مجھ کو یہ حکایت اس پر یاد آ گئی کہ ؎

اے لقاء تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اے محبوب! تیری زیارت ہر سوال کا جواب ہے۔ بآسانی ہر مشکل

کا تو حل ہے۔

یہ برکت ہے اہل اللہ سے تعلق رکھنے کی۔ تو وہی اس کا اہتمام کیجیے اور اپنی اولاد کے لئے اس کا انتظام کیجیے۔ اور اگر عذر ہے کہ وہ انگریزی پڑھتے ہیں ان کو اتنی فرصت کہاں تو میں اس کی ایک سہل اور مختصر صورت بتلاتا ہوں کہ صرف تعطیلات میں اپنے بچوں کو کسی بزرگ کے پاس بھیج دیا کیجیے اور خود بھی رہ لیا کیجیے اور میں اس کا اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ تعلیم انگریزی یا نوکری نہ چھڑاویں گے بلکہ اگر آپ خود بھی چھوڑنا چاہیں گے تو وہ نہ چھوڑنے دیں گے۔ کیونکہ وہ حکیم ہیں سمجھتے ہیں کہ ضعفاء کے لئے نوکری چھوڑنے میں زیادہ مفاسد ہیں۔

غرض تمام تر وجہ آپ کے شبہوں کی یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت معلوم نہیں۔ تو جب بزرگوں کے قرب میں انکشاف حقیقت کا اثر ہے تو خدا کے قرب میں تو یہ اثر کیسے نہ ہوگا۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ تم مجتبیٰ بنو اگر کہو کہ خدا نے تو مجتبیٰ بنا لیا۔ چنانچہ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ کا یہی ترجمہ ہے۔ پھر ہم کو کیا ضرورت ہے۔ تو سبحان اللہ! اگر کوئی کہے کہ شام کو فلاں شخص نے تمہاری دعوت کی ہے۔ تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہی خود تمہارے منہ میں بھی دے گا۔ اس نے تو تمہارے لئے سامان کیا ہے۔ باقی کھاؤ تم خود اسی طرح اجتباء کا سامان تمہارے لئے کر دیا ہے باقی اس کو حاصل کرو تم۔

لہ نظیر الاذن فی اشتراط الولاء للبائعین فی قصۃ بریرۃ رضی اللہ عنہا لحکمتہ ذکرھا الامام النووی بقولہ والثانیۃ والعشرون احتمال اخف المفسدتین لدفع اعظمھا واحتمال مفسدۃ یسیرۃ لتحصیل مصلحۃ عظیمۃ علی ما بیناہ فی تاویل اشتراط الولاء لھم اھ

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک گوجر کے یہاں ایک موروثی پیر آیا۔ گوجر بولا اب کے تو بہت ہی دُبلے ہو رہے ہو۔ پیر صاحب بولے تم نماز نہیں پڑھتے تمہارے بدلے میں پڑھتا ہوں۔ تم روزہ نہیں رکھتے میں ہی رکھتا ہوں۔ علی ہذا سب اعمال پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پلصراط پر جو کہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے تمہارے عوض چلنا پڑتا ہے تو کہاں تک دبلا نہ ہوں۔ گوجر بولا بہت ہی کام کرنا پڑتا ہے جا میں نے فلاں کھیت تجھے دے دیا۔ پیر خوش ہوئے۔ کہا کہ قبضہ کرا دے۔ وہ ساتھ چلا۔ دھانوں کی پتلی پتلی ڈولیں ہوتی ہیں۔ ایک جگہ پیر پھسل کر گر گئے گوجر نے ایک لات دی کہ تو پلصراط پر کیا چلتا ہوگا۔ جھوٹا ہے میں ایسے جھوٹے کو کھیت نہیں دیتا۔ اب وہ کھیت بھی چھین لیا اور چوٹ بھی لگی۔

تو اسی طرح اب کوئی چاہے کہ مجتنبی تو ہم ہوں مگر کام سارے کوئی دوسرا کرے۔ نہیں بلکہ طریقہ بتلا دیا اب تم کرو۔ یہ سب ہوا اجتبا کم کے متعلق بیان تھا اب اس مقصود یعنی نفی حرج کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

دشواری کی حقیقت وہ عرض یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ دین میں دشواری ہے اس کے معنی کیا ہیں۔ کیونکہ اس کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور یہ دشوار ہے۔ اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت ہے۔ تو اسلام میں کون سی دشواری ہے۔ آیا یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو تسلیم ہے کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔

مثلاً جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں اور ان کا وقت دس بجے سے ہے تو کیا

کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی چھوڑ نہ دیا۔ تو جب قانون کی پابندی ہوگی۔ اس میں دشواری ضرور ہوگی۔ تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں لَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى (مت پیروی کرو خواہشات کی) اور اس سے صاف اِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ۔ (بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو) غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے۔ یہ تو سبھی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے۔ کوئی اپاہجوں سے پوچھے۔ خاص کر واجد علی شاہ کے احدیوں سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے

مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے۔ ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے۔ اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا ایک بیٹھا ہوا۔ ایک سوار ادھر سے گزرا۔ لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوار! ذرا یہ بیر جو میرے سینہ پر رکھا ہے میرے منہ میں ڈال دو۔ اس کو اس آرام طلبی سے سخت حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ یہ حیرت ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے۔ وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہو جائے گی۔ آپ کو کیا خبر یہ میرے ساتھ کیسا ہے۔ کل میں لیٹا تھا یہ بیٹھا تھا۔ مجھ کو جو جماہی آئی اس سے منہ کھل گیا۔ ایک کتا آ کر منہ میں پیشاب کرنے لگا۔ یہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا۔ اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دے میں ضرور اس کے منہ میں بیر دوں گا۔ سوار حیرت میں غرق ہو گیا اور لاحول پڑھتا ہوا چل دیا۔ تو حضرت

اگر کوئی احدیوں سے پوچھے تو ان کو تو کھانا بھی مشکل ہے۔

ہمارے ایک عزیز دو بھائی ہیں۔ ایک چھوٹے ایک بڑے۔ بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا تو ایسی نظیریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی۔ تو اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے۔ اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ اور ڈکیتی نہ ڈالو۔ مگر اس کو کسی نے نہ کہا کہ بڑا سخت قانون ہے۔ وجہ یہ کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا۔ اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اُس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے لیکن جو ڈکیتی پیشہ ہیں اُن سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح ایک جماعت یہودوں کی ایسی بھی ہے کہ اُن کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو۔ حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے۔ مگر یہ اُن کو گراں ہے تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں۔ تو محض پابندی سے تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ پھر اسلام ہی پر کون اعتراض ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت تو تسلیم اور یہ سختی نہیں، مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے۔ تو واقعی یہ دشواری دشواری ہے۔ مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو۔

اب یہ شبہ ہوگا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے۔ تو حقیقت میں اس میں تلبیس ہوئی ہے۔ قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی

دشواری پیش آوے۔ مثلاً یہ قانون ہو جاوے کہ اگر چھٹانک بھر سے زیادہ کوئی کھاوے تو پھانسی ہوگی۔ یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی سب کو تکلیف ہو۔ اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آوے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجاوے وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے۔ پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے۔ تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرور تنگی ہوگی۔ کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشا ان باغیوں کی بغاوت ہے۔

مثلاً کوئی اگر ایسی جگہ پہنچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں اور یہ شخص وہاں پہنچ کر کوئی چیز خریدے اور دام دے دے۔ پھر اس سے کہا جائے کہ گو قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لے کر پوری چیز دو۔ مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے اس لئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہیے کہ یہ دشواری قانون کی ہے۔ یا ان بدمعاشوں کی بدمعاشی۔ قانون کا منشا تو یہ ہے کہ سیر بھر کی سیر بھر دو۔ مگر ان بدمعاش لوگوں نے بدمعاشی کی اور سیر بھر کی آدھ سیر دی۔ تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو برا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں۔ تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے۔ وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کی مان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آوے۔ اگر وہ پچاس قیامتیں بھی آجاویں جب بھی شریعت

کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے۔ صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی۔ اب جس کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ۔ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کئے کو اسلام پر تھوپنا ایسا ہے کہ ؎

حملہ برخود مے کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

اے سادہ مرد! تو اپنے ہی پر حملہ کرتا ہے اس شیر کی طرح جس نے اپنے پر حملہ کیا۔

مثنوی میں شیر کی حکایت بھی چوڑی لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دیا اور کہا میں تمہارے راتب کے لئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا۔ راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا۔ اور مجھ سے چھین لیا۔ شیر کو غصہ آیا کہ بتلا وہ کہاں ہے۔ اس نے ایک کنوئیں پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا۔ بس شیر اس کنوئیں میں جا کودا۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

حملہ برخود مے کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

اے سادہ مرد! تو اپنے اوپر حملہ کرتا ہے اس شیر کی طرح جس نے اپنے اوپر حملہ کیا۔

اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے۔

آئینہ شریعت

اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے ایک آئینہ دیکھا۔ اُس میں اپنی صورت نظر پڑی۔ آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر پھینچ مارا کہ ایسا ہی بدشکل تھا تب تو کوئی تجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔

ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اُس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا۔ لوٹے میں ایک ٹکرا گر پڑا۔ جھانکنے سے اپنی صورت نظر آئی۔ سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے۔ باپ سے کہا، ابا اُس نے میرا ٹکڑا لے لیا۔ آپ چھیننے اٹھے۔ جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل بولے کہ لعنت خدا کی۔ بڈھا ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ تف ہے تیری اوقات پر سو وہ کس کو تف کہہ رہے تھے، اپنے کو!

اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا اور وہ تنگی اپنی صفت تھی اُس کو شریعت کی تنگی سمجھا۔ حضرت یہ ہے حقیقت سختی کی اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے مگر نہ ایسا اُلّو کہ خاک پتھر سب کی اجازت دے دے۔ ظاہر ہے کہ جب غذائیں کھائی جاویں گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی ممانعت ہو گی۔ اتفاق سے ایک دیہاتی پہنچا کہ صاحب کھاؤں کیا۔ جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک۔ وہ بولا یہ تو ملتا نہیں۔ کہا مونگ کی دال۔ کہا یہ بھی نہیں ملتی۔ کہا فیرینی، کہنے لگا یہ بھی نہیں ہے۔ پھر خود پوچھا بینگن کھاؤں۔ کہا ہرگز نہ کھانا۔ کریلہ کو پوچھا اُس کو بھی منع کیا۔ آلو سے بھی روک دیا تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں۔ طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا تو یہی ہے۔ دیہاتی نے باہر آ کر کہا کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ وہ بھی نہ کھاؤ۔ تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے یا یہ کہا جاوے گا کہ وسعت تو

یہ ہے کہ متعدد چیزوں کی اجازت دے دی لیکن وہ مقام ایسا کوردہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں۔ تو یہ طب کی تنگی تو نہیں، اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے۔

اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر کے دیکھئے کہ معاش کی ضروری سبیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں اگر پچیس آپ نکالیں گے۔ تو بیس کو شریعت یجوز کہے گی اور پانچ کو لایجوز۔ لیکن اگر آپ کے ملک والے ہمیشہ اُن ہی پانچ کو استعمال کریں اور بیس کو متروک کر دیں تو یہ تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانون شریعت کی۔ پس یہ الزام تو بحمد اللہ بوجہ احسن و اکمل رفع ہو گیا۔ اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو تو علم دین پڑھئے۔ اُس سے معلوم ہو گا کہ شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسع کیا ہے۔

درستی اعمال کی ضرورت

اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے۔ اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو۔ وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں مگر حالت موجودہ میں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل نہیں کرتے۔ عارضی دشواری تو ہو گئی۔ تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہنچ گیا البتہ اعتقاد درست ہو گیا کہ شریعت میں دشواری نہیں۔ مگر عمل کس طرح سے کریں۔ کیا ہم دین چھوڑ دیں۔ کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز معاملات اکثر ناجائز، تجارت اکثر ناجائز، تو یہ ایک فریاد قابل استماع ہے۔ سو اُس کے متعلق بھی سن لیجئے۔ اس میں قدرے تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم

کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے، غیر مسلّم ہے۔

سمجھئے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ کہ اُن کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے۔ اور ایک وہ کہ اُن کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائیے، نماز روزہ کرے، حج کرے، تکبر نہ کرے، باجا گاجا چھوڑ دے۔ تو بتلائیے اس میں معاش کا کیا نقصان ہے۔ تو اس میں تو آپ آج ہی سے اصلاح کر لیجئے۔ پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہو جاویں گے۔ کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذّت ہیں کہ خواہ مخواہ آپ نے اُن کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ آگے دس ہی رہ جاویں گے۔ اُن میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چونکہ غالب درجہ اعمال صالحہ کا موجود ہو چکا ہے اس لئے حق تعالیٰ سے اُمید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب و قلیل ہیں درست فرما دیں گے۔

جیسے ایک شعلہ جوّالہ کہ دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے حالانکہ اُس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی۔ مگر جب نور و ظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے۔ اور اس درستی میں گو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذب حدید ہے۔ پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال صالحہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعوےٰ ہو سکتا ہے مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ کی ترقی کا راز یہی ہے۔ ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھا نہیں جاتا مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے

ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں۔ جس وقت تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں۔

اُن کی خدمت میں جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے۔ غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی مگر جب قوت ہو گی تمام موانع مضمحل ہو جاویں گے۔ اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جائے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے۔ جیسے کسی نے یہ سُن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے۔ غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے۔ یہ ہے وہ راز۔

اگر بالفرض اصلاح بھی نہ ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جاوے گی کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمتی چلی جاوے گی اور اس سے نفرت پیدا ہو جاوے گی اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کر دے گی۔ اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے۔

اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو ٹل سکتے ہیں مگر ایک نہیں ٹل سکتا۔ تو کیا کوئی یہ کہے گا کہ ع

چو آب از سر گزشت چہ یک نیزہ چہ یک دست

ہرگز نہیں بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے۔ تو اسی طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے

صرف دس ہی کے مجرم رہ گئے۔

معاش اور شریعت

اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے۔ تو اول تو چونکہ آپ کو شریعت کے احکام نہیں معلوم ہیں اس وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ احکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑے سے تغیر سے وہ ناجائز جائز ہو جاوے گا۔

مثلاً اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے۔ اب اگر کہئے کہ صاحب اچھا مسئلہ سنا کہ نرخ کے حساب سے تو سو روپیہ کی چاندی ایک سو بیس بھر آتی مگر اب سو روپیہ کی سو ہی روپیہ بھر ملی۔ اچھا عمل کیا کہ بیس روپیہ کا خسارہ ہوا۔ اب ساری عمر کے لئے مولویوں کو خیر باد کہہ دیں گے۔ تو سنیئے بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا۔ کیا کوئی جائز شکل معاملہ کی ہے تو مولوی صاحب یوں کہتے کہ ان روپوں میں ایک گنی بھی ملا لو تو ایک سو بیس روپیہ بھر چاندی جو آوے گی تو پچاس روپیہ بھر تو پچاس روپیہ کی آوے گی اور باقی کو اس گنی میں شریعت محسوب کر دے گی۔ تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ شریعت خود فیصلہ کر چکی ہے۔

تو بتلائیے کیا نقصان ہوا۔ اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں صاحبو پوچھتے تو رہو۔ اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہہ دیں گے۔

کیونکہ شریعت اُن کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جیسے چاہے جائز کر دیں۔

جیسا کہ ایک مطوف سے ایک بڑھیا نے صفا مروہ کی سعی میں تھک کر کہا تھا کہ مولوی صاحب اب تو معاف کر دو۔ اسی طرح بعضے لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء ہند مثل بعض علماء مصر کے کرنے لگیں۔ ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز۔ تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں علماء سے۔

جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے تم اُس کی تصدیق کر کے توجیہ کر دیا کرو۔ چنانچہ ایک بار اس رئیس کے منہ سے نکلا کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی۔ وہ اس کے سُم کو توڑ کر ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی۔ سب اہل مجلس ہنسنے لگے کہ سُم اور ماتھے کا کیا جوڑ۔ نوکر بولا سچ ہے حضور وہ اس وقت سُم سے پیشانی کھجلا رہا تھا۔ تو حضور علماء سے تو ایسی نوکری ہوتی نہیں نہ ہم اتنے ذہین ہیں اور نہ خدا کرے کہ ہوں۔

تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سب کو جائز کہہ دیں۔ مگر پوچھ کر دیکھو، تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جاوے گا۔ تو بہت بڑا حصہ اس عار یعنی دشواری کا اس طرح ختم ہو جاوے گا۔ ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جاویں گے کہ وہ بالکل ناجائز ہوں گے۔ مگر اس میں بھی دو درجے ہیں۔ ایک تو وہ کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں۔ پس اس کو تو چھوڑ دیا جاوے کیونکہ اُس کا چھوڑنا مضر حوائج ضروریہ نہیں۔ اور ایک درجہ وہ ہے کہ اس کو کرتے رہو۔ اور گو یہ جائز تو نہ ہونگے مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اُس سے ایسے جرائم خفیف

ہو جاویں گے۔ وہ یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنا چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ ہر روز توبہ کیا کرے۔ اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اس پر پچھتائے اور دعا کیجئے کہ اے اللہ مجھے معاف فرمایئے مواخذہ نہ کیجئے۔ تو یہ کیوں نہیں کرتے۔ کیا ایسا کرنے سے نوکری سے موقوف ہو جاؤ گے؟ ہرگز نہیں بلکہ تم نوکر ہی رہو گے۔

دوسرے یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ کوئی دوسری سبیل میرے لئے نکال دیجئے۔ تو اس میں یا تو کوئی سبیل نکلے گی اور جو کوئی دوسری سبیل نہ نکلے تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو لکھا جاوے گا جری گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جاوے گا۔ اور یہ توسع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے۔ اور اس توسع میں راز شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جاوے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہو جائے۔ مثلاً یہی کہ چلو آریہ بنیں۔ تو یہ توسع این بلا دفع بلاہائے بزرگ کا مصداق ہے اور میں کفر سے بچا رہا ہوں۔ کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے تو خدا جانے کیا کیا اس کو سوجھتا ہے۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب جب تھانہ بھون میں رہتے تھے ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائداد کے

لہ واعظ مرالمفسدتین ما بتیہ تدریجًا فی قولہ والحکمۃ فی اذنہ ثم ابطالہ ان یکون ابلغ فی قطع عادتہم فی ذلک وزجوہم عن مثلہ اھ

معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے۔ حضرت دُعا فرما دیتے۔ ایک بار آ کر کہنے لگے کہ اب تو اس نے حد ہی کر دی اور جائیداد غصب ہی کرنے کو ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کر۔ اس نے کہا، بہت اچھا۔ دفعۃً حافظ محمد ضامن صاحب حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا، ہرگز صبر مت کرنا۔ جاؤ نالش کرو اور ہم دعا کریں گے اور حضرت سے فرمایا، آپ تو عابر شاکر تھے سب چھوڑ کر بیٹھ رہے ہیں۔ اس میں تو اتنی قوت نہیں۔ یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستا دے گی یہ جھوٹی گواہی دے گا چوری کرے گا۔ تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے۔

تو یہ ہے اصل راز اس توسع کا۔ تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ سنیں گے مگر یہ اس لئے ظاہر کر دیا گیا کہ یہ کفر سے بچاتا ہے لیکن خدا کے لئے اس کو آپ تمام معاصی میں آڑ نہ بنالیں کہ یہ جز تو بہت اچھا ہاتھ آیا۔ بات یہ ہے کہ اول تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاصی میں۔ اس کا توڑ یہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اس میں یہ قید بھی تو لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو جیسے کوئی بیت الخلاء میں بیٹھا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی مگر انہوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے۔ آخر ضرورت سے پاخانہ میں گئے تو چٹخنی لگ گئی اور اُن کے کھولنے سے نہ کھلی۔ بڑے پریشان۔ لوگوں سے التجا کی سب نے انکار کر دیا۔ آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم کھلائی۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پاخانہ ہے اس میں قسم کھلانا جائز نہیں۔ تو جس طرح وہ پاخانہ سے نکلنے

کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو۔ کیا کوئی پائخانہ میں جا کر فخر کرتا ہے بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری ہیں کیا کریں۔ بس اس کی یہ حالت ہو گی کہ

چونکہ برمیمنت بربند و لبستہ باش — چوں کشاید چابک بر جستہ باش

جب تجھے مرخ سے باندھیں، بندھا رہ۔ جب کھولیں ہوشیار اور چالاک ہو۔

تو نکلنے کی فکر تو کرو، کوشش تو کرو، گو کچھ اُمید نہ بھی ہو۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید — خیرہ یوسف وار مے باید دوید

اگرچہ جہاں میں ظاہر رخنہ نہیں ہے۔ یوسفؑ کی طرح دوڑنا چاہیے۔

یوسف علیہ السلام کا قصہ یہ ہوا کہ جب زلیخا نے دروازہ بند اور مقفل کر لیا اور آپ نکلنے کے لئے دوڑے ہیں۔ عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے۔ اس کو فرماتے ہیں کہ ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید — خیرہ یوسف وار مے باید دوید

اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑا، ٹکر بھی لگ گئی۔ اتنے پر بھی فضل ہو جاوے گا۔ اب بتلایئے اس میں کون سی چیز مشکل ہے۔ میں تو نوکری نہیں چھڑاتا مگر نفور رہیں۔ سو یہ کیا مشکل ہے۔ اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر ناز ہے بے باکی ہے۔ سو یہ فخر کیسا اور تکبر کیسا اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے سو اہل اسباب کا علماء کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا مگر اس سے

زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ تو اب کون سا مرتبہ اختلاف کا رہ گیا نہ قانون تو دشوار ہے نہیں اور قانون سخت نہیں۔ صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہو جاتی ہے۔ تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں مخل ہی نہیں اور جو مخل ہے اُس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہو سکتا ہے اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہو سکے وہ اوّلاً بہت مختصر ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کئے پر پچھتانا اور توبہ کرتے رہنا تو اب وہ کون سا جزء ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہو گیا کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ۔ الآیہ (نہیں کی تم پر دین میں کچھ تنگی)

صورتِ اصلاح

اس کے بعد ایک عملی مرحلہ دشواری کا اور رہ گیا مگر وہ بہت ہی معمولی ہے۔ وہ یہ کہ تدبیرات مذکورہ کے لئے جو ہمت کی ضرورت ہے اور لوگ ہمت سے کام نہیں لیتے حتیٰ کہ کم ہمتی کے سبب توبہ تک کا ارادہ نہیں کرتے یا کر کے توڑ دیتے ہیں۔ ع

بشب توبہ کردو سحر گہ شکست

ایسے بہت سے لوگ ہیں۔ تو اس کا صرف ایک علاج ہے۔ وہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے اور کچھ علاج نہیں۔ اب چاہے آپ مجاہدہ کریں یا وظیفہ پڑھیں اس سے فائدہ مطلوبہ حاصل نہیں۔ مگر مشائخ کے یہاں آج کل وظیفہ بہت سستا ہے۔ نماز کی پابندی کے لئے ایک وظیفہ پھر اُس وظیفہ کے دوام کے لئے ایک اور وظیفہ۔ مگر بالکل بے جوڑ علاج۔ بھلا وظیفوں کو ترک گناہ میں کیا دخل

ہر چیز کا علاج الگ ہے۔ وظیفہ صرف ذریعہ ہے غلبۂ ذکر علی القلب کے لئے بشرطیکہ دنیا کے لئے نہ ہو۔ باقی اگر ایک شخص کو عادت ہے لڑکوں کو دیکھنے کی تو یہ روزہ یا وظیفہ سے نہیں جاتی۔ اگرچہ روزہ میں کمی شہوت کی ہوتی ہے مگر مجھ سے ایک ستّر برس کے بوڑھے نے جو ایک اسلامی ریاست میں کلکٹر تھے شکایت امرد پرستی کی کی اور روتے تھے۔ بھلا ستّر برس کے بڈھے میں کیا شہوت ہوتی۔ تو وظیفہ سے اس میں کیا ہونا۔ پس اس کا علاج یہی ہے کہ کسی اہل اللہ کے پاس چلا جاوے کہ ؎

گر تو سنگ خارہ و مرمر شوی | چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی
نفس نتواں کشت الا ظل پیر | دامنِ آں نفس کش را سخت گیر

اگرچہ تو سخت پتھر ہے۔ جب اللہ والے سے تعلق قائم کرے، موتی ہو جاوے۔ مرشد کے زیر سایہ ہونے کے بغیر نفس کشی نہیں ہو سکتی۔ کسی نفس کش کا دامن پکڑ۔

غرض اس کا علاج اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ کسی اہل اللہ کے پاس رہے مگر اُس کے پاس رہنے کے کچھ آداب ہیں۔ وہ یہ کہ اس طرح سے رہے کہ ؎

قال را بگذار مرد حال شو | پیش مرد کاملے پامال شو

زبانی جمع خرچ چھوڑ صاحب حال ہو۔ کسی کامل مرد کے سامنے زانو ادب تہ کر۔

نیز اُس کے ساتھ رہنے میں یہ ضرور ہے کہ جو کہے وہ کرو اور اطمینان رکھو کہ وہ کہے گا ایسا کہ جو آسان ہو مگر نیت یہی رکھو کہ اگر سخت بھی کہے گا تو ہرگز

خلاف نہ کریں گے۔ بہتر اُن کے زجر سے بُرا نہ مانو کیونکہ بعض امراض کا علاج یہی ہے

ایک صاحب نے میرے پاس ایک دفتر سوالات کا بھیجا۔ میں نے لکھا کہ یہاں آؤ اور سمجھ لو۔ انہوں نے لکھا کہ آؤں گا مگر دو شرط سے ایک تو یہ کہ گفتگو کے وقت چلانا نہیں۔ دوسرے یہ کہ تمہارے گھر کا کھانا نہ کھاؤں گا۔ میں نے لکھ دیا آؤ دونوں شرطیں منظور ہیں۔ آئے ملے۔ میں نے کہا صاحب ایک شرط سے رجوع کرتا ہوں یعنی یہ کہ چلانا نہیں۔ میں ضرور چلاؤں گا کیونکہ بعض مرض کا علاج چلانا ہی ہے اور اس میں بڑی برکت ہے۔ اور اگر کہیے کہ دھوکا دے کر بلایا ہے، تو اگر منظور نہیں آمد و رفت کا کرایہ لیجئے اور جائیے۔ آخر سیدھے ہو گئے۔ میں نے کہا، کھانے کی نسبت کیا رائے ہے۔ کہنے لگے وہی پہلی شرط ہے۔ میں نے کہا، بہتر! پھر میں اٹھ کر گھر چلا تو پیچھے سے اُنہوں نے ایک لڑکا بھیجا کہ میں نے اس شرط کو بھی چھوڑ دیا کھانا بھی کھاؤں گا۔ پھر اُن سے گفتگو کی اور تسلی ہو گئی اور میں نے اُن کو نصیحت بھی کی کہ مختلف کتابیں نہ دیکھو زیادہ خرابی اسی سے ہوتی ہے۔ غرض یہ ضرور ہے کہ اگر وہ ڈانٹیں تو بُرا نہ مانو ؎

در بہر زخمے تو پُر کینہ شوی ۔ پس کجا صیقل چو آئینہ شوی

اگر تو ہر زخم سے رنجیدہ خاطر ہوتا ہے تو آئینہ کی طرح صاف کب ہو سکے گا۔

مولانا نے ایک حکایت بڑی عجیب لکھی ہے کہ ایک قزوینی کسی کے پاس گیا کہ میری کمر پر شیر کی تصویر گود دے۔ وہ گودنے بیٹھا ایک جگہ سوئی چبھوئی۔ چلّایا کہ یہ کیا کرتا ہے۔ اُس نے کہا تیری فرمائش پوری کرتا ہوں۔ کہنے لگا کہاں

سے شروع کیا ہے۔ بولا دُم سے۔ کہنے لگا شیر بے دم ہی۔ اُس نے دوسری جگہ سوئی رکھی۔ پھر چلایا کہ اب کیا بناتا ہے۔ اُس نے کہا شکم۔ بولا شکم کیا ہو گا۔ اُس نے تیسری جگہ سوئی لگائی۔ پھر چلایا کہ یہ کیا ہے۔ بولا کہ کان۔ کہنے لگا کان بھی نہ سہی۔ وہ گودنے والا بڑا پریشان ہوا۔ سوئی پھینک دی اور کہا کہ ؎

شیر بے گوش و سر واشکم کہ دید ... ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

یعنی خدا نے بھی تو ایسا شیر پیدا نہیں کیا۔ اِس پر مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن ... پس تو از شیر ژیاں دم کم مزن

اور اسی مقام پر فرماتے ہیں ؎

در بہر زخمے تو پُر کینہ شوی ... پس کجا بے صیقل چو آئینہ شوی

آخر نوکری کی خوشامد میں حکام کی ڈانٹ سہتے ہو۔ اگر اصلاح باطن کے لئے شیخ کا زجر سہہ لیا تو کیا بڑی بات ہے۔ تو اُن کے پاس رہنے سے اعمال صالحہ کا عزم قوی ہو جاتا ہے اور بُری چیزوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور پھر بڑے بڑے کام آسان ہو جاتے ہیں۔

ہمّت اور محبّت یہی مراد ہے ہمت سے اور راز اس کا یہ ہے کہ اُن کے پاس رہنے سے یہ شخص صاحب محبّت ہو جاتا ہے اور محبّت کی خاصیّت ہے کہ ؏

از محبّت تلخہا شیریں شود

محبّت وہ چیز ہے کہ میں نے ایک نوجوان کو اسی سفر میں دیکھا کہ وہ کسی رنڈی پر عاشق ہو گیا۔ کہتا تھا کہ راتوں کا جاگنا اور نماز کو جانا سہل ہو گیا اور پہلے

فرض نماز کے لئے اٹھنا بھی دشوار تھا۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ یہ نفع عارضی ہے اور چونکہ نفع سے زیادہ اس میں مفاسد ہیں۔ تو یہ ایسا ہے کہ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ (آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں کو فائدے بھی ہیں)

اس پر ایک اور واقعہ یاد آیا کہ میں ایک بار کاندھلہ گیا۔ نماز عشاء کے بعد سونے کے متعلق یہ تجویز ٹھہری کہ مسجد کی سمت شمال کی طرف ایک سہ دری تھی وہاں سو رہیں گے۔ اتنے میں محلہ میں سے ایک رقاصہ کی آواز گانے کی آئی۔ میں نے کہا اب یہاں نہیں رہوں گا کسی مردانے مکان میں سونے کا انتظام کیا جائے میرے ساتھ ایک صوفی آزاد تھے وہ وہاں ہی رہے اور صبح کو کہنے لگے کہ اُس کی آواز سے آج نماز میں خوب یکسوئی ہوئی۔ خطرات بالکل نہیں آئے۔ میں نے کہا کہ خیال کا نہ آنا کافی نہیں بلکہ دوسری طرف کا خیال آنا چاہیے یعنی خدا کی طرف کا سو اُس کی آواز اس سے بھی مانع تھی تو یہ مفسدہ اُس منفعت سے بدرجہا زیادہ ہے

مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی ایک ترک کی کہ اُس کی مجلس میں مطرب نے اس قسم کی غزل گائی ؎

گلے یا سوسنے یا سرو یا ماہی نمیدانم
ازیں آشفتۂ بیدل چہ مے خواہی نمیدانم

اور اسی طرح نمیدانم نمیدانم کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ اُس ترک کو غصہ آیا اُس نے ایک گھونسہ دیا اور کہا کہ کم بخت کب تک نمیدانم نمیدانم بکے گا۔ جو جانتا ہے وہ کہہ۔

تو مولانا اس مقام پر فرماتے ہیں کہ مقصود اثبات ہے نفی نہیں۔ تو اس نفی خطرات سے چونکہ مفسدہ پیدا ہوا کہ اثبات اُس مُردار کا ہوا نہ کہ خدا کا۔ اس لئے یہ نفی مقصود نہیں۔ خدا کا اثبات مطلوب ہے جو کہ یہاں مقصود ہے۔ تو جو حکایت اوپر بیان کی گئی کہ وہ عاشق ہو گئے اور نماز میں جانے لگے تو یہ کچھ بھی نہیں معصیت اگر ذریعہ بن جاوے عبادت کا، تب بھی وہ معصیت ہی رہے گی۔ چنانچہ اگر کوئی مسجد کے قرب میں ناچ کرانے لگے کہ اس بہانہ سے لوگ جمع ہو جاویں گے پھر اُن کو مسجد میں لے چلیں گے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ جس کو صبح کو بھی اٹھنا مشکل تھا اب وہ عشق کی بدولت رات کو جاگتا ہے۔ تو ؎

عشق مولٰے کے کم از لیلیٰ بود　　　گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

اور سنو ؎

ز عشق ہم چوں خودی ز آب گل　　　ربا ید ہمہ صبر و آرام دل

اور یہ حالت ہوتی ہے ؎

چو در چشم شاہد نیا ید زرت　　　زر و خاک یکساں نماید برت

جب محبوب کی نظر میں تیرا سونا نہ آئے تو تیرے نزدیک سونا اور خاک برابر ہے۔

تو اس حالت پر نظر کرتے ہوئے ؎

عجب داری از سالکان طریق　　　کہ باشند در بحر معنی غریق

غرض محبت کا یہ خاصہ ہے اور اہل اللہ کے پاس بیٹھ کر خدا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ پس یہ تدبیر ہے ہمت کی اور ظاہر ہے کہ اس میں کچھ دشواری نہیں۔

تو اب سارے مرحلے طے ہو گئے اور یہ صحبت اگر کسی سے متصل نہ ہو سکے تو مختلف زمانوں میں سہی یعنی جب کسی کو جتنا موقع اُس کا ملے دریغ نہ کرے۔ حق تعالےٰ مدد فرماویں گے۔

مصاحبت کی صورت

مصاحبت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو زندوں کے پاس بیٹھنا اور ایک قبروں پر۔ یہ بھی بزرگوں کا طرز ہے۔ اور ہر چند کہ اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی مگر اب لوگوں نے اس میں غلطی کی ہے کہ انہوں نے قبروں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ دولت باطنی کا بھی اور ظاہری کا بھی مدار قبروں ہی پر سمجھ لیا ہے اور سب زندوں کو چھوڑ دیا۔ اس لئے اس تقسیم کی تصریح کی تاکہ زندوں سے استغنا نہ ہو جاوے بلکہ اصل تو یہی ہے۔ بلکہ اہل قبور سے مستفید ہونے کی شرط خود زندوں سے مستفید ہونا ہے۔ اور اُن کے مقابل بعضے وہ لوگ ہیں جو اولیاء ہی کے منکر ہیں اور بعضے فیوض قبور ہی کے منکر ہیں میں نے ایک رسالہ دیکھا ہے اہل ظاہر کا کہ اُس نے استفادہ عن اہل القبور کی نفی پر اس سے استدلال کیا ہے لَا تَجْلِسُوْا عَلَی الْقُبُوْرِ (قبروں پر مت بیٹھو) تو جلوس سے مراد جلوس للاستفادہ لیا ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی دلیل نہیں[1]۔

میں نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ اس میں میں نے حدیث سے ثابت کر دیا ہے کہ اہل قبور سے فیض ہوتا ہے۔ اور ہمارے بعض بیانوں سے شبہ ہو جاتا ہے

---

[1] بلکہ اس کے معنی تغوط قبر پر ہے یا اس پر بیٹھنا جس سے اُس کی اہانت ہے۔

کہ یہ بزرگوں کے قائل نہیں۔ کیا کہا جاوے یہ محض تہمت ہے۔ آپ چاہتے ہیں
کہ خدا اور رسول کو چھوڑ کر بزرگوں کے بندے ہو جاویں۔ سو یہ تو ہوگا نہیں۔ صاحبو! میں
تو آپ کو خود بزرگ بنانا چاہتا ہوں۔ تو دیکھ لو بزرگ کاہے سے ہوئے ہیں۔
صرف طاعت سے۔ میں اُس کی تعلیم کر رہا ہوں۔

ایک بزرگ نے کہا ہے کہ ملفوظات کے یاد کرنے سے چنداں نفع نہیں
تم خود ایسے ہی کیوں نہ ہو جاؤ کہ تم سے ویسے ہی ملفوظات صادر ہونے لگیں۔ تو
اُس رسالہ سے ہم لوگوں پر سے یہ شبہ بھی بزرگوں کے انکار کا رفع و زائل ہو جاویگا
اور بحمداللہ وہ کتاب ایسی مقبول ہوئی کہ ایک غیر مقلد نے مطبع میں وہ کتاب دیکھ کر
ناظم مطبع سے کہا کہ مصنف کو لکھ دو کہ اس میں اختصار نہ کرے۔ اور ایک شخص میرے
پاس آئے جو کہ بیعت کے منکر تھے۔ وہ اس کو دیکھ کر خود بیعت ہو گئے۔ اس میں
ساڑھے تین سو حدیثیں ہیں اور ہر حدیث سے کم سے کم ایک مسئلہ تو ضرور ہی ثابت
اور بعض سے کئی کئی۔ اُس کتاب کا نام ہے "تکشّف"۔ اُس کا منگانا ضروری ہے
اور ایک رسالہ میرا القاسم میں نکلتا ہے "اصلاح انقلاب"۔ اُس سے ظاہری
اعمال کی اصلاح ہوگی۔ وہ بھی ضروری ہے۔ غرض اس کتاب تکشف میں یہ ثابت
کیا ہے کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ اگر کوئی
پوچھے کہ حلوا کھانا جائز ہے یا نہیں۔ تو ایک تو قانونی جواب ہے کہ جائز ہے
اور ایک شفیق کا جواب ہے کہ مریض کو جائز نہ کہے۔ اسی کو شیخ کہتے ہیں ؎

سماع اے برادر بگویم کہ چیست ۔۔۔ مگر مستمع را بدانم کہ کیست
اگر مرد لہوست و بازی و لاغ ۔۔۔ قوی تر شود دیوش اندر دماغ

اگر از برج معنی بود طیر او — فرشتہ فرو ماند از سیر او

چنانچہ ضلع بارہ بنکی کی حکایت ہے کہ ایک شخص کہتے تھے کہ ایک شخص نے عورت سے سماع سنا اور مجلس ہی میں سے اس کو ایک کوٹھری میں لے جا کر منہ کالا کیا اور باہر آکر اپنی اس حرکت کی توجیہ کی کہ جب آگیا جوش نہ رہا ہوش۔ یہ دونوں لفظ چھوٹے سین سے فرمائے۔ اور شیخ اس تفصیل کے بعد صاحبِ حال پر اعتراض کرنے والوں کو دفع کرتے ہیں ؎

مکن عیب درویش حیران و مست — کہ غرق ست از آں میزند پا و دست

یعنی اس پر اعتراض نہ کرو۔ ایسی ہی تفصیل حضرت جامی فرماتے ہیں ؎

زندہ دلاں مردہ تناں را رواست
مردہ دلاں زندہ تناں را خطاست

جن کے دل بوجہ تعلق مع اللہ کے زندہ ہیں اور بدن مردہ ہوں اُن کے لئے سماع جائز ہے اور جن کے دل مردہ ہوں اور تن زندہ ہوں اُن کا سننا غلطی ہے۔

غرض محققین کی عادت ہے کہ وہ ایک ہی فتویٰ سب کو نہیں دیتے۔ اس لئے طبیب سے جب حلوا کھانے کی نسبت پوچھا جاوے تو اس کو پوچھنا چاہئے کہ حلوا کون کھاوے گا۔ اگر معلوم ہو کہ مریض کھاوے گا ناجائز کہہ دے۔ اگر معلوم ہو کہ تندرست کھاوے گا جائز کہہ دے۔ اب یہ ممانعت مریض کی سُن کر اگر کوئی کہے کہ یہ تو حلوا کے منکر ہیں تو کیسی بے وقوفی ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک نو عمر مولوی نے پوچھا کہ قوالی

سے فیض حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ کون فیض لینا چاہتا ہے اُنہوں نے کہا کہ میں۔ مولانا نے فرمایا کہ نہیں ہوتا۔ تو یہ ہے محققین کی شان۔ غرض فیض تو شرائط خاصہ سے ہوتا ہے لیکن اُن کو کارفرما سمجھنا یہ تو صریح شرک ہے۔

رام پور کی ایک حکایت سُنی ہے مولوی عبدالحق خیرآبادی کی کہ ایک پٹھان ملنے آئے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ خانصاحب کیسے فرصت ہو گئی۔ آج کل تو آپ کو دیہات میں بہت انتظام کرنا ہوگا۔ تو خانصاحب بولے کہ انتظام تو بڑے پیر صاحب کے سپرد کر آیا ہوں۔ مولوی صاحب نے فرمایا، آہاہم تو اُن کو ولی سمجھتے تھے مگر معلوم ہوا کہ بدمعاش ہیں۔ خانصاحب کو بہت ناگوار ہوا کہ اُنہوں نے بے ادبی کی مگر واقع میں بے ادبی خود اُنہوں نے کی۔ تو بعضے آدمی سب کام اولیاء اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔

میں نے مکہ میں دیکھا کہ ایک شاہ صاحب نے آکر حضرت کے بھتیجے حافظ احمد حسین صاحب کو کچھ روپیہ امانت کا سپرد کیا۔ حافظ صاحب نے کہا اللہ کی سپردگی میں رکھ جاؤ۔ تو آپ کیا کہتے ہیں کہ اللہ کے سپرد تو کرنا چاہئے ہی نہیں اور اس پر ایک مہمل حکایت ہانک دی کہ کسی شخص کی ایک دکان تھی۔ وہ جب جاتا دکان حضرت غوث اعظم کے سپرد کر کے جاتا۔ اس کا ایک بھائی تھا۔ وہ ہمیشہ دل میں اس پر نکیر کرتا ایک بار یہ بھائی دکان پر تھا۔ یہ جب جانے لگا تو خدا تعالیٰ کے سپرد کر گیا۔ اُسی دن چوری ہو گئی۔ دوسرے بھائی کو خبر ہوئی۔ کہنے لگا تو نے نادانی کی کہ اللہ میاں کے سپرد کیا اللہ میاں کا تو کام ہی ہے کہ اُس سے لیا اُس کو دے دیا۔ اور حضرت غوث اعظم تو محکوم ہیں۔ یہ خلاف امانت کر نہیں سکتے۔ یہ حکایت اُن شاہ صاحب نے حافظ

احمد حسین صاحب کے سامنے بیان کی۔ وہ بہت جھلائے کہ کوئی بڑا مردود ہوگا۔

اب مشکل ہم لوگوں کی ہے کہ ہم نہ وہابی نہ بدعتی۔ ہمارا مشرب یہ ہے کہ اعمال ظاہرہ میں فقہا کی تقلید کرتے ہیں اور اعمال باطنہ میں صوفیہ کی۔ اور اعمال ظاہرہ میں صوفیہ کی تقلید نہیں کرتے۔ مثلاً سماع وغیرہ کہ اُن کو باطن میں کچھ دخل نہیں خواہ یہ جائز ہو یا ناجائز۔ وناجائز دونوں سے مرکب۔ تو اس میں تو ہم فقہاء کے مقلد ہیں اور جو اعمال باطنہ ہیں اس میں ہم صوفیہ کے مقلد ہیں۔ تو ہمارے بزرگوں کا مشرب حنفی صوفی ہے۔ تو ایسے شخص کی کم بختی دونوں طرف سے آتی ہے۔ اب عرس میں شریک نہ ہوئے تو وہابی اور ذکر جہر کیا تو بدعتی ہونے کا اعتراض۔

اسی طرح فیض قبور میں نہ تو ہم ایسے قائل کہ سب کام وہی کرتے ہیں اور نہ اس کے قائل کہ اس سے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ ضرور ہوتا ہے مگر فیض دو ہیں۔ ایک تعلیم کا اور ایک تقویت نسبت کا۔ تو تعلیم کا فیض تو قبور سے نہیں ہوتا۔ یہ تو زندہ بزرگوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہا ہے کہ ؏

گربۂ زندہ بہ از شیر مردہ

اور ایک درجہ ہے تقویت نسبت کا کہ کسی زندہ کی بدولت نسبت حاصل ہو گئی اب اس کو بڑھانا چاہتا ہے تو یہ قبور سے ہو جاتا ہے۔ تو جو صاحب نسبت نہ ہو اُس کو تو چاہئے کہ زندہ پیروں سے لے۔ قبور سے لینے کی کوشش کرنا اُس کو بیکار۔

ایک موضع ہے ضلع انبالہ میں براس۔ وہاں مولانا رفیع الدین صاحب تشریف لے گئے۔ وہاں کے متعلق بعض بزرگوں کو مکشوف ہوا ہے کہ بعض انبیاء کی قبور ہیں

تو مولانا رفیع الدین صاحب گردن جھکا کر بیٹھے تھے۔ بعضے طالب علم بھی اسی طرح بیٹھے۔ میں نے کہا کہ اُدھر سے تو اندھے ہو ہی۔ ادھر کی آنکھیں بھی کیوں بند کیں۔

تو زندہ بزرگوں کی خدمت میں رہ کر جب وہاں سے قابلیت دیکھ کر اجازت ہو تو اس وقت اس غرض سے قبور پر جائیں اور غیر صاحب نسبت تو فاتحہ پڑھ آوے کیونکہ یہ بھی ثواب ہے کہ کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھ کر چلا آوے اور جو صاحب نسبت ہے اس کا دوسرا حال ہے۔ تو جس مرتبہ کا کوئی شخص ہو جو اُس کے مناسب ہو اُس کا التزام رکھے۔ یہ کلام تھا صحبت اموات میں۔ باقی اصل طریق صحبت ہے احیاد کی۔ اُسی سے علم صحیح حاصل ہوتا ہے۔ اُسی سے ہمت میں قوت ہوتی ہے، جو شرط اعظم ہے سہولت اعمال کی۔ جس کا راز وہی ہے جو عرض کیا گیا کہ اس صحبت سے محبت بڑھتی ہے اور محبت سے سہولت ہوتی ہے۔

الحمد للہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ پر ہر پہلو سے کلام کافی ہو گیا اب ختم کرتا ہوں۔ دُعا کیجئے کہ علم و عمل و توفیق ہو۔ (پھر دُعا کے بعد جلسہ ختم کیا گیا)

حق الاطاعت

حق الاطاعت کے متعلق یہ وعظ ۲۱ رشوال ۱۳۲۹ھ بروز یکشنبہ
کاندھلہ میں ہوا۔ جو ۲½ گھنٹوں میں ختم ہوا اور مولانا سعید احمدؒ
نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ ونحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم قال اللّٰہ تبارک وتعالیٰ۔ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ط (یعنی تم اللہ اور رسول کی اطاعت کیا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔)

شریعت و طریقت

یہ ایک آیت ہے جس کے الفاظ نہایت ہی مختصر ہیں مگر اس میں ایک ایسا جامع مضمون مذکور ہے جس سے کوئی جزو نہ شریعت کا خارج ہے نہ طریقت کا۔ اور یہاں کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ آیت شریعت اور طریقت دونوں کو کیسے جامع ہو سکتی ہے۔ کیونکہ شریعت اور طریقت تو سُنا ہے کہ دو متقابل اور متغائر راستے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے عام مسلمان بھائیوں میں جہاں اور بہت سی بے بنیاد باتیں شائع ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ شریعت اور طریقت کو جدا سمجھتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ ظاہری احکام کے بجا لانے کا نام تو شریعت ہے اور باطنی احکام کے بجا لانے کا نام طریقت ہے اور باطنی احکام ظاہر کے مبائن ہیں۔ اکثر طبائع میں یہ فاسد اعتقاد جما ہوا ہے کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور۔ بہت سی باتیں جو شریعت میں ناجائز ہیں وہ طریقت میں جائز ہیں۔ اور ایسا سمجھنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو دائرہ اباحت کو وسیع کرتے ہیں۔ اور محرمات کو بہت کم سمجھتے ہیں

اور یہ لوگ تو گویا شریعت کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھتے۔ سو اُن کا تو کچھ ذکر ہی نہیں، ذکر ان لوگوں کا ہے جو شریعت کو بھی کوئی چیز سمجھتے ہیں مگر دونوں کو قسیم اور مقابل سمجھ رکھا ہے۔ اور گو شریعت و طریقت میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ کلیۃ و جزئیۃ کا فرق ہے۔ یعنی شریعت کل ہے اور طریقت اس کا جزو ہے۔ مگر لوگوں نے اس کے سمجھنے میں یہ غلطی کی کہ شریعت صرف احکام ظاہری اور طریقت صرف احکام باطنی کا نام سمجھ لیا۔ قرآن شریف میں اس مضمون کلیت شریعت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

(پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔ سو آپ اسی طریقہ پر چلے جائیے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلیے)

اس مقام پر شریعت کو اہواء (خواہشات) کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ اہواء کا مقابل مطلق دین ہے خواہ احکام ظاہری ہوں یا احکام باطنی۔ باقی اس کے یہ معنی نہیں کہ بعض چیزیں احکام ظاہری کی رو سے حرام ہیں اور احکام باطنی کی رو سے حلال ہیں ——— اور باطن سے وہ مراد نہیں جس کو عوام باطن کہتے ہیں۔ میری مراد باطن سے وہ ہے جس کی خبر نہ مدعیان باطن کو ہے نہ مدعیان ظاہر کو۔

مدعیان ظاہر نے تو دین صرف اس کو سمجھ رکھا ہے کہ نماز پنج وقتہ ادا کر لی جائے مال نصاب کو پہنچ جائے تو زکوٰۃ دے دی جائے اور زیادہ مال ہو تو حج کر لیا جائے

باطن کی اُن کو کچھ خبر نہیں۔ چاہے دل میں کیسے ہی امراض بھرے رہے ہوں۔ دل میں تکبر ہے
بغض ہے حسد ہے، ریا ہے مگر اپنے کو دینداد شمار کرتے ہیں۔ نہ اُن کو اپنی خبر نہ دوسرے
کی۔ اپنے اندر ہزاروں عیب ہوں تب بھی پروا نہیں اور دوسرے لوگوں پر ظاہری احکام
میں ذرا کمی ہونے سے ملامت اور ہنسی کرتے ہیں ؎

از بروں چوں گورِ کافر پُر حلل ۔۔۔ وندروں قہرِ خدائے عزّ وجل

یعنی ظاہری حالت ان کی ایسی ہے جیسے کافر کی قبر مزین ہوتی ہے
اور اس کے اندر خدائے تعالیٰ کا قہر و غضب نازل ہوتا ہے۔
ظاہری حالت تو یہ کہ بایزید بھی دیکھ کر شرما جائیں اور باطن کی یہ حالت کہ کچھ
پوچھئے نہیں۔ انہیں لوگوں کو حدیث میں فرماتے ہیں۔

اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰی مِنَ السُّکَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ اَمَرُّ مِنَ الْمُنِّ

باتیں شکر سے بھی زیادہ شیریں اور دل میں تکبر اور حسد اور تحقیر وغیرہ بھرے ہوئے ہیں یہ
اُن کی کیفیت ہے جو اہل ظاہر ہیں اور ان میں ایسے لوگ کثرت سے ہیں جن کو باطن
کی کچھ خبر نہیں ؎

ریا حلال شمارند و جامِ بادہ حرام
زہے شریعت و ملّت زہے طریقت و کیش

ریا کو حلال شمار کرتے ہیں اور شراب کے پیالہ کو حرام۔ یہ اچھی شریعت
و ملت ہے اور اچھی طریقت اور مذہب ہے۔

ظاہر و باطن | ریا تفاخر کے لئے کام کرنا یہ باطن کا گناہ ہے اور شراب پینا
ظاہر کا گناہ۔ اس کو تو حرام سمجھتے ہیں اور باطن کے گناہ کو حلال،!

صاحبو! اسلام اور دین کے یہ معنی ہیں کہ دونوں پہلو برابر ہوں۔ جیسے حسین وہ ہے کہ اس کا خط اور خال اور آنکھ ناک غرض ہر عضو موزوں ہو۔ ہر ادا دل کش ہو۔ ایک شخص کی آنکھ رخسار، ہاتھ، پاؤں سب درست ہوں مگر ناک نہ ہو تو اس کا سب حسن خاک میں مل جائے گا۔ اسی طرح تدین کو سمجھو۔ دیندار وہ ہے جس میں ظاہری و باطنی اجزاء دین کے سب ہوں۔ جس نے ایک ادا بھی چھوڑ دیا وہ دیندار نہیں چاہے دوسری ادا کیسی عمدہ اور دل کش ہو۔ جیسے حسین وہ ہے جس کی ساری ادائیں اچھی ہوں۔ مالدار وہ نہیں سمجھا جاتا جو ایک پیسہ کا مالک ہو۔ زمیندار وہ نہیں سمجھا جاتا جس کے پاس ایک بیگھہ زمین ہو۔

مجھے ایک طالب علم کا لطیفہ یاد آگیا کہ وہ ایک گاؤں میں گئے۔ نماز کی سختی سے تاکید کی اور بے نمازیوں کو سخت الفاظ کہے۔ گاؤں کے لوگ بگڑ گئے اور واعظ کو ایذا دینے کے درپے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تو بے نمازیوں کو کہا ہے تم یہ بتلاؤ کہ کبھی عید بقرعید کی نماز بھی تم نے پڑھی ہے۔ کہنے لگے ہاں۔ انہوں نے کہا بس تم تو نمازی ہو۔

سو تم بھی سمجھتے ہو کہ یہ دفع الوقتی تھی۔ ایسا شخص نمازی نہیں سمجھا جاتا۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ سارے اہل ظاہر ایسے ہی ہیں مگر اکثر حالت یہی ہے۔ غرض جیسے مالدار وہ نہیں ہے جس کے پاس ایک پیسہ ہو اسی طرح دیندار وہ نہیں ہے جس کا صرف ظاہر اچھا ہو۔ تو غرض یہ ہے کہ باطن کو ہم نے چھوڑ رکھا ہے اور اس کو کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ اور جو کوئی سمجھاتا ہے کہ تیرا روزہ زکوٰۃ کام نہ آئے گا اس سے لڑتے جھگڑتے ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ ظاہر کی اصلاح ضروری نہیں بلکہ

شکایت یہ ہے کہ باطن کو بالکل ہی چھوڑ رکھا ہے ورنہ باطن کی اصلاح بھی بغیر اصلاح ظاہر کے ممکن نہیں کیونکہ مثلاً جب ظاہری فرض کو چھوڑا تو باطن بھی تو مقہور ہوا اور یہ دال (دلالت کرنے والا) ہو گا عدم انقیاد (تابع ہونا) باطن پر۔

یہ تو اہل ظاہر کا حال تھا کہ باطن کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ اب لیجئے مدعیان باطن کو۔ سو وہ بھی خبر سے باطن کی بے خبر ہیں۔ کیونکہ باطن یہ ہے کہ جو احکام متعلقہ قلب ہیں ان کو بجا لاوے۔ باطن یہ نہیں کہ کشف ہو، کرامت ہو، جو کہہ دیا وہ ہو گیا اس کو دین سے کوئی تعلق نہیں۔ دجال کو بڑا تصرف حاصل ہو گا جو کسی ولی کو بھی حاصل نہیں ہوا۔ جب کہہ دے گا بارش ہو جاوے گی۔ زمین کے خزانے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیں گے مگر پھر ملعون ہے اور کافر۔ بلکہ اکابر صوفیہ تو ایسے تصرفات کے قصد کرنے کو بھی برا سمجھتے ہیں۔ اُن کا تو یہ حال ہوتا ہے۔ ع

با وجودت زمن آواز نیاید کہ منم!

(تیرے وجود کے سامنے مجھ سے آواز نہیں آتی کہ میں ہوں) تصوف تو اس کا نام ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کر دے کہ جس حال میں چاہے رکھے۔ پھر تصوف کا دعویٰ کب جائز ہو گا البتہ جس چیز کی طلب کا خدا ہی کا حکم ہے وہاں یہی تسلیم ہے کہ اس کو بجا لایا جائے۔ اور یہ اس لئے کہا کہ شاید کوئی یہ کہے کہ پھر نماز بھی نہ پڑھو کہ یہ بھی تسلیم کے خلاف ہے۔

بیٹے کسی بڑے حاکم کے سامنے اُلٹ پلٹ کرنا جیسا تفویض (سپرد کرنے) کے خلاف ہے ایسا ہی اُس کے حکم کی تعمیل نہ کرنا بھی تفویض کے خلاف ہے۔ جس کام کو کہا اُسے کرو جس کو نہیں کہا اُسے نہ کرو۔ اگر کوئی شخص حکم کی موافقت نہیں کرتا

تو اُس کو کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو سپرد کر دیا۔ تو جو کہہ دیا اُس کو کرنا ہی تفویض ہے۔ غرض اکابران تصرفات کو ناپسند کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا حکم نہیں اور بدون حکم کے کچھ کرنا تفویض و تسلیم کے خلاف ہے۔

حاصل یہ کہ باطن یہ نہیں ہے کہ جو عوام کا مزعوم ہے بلکہ احکام باطنیہ وہ عبادات ہیں جو قلب کے متعلق ہیں کیونکہ جیسے عبادت بدنیہ نماز وغیرہ فرض و واجب ہیں ایسے ہی عبادات قلبیہ بھی بعض فرض و واجب ہیں مثلاً ایمان قلب کا فعل ہے کیوں کہ ایمان تصدیق کا نام ہے اور تصدیق دل سے ہوتی ہے۔ یا نماز میں نیّت فرض ہے۔ یہ بھی فعل قلب ہے اور یہ سب دل کی عبادتیں ہیں یا مثلاً شکر کرنے کا حکم ہے یہ بھی فعل قلب ہے کیونکہ شکر کے معنی قدر دانی کے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ دل سے ہوتی ہے نیز صبر کا حکم ہے۔ سو یہ بھی دل سے ہوتا ہے اس لئے کہ صبر کے معنی مکارہ (رنج و سختی) پر اپنے کو ضبط کرنے کے ہیں۔ اوّل قلب میں استقلال اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ضبط کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو دل کی عبادات کا بیان تھا۔

گناہوں کی جڑ اب دل کے گناہ سنئے حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔ یہ دل کا گناہ اتنا بڑا ہے کہ سارے گناہ اس کی فرع (شاخ) ہیں۔ کیا اب بھی کسی کو یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ باطن کوئی چیز نہیں اور نہ اُس کی اصلاح کی ضرورت۔

اس حدیث میں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ تمام گناہوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے مگر حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ کسب الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ (دنیا کمانا ہر گناہ کی جڑ ہے۔)

حُب اور چیز ہے کسب اور چیز ہے۔ حُب دنیا حرام ہے اور کسب کرنا بضرورت ادا حقوق حدود شرعیہ کے اندر رہ کر بعض کے لئے واجب ہے۔ اگر اس کو ترک کر دیا جائے تو اُن بعض کو ملامت ہوگی اور مستحق عذاب ہوں گے۔ بعض اس لئے کہا کہ یہ حکم کلی نہیں۔ بعض کو ملامت بھی نہیں ہوگی کیونکہ مثلاً سلطنت میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض کے ذمہ جمہوری تعلق ہوتا ہے اُن کو خود کسب کی اجازت نہیں ہوتی۔ اُن کی تنخواہ بذمہ سلطنت ہوتی ہے اور بعض کے ذمہ ایسا تعلق نہیں ہوتا اُن کے لئے عدم کسب و آوارہ گردی جرم ہے۔ کیوں کہ جب معاش نہیں تو کھانا پینا کہاں سے ہوگا۔ تو خواہ مخواہ چوری بھوا، نقب، لوٹ وغیرہ کرنا شروع کرے گا جس سے ملک میں فساد اور بدنظمی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ اس حکمت سے آوارہ گردی قانوناً ممنوع ہے۔ بس عام رعایا کے لئے تو عدم الکسب (نہ کمانا) جرم ہوا اور سرکاری آدمی کے لئے جس کے ذمہ جمہوری تعلق ہے کسب ممنوع ہے اُس کو خزانہ شاہی سے تنخواہ دی جاتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی گورنمنٹ کا ملازم تجارت کرے تو مجرم ہوگا اور اُس سے کہا جائے گا کہ یا تجارت چھوڑو یا سرکار کو چھوڑو۔ دونوں ایک ساتھ کرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی یہی راز ہے جس کی طرف مولانا نے اشارہ فرمایا ہے ۔

ہم خُدا خواہی وہم دنیائے دوں — ایں خیال ست و محال ست و جنوں

یعنی خدا کو بھی چاہو اور دنیائے حقیر کو بھی۔ یہ خیال محال اور جنون ہے

اسی طرح اللہ کے بندوں میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ سرکاری آدمی کے لئے جو کہ سرکاری خدمت کرتا ہو کسب کرنا جرم ہے اور وہ خدمت تفرغ للعبادۃ (عبادت

کے واسطے فارغ ہونا) ہے لازمی و متعدی جیسے اصلاح وارشاد خلق ۔ جیساکہ ارشاد
ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۔ (میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے
پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں) جو لوگ اس کی تکمیل میں مشغول ہیں جس کے لئے
انبیاء مبعوث ہوئے اُن کے لئے کسب کرنا جرم ہے ۔ اسی لئے کوئی نبی تاجر نہیں
اور جیسے اُن کو کسب کی اجازت نہیں لوگوں سے مانگنے کی بھی اجازت نہیں ۔

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۔۔۔۔ الآیۃ

میں تم سے اس تبلیغ پر کچھ مال نہیں مانگتا میرا معاوضہ تو صرف اللہ تعالیٰ
ہی کے ذمہ میں ہے ۔

اور فرماتے ہیں ۔

وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْعَابِدِينَ وَلَمْ أُمَرْ أَنْ أَكُونَ مِنَ التَّاجِرِينَ
اَوْ كَمَا قَالَ

یعنی مجھ کو اس بات کا حکم ہوا ہے کہ میں عبادت کرنے والوں سے
ہوں نہ تجارت کرنے والوں میں سے ۔

تو جو کام کرے اُن کے لئے بھی یہ جرم ہے کہ تاجر وغیرہ بنے ۔ اُن کی تنخواہ
سرکار سے ہے ۔ اُن کو خزانہ شاہی سے وظیفہ ملتا ہے ۔ اور جیسے سلطنت کا خزانچی
نہیں کہہ سکتا کہ میں دینے والا ہوں اسی طرح خادمان دین کی خدمت کرکے کوئی یہ دعویٰ
نہیں کر سکتا کہ میں دینے والا ہوں ۔ اس لئے کہ دل کی کل خدا کے ہاتھ میں ہے
جس طرف اس کو پھیرتا ہے اسی طرف سارے اعضا پھر جاتے ہیں ۔ اگر وہ دل میں
بات نہ ڈالتا کہ فلاں شخص دین کی خدمت کر رہا ہے اس کی خدمت کرنا ہمارے

لث اجر ہے تو قیامت تک ممکن نہ تھا کہ تم کچھ بھی کسی کو دے سکتے۔ اگر
و کر اگر ہم ہاتھ روک لیں تو معلوم ہو جاوے کہ پھر انہیں کیسے ملتا ہے تو
ہوں کہ روک لو۔ یہ بھی ہو چکا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا
وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ۔
يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَ
لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

یعنی یہ منافقین وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہیں ان پر کچھ خرچ مت کرو۔ یہاں تک کہ یہ آپ ہی منتشر ہو جائیں گے۔ ان کا یہ کہنا محض جہالت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں تمام خزانے آسمانوں کے اور زمین کے لیکن منافقین نہیں سمجھتے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم اب مدینہ میں لوٹ کر جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو نکال دے گا۔ ان کا یہ کہنا بھی جہالت محض ہے بلکہ اللہ ہی کی عزت ہے اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی لیکن منافقین نہیں جانتے۔

یہ منافقین جن کا اس آیت میں ذکر ہے ان کو دو چیز کا زعم تھا۔ ایک مال کا
ر جاہ کا۔ اور انہی دو باتوں کی وجہ سے یہ غریب مسلمانوں کو ذلیل و حقیر سمجھتے
ی مرض آج کل پھیلا ہوا ہے اور اسی کی کمی کی وجہ سے اس زمانہ کے بعض مسلمان
حقیر کرتے ہیں۔ سو اس میں غور کرو یہ قرآن ہے ناول نہیں ہے۔ فرماتے ہیں

کہ یہ منافقین یوں کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں اُن کو روٹی مت دو یہاں تک کہ خود ہی بھاگ جائیں گے۔ خدا تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں کہ پاگل ہوئے ہو آسمان اور زمین کے سب خزانے خدا ہی کی ملک ہیں مگر تم کو خبر نہیں۔ یہ تو مال پر غرہ تھا جس کا جواب بھی آپ نے سُن لیا۔

جاہ پر غرہ یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ مدینہ پہنچ کر ہم میں سے عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک سفر میں لوٹتے ہوئے ایک انصاری اور ایک مہاجر میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ انصاری نے انصار کو آواز دی، مہاجر نے مہاجرین کو پکارا اور قریب تھا کہ فساد ہو جاتا کہ اتنے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پہنچ گئے اور آپ نے دونوں فریق کو سمجھا دیا۔ اس پر منافقین نے کہا کہ یہ مہاجرین اپنے گھر بار چھوڑ کر ہماری روٹیوں سے پلے ہیں اور پھر ہمیں سے لڑتے ہیں۔ مدینہ پہنچ کر عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا یعنی ہم ان مسلمان مہاجرین کو نکال دیں گے۔ حق تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

یعنی عزت اللہ کے لئے اور اُس کے رسول کے لئے اور مسلمانوں کے لئے ہے لیکن منافقین نہیں جانتے۔

اور کیسی خوبصورتی سے فرمایا کہ اُن کے مقدمات کو تسلیم فرمالیا کہ ہاں سچ کہتے ہو عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا مگر عزت خدا کے لئے ہے اور رسول اللہ کے اور مسلمانوں کے لئے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہم تم کو نکال دیں گے اس آیت میں اُن کی حکایت مع شکایت وجواب کے اس طرح بیان کی گئی ہے

کہ خصم (مقابل) کو بالکل ساکت کر دیا البتہ شاید یہ شبہ ہو کہ یہ جواب کیا ہوا کیونکہ یہ تو محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے کہ عزت اللہ اور رسول کے لئے ہے کوئی دلیل تو بیان نہیں کی گئی حالانکہ دلیل کی ضرورت ہے کیونکہ مخاطب اُس کا منکر ہے۔ تو سمجھئے کہ جواب دو طرح ہوتا ہے۔ حکیمانہ اور حاکمانہ اور دونوں کے جدا جدا مواقع ہیں حکیمانہ جواب جب دیا جاتا ہے جب مخاطب میں فہم کی قابلیت ہو اور وہ سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہو اور سمجھنے کے بعد حق ماننے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اور اگر مخاطب میں یہ باتیں نہ ہوں جواب حاکمانہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حکام ظاہری بھی کبھی جواب حکیمانہ دیتے ہیں کبھی حاکمانہ۔ آپ نے علوم درسیہ پڑھے ہیں۔ طبیعت فلسفیانہ جواب کی خوگر ہو گئی ہے اس لئے یہ جواب سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ خدا میں جہاں حکیمانہ شان ہے ویسے ہی حاکمانہ شان بھی ہے۔ تو خدا تعالیٰ نے یہاں حاکمانہ جواب دیا ہے کیونکہ پورا اطمینان ہے کہ جب چاہوں گا اُن منافقین کو نکال باہر کر دوں گا مگر ہم لوگوں کے مذاق چونکہ بگڑ گئے ہیں اس لئے قرآن کے جوابات میں شکوک و اوہام پیدا ہوتے ہیں کہیں آیات میں ربط معلوم نہیں ہوتا مگر سچ کہا کسی نے ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را | کہ شناسی زبان مرغاں را

تم نے کبھی سلیمان علیہ السلام کو آنکھ سے تو دیکھا نہیں پھر تم پرندوں کی بولی کب سمجھ سکتے ہو۔ یعنی تم کو کبھی قرآن کھول کر پڑھنے کی توفیق تو ہوئی نہیں پھر اس کے مطالب اور معنی کو کیوں کر سمجھ سکتے ہو۔

قرآن کا اثر ہمیں کبھی قرآن کو کھول کر پڑھنے کی بھی توفیق کم ہوتی ہے پھر مطالب و مضامین سے کیوں کر مناسبت ہو۔ اسی لئے قرآن سب سے

پہلے پڑھانا چاہیئے تاکہ خوب رچ جاوے اور طبیعت کو مناسبت الفاظ سے تو پیدا ہو جاوے۔ اس کے بعد جب معانی سمجھنے کا وقت آئے گا تو اس کی یہ حقیقت معلوم ہوگی جو اس آیت میں مذکور ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ۔

یعنی اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔

اس وقت دل شکوک واوہام سے ملوث نہ ہوگا۔

میں ایک حکایت بیان کرتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اگر دل سادہ ہو اور ذہن خالی ہو تو پھر قرآن کا اثر کیا ہوتا ہے۔ ہم پر اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ دل سادہ نہیں رہا۔ حضرت اصمعی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ سفر کو جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کو ایک بدوی نے روکا اور مال چھین لینے کا قصد کیا انہوں نے کہا کہ تجھ کو خدا کا خوف نہیں آتا کہ ناحق لوگوں کا مال چھینتا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا نے ہمارا رزق اسی طرح مقرر فرمایا ہے اور ہمارا اسی طرح گزران ہے اصمعیؒ نے کہا کہ تو جھوٹ کہتا ہے تیرا رزق آسمان میں ہے وہاں سے حسب تقدیر پہنچتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں۔ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (یعنی تمہارا رزق اور جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سب آسمان میں ہے)۔ اس نے کبھی کلام مجید نہیں سنا تھا ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ پھر کہا کہ اے اصمعی میں اپنے رب پر ایمان لایا اور آج سے تدبیر کو ترک کیا۔

دیکھئے اُس بدوی کا دل سادہ تھا۔ اُس کو ایک بھی شبہ نہ ہوا۔ وہ پاگل نہیں تھا۔ اُس نے خالی الذہن ہو کر کلام باری کو سُنا اور خلو ذہن کے سبب اُس کو فوراً یقین پیدا ہو گیا اور اس سے متاثر ہو گیا۔ ہم نے شکوک و اوہام میں پھنس کر یقین کو دھو ڈالا۔ قلب مسخ ہو گیا۔ اس لئے کلام اللہ کا بھی حالانکہ وہ خدا کا کلام ہے اور نہایت سچا مؤثر کلام ہے ہمارے دلوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

دیکھو! تختی پر اوّل نقش جم جاتا ہے اور اگر مشق کرتے کرتے مسخ ہو گئی تو پھر میر پنجہ کش کا جیم بھی اُس پر نہ جمے گا۔ اُس بدوی کا دل خالی تھا قرآن کی آیت سنتے ہی اس کا یقین پختہ ہو گیا اور اصمعی کو اور اونٹ کو چھوڑ کر چل دیا۔ حقیقت میں عمل کے لئے تھوڑا علم بھی کافی ہے۔ اس کے بعد اصمعیؒ نے اُس کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے پوچھا کہ اس آیت سے آگے کچھ اور بھی ہے۔ اصمعیؒ نے پڑھا۔

فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ

یعنی قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ وہ برحق ہے جیسا تم باتیں کر رہے ہو۔

سُنتے ہی دل پر ایک صدمہ پہنچا اور کہا، وہ کون ظالم ہو گا جس نے حق تعالےٰ کی تکذیب کی تھی کہ جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے یہ قسم کھائی اور اس صدمہ سے دم نکل گیا۔

اس سے سبق لینا چاہئے۔ قرآن وہ چیز ہے کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک بچی نے کلام مجید کے ایک مضمون کو مجھ سے سُنا اور ہچکی بندھ گئی۔ ہم ظلمات میں

ہیں اور اُس کو علم سمجھتے ہیں۔

علم اور جہل حدیث میں ہے کہ بعض علم بھی جہل ہے

علمِ رسمی سر بسر قیل ست وقال — نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

علم رسمی محض قیل وقال ہے نہ اس سے کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے نہ حال۔

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت — زنگ گمراہی ز دل بزدایدت

یعنے واقع میں علم وہی ہے جو تم کو محبوب حقیقی کا راستہ بتا دے اور دل سے گمراہی کے زنگ کو دور کر دے۔

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند — خوف وخشیت در دلت افزوں کند

یعنی خواہشاتِ نفسانی کو تمہارے سر سے باہر کر کے تمہارے دل میں خدائے تعالیٰ کا ڈر اور خوف بڑھا دے۔

تو نہ دانی جز یجوز ولا یجوز — خود نہ دانی کہ تو حوری یا عجوز

تم سوائے یجوز (یہ جائز ہے) اور لا یجوز (یہ ناجائز ہے) کچھ نہیں جانتے اپنی خبر نہیں کہ تم خود یعنی مقبول ہو یا عجوز یعنی مردود ہو۔

کہتے ہیں کہ یجوز لا یجوز کا قانون یاد ہو تو پھر سب معاف ہے۔ کیوں صاحبو! اگر ایک بیرسٹر باغی ہو تو کیا ماخوذ نہ ہوگا بلکہ زیادہ ماخوذ ہوگا کہ تو نے قانون سے واقف ہو کر کیوں بغاوت کی۔ تو نے بالقصد بغاوت کی۔ اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ قانون دان لوگ بڑی احتیاط کرتے ہیں۔ اس کا یہی راز ہے کہ اُن کی خطا و قصور

بدنیتی پر محمول کی جائے گی اور ناواقفوں کے بارے میں ہم نے خود دیکھا ہے کہ حکام کہتے ہیں اس نے بدنیتی سے نہیں کیا ناواقفی سے خطا ہوگئی ہے۔ خود عذر سکھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پھر نہ کرنا۔ تو معلوم ہوا کہ محض علم کی کثرت کچھ مفید نہیں بلکہ اس سے اور زیادہ مواخذہ ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے۔

وَيْلٌ لِّلْجَاهِلِ مَرَّةً وَّ لِلْعَالِمِ سَبْعُ مَرَّاتٍ

یعنی جاہل کے لئے ایک ہی مواخذہ ہے اور عالم کے لئے سات گنا مواخذہ ہے۔

تو جب بلا عمل اس علم کی یہ حالت ہے تو دنیا کے علوم کا کیا کہنا وہ تو سراسر ظلمات ہیں۔ ایسی حالت میں قرآن کی حلاوت کیسے محسوس ہو سکتی ہے۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ مال تو زید کے پاس ہے خدا کے پاس کہاں۔ تو یہ جواب یعنی للہ خزائن (اللہ ہی کے لئے خزانے ہیں) درست کیسے ہوا۔

تو جواب وہی ہے کہ یہ جواب حاکمانہ اسی لئے تو ہے کہ بظاہر یہ چیزیں ہمارے پاس معلوم ہوتی ہیں۔ تو حاصل جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہ چیزیں ظاہر میں تمہارے پاس ہیں مگر در حقیقت سب خزانے ہمارے پاس ہیں۔ اور اگر ظاہر میں بھی یہ چیزیں ہمارے پاس نہ ہوتیں کہ ظاہری قبضہ بھی ہمارا ان پر نہ ہوتا تو یہ جواب حکیمانہ ہوتا حاکمانہ نہ ہوتا۔ اور اگر غور کیا جائے تو اس میں حکیمانہ جواب بھی ہے۔ میں نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ جتنے خزانے ہیں خدا کی ملک ہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ چیزیں اگرچہ ہمارے قبضہ میں ہیں مگر ہم ان کے حقیقی مالک نہیں بلکہ یہ سب ہمارے پاس مستعار ہیں۔ ان سب کا مالک حقیقی حق تعالیٰ ہے۔ اور مشہور ترجمہ میں یہ شبہ

ہوسکتا ہے کہ یہ چیزیں خدا کے پاس کہاں ہیں اور اس ترجمہ میں یہ شبہ نہیں۔ جیسے بادشاہ دنیاوی تمام خزانوں کا مالک ہوتا ہے اور وہ خزانچی کو حکم دیتا ہے کہ دیدو اسی طرح خدا کا حکم ہوتا ہے کہ خادمان دین کی خدمت کرو۔ مگر اتنا فرق ہے کہ حاکم دنیوی کے حکم کے بعد خزانچی اپنے اختیار سے باہر نہیں ہو جاتا اور یہ وہ حکم ہے کہ دینے والا مضطر ہو جاتا ہے۔ اللہ والے بھینکتے ہیں اور وہ منتیں کرتا ہے جس کا دل چاہے ہاتھ روک لے۔

هَا اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ الخ۔

(ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ تم کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے۔ سو بعض تم میں ایسے ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو کوئی بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے لئے بخل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو کسی کے محتاج نہیں اور تم سب محتاج ہو۔)

خدا غنی ہے اور محتاج تم ہو۔ خرچ کرنے کا جو حکم ہے تمہارے ہی نفع کے لئے ہے۔ کہ آخرت میں اس کی ضرورت ہوگی۔ تو خرچ کرنے کا حکم تمہاری احتیاج پر نظر کر کے دیا گیا ورنہ خدا کو تمہاری کچھ ضرورت نہیں۔

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ

اگر تم خرچ کرنے سے باز رہو تو خدا تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کر دے گا۔ پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے تم سے اچھے ہوں گے۔ ان کے ہاتھ سے

ہم کام سے رہیں گے۔ یہ معنی ہیں لِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ ہی کے لئے ہیں خزانے آسمانوں اور زمین کے) کے بہر حال اس قول کا جواب حکیمانہ وحاکمانہ قرآن میں موجود ہے۔

مقامِ علماء

اب بھی بہت لوگ مال اور جاہ کے نازمیں ہیں اور اہل علم کی توہین کرتے ہیں۔ وہ اس جواب کو اچھی طرح سُن لیں اور سمجھ لیں کہ یہ لوگ سرکاری ملازم ہیں۔ اگر کلکٹر کے لباس میں پیوند ہو تو اس کی ذلت نہیں کی جاسکتی اور نہ اُس سے اُس کی عزت کم ہوتی ہے۔ تو اگر ایک اہل اللہ کے پاس اچھا کپڑا نہ ہو تو اُس کی ذلت کرنا کب جائز ہو سکتی ہے۔ سرکاری آدمی جس حال میں بھی ہو اُس کی توہین جرم ہی ہے۔ حق تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتے ہیں۔

مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ

کہ جو کوئی میرے ولی سے عداوت رکھے تو میں اُس کو اعلانِ جنگ سناتا ہوں۔

صاحبو! اگر ایک چھوٹی سی سلطنت اعلانِ جنگ دے دے تو بڑی بڑی سلطنتوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور اولیاء اللہ کی عداوت پر احکم الحاکمین اعلانِ جنگ سناتے ہیں۔ مگر اللہ رے غفلت کہ پھر بھی غافل ہیں کہ اس کے منتظر ہیں کہ توپ خانہ لگا دیا جائے۔ صاحبو! حکام دنیا کے ادنیٰ ملازموں کی توہین تو جرم ہو اور احکم الحاکمین کے ملازموں کی توہین جرم نہ ہو۔ علماء سرکاری آدمی ہیں اُن کے لئے کسب کرنا ایک درجہ میں ناپسند ہے اور عوام کے لئے یہ حکم ہے کہ کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَةِ یعنے جیسے نماز روزہ فرض ہے ایسے ہی حلال رزق حاصل

کرنا بھی فرض ہے۔ اُن کو ترک اسباب میں بزرگوں کی نقل مناسب نہیں۔

ایک بزرگ ایک مقام پر تھے۔ ایک شخص اپنی اولاد کو نصیحت کرنے لگے کہ بھائی کچھ کھانے کمانے کی لیاقت حاصل کر لو۔ اُنہوں نے کہا کیا ضرور۔ دیکھئے حضرت مولانا گنگوہیؒ کچھ نہیں کماتے پھر کیسے آرام میں ہیں۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ افسوس مولانا کی اس بات کو تو دیکھا مگر اُن کے کمالات کو نہ دیکھا۔ یہ ہمت نہ ہوئی کہ ہم بھی دین کی خدمت کریں۔ توکل سہل معلوم ہوا کیونکہ اس میں کچھ کرنا تو پڑتا ہی نہیں۔ مگر نہ بھولو یہ بھی ہے توکل ہر ایک کا کام نہیں۔

نازرا روئے ببایدہمچو ورد   چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

نازو ادا کے لئے حسین چہرہ چاہئے۔ جب تم حُسن نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس مت جاؤ۔

عیب باشد چشم نابینا و باز   زشت باشد نقش نازیبا و ناز

یعنی جس طرح نابینا آنکھ کے لئے کھلا ہوا ہونا عیب ہے، اسی طرح نازیبا شکل کے لئے ناز بُرا ہے۔

چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش   ہمچو او با گریہ و آشوب باش

جب تم یوسفؑ نہیں ہو یعقوبؑ ہی رہو اور اُن کی طرح گریہ و آشوب میں رہو۔ یعنی جب تم کامل نہیں ہو تو کاملوں کی ریس مت کرو۔

جو جس کام کے لائق ہے اُس کے لئے اُس کے اسباب مہیا کر لیتے ہیں تو عوام کا کام کسب کرنا ہے اور علماء کی یہ حالت ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِی

الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔

صدقات اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مقید ہو گئے ہیں۔ ان کو زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ ناواقف ان کو بے سوالی سے تونگر خیال کرتا ہے۔ تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو کہ فقر و فاقہ کا چہرہ پر ضرور اثر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے۔

اس میں احصروا فرمایا ہے جس کا ترجمہ سہل یہ ہے کہ محبوس ہو گئے ہیں دین کے کام میں اور تجارت وغیرہ کے لئے سفر نہیں کر سکتے۔ مجھے خوب یاد آیا کہ آج کل بعض لوگ مولویوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ اپاہج ہیں کھانے کمانے کے قابل نہیں۔ مگر یہ اپاہج کا خطاب اُن کو خدائی دربار سے ملا ہے۔ فرماتے ہیں لا یستطیعون ضربا فی الارض یعنے اُن کو زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ پس اس کہنے پر بُرا نہ مانا کرو بلکہ یہ پڑھ دیا کرو ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم ۔۔۔ مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

ہم اگر مفلس و دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے۔ محبوب حقیقی اور اُس کی محبت کے متوالے ہیں۔

اے گروہ علماء و طلباء اگر کوئی تمہیں دیوانہ کہے تو بُرا نہ مانو۔ پس یہ اپاہج ہی ایسا وصف ہے کہ سب انبیاء اس سے متصف تھے ؎

انبیاء در کارِ دنیا جبری اند ۔۔۔ کافراں در کار عقبےٰ جبری اند

یعنی انبیاء علیہم السلام تو کارِ دنیا میں جبری اور تارک اسباب ہیں اور کفار کارِ عقبیٰ میں جبری اور تارک اسباب ہیں۔

انبیاء را کارِ عقبےٰ اختیار کافراں را کارِ دنیا اختیار

یعنی انبیاء علیہم السلام کو کارِ عقبےٰ اختیار ہوا ہے کہ اس کے اسباب میں سعی کرتے ہیں۔ کفار کو کارِ دنیا اختیار ہوا ہے کہ اس سے اسباب میں سعی کرتے ہیں۔

تبلیغ دین ایسی چیز جس میں تم سب انبیاء کے شریک ہو تمہارے لئے فخر کی بات ہے اور خوشی کی جگہ ہے کہ تم کو وہ لقب دیا گیا ہے جو خدا کے یہاں سے ملا ہے۔ سچ ہے۔ ع

اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ

(یعنی بزرگی وہی ہے جس کی دشمن بھی شہادت دے دیں۔) یہ خطاب شرف کی دلیل ہے۔ خوش ہونے کی بات ہے۔ تو آپ کی سمجھ میں آیا کہ اس آیت میں کون لوگ مراد ہیں۔ وہ لوگ مراد ہیں جو دین کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں نہ مزدوری کریں نہ تجارت کریں۔ لوگ اس مضمون کو نظر تحقیر سے دیکھتے ہیں کہ یہ بھی کوئی کام ہے مگر تھوڑے دنوں سے لوگ اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں کہ ایک جماعت محض دین کے کام کے لئے وقف ہو جو دنیا کا کوئی کام نہ کرے مگر اس کا افسوس ہے کہ اس ضرورت کے احساس میں بھی انہوں نے دوسری ہی قوموں کا اتباع کیا۔ مسلمانوں کا مذاق یہ ہو گیا ہے کہ قرآن وحدیث سے ان کو تشفی نہیں ہوتی بلکہ بعض اہل علم بھی ایسے دیکھے گئے جن کو قرآن وحدیث سے شفا نہیں ہوتی

اور جب غیر قومیں اسی کام کو اختیار کریں تو تسلی ہو جاتی ہے۔ ذرا اپنے قلوب کو ٹٹول کر دیکھ لو۔ خیر سمجھنے کا جو بھی ذریعہ ہو ہمارا کام چل گیا۔ آپ سُن رہے ہونگے کہ بعض غیر مسلم قوموں نے اپنے دین کی تعلیم کے لیئے ایک قوم کو وقف کر دیا ہے جن کو دنیا کے کام کرنے کی بالکل اجازت نہیں۔ ان کا کام صرف دین کی اشاعت ہے اور اُن کے مصارف کا سارا بار قوم پر ہے۔ اور اُن کے ایسا کرنے کا راز یہ ہے کہ وہ سمجھ گئے کہ ایک شخص دین و دنیا دونوں کے کام بخوبی نہیں کر سکتا۔ اس لیئے مجبوراً اُن کو ایک جماعت دین کی خدمت کے لیئے خاص کر دینی پڑی۔

اے مسلمانو! مذہب باطل والے اس راز کو سمجھ گئے افسوس ہے کہ مذاہب حق والے نہ سمجھ سکیں۔ ہمیں اوروں سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ اگر پوچھا جائے افسوس ہے کہ شفیق معلم سے تو سبق نہ سیکھا، مخالف معلم سے سیکھا۔ حضرات جتنی انجمنیں آج کل قائم ہو رہی ہیں۔ اس لحاظ سے تو موجب خوشی ہیں کہ کام کرنے کا دل میں خیال پیدا ہوا مگر جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ یہ سب دوسری قوموں کو دیکھ کر خیال پیدا ہوا ہے تو ایک گونہ رنج کی موجب ہیں۔ مسلمانوں کو ہر کام میں قرآن پر نظر کرنی چاہیئے تھی اور اُسی سے سبق لینا چاہیئے تھا اور یوں کہنا چاہیئے تھا کہ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ (یعنی ہم کو قرآن شریف ہی کافی ہے) مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ حدیث و فقہ کوئی چیز نہ ہو کیونکہ قرآن ایک متن ہے حدیث و فقہ سب اس کے لیئے شروح ہیں۔ اسی کو فقہا نے کہا ہے کہ اَلْقِیَاسُ مُظْہِرٌ لَا مُثْبِتٌ (یعنی قیاس حکم کا ظاہر کرنے والا ہے نہ ثابت کرنے والا نہیں ہے) تو حدیث و فقہ نے قرآن کے مطالب کو ظاہر کر دیا ہے کوئی حکم قرآن کے خلاف نہیں بیان کیا۔

اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک صندوق مقفل ہے اور کنجی سے اُسے کھول دیا اور بہت سے جواہرات نظر آنے لگے تو یہ جواہرات کنجی سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ وہ صندوق میں موجود تھے مگر پوشیدہ تھے۔ کنجی نے اُن کو ظاہر کر دیا تو حدیث وفقہ قرآن کے لئے کنجی ہیں۔ جتنے علوم ہیں سب قرآن ہی سے نکلے ہیں۔ اُس کی تو یہ شان ہے ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُکَ وَاحِدٌ وَکُلٌّ اِلٰی ذَاکَ الْجَمَالِ یُشِیْرُ

یعنی عنوانات مختلف ہیں اور حسن یعنی قرآن ایک ہی ہے ہر عنوان اس ایک ہی حسن کی طرف مشیر ہے۔

ایک محبوب ہے جس نے صبح کو دھانی جوڑا پہنا۔ شام کو دوسرا جوڑا پہنا، تو جو عاشق نہیں وہ تو نہیں پہچانے گا مگر عاشق کہے گا ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش!

من اندازِ قدت را می شناسم!

کہ جو لباس چاہے پہن لے۔ میں تو چال سے پہچان لیتا ہوں۔ تو قرآن کا جو عاشق ہے اُس کو حدیث وفقہ میں بھی قرآن ہی نظر آتا ہے۔

مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی حضرت مولانا گنگوہیؒ سے فرمایا کرتے تھے کہ حدیث تو آپ کے سامنے آکر حنفی ہو جاتی ہے۔ ان حضرات کو حدیث میں فقہ نظر آتی تھی اور ان اہل نظر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی

ہرچہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

یعنی میری جان فگار اور چشم بیدار میں تو ہی سمایا ہوا ہے۔ جو کچھ دُور سے ظاہر ہوتا ہے تجھی کو گمان کرتا ہوں۔

جیسا کہ اہل اللہ کو ہر شے میں خدا نظر آتا ہے مگر معاذ اللہ یہ معنی نہیں کہ یہ سب خدا ہیں۔ استغفر اللہ! بندہ بندہ ہے خدا خدا ہے۔ جیسا کہ قرآن قرآن ہے اور حدیث حدیث۔

مولانا جامیؒ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ حال میں فرما رہے تھے کہ۔ ع

ہر چہ پیدا می شود از دُور پندارم توئی

(یعنی جو کچھ دُور سے ظاہر ہوتا ہے تجھ ہی کو پہچانتا ہوں۔) کسی منکر نے مسخرہ پن سے کہا کہ مولانا اگر خر پیدا مے شود (اگر گدھا ظاہر ہو) تو آپ نے کیا مزے کا جواب دیا کہ پندارم توئی (تجھی کو گمان کرتا ہوں)

تو افسوس یہ ہے کہ اُن کی حالت کی خبر نہیں کہ وہ شب و روز کس طرح دین کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں کہ اُن کو ہر وقت اُسی کی دُھن ہے۔ ہر دم خدا کی محبت میں مستغرق ہیں۔ پھر وہ دنیا کے کام کس طرح کر سکتے ہیں۔ حضرت طلب ایسی چیز ہے کہ ماسوائے مطلوب سے بالکل جدائی ہو جاتی ہے۔ تو قرآن میں جو فرمایا ہے۔ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ —— الآیہ کہ وہ مقید اور اپاہج ہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ یعنی دنیا کے کاموں سے اپاہج ہیں ورنہ دینی کام میں اُن سے بڑھ کر چُست کون ہوگا اور اگر غور کیا جائے تو یہ اپاہج ہاتھ پیر چلانے والوں سے بدرجہا افضل ہیں۔ باقی عرف کا تو کوئی علاج نہیں اور اب تو عرف بھی بدل گیا۔ غرض جب ہندوؤں نے یہ عہد کر لیا کہ اُن کے مذہب (باطل) کی خدمت

کے لیے ایک جماعت وقف کر دی جائے جس کو دنیاوی امور سے کچھ سروکار نہ ہو تو کیا مذہب حق کی خدمت کے لیے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ پس ان لوگوں کے لیے جو خدام دین ہیں کسب ناپسندیدہ ہے اوروں کے لیے نہیں بلکہ اوروں سے ترک کسب پر بازپرس ہو گی۔

حُبِّ مال

اب جسے دیکھو توکل کرنا چاہتا ہے۔ لوگوں نے توکل کا نام سیکھ لیا ہے مگر کام بہت کم ہے۔ سعدیؒ خوب فرماتے ہیں ؎

نان از برائے کنج عبادت گرفتہ اند
صاحب دلاں نہ کنج عبادت برائے ناں

اہل خدمت نے روٹی گوشہ کے لیے لی ہے نہ کہ گوشہ روٹی کے لیے اب خدا کے ساتھ معاملہ ہے خود دیکھ لو گے کہ گوشہ نشینی سے اکثر کی نیت کیا ہے۔ حاصل یہ کہ کسب الدنیا تو فرض ہے گو بعض ہی کے اعتبار سے سہی مگر حب الدنیا (دنیا کو محبوب بنانا) گناہ ہے۔ اب اگر کوئی حُب الدنیا کو منع کرتا ہے تو اُس پر لوگ الزام رکھتے ہیں کہ اپاہج بنانا چاہتا ہے۔

صاحبو! استنجے کے ڈھیلے کتنی ضرورت کی چیز ہیں مگر کوئی اُن سے محبت کرنے لگے کہ ہر دم اُسی کی دُھن میں رہے تو اُس کو بے وقوف ضرور کہا جائے گا۔ آخرت کے مقابلے میں دنیا استنجے کے ڈھیلے سے بھی بدتر ہے۔ لہٰذا اس سے کام لینے سے اور اُس کام لینے کے لیے کمانے سے کہ وہ کسب ہے کوئی منع نہیں کرتا۔ البتہ اس کی محبت اور دھن یقیناً قابل ملامت ہے کہ یہ حُب ہے پس حُب دل میں ہوتی ہے اور کسب ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ دنیا دل

میں نہ ہو اور ہاتھ میں ہونے کا کچھ ڈر نہیں۔ اسی طرح مال کی حالت ہے کہ فی الید (ہاتھ میں) ہونا نافع اور فی القلب (دل میں ہونا) مضر ہے۔ حدیث میں ہے نِعمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ (یعنی نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے) اگر مال نہ ہو تو جئے کس طرح سے۔ اس لئے مال اچھی چیز ہے مگر جب تک قلب میں نہ جاوے اور ہاتھ ہی میں رہے۔ یہ ذکر تھا معاصی قلب کا۔ پس شریعت اس مجموعہ احکام ظاہری و باطنی کا نام ہے۔ اب معلوم ہو گیا ہو گا کہ شریعت و طریقت میں عطف الجزء علی الکل (کل پر جز کا عطف ہے یعنی شریعت کل ہے اور طریقت اس کا جزء ہے۔)

حُبِّ رسول ؐ بہر حال یہ وہ آیت ہے کہ اس میں شریعت و طریقت دونوں کو بھر دیا ہے۔ یہ تمہید تھی اب ترجمہ اور مقصد بیان ہوتا ہے کہ خدا کا کہنا مانو اور رسول ؐ کا کہنا مانو۔ یہی مضمون قرآن میں جابجا مختلف طور پر مذکور ہے کہیں صرف اطیعوا اللہ (خدا کا کہنا مانو) ہے کہیں فقط اطیعوا الرسول (رسول ؐ کا کہنا مانو) اور کہیں دونوں کو ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس سے ایک عجیب مسئلہ ظاہر ہو گیا کہ اطاعت تو فقط اللہ تعالیٰ کی ہے اور واسطہ اس میں حضور ؐ ہیں۔ تو جہاں اطیعوا اللہ کے بعد والرسول بھی فرما دیا ہے وہاں معنی یہ ہیں کہ رسول کا کہنا مانو ان کے ذریعہ سے اللہ کی اطاعت ہوگی اور کہیں اطیعوا الرسول ہی فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کو خدا سے تعلق ہو اُس کے ساتھ تعلق کرنا خدا کے ساتھ تعلق کرنا ہے۔ اس سے صاف طور پر اہل سلوک کا ایک شبہ کھل گیا۔ وہ یہ ذکر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ؐ (خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) میں لا الٰہ کہتے وقت جو ماسوائے اللہ کے

محبت کو قلب سے نکالا جاتا ہے تو کیا رسول کی محبت کو بھی نکالا جاوے۔

جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت خدا کی محبت کا غیر نہیں کیونکہ حضورؐ سے محبت اسی لئے ہے کہ وہ ذریعہ ہیں وصول الی اللہ (اللہ تعالیٰ تک پہنچنے) کا۔ تو یہ تو بعینہ خدا کی محبت ہے۔ تو یہ لاالہ کے تصور سے خارج نہ کی جاوے گی۔

مولانا نے ایک مقام پر اس کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص نے لعل سے پوچھا کہ تو کس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے؟ اپنے کو یا آفتاب کو۔ اُس نے کہا کہ جس کو زیادہ محبوب بتلاؤں اُس سے دوسرے کا محبوب ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ اگر اپنے نفس سے محبت ہے تو بوجہ لعل ہونے کے وصف کے ہے اور اس کا یہ وصف آفتاب سے آیا ہے۔ تو آفتاب سے محبت ہوئی اور اگر آفتاب سے محبت ہے تو اسی لئے کہ اُس نے یہ وصف میرے نفس کو عطا کیا ہے تو اپنے نفس کی محبت ہوئی۔

اس تمثیل سے یہ مسئلہ خوب حل ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی واسطے محبت ہے کہ آپ مظہر (ظاہر ہونے کی جگہ) صفات خداوندی ہیں۔ حق تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ آپ نورٌ من انوار اللہ (انوار الٰہی کا ایک نور ہیں) آپ موصل اللہ (اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے) ہیں۔ تو یہ بعینہ خدا ہی کی محبت ہے۔

کسی نے حضرت جنید کو دیکھا ہاتھ میں تسبیح لئے ہوئے۔ پوچھا کیا آپ بندی ہیں۔ آپ نے فرمایا اسی نے تو منتہی اور واصل الی اللہ بنایا تو کیا ایسا رفیق چھوڑ دیں۔ ایک بزرگ اسی معنی میں فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

یعنی مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے محبوب کے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے قدموں پر فدا ہوتا ہوں کہ اُن کا گزر محبوب کے کوچہ میں ہوا ہے۔

ہر دم ہزار بوسہ زنم دستِ خویش را
کو دامنت گرفتہ لبسویم کشیدہ است

یعنی اپنے ہاتھ کو ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ انہوں نے محبوب کا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے۔

اپنے ہاتھ پیر پر ناز کرتے ہیں اور جان فدا کرتے ہیں۔ حقیقت میں ان حضرات کا فہم بہت عالی ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھوں کو اپنا سمجھ کر نہیں چومتے بلکہ یہ سمجھ کر کہ اس سے طاعت وعبادت ہوئی ہے۔ آنکھ پر اپنی آنکھ سمجھ کر ناز نہیں کرتے بلکہ اس لئے کہ اُس نے انوار محبوب کا معائنہ کیا ہے اور یہی عالی فہمی تو ہے جس کی وجہ سے افلاطون نے صوفیار کو حکمار سے اکمل تبلایا ہے۔

حکمار و فلاسفہ

اس کی حکایت یہ ہے کہ کسی نے افلاطون کو خواب میں دیکھا تھا۔ اوّل بڑے بڑے حکمار کی نسبت پوچھا۔ وہ یہی کہتا تھا کہ لَاشَیْ لَاشَیْ (کچھ نہیں کچھ نہیں) اس کے بعد پوچھا کہ جنید و شبلی کی نسبت کیا کہتے ہو۔ اُس نے کہا کہ اُولٰئِکَ ھُمُ الْفَلَاسَفَۃُ حَقًّا (حقیقی فلاسفہ اور حکمار یہی ہیں) اور آج کل کا فلسفہ تو ان حکما کے فلسفہ سے بھی گرا ہوا ہے۔ کیونکہ فلاسفہ یونان

نے اگرچہ غلطیاں بھی کی ہیں مگر پھر بھی اُن کے کمال میں کوئی شک نہیں۔ صرف عقل کے ذریعہ سے بہت سے مسائل الٰہیہ صحیح معلوم کئے۔ امور معاد (آخرت) و عالم آخرت کے بھی قائل ہوئے۔ اور یہ سائنسدان تو بقول ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے صناع ہیں۔ فقط مشاہدات کا علم رکھتے ہیں۔ جو چیز آنکھ سے نظر آگئی اُس کی تحقیق کرلی۔ عقلیات سے انہیں کچھ مس نہیں۔ صناعت بھی فلسفہ کا ایک شعبہ ہے، مگر نہایت ادنیٰ درجہ کا۔ فلاسفہ یونان کے سامنے اُن کو فلسفی کہنا ایسا ہے جیسا غلط اور نا تمام قل ھو اللہ پڑھنے والے کو پورے حافظ قرآن کے سامنے حافظ کہنا ہاں جن لوگوں کو فلسفہ کی حقیقت ہی معلوم نہیں وہ انہیں کو کامل خیال کرتے ہیں۔

جیسا ایک گاؤں کا قصہ ہے کہ کسی کے سر میں درد تھا۔ دوسرا دم کرنے کھڑا ہوا تو قل ھو اللہ، کی پہلی آیت کو اس طرح بگاڑ کر پڑھا کل باللہ حدؔ اور پھونک ڈال دی۔ تو ایک گاؤں والا یہ کہتا ہے جا سوہرے تو تو ناہرج (حافظ) ہی ہو گیا۔ تو جیسے قل ہو اللہ تبت کا حافظ گاؤں والوں کے نزدیک حافظ ہے ایسے ہی آج کل کے لوگ ان کو فلسفی کہتے ہیں۔ ورنہ فلسفہ کہتے ہیں اصل میں

معرفت حَقَائِقُ الْاَشْیَاءِ عَلٰی مَا ھِیَ عَلَیْہِ فِیْ نَفْسِ الْاَمْرِ بِحَسْبِ الطَّاقَۃِ الْبَشَرِیَّۃِ۔

یعنی نفس الامر اور واقع میں جس رنگ ڈھنگ پر چیزیں ہیں، بشری طاقت کے موافق ان کے حقائق کا معلوم کرنا۔

گو۔ اور اس کے کئی شعبے ہیں، طبیعات، عنصریات، الٰہیات وغیرہا۔ علم طبیعات کو کائنات سے ایسی نسبت ہے جیسے مکان سے بدررو کو۔ اگر کوئی شخص کسی کے

مکان میں جاکر بدر رو دیکھے اور اس کی پوری تحقیق کرے یقیناً اس شخص کا علم ناقص ہے اس سے وہ شخص بڑھ کر ہے جس نے گھر کے اندر کی عمدہ چیزیں معلوم کر لیں۔ تو فلاسفر یونان آج کل کے سائنس والوں سے یقیناً بڑھے ہوئے تھے۔ کیوں کہ انہوں نے مشاہدات کے علاوہ عقلیات و مخفیات کا علم حاصل کیا اور پھر ان سے وہ بڑھے ہوئے ہیں جنہوں نے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کی۔ کیونکہ اس تمام عالم کو خدا تعالیٰ شانہ کے روبرو دیکھئے تو یہ حالت ہے ؎

اگر آفتاب است و یک ذرہ نیست　　　دگر ہفت دریا ست یک قطرہ نیست

یعنی اگر تمام عالم آفتاب ہے تو حق تعالیٰ کے روبرو اس کی ایک ذرہ کی بھی نسبت نہیں اور اگر تمام عالم سات دریا ہیں تو اللہ تعالیٰ کے روبرو ان کی ایک قطرہ کی بھی نسبت نہیں ہے۔

پس پورا فلسفی وہی ہے کہ جس نے خدا کو پہچان لیا ہے۔ اسی واسطے تو افلاطون کہتا ہے اُولٰئِكَ هُمُ الْفَلَاسِفَةُ حَقًّا۔ (حقیقت میں فلاسفر یہی لوگ ہیں۔) تو اہل اللہ کا فہم عجیب ہوتا ہے۔

حضرت شیخ ابوالبرکات کے پاس ابو علی بن سینا گیا۔ کسی نے اس کی نسبت پوچھا کہ حضرت یہ کیسا شخص ہے۔ فرمایا کہ بو علی اخلاق ندارد۔ (اخلاق نہیں رکھتا) ابو علی نے سن کر ایک کتاب تصنیف کی جس میں علم اخلاق کو خوب بیان کیا اور ان کے پاس بطور جواب کے بھیجی۔ انہوں نے ایک جملہ میں ساری کتاب اڑادی کہ من کے گفتہ بودم کہ اخلاق نداند۔ گفتہ بودم کہ اخلاق ندارد۔ (یعنی میں نے کب کہا تھا کہ اخلاق نہیں جانتا بلکہ میں نے یہ کہا تھا کہ اخلاق نہیں رکھتا۔) بلکہ یہ بھی

تو اخلاق نہ ہونے کی بات ہے کہ خواہ مخواہ اعتراض کے جواب دینے کی کوشش کی۔ بو علی لاجواب رہ گیا۔

ایک اور بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ کچھ جمع نہ کرتے تھے۔ سب اڑا دیا کرتے تھے۔ کسی بزرگ نے اُن کو لکھا کہ لَا خَیْرَ فِی الْاِسْرَافِ (یعنی اسراف میں خیر نہیں) اُنہوں نے کیا عجیب جواب دیا لَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ (یعنی خیر میں اسراف نہیں ہوتا۔)

اہل علم صوفیہ اور فلاسفہ کی تحقیقات کو مقابلہ کر کے دیکھئے۔ جہاں تک اُن کی نظر پہنچتی ہے فلاسفہ کو اُس کی ہوا بھی نہیں لگتی۔ مگر شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ یہ لوگ تو بڑے بھولے ہوتے ہیں تو سمجھو کہ یہ دنیا کے امور سے ناتجربہ کار ہوتے ہیں بد عقل نہیں ہوتے اور ناتجربہ کار ایک بڑا فلسفی بھی ہوتا ہے تو کیا وہ حکیم نہیں رہا۔

ایک عربی خواں طالب علم سے ایک کالج کے تعلیم یافتہ نے پوچھا کہ بتاؤ کل کواکب کتنے ہیں۔ اُس نے کہا کہ سات سیارہ اور ثوابت مرصودہ ایک ہزار بائیس ہیں اور غیر مرصودہ منضبط نہیں۔ اُس نے کہا تم کو اتنی بھی خبر نہیں۔ کیا فلسفہ پڑھتے ہو۔ عربی خواں نے کہا بتلاؤ سمندر میں مچھلیاں کتنی ہیں۔ اُس نے لاعلمی ظاہر کی۔ اُس نے کہا، تم کو زمین کی بھی خبر نہیں کیا فلسفہ پڑھتے ہو۔

غرض ناتجربہ کاری اور چیز ہے اور کم عقلی اور چیز ہے۔ اہل اللہ ہرگز کم عقل نہیں۔ ہاں دنیا کے امور سے ان کو چونکہ دلچسپی نہیں اس لئے ناتجربہ کار ہوتے ہیں۔ لوگ ان کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔

ملا جیون کا قصہ جونپور کے پُل کی بابت مشہور ہے۔ ملا جی ایک مرتبہ مکان

پر بیوی کے مقابلہ میں شاہی فوج اتنی بات پر چڑھا لائے تھے کہ اُس نے اصرار کیا تھا کہ نمک ٹھیک ہے زیادہ نہیں ہے۔

خیر یہ تو مشہور قصہ ہے ممکن ہے کہ صحیح ہو یا غلط ایک بزرگ کم عمر کو ہم نے دیکھا ہے۔ اصول شاشی پڑھتے تھے۔ ایک طالب علم کا پیٹ بڑھا ہوا تھا میں ہنسی میں اُس کو حاملہ کہا کرتا تھا۔ یہ سُن کر اُسے یقین آگیا کہ مردوں کو بھی حمل ہوتا ہے۔

اُن کی کرامت سب سے اوّل یہ ظاہر ہوئی کہ عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے اتفاق سے ٹاٹ میں ایک سوا لگا ہوا تھا۔ وہ اُن کی ران میں گھس گیا مگر اُس بندۂ خدا کو نماز میں کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ جب سلام پھیر چکے تو کہا ذرا دیکھیو۔ میری ران میں کس چیز نے کاٹا ہے۔ لالٹین لاکر جو دیکھا تو ٹاٹ نیچے تک خون سے آلودہ تھا اور اُن کا پائجامہ بھی تمام خون سے بھر گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ٹاٹ سینے والے سُوا اُس میں لگا کر چلے گئے تھے۔ وہ اُن کی ران میں آدھا گھُس گیا۔ مجھے اُس وقت اُس شخص کی نماز پر سخت حیرت ہوئی اور اب معلوم ہوا کہ یہ کوئی خدا کا برگزیدہ بندہ ہے۔ پھر ایک دن کُرتہ میں خود بخود آگ لگ گئی۔ اللہ اللہ! ؂

در دلم بسکہ گرمیِ عشق ست　　　موئے بر سینہ ام نمے روید

میرے دل میں عشق کی گرمی ہے۔ اس وجہ سے سینہ پر بال نہیں اُگتے ہیں۔

تو اب ان لوگوں کو بے وقوف نہ کہیں گے بلکہ ناتجربہ کار تھے۔ ممکنات کو ممکن سمجھتے تھے۔ خدا کی قدرت پر نظر تھی کسی نے کوئی ممکن بات غلط ہی کہہ

براہ کرم ورق نہ موڑیں

دی اُس کو جھوٹا نہ کہتے تھے کیونکہ سمجھتے تھے کہ خدا کو سب قدرت ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ پھر کسی مسلمان کو جھوٹا کیوں سمجھا جائے۔ تو یہ حضرات بیوقوف نہیں ہوتے بڑے عاقل ہوتے ہیں۔ اور جو بعض طالب علم کچھ بیوقوف نظر آتے ہیں تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کا انتخاب عالم دین بنانے کے لئے ہی غلط ہے۔

کسی کے دو لڑکے ہوں۔ ایک سمجھدار اور ایک کم سمجھ۔ سمجھدار کو انگریزی پڑھا دے گا اور بے وقوف کو عربی۔ پس علمِ دین نے تھوڑا ہی بیوقوف بنا دیا۔ وہ تو پہلے ہی ایسا تھا اور اُسی کو انتخاب میں لیا گیا۔ اسی طرح فقراء میں عوام جہلاء جن کے اکثر معتقد ہوتے ہیں وہ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ نے عقلاء کو دیکھا نہیں۔

حقیقتِ طاعت

کلام دُور چلا گیا۔ اور یہ مضمون تھا کہ جیسے لعل کی محبّت بوجہ مظہر نور آفتاب ہونے کے آفتاب کی محبّت ہے۔ اسی طرح رسول ؐ کی محبّت و اطاعت بعینہٖ خدا کی محبّت و اطاعت ہے۔ پس اَطِیْعُوااللّٰہَ وَاَطِیْعُواالرَّسُوْلَ (اللہ کا کہنا مانو اور رسول ؐ کا کہنا مانو) سب صحیح ہو گیا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اطاعت کا حکم دیا ہے اور اس کا ثمرہ یہ بیان فرمایا ہے لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

اس آیت کے متعلق دو مضمون ہیں۔ مختصر بیان کرتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اس میں اطاعت کا حکم ہے۔ لوگ اس کے معنے کہنا ماننا سمجھتے ہیں مگر اس میں

ایک اور چیز بھی ہے جس کو لوگ بیان نہیں کرتے یعنی اطاعت کے معنی خوشی سے کہنا ماننا ہے کیونکہ طوع اُس کا مادہ ہے اور طوع کے معنی رضا و خوشی کے ہیں تو اس میں حکم صرف کہنا ماننے کا نہیں بلکہ خوشی اور رضامندی کے ساتھ کہنا ماننے کا ہے۔

اب ٹٹولنا چاہیئے کہ رغبت اور خوشی سے کہنا ماننے والے کتنے ہیں بہت ہی کم ہیں۔ اکثر تو اس واسطے نماز روزہ کرتے ہیں کہ اگر نہ کریں گے تو پٹیں گے عذاب ہوگا۔ اس مذاق کے لوگوں کو اگر عذاب کا ڈر نہ ہوتا تو کبھی کہنا نہ مانتے سو اس کا نام اطاعت نہیں یہ تو سزا کے خوف سے کام کرنا ہوا۔ اطاعت یہ ہے کہ جنت دوزخ نہ ہوں تب بھی کہنا مانے۔ چاہے کچھ انعام ملے یا نہ ملے۔ سزا کی وعید ہو یا نہ ہو۔ ہر حال میں سر تسلیم خم رہے۔ کیونکہ اُن کی ذات کی عظمت کا یہی مقتضا ہے۔ صاحب کمال کی اطاعت کرنے کو خود بخود جی چاہا کرتا ہے اُس کی طرف خود قلب مائل ہوا کرتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کون صاحب کمال ہوگا جس میں ظاہری اور باطنی ساری خوبیاں جمع ہیں اور سب خوبیوں کے دینے والے بھی وہی ہیں۔

صاحبو! اگر غلام سے کہا جائے کہ یہ کام کرو اور وہ ساتھ ہی یہ کہے کہ کیا ملے گا۔ تو انصاف سے کہو وہ بے ہودہ ہے یا نہیں۔ بیشک ایسا غلام گردن زدنی (گردن مارنے کے لائق) ہے جو بدلا لے کر اپنے آقا کا کام کرے اُس کی تو حالت ہونی چاہیئے تھی ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

یعنی زندگی عطا فرمائیں تو آپ کی مہربانی ہے اور اگر آپ قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں۔ دل آپ پر آگیا ہے جو کچھ تصرف کریں میں آپ سے راضی ہوں۔

ثمرات کے لیے جس نے اطاعت کی اُس نے ثمرات کی اطاعت کی ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن ۔ کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت مزدوروں کی طرح مزدوری کی وجہ سے مت کرو یعنی ثمرات کے لئے عبادت و اطاعت مت کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی وجہ سے کرو۔ ثمرات خود مرتب ہو جائیں گے۔ اس لیے آقائے حقیقی خود بندہ پروری کی روش کو جانتے ہیں۔

خدا کو خدا سمجھ کر عبادت کرو۔ یہ ہے خوشی سے کہنا ماننا اور یاد رکھو خوشی سے کہنا وہ مانے گا جس کو محبت ہو۔ ظاہراً اس مقام پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ محبت تو قلبی کیفیت ہے اور دل پر کیا اختیار ہے مگر یہ خیال غلط ہے دل کی حرکت کا ارادہ کرو۔ دیکھو حرکت ہوتی ہے یا نہیں۔ تم نے نہ ارادہ کیا نہ سیکھا پہلے ہی سے خیال پکا لیا کہ دل پر کیا اختیار ہے۔

دیکھو! بچہ کو پہلے پہل چلنا نہیں آتا مگر ماں باپ کو چلتا دیکھ کر وہ بھی سیکھ جاتا ہے۔ اگر ماں باپ سے نہ سیکھے تو ہرگز نہیں چل سکتا۔ آپ صاحبوں نے تحصیل کا قصد نہیں کیا۔ اگر طلب ہوتی تو ڈھونڈتے اور کامیاب ہوتے۔ مگر افسوس کہ ناامید ہو کر بیٹھ رہے۔ شریعت نے کم ہمتی کی تعلیم نہیں دی ہمارے

حضورؐ نے عالی ہمتی کا حکم فرمایا ہے۔
ایک شخص آپ کے فیصلہ میں ہار گیا تو اُس نے کہا حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ (یعنی اللہ تعالیٰ مجھ کو کافی ہیں اور وہ اچھے کارساز ہیں) حضورؐ نے فرمایا کہ تدبیر کرو اور جب کچھ نہ بنے تب کہو حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔ دنیا کے بارے میں سب حضورؐ کی اس تعلیم پر عمل کرتے ہیں کہ پہلے اپنی طرف سے انتہا درجہ کی کوشش کر لیتے ہیں۔ جب کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو تقدیر کے حوالے کر دیتے ہیں، مگر دین کے بارہ میں یہ حکم یاد نہیں رہتا۔ اُس میں پہلے ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔

اسبابِ محبّت

چنانچہ یہ شبہ بھی اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ دل پر کیسے اختیار ہو گا۔ تو سنو واقعی محبّت کی کیفیت قلبی ہے اور براہ راست تمہارے اختیار میں نہیں مگر اس کے لئے چند اسباب ہیں۔ وہ تمہارے اختیار میں ہیں۔ تو دار و مدار اُن اسباب پر ہے اور وہ موقوف محبّت پر نہیں۔ مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ دین میں تنگی نہیں جب محبّت کا حکم ہے تو اُس کی تحصیل کے اسباب بھی آسان فرمائے ہیں۔ سنیئے! میں ان اسباب کو بیان کرتا ہوں جن سے محبّت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے چند باتوں کا التزام کرنا چاہیئے۔

ایک تو اس کا کہ کسی وقتِ خاص میں خدائے تعالیٰ کے انعامات کو سوچا کرے اور اس کے ساتھ ہی اپنی نالائق حرکتوں کا مطالعہ کرے اور غور کرے کہ اگر حکامِ ظاہری کی اتنی مخالفتیں کرتا تو کیا انجام ہوتا اور اُن کی نگاہوں میں کیسی ذلت ہوتی۔ مگر حق تعالےٰ نے باوجود میری سرکشی کے اپنے انعامات مجھ سے بند

نہیں کیے ہے

ولیکن خداوندِ بالا و پست   بعصیاں درِ رزق بر کس نہ بست

یعنی خدائے تعالیٰ نے گناہوں کی وجہ سے کسی پر رزق کا دروازہ نہیں بند کیا۔

ایک جزو تو یہ ہے۔

دوسرا جزو یہ ہے کہ احکام ظاہریہ شرعیہ کو بتکلف شروع کر دے۔ یہ تجربہ ہے کہ اعمال میں محبت پیدا کرنے کا خاصہ ہے کہ اگر اوّل اوّل محبت نہ بھی ہو، تو بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے مقناطیس کی کیفیت ہے کہ لوہا جب تک دور ہے تو کچھ نہیں اور جہاں پاس آیا تو یہ خود کھینچ لیتا ہے۔ اعمال میں بھی مقناطیسی اثر ہے۔

تیسرا جزو یہ ہے کہ کچھ وقت ذکر کے لئے بھی نکال لے خواہ تھوڑی ہی دیر ہو خواہ بلا مراقبہ بیٹھے ہی ہو۔ مگر خلوت میں ہو ذرا توجہ کے ساتھ۔

چوتھا جزو یہ ہے کہ اہل اللہ کے پاس بیٹھا کرے۔ انشاء اللہ اس صحبت کا اثر یہ ہوگا کہ بہت جلد دنیا کی محبت دل سے کم ہو جائے گی۔ اور اہل اللہ کی پہچان یہی ہے کہ اُن میں دنیا کی محبت کم ہو اور اُن میں خدا کی محبت ہو۔ ایسوں کے پاس جا کر بیٹھو۔

طریقِ اصلاح

مگر اُن کو اپنی باتوں میں نہ لگاؤ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ بزرگوں کے پاس جا کر دنیا بھر کی حکایتیں بیان کرتے ہیں۔ اس سے نقصان کا اندیشہ ہے کیونکہ اس سے اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگرچہ تمہاری

دل شکنی کے خیال سے وہ اپنے اخلاق کی وجہ سے تم پر ظاہر نہ کریں اور یہ بھی نازیبا حرکت۔ طبیب کے پاس اپنا معالجہ کرانے جایا کرتے ہیں یا قصے بیان کرنے کو۔ اور بہت بولنے والے کو اُن کے یہاں سے کچھ ملتا بھی نہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

با مدعی مگوئید اسرارِ عشق و مستی بگزار تا بمیرد در رنج خود پرستی

یعنی مدعی اور ظاہر پرست کے سامنے عشق اور مستی کے اسرار کو مت بیان کرو۔ ان کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو۔

مگر ایسا بھی نہ کرو کہ بالکل خاموش ہی ہو جاؤ کہ وہ کوئی بات خود پوچھیں تو بھی نہ بولو بلکہ اپنی حالت کہو۔ طریق اصلاح پوچھو۔ فضولیات قصے وغیرہ مت چھیڑو۔ اسی طرح اگر کسی کامل کی صحبت میں بیٹھو گے تو انشاء اللہ بہت جلد اثر ہوگا ؎

صحبتِ نیکاں اگر یک ساعت ست
بہتر از صد سالہ زہد و طاعت ست

اگر اہل اللہ کی صحبت یک ساعت بھی میسر ہو جائے ، تو وہ سینکڑوں برس کے زہد و طاعت سے بہتر ہے۔

یہ نہایت اکسیر ہے۔ اس کا خاصہ ہے کہ خدا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر کہیں کوئی کامل نظر نہ پڑے تو اس کا بدل یہ ہے کہ اُن کے ملفوظات کا مطالعہ کرو مگر حقائق و معارف کو مت دیکھو بلکہ اُن کے مجاہدات کو اور شوق وطلب کے واقعات کو غور سے پڑھو۔ اُن کا بھی وہی اثر ہے۔ جو صحبت کا اسی صحبت و مطالعۂ تذکرہ کی نسبت کہتے ہیں ؎

مقامِ امن و مئی بے غش و رفیق شفیق
گرت مدام میسّر شود زہے توفیق

یعنی امن کی جگہ اور خالص محبت الٰہی اور مرشد کامل اگر ہمیشہ تم کو میسّر ہونے ہیں تو بہت ہی اچھی بات ہے۔

یہ تو اوّل درجہ کی بات ہے دوسرے کو کہتے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی مئے ناب و سفینۂ غزل است

اس زمانہ میں جو رفیق خلل سے خالی ہے۔ وہ اہل اللہ کے ملفوظات اور دل عشق اور محبت الٰہی سے مالامال ہے۔

یہ دوسرا درجہ ہے۔ مئے ناب سے محبّت الٰہی مراد ہے اور سفینہ سے ملفوظات مراد ہیں۔ مجھ سے بعض لوگوں نے اپنی بیویوں کی شکایت کی کہ نماز نہیں پڑھتی ہیں۔ میں نے کہا کسی کو منوانا بھی آوے۔ تم یوں کرو کہ گھر میں جا کر ان کو کچھ مت کہو بلکہ بیٹھ کر کتاب لے کر پکار پکار کر پڑھنا شروع کرو۔ ایک چلہ نہ گزرنے پاوے گا کہ سب درست ہو جاویں گی۔ چنانچہ لوگوں نے مجھے خبر دی کہ واقعی اس کا بہت جلدی اثر ہوا۔ لوگ بے تدبیری کرتے ہیں۔ حال یہ ہے

؎ بے خبر بودند از حالِ دروں — اَسْتَعِیْذُ اللّٰہَ مِمَّا یَفْتَرُوْنَ

اندرونی حالت یعنی اصل تدبیر سے لوگ بے خبر ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہم ان کی بے تدبیری سے پناہ مانگتے ہیں۔

ہرچہ کردند از علاج واز دوا — رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

یعنی جو کچھ اُنہوں نے تدبیر و علاج کیا اس سے رنج بڑھتا رہا اور حالت ابتر ہوتی گئی۔

جب طبیب کامل آوے گا تو یہ کہے گا ؎

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

جو علاج اور تدبیر اُنہوں نے کی ہے اس سے لوگوں میں درستی کی بجائے نادرستی بڑھ گئی۔

یہ حقیقت میں علاج ہی نہ تھا۔ مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جھاول تشریف لے گئے۔ لوگ مسجد میں حاضر ہوئے ایک بے نمازی بھی آئے۔ لوگ کہنے لگے یہاں آج بھولے سے کہاں آئے ہو اور مولانا سے بھی کہا کہ یہ کبھی نماز نہیں پڑھتے۔ مولانا نے فرمایا کہ تم کو کیسے خبر ہوئی ممکن ہے کہ گھر میں نماز پڑھ لیتے ہوں۔ اُس نے کہا کہ اب تو مجھے مولانا نے نمازی کر دیا۔ اب نہ نماز چھوٹے نہ جماعت۔ ایک ذرا سی نرمی پر ساری عمر کا بے نمازی پکا نمازی ہو گیا۔

یہ ہیں ورثۃ الانبیاء (انبیاء کے سچے وارث) کہ سختی کی جگہ سختی کرتے ہیں نرمی کی جگہ نرمی برتتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کسی بزرگ کو ایک جگہ سختی کرتے دیکھ لیا بس ہر جگہ کے لئے یہی نسخہ یاد کر لیا کہ ہر جگہ سختی ہی ہو۔

جیسے ایک طبیب کسی رئیس کی نبض دیکھنے گئے تھے۔ ساتھ میں صاحبزادے بھی تھے۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر مریض سے کہا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نارنگی کھائی ہے۔ اُس نے اقرار کیا۔ جب حکیم صاحب واپس ہوئے تو

صاحبزادے نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیسے معلوم کر لیا کہ اُس نے نارنگی کھائی ہے۔ حکیم نے کہا کہ میں نے اُس کی چارپائی کے نیچے چھلکے پڑے ہوئے دیکھے تھے۔ اس سے سمجھا۔ صاحبزادے نے یہاں سے کلیہ قاعدہ نکال لیا کہ چارپائی کے نیچے جو چیز پڑی ہوا کرے مریض اُسی کے کھانے سے بیمار ہوا کرتا ہے۔ باپ کے انتقال کے بعد جو صاحبزادے کو خلافت ملی تو اسی رئیس کے یہاں ایک دفعہ بلائے گئے۔ آپ نے نبض دیکھ کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپنے نمدہ کھایا ہے کیوں کہ اتفاق سے اُس وقت چارپائی کے نیچے نمدہ پڑا ہوا تھا رئیس نے دھکا دیکر گھر سے باہر نکال دیا۔

تو بعض لوگوں کو ایک ہی نسخہ یاد ہوتا ہے مگر حکیم وہ ہے جو ہر مرض کی شناخت کر کے اُس کے مناسب دوا دے۔ ایسے ہی طبیب روحانی وہ ہے کہ سختی کی جگہ سختی اور نرمی کی جگہ نرمی برتے۔ اور بعض دفعہ ناواقف معترض جوش کو سختی سمجھ جاتا ہے حالانکہ وہ سختی نہیں ہوتی۔ وہ جوش ہوتا ہے اور یہ جوش وہاں آتا ہے جہاں دین کی بے حرمتی ہو۔ اس میں انسان فطرۃً مجبور ہے جب اپنے محبوب کے ساتھ گستاخی ہوتے دیکھتا ہے وہ اپنے قبضہ میں نہیں رہ سکتا میں جو کالج میں گیا تو مجھ سے لوگوں نے کہا کہ مولوی بڑے متعصب ہوتے ہیں میں نے کہا، صاحبو! ذرا انصاف سے فرمائیے گا۔ کہ اگر آپ کی والدہ ماجدہ کی شان میں کوئی شخص گستاخی کرنے لگے تو کیا تم کو جوش نہ آئے گا ضرور آئے گا اور اگر نہ آئے تو تم سے زیادہ بے غیرت کوئی نہیں۔ تو میں بقسم کہتا ہوں کہ مولویوں کے نزدیک دین ماں باپ سے زیادہ پیارا ہے۔ اس سے انہیں دین

انہیں کوئی چیز عزیز نہیں. پھر اگر اُن کو دین کی بے حرمتی پر جوش آئے تو اُن کو متعصب کیوں کہا جاتا ہے. بلکہ افسوس اس شخص کی حالت پر ہے جس کو ماں باپ کی بے حرمتی پر تو جوش آئے اور دین کی بے حرمتی کو ٹھنڈے دل سے دیکھ لے اور اُسے کچھ بھی غیرت نہ آئے. غضب کی بات ہے کہ تمہاری نگاہوں میں دین کی وقعت ماں کے برابر بھی نہیں۔ اس جواب کو سن کر سب کی آنکھیں نیچی ہو گئیں کالج کے نوجوانوں میں یہ وصف قابل تعریف ہے کہ بات کو سمجھ کر پھر اپنی بات سے لوٹ جاتے ہیں خواہ اُس واپسی پر قائم نہ رہیں۔

تو صاحبو! یہ سختی نہیں ہے۔ یہ غیرت وحمیّت اسلامی ہے۔ یہ تو جزو دین ہے البتہ ہر جگہ سختی بُری چیز ہے۔ تو جس کے پاس کوئی بزرگ نہ ہو وہ بزرگوں کے ملفوظات اور اُن کے احوال واقوال کا مطالعہ کرتا رہے۔ انشاء اللہ اگر یہ چار جزو کا نسخہ زیر عمل رہے گا تو میں دعوٰی سے کہتا ہوں کہ چالیس دن کے اندر اندر ضرور اُس کے دل میں محبت خدا تعالیٰ پیدا ہو جاوے گی۔ اور میں کیا میرا دعوٰی کیا، یہ بھی خدا اور رسولؐ کے ارشاد پر اعتماد کر کے کہتا ہوں۔ کوئی اپنے گھر سے نہیں کہتا۔

مگر اس میں ایک غلطی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کے مزاج میں عجلت بہت ہے۔ وہ یوں چاہتے ہیں کہ تھوڑے دنوں میں یہ حال ہو جائے کہ اللہ کا نام سُن کر لوٹ پوٹ ہو جائے۔ وہ محبت کے معنی غلط سمجھتے ہیں۔ لوگ اسی کو محبت سمجھتے ہیں کہ نام سُن کر لوٹ پوٹ ہو جائے۔ یہ صحیح نہیں۔ محبت نام ہے میلان قلبی کا اُس کے مراتب کثیرہ ہیں۔ یہ بھی ایک مرتبہ ہے کہ نام سُن کر بے تاب ہو جائے

ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ خدا کی طرف دل کھنچنے لگے۔ اور جیسے مراتب مختلف ہیں اسی طرح قسمیں بھی مختلف ہیں۔ ایک عقلی دوسری طبعی اور جس محبت حاصل کرنے کا حکم ہے وہ محبت عقلی ہے۔ اسی لئے اَطِیْعُوا اللّٰہَ (اللہ کا کہا مانو) فرمایا۔ یہ نہیں فرمایا کہ اطیعوا اللہ طبعاً (اللہ تعالیٰ کی طبعاً اطاعت کرو۔) اب میدان وسیع ہوگیا کہ کم از کم یہی سمجھ کر اطاعت کرو کہ خدا ہم سے خوش ہوگا مگر اس پر بس نہ کرو، آگے بڑھتے رہو یہاں تک کہ اطاعت میں لطف آنے لگے اور پھر اس کے بغیر چین نہ پڑے نہ سمجھنے سمجھانے کی ضرورت رہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ہر چہ بروے میرسی بروی مایست

اے برادر! محبوب حقیقی کی درگاہ بے نہایت ہے جس مرتبہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو۔ آگے بڑھتے جاؤ۔

تقاضائے عظمت دوسرا مضمون اس آیت کے متعلق یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (تاکہ تم پر رحم کیا جائے) اس میں ایک بہت باریک بات ہے۔ وہ یہ کہ جتنے حکام دنیا میں ان کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر اطاعت نہ کرو تو سزا ہوتی ہے اور اطاعت کرو تو کچھ انعام نہیں اور جہاں معاوضہ ہوتا ہے وہ زیادہ کام کرنے کا ہوتا ہے۔ نفس اطاعت پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ پابندی قوانین بلا معاوضہ ہر شخص کے ذمہ ہوتی ہے اگر پابندی کوئی نہ کرے تو مستحق سزا ہوتا ہے اور کوئی پابندی کرے تو اپنے فرض منصبی کو ادا کر رہا ہے مستحق معاوضہ نہیں ہوتا۔ تو کیا اس کو ظلم کہا جا سکتا ہے کیا کوئی اسے خلاف انصاف کہہ سکتا ہے۔ سو جو شخص حکومت کا راز جانتا ہے

وہ اس کو ظلم نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ حکومت کا حق سمجھتا ہے۔ تو دنیا میں یہ تو ہوتا ہے کہ کام لیا جاوے اور کچھ نہ دیا جاوے مگر یہ نہیں ہوتا کہ بغیر کام کئے صرف اطاعت پر کچھ دیا جائے۔

اب گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ نماز پڑھنے سے منتظر ہیں کہ کچھ ملے گا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی قدر دل میں نہیں وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (جیسی اللہ تعالیٰ کی قدر ہونی چاہیے ویسی انہوں نے قدر نہیں کی) اگر اتنی بھی خدا کی قدر ہوتی جتنی حکام دنیوی کی تو کیا خدا کا ہم پر حق نہیں ہے۔ پھر کیا منہ لے کر ہم معاوضہ و انعام کے متمنی ہیں یہ معلوم ہوا کہ خدا کی عظمت دل میں نہیں ہے۔ اگر عظمت ہوتی تو اگر کچھ بھی نہ ملتا تب بھی اطاعت کرتے۔ مگر حق تعالیٰ کے قربان جایئے کہ اطاعت کا بدلہ صرف سزا نہ دینا گوارا نہ کیا بلکہ فرماتے ہیں لعلکم ترحمون (تاکہ تم پر رحم کیا جاوے) اور رحمت کا لفظ فرمایا۔ جو جنت و دیدار لقا سب کو شامل ہے اور پھر شفقت تو دیکھئے کہ ترحمون فرمایا یَرْحَمُكُمُ اللّٰهُ (اللہ تعالیٰ تم پر رحم کریں) نہیں فرمایا۔ نکتہ یہ ہے کہ اتنا بھی شرمندہ نہ کیا کہ ہم تم پر احسان کریں گے تاکہ عبادت کے ساتھ احسان کے بھی زیر بار نہ ہوں۔ بلکہ بصیغہ مجہول فرمایا کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

ایک نکتہ اور رہ گیا کہ لعلکم کیوں فرمایا کیونکہ لعل تو امید و شک کے مقام پر استعمال کیا جاتا ہے اور حق تعالیٰ اس سے بری ہیں۔ تو نکتہ یہ ہے کہ یہ شاہی محاورہ ہے۔ محاورہ میں شاید اور امید کا لفظ یقین ہی کے لئے ہوتا ہے بادشاہ یوں ہی خطاب کیا کرتے ہیں کہ تم کو امید رکھنی چاہیے۔ اگر عظمت باری

کو پیش نظر رکھا جائے تو اشکال وارد ہی نہیں ہوتا۔ نیز ہی خطوط میں کثرت سے یہ محاورہ مستعمل ہے لکھتے ہیں امیدوار بودہ باشند۔ (تم کو امیدوار رہنا چاہئے) اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن سب کتابوں سے پہلے پڑھے جب تک طرز تصنیفی کا دماغ خوگر نہ ہو۔

یہ مضمون تو آیت کے متعلق تھا مقصود یہ ہے کہ احکام خداوندی کو ماننا اور ان کا ماننا اُن کے جاننے کے اوپر موقوف ہے۔ بدون جانے قانون کی پابندی کیسے ممکن ہے پس علم دین حاصل کرو۔ میں نے علم دین کی فضیلت نہیں بیان کی کیونکہ ضرورت کا بیان کافی ہے اور ضرورت آپ کو معلوم ہو گئی کہ بدون علم دین حاصل کئے اطاعت خدا ناممکن ہے۔

اب ایک فضیلت بھی بیان کرتا ہوں تاکہ زیادہ رغبت ہو۔ فرماتے ہیں اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ (عالم انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں) امام محمدؒ کو کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ فرمایا جب میں درگاہ رب العزت میں حاضر ہوا، مجھ سے فرمایا گیا کہ کیا مانگتے ہو۔ میں نے عرض کیا یارب اغفرلی (اے پروردگار مجھ کو بخش) ارشاد ہوا کہ اے محمد! اگر ہمیں تم کو عذاب دینا ہوتا تو تم کو یہ علم عطا نہ کرتے۔ اور اسی سے بعض نے استنباط کیا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میرے ساتھ خدا کو کیا منظور ہے بجز علماء کے کیونکہ ارشاد ہے مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کرنا چاہتے ہیں اُس کو دین میں سمجھ عطا کر دیتے ہیں)

اب سمجھ میں آیا کتنی بڑی ضرورت ہے اور کیسی فضیلت ہے علم دین کی

کہ خدا تعالیٰ بدون اُس کے خوش نہیں ہو سکتے۔ رضا رحق علم دین حاصل کرنے پر موقوف ہے۔ ہاں اگر کوئی خدا ہی کو خوش کرنے کی ضرورت نہ سمجھے تو ایسے لوگ میرے مخاطب نہیں مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔ جس انسان کو بیوی بچوں سے صبر نہیں وہ خدا کو صبر کر کے کیوں چین سے بیٹھ سکتا ہے۔ عرفاً وہ شخص بہت باہمت سمجھا جاتا ہے جس کو بیوی بچوں کا صبر آجاوے مگر نہیں اُس سے بڑھ کر باہمت گو مذموم ہی وہ ہے جس نے خدا کو چھوڑ دیا اور صبر آگیا ؎

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن
صبر چوں داری ز رب ذوالمنن

تم کو جب بیوی بچوں سے صبر نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ سے تم کو کیونکر صبر آگیا ہے۔

اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں
صبر چوں داری ز نعم الماہدون

جب تم کو حقیر دنیا چھوڑ کر صبر نہیں آسکتا تو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر کیوں کر چین آگیا ہے۔

ہائے بیوی بچوں کی ناراضی تو نہ اٹھائی جائے۔ پھر خدا کی ناراضی کیوں کر اٹھا سکتا ہے۔ اپنے ایک ادنیٰ ہم جنس کو ناخوش کر کے تو چین سے نہیں بیٹھ سکتا احکم الحاکمین، رب العٰلمین کو ناخوش کر کے کیوں کر آرام سے بیٹھ سکتا ہے۔ جب خدا کے خوش کرنے کی ضرورت ہے اور وہ بدون اطاعت کے ہو نہیں سکتی اور اطاعت بدون علم ناممکن، تو میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس کا

کیا بندوبست کیا۔

مگر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ میرا مطلب یہ ہے کہ سب مولوی بنو۔ اور بعضوں کو یہ ڈر ہوا ہوگا کہ علم کی ضرورت ثابت کر کے لاؤ روپے کی آواز بلند ہوگی تو میں دونوں باتوں کا اطمینان دلاتا ہوں۔ نہ میں سب کو مولوی بننے کو کہوں نہ چندہ مانگوں بلکہ میں تو اراکین مدارس کو بھی یہی کہا کرتا ہوں کہ چندہ کی تحریک نہ کیا کریں کسی کا سو دفعہ جی چاہے دے نہ چاہے نہ دے۔ اپنا تو یہ مشرب ہے لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا (یعنی ہم اس پر اجرت نہیں مانگتے) اور میں تو یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ مدارس والے کچھ جاویں اور استغنا برتیں تو دینے والے خوشامدیں کر کے دینگے مگر چونکہ یہ سمجھ رکھا ہے کہ مانگے ہی سے ملتا ہے حق تعالیٰ بھی اسی طرح دیتے ہیں دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ کسی سے نہیں کہا جاتا کہ سب کے سب مولوی بنو مگر ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ سب عالم دین بنو اور عالم دین مولوی ہی کو نہیں کہتے بلکہ ان دونوں میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ہر مولوی عالم دین ہے مگر ہر عالم دین مولوی نہیں ہوتا۔ علم دین کبھی صحبت سے حاصل ہوتا ہے کبھی پڑھنے سے اس پر میں سب کو مجبور کرتا ہوں کہ علم دین جس طرح ہو حاصل کرو۔

طریق تعلیم اس میں تفصیل اس طرح ہے کہ مسلمانوں میں دو قسم کے لوگ ہیں امراء و غرباء۔ پھر امراء میں دو قسم کے ہیں نوجوان اور بوڑھے۔ سو جن کی عمر پڑھنے کی ہے یعنی جوان وہ تو اپنے لئے علم دین یعنی مولویت تجویز کریں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انگریزی اُن کو نہ پڑھاؤ۔ انگریزی پڑھائیں مگر ترتیب بدل دیں۔ کیونکہ موجودہ ترتیب میں بہت خرابیاں ہیں اور صرف انگریزی پر اکتفا کرنے کی تو اجازت ہی نہیں

کیونکہ اُس میں نہ دین درست ہوتا ہے نہ دنیا۔

ایک صاحب کو میں نے دیکھا ہے کہ انگریزی پڑھ کر وطن آکر نماز میں شریک ہوئے اور دو رکعت امام کے ساتھ پڑھ کر سلام پھیر دیا کچھ خبر نہیں کہ نماز ہوئی یا نہیں اور خبر کیسے ہو جب فکر ہی نہیں۔

اس سے بڑھ کر میں ایک اور بات کہتا ہوں کہ صرف انگریزی پڑھا ہوا بعض دفعہ کفر کی باتیں زبان سے کہہ جاتا ہے اور اُس کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اُس کے تحت میں مسلمان بی بی ہوتی ہے اور حرام کے بچے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ کلمۂ کفر سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ جب نکاح نہ رہا تو اولاد سب حرامی ہوئی مگر اس شخص کو کچھ بھی خبر نہیں ہوتی افسوس ہے کہ مسلمانوں کو اس پر ذرا توجہ نہیں۔ گو یہ کہنے کی بات نہیں مگر بغیر کہے رہا بھی نہیں جاتا۔ ایک شخص نے علی الاعلان یہ کہا کہ یہ مذہبی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے۔ ہاں آپ بہت بڑے فلاسفر تھے اس لئے میں آپ کی عظمت کرتا ہوں۔ اب بتلاؤ ایمان گیا یا رہا۔ اُس کا تو ایمان گیا ہی مگر اُس کے نکاح میں ایک عفیفہ دیا کدامن عورت) ہے اُس بے چاری کا کیا حشر ہوگا۔ تو اس کا انسداد بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس انگریزی کے ساتھ کچھ دین کا بھی حصہ ہو۔

صاحبو! رؤسا جو انگریزی پڑھتے ہیں اُن کو اس سے روپیہ کمانے کی تو ضرورت نہیں بلکہ بوجہ ضرورت زمانہ کے پڑھتے ہیں۔ سو اس کے لئے نہ ڈگری کی ضرورت نہ پاس کی ضرورت۔ ان لوگوں کو اوّل علم دین پڑھانا چاہئے۔ اُس کے بعد یہ ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ غرض میں انگریزی پڑھنے کو منع نہیں کرتا۔ اتنا ضرور کہتا ہوں کہ پہلے علم دین پڑھا دیں کیونکہ پہلا نقش زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ ع

ما الحب الا للحبیب الاول

(یعنی محبوب اول ہی کے لئے محبت گہرا اثر رکھتی ہے) یہ میرا خیال ہے جو میں نے عرض کر دیا ؂

گر نیاید بگوشِ رغبت کس — بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(اگر کسی کو یہ بات مرغوب نہ ہو تو وہ جانیں۔ ہم پر پہنچانا تھا پہنچا دیا، منوانا ہمارا کام نہیں۔)

یہ تو امراء کا حال ہے۔ رہے غرباء اُن کی تقسیم یہ ہے کہ اُن کے جو بچے غبی الطبع ہیں اُن کو علم دین پڑھاؤ اور جو حریص و دنی ہیں اُن کو ضرورت سے آگاہ کر دو۔ پورا مولوی مت بناؤ۔ یہ بڑی غلطی ہے کہ سب کو پورا عالم بنا دیا جائے چاہے اُن کی طبیعت کیسی ہی ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ لندن میں ایک جماعت انتخاب کنندگان کی ہے۔ وہ جس کو جس کے قابل دیکھتے ہیں اُسی کی تعلیم دیتے ہیں۔ تو غرباء کے بچوں میں انتخاب کرو جس میں استغناء اور توکل کی شان ہو اُسے مولوی بناؤ۔ تو دو قسم کے لوگ علماء ہوئے۔ ایک امراء اور ایک غرباء کی یہ قسم۔

رہے اور لوگ یعنی بڈھے لوگ امراء کے و غرباء کی دوسری قسم کے بچے (یعنی حریص و دنی) اور غرباء کے بڈھے، تو اُن کو قرآن پڑھا دو اور نصاب دین خواہ اردو ہی کا ہو پڑھا کر اپنے اپنے کام میں لگا دو۔

اب رہ گئیں عورتیں اُن کے لئے یہ طرز ہے کہ مردوں کو چاہئے کہ گھر میں جا کر ایک کتاب کے دو تین صفحے روز سنا دیا کریں۔ ایک قسم اور رہ گئی۔ وہ یہ کہ بعض پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ اُن کے لئے ہفتہ میں ایک دن مقرر کریں اور

ایک سمجھ دار آدمی دو چار ورق سمجھا کر سنا دیا کرے۔

غرض میں سب کو مولوی نہیں بناتا صرف یہ کہتا ہوں کہ علم دین جس طرح ہو، حاصل کرو اور اس کے لئے میں نے آسان طریقے بھی بیان کر دیئے۔ بتلایئے کہ اس میں کسی کا کیا نقصان ہے مگر اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر شہر میں ایک باضابطہ مدرسہ ہو جو سب کا مرکز ہو ورنہ واعظ و مولوی کی تلاش میں دقت ہوگی باہر سے بلانا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ باہر کا آدمی ہر وقت نہیں آسکتا، نہ زیادہ مدت تک ٹھہر سکے۔ الحمد للہ کہ آپ کے اس شہر میں ایک مدرسہ جاری کیا گیا ہے جس کے لئے آپ سے روپیہ نہیں مانگا جاتا ہاں اولاد مانگی جاتی ہے۔ اگر کسی کے پاس اولاد بھی نہ ہو تو زبانی امداد کریں یعنی دعا کریں اور دوسروں کو رغبت دلائیں۔ ع

فَلْيُسْعِدِ النُّطْقُ اِنْ لَّمْ يُسْعِدِ الْمَالُ

(یعنی اگر کوئی مالی امداد نہ کر سکے تو وہ زبانی ہی امداد کرتا رہے)

اب اس جملہ پر بیان کو ختم کرتا ہوں کہ اس مدرسہ کی طرف سب لوگ توجہ کریں جس کے پاس مال ہو مال سے جس کے پاس اولاد ہو اولاد سے۔ جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ دعا کرے کہ اے اللہ! اس کو وسعت دے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى وَسَلَّمَ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اتباع المنیب

یہ وعظ ۱۹ صفر سنہ ۱۳۳۱ھ کو کٹرہ ابوتراب لکھنؤ شہر میں کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا، جو ۴ گھنٹے ۲۵ منٹ میں ختم ہوا۔ سامعین کی تعداد تخمیناً ۲۵۰۰ تھی۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ والہٖ وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وَاِنۡ جَاھَدٰكَ عَلٰۤی اَنۡ تُشۡرِكَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا وَّاتَّبِعۡ سَبِیۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝

یعنی اور اگر تجھ پر وہ دونوں (یعنی والدین) اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرا جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو اُن کا کہنا نہ ماننا اور دنیا میں اُن کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا اور اس کی راہ چلنا جو میری طرف رجوع ہو۔ پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے پھر میں تم کو جتلا دونگا جو کچھ تم کرتے تھے۔

ناصحین کو نصیحت

یہ ایک آیت ہے سورۂ لقمان کی۔ اس وقت اس کے تمام اجزاء کے متعلق بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف ایک جملہ کا بیان مقصود ہے مگر برکت کے لئے نیز ادب کے لئے پوری آیت تلاوت کی گئی مقصود صرف وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ کا بیان کرنا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں اور خطاب عام ہے کہ اتباع کرو اُن کے طریقہ کا جو میری طرف رجوع کریں۔ یہ اس کا ترجمہ ہے اور اس کے ماقبل اور مابعد بھی اسی کے مناسب مضمون ہے اور تمہید کے طور پر اُس کا بیان بھی کروں گا مگر مقصود وہی جملہ وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ۔ (اُن کے طریقہ کی اتباع کرو جو میری طرف رجوع کریں) ہے۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے لقمان علیہ السلام سے کچھ حکمتیں نقل کی ہیں جن کی اُنھوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی تھی اور منجملہ حکمتوں کے ایک نصیحت اداۓ حقوق والدین کی بھی نصائح ضروریہ میں سے تھی جو کہ حضرت لقمان نے بیان

نہیں کی تھی یا تو اس لیئے کہ انہیں حق تعالیٰ کے حقوق کا بیان کرنا مقصود تھا اور یا
اس لیئے کہ انہوں نے خودغرضی کے ایہام سے اس کا بتلانا مناسب نہ سمجھا ہو اور
اس سے پہلو تہی کی ہو مگر چونکہ بغیر اس کے مضمون ناتمام رہا جاتا تھا اس لیئے حق
تعالیٰ نے درمیان میں اس کو ذکر کر دیا اور جس آیت سے اس کو شروع کیا ہے اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حق تعالیٰ ہی نے فرمایا ہے حضرت لقمان سے منقول نہیں ہے
کیونکہ شروع میں فرمایا ہے۔ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ —— الآیۃ یعنی ہم نے انسان کو اس
کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے متکلم کے صیغہ سے تعبیر کرنا اس کی دلیل
ہے کہ یہ نصیحت خود حق تعالیٰ نے فرمائی ہے حضرت لقمان سے منقول نہیں ہے
اور اس سے ایک مسئلہ بھی مستنبط ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ نصیحت میں خودغرضی کے ایہام
سے بھی بچنا مناسب ہے جیسا کہ لقمان علیہ السلام نے کیا کیونکہ حقوق والدین کی نصیحت
سے چونکہ اپنے بیٹے کو نصیحت فرما رہے تھے ایہام خودغرضی کا ممکن تھا۔ پس
خودغرضی کے ایہام سے بچنا چاہئیے کیونکہ اکثر ایسی صورت میں مخاطب کے
قلب پر اس نصیحت کا اثر نہیں ہوتا اور یہ ایک اصل کلی (قاعدہ کلیہ) ہے اس
کے فروع اور جزئیات بہت ہیں جن کی آج کل ضرورت واقع ہوتی ہے اور یوں تو
ہر اصل کے فروع بہت سے ہوتے ہیں مگر اس اصل کے خاص وہ فروع بھی متعدد
ہیں جن سے اکثر سابقہ پڑتا ہے۔

چنانچہ ایک فرع یہ ہے کہ اکثر لوگ وعظ یا نصیحت اس لیئے کرتے ہیں
کہ اپنے گروہ کو قوت ہو۔ آج کل یہ عام طور پر ہو رہا ہے۔ ہر چند اس میں نیت
بخیر بھی ہوتی ہے کیونکہ اپنے کو حق پر سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس پر لانا

چاہتے ہیں مگر اپنی غرض یہی ہوتی ہے۔ نیت یہ ہوتی ہے کہ مجمع اہل حق کا بڑھے گا تو ہم کو قوت ہوگی۔ گو یہ نیت نہ ہونے کی صورت میں بھی قوت حاصل ہوتی مگر اس کے قصد اور لزوم میں بڑا فرق ہے۔ پس قصد اور نیت، تو یہ نہ ہونی چاہیئے۔ گو یہ بات لازم آجاوے بلکہ نیت تو یہی ہونی چاہیئے کہ لوگ حق کو قبول کریں۔ اس میں تو برکت ہوتی ہے اور مجمع اہل حق کو قوت اور ترقی بھی ہوتی ہے۔ اور جب براہ راست مجمع بڑھانے کی ہی نیت ہو گو وہ مجمع اہل حق کا ہی سہی مگر یہ تجربہ ہے کہ اس کا اثر سامعین پر ضعیف ہوتا ہے بلکہ بعض وقت مقصود کے خلاف اور برا اثر ہوتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ایسا ملکہ اور ایسی فہم عطا کی ہے کہ نیت اور مقصود اُس سے مخفی نہیں رہتا۔ پس سامعین کو معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں کیا مقصود ہے پس ویسا ہی اثر بھی ہوتا ہے۔ لہذا ناصحین کے لئے ضروری ہے کہ بے غرض ہو کر تبلیغ کریں۔

علماء کو نصیحت

تبلیغ سے مقصود صرف یہ ہو کہ مخاطب کو نفع ہو۔ اب اُس نفع سے چاہے جو کچھ بھی لازم آجائے۔ یہ ایک فرع تھی اُس اصل مذکور کی۔

اب دوسری فرع سنیئے کہ اُس کا بیان بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ اس میں اہل علم کی اصلاح ہے اور ہم کو عوام سے زیادہ اہل علم کو مشورہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ عوام کی باگ انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ان کی اصلاح ہوگئی تو عوام کی اصلاح بھی ہو جاوے گی۔ اور اگر ان میں کمی ہوگی تو ان کا اور ان کی بات کا اثر بھی ویسا ہی ناقص متعدی (دوسرے تک پہنچنے والا) ہوگا جیسا کہ ابھی میں

نے بیان کیا۔ پس ضرورت معلوم ہوئی کہ اس اصل سے جو مسئلہ خواص کے مناسب مستنبط ہوتا ہے اس کا بھی اختصار کے ساتھ ذکر ہو جاوے۔

سو وہ یہ ہے کہ بعض اوقات علماء کسی خاص شخص کے فرمایش مضمون پر وعظ کہنے ہیں چاہیے وہ مجمع کے مناسب ہو یا نہ ہو تو ایسا بھی نہ کرنا چاہیے اور مجھ کو یہ باتیں پیش آتی ہیں اس لئے میں کہتا ہوں۔ چنانچہ ایک مقام پر مجھ سے کہا گیا کہ ذرا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کرنا کیونکہ اس مقام پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم لوگ نعوذ باللہ حضور کی عظمت کم کرتے ہیں۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کیونکہ اس سے مخاطب کو کیا نفع ہوا۔ اس لئے کہ مخاطبین میں کوئی بھی حضور کے فضائل کا منکر نہیں۔ تو اس مجمع میں اس مضمون کو بیان کرنے سے سوائے اس کے کیا غرض ہے کہ اپنے کو خوش عقیدہ اور نیک خیال ظاہر کر دیں۔ تو دو گھنٹہ وقت صرف کروں اور حاصل یہ ہو کہ ہم کو بزرگ سمجھے۔

ایک مقام پر جو مشہور ہیں یہ رائے دی گئی کہ بعض لوگ تمہاری جماعت پر عدم تقلید کا شبہ کرتے ہیں اس لئے امام ابو حنیفہؒ کے فضائل کا ذکر کرو۔ میں نے کہا کہ اس بیان سے بجز اس کے کہ اپنا تبریہ ریا کی بیان کرنا ہو اور کیا حاصل ہے اور میں نے کہا کہ مجھے تو غیرت آتی ہے کہ چند مسلمان اشتیاق کے ساتھ احکام سننے کے لئے آئیں اور بجائے اس کے اپنی عقیدت اُن کے ذہن میں جمائی جاوے رہی یہ بات کہ ہماری طرف سے اُن کا گمان بد ہے تو ہوا کرے۔ ہم اپنا حق ادا کرتے ہیں کسی کی سمجھ میں آوے تو عمل کرے ورنہ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ (جاننے والے سے بڑھ کر جاننے والا موجود ہے)

پس اس قسم کے خیال اکثر مصلحت کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ایسا کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے میں اس کو بیان کرتا ہوں کہ یہ مناسب نہیں۔ اس میں خود غرضی کا شبہ ہے۔ اگر کسی کو واقعی آپ کے متعلق تحقیق کرنی ہوگی وہ دوسرے ذرائع سے کرے گا۔ باقی اپنے منہ سے اپنا تزکیہ (پاکی بیان کرنا) یہ بالکل تہذیب اور مروّت کے خلاف ہے بلکہ خود تو یہ کہنا چاہیئے کہ ہم اس سے بھی بدتر ہیں۔
اور اس اصل سے ایک اور فرع غامض (باریک) سمجھ میں آئی کہ علماء کے لئے مناسب یہ ہے کہ تعلقات دنیویہ میں زیادہ مشغول نہ ہوں اور یہ بات شاید اوّل وہلہ میں عقلاء کی سمجھ میں نہ آوے مگر میں اس کو سمجھائے دیتا ہوں کیونکہ آج کل عقل کی بہت پرستش ہوتی ہے۔ جب تک کہ کوئی بات اُن کی عقل میں نہ آوے، اُس وقت تک اُس کو قبول نہیں کرتے اور اس قسم کی باتوں کو تو آج کل تنزل کی تعلیم کہا جاتا ہے مگر الحمد للہ میں علماء کو کہہ رہا ہوں اور وہ اس کو تنزل نہ کہیں گے۔

تو بات یہ ہے کہ جو علماء دنیا کے کاروبار کرتے ہیں اُن کی بابت معلوم ہوا ہے کہ اُن معاملات کے متعلق جب وہ کوئی فتویٰ بیان کرتے ہیں تو لوگ اُس کی وقعت نہیں کرتے۔ چنانچہ اسی کی بناء پر عوام کی زبان زد ہے کہ مولوی اپنے مطلب کے فتوے نکال لیتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ساتھ دنیوی جھگڑے ہیں اس وجہ سے لوگوں کو اُن پر اعتماد نہیں۔ اور اگر یہ جھگڑے نہ ہوں تو اُن کی سختی احتیاط پر محمول ہوگی، اور نرمی واقفیت زمانہ پر محمول ہوگی۔ غرض ہر حال میں وہ محمود ہوں گے اور گو یہ محمود ہونا مقصود نہیں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اُن سے لوگوں کو فائدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر مریض کو طبیب پر اعتماد نہ ہو تو مریض تو گیا گزرا۔ پس طبیب کے لئے

ضروری ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی بات ایسی نہ کرے کہ مریض کا اُس سے اعتماد
جاتا رہے اور مریض اُس سے بدگمان ہو جاوے اور یہی معنی ہیں اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ
التُّهَمِ (یعنی تہمت کے موقعوں سے بچو۔) کے۔

اس کو پہلے مضمون کے متعارض نہ سمجھئے کہ پہلے کہا تھا کہ کسی کا ہماری طرف
سے گمان بد ہو تو ہوا کرے کیونکہ مواضع التہم (تہمت کی جگہیں) کے بچنے کے
امر میں یہ قید ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی کام ایسا نہ کرے کہ بدگمانی ہو اور
وہاں محض اظہار حق ہی سے جو کہ مامور بہ ہے بدگمان ہوتے ہیں تو وہ ایسا ہو گیا کہ

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔۔۔

یعنی اُن کفار نے اُن مسلمانوں میں کوئی عیب نہیں پایا بجز اس کے
کہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو کہ زبردست سزاوار حمد ہے۔

تو وہاں وہ فعل مامور بہ اور سراسر محمود ہے اور یہاں ایسے امور ہیں کہ وہ
ضروری نہیں ہیں ان سے بچنا ممکن ہے۔ پس اگر اُن سے نہ بچے گا تو لازم آوے گا
کہ خود اپنے آپ لوگوں کو بدگمان کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ علماء اپنی جائدادیں تلف
کر دیں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس میں جو توسیع ہوتی ہے اُس سے بچیں کیونکہ وہ
غیر ضروری ہے۔ پس غیر ضروری کے لئے متہم ہونا مناسب نہیں۔ یہ وجہ ہے
جس لئے میں کہتا ہوں کہ اہل علم کے لئے تقلیل تعلقات (تعلقات میں کمی کرنا)
مناسب ہے۔ تو یہ بھی اُسی اصل کی فرع ہے کیونکہ اس میں خود غرضی کے ایہام
سے بچنے کو کہا گیا ہے اور توسیع تعلقات کی صورت میں نصیحت کرنے سے
خود غرضی کا ایہام ہوتا ہے پس اس ایہام سے بچنا لازم ہے اور اس سے بچنے

کی یہی صورت ہے کہ توسیع تعلقات کو ترک کیا جاوے نہ یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر (یعنی اچھے کاموں کا امر کرنا اور بری باتوں سے روکنا) ہی کو ترک کر دیا جاوے کیونکہ وہ تو مامور بہ ہے۔ پس یہ بھی اسی کی ایک فرع ہوئی۔ یہ طلباء کے کام کی بات ہے کیونکہ یہ پڑھ کر مقتدا بنیں گے اُس وقت اُن کو اس سے فائدہ ہوگا۔

مقامِ اتہام سے بچنا ایک فرع یہ بھی ہے کہ اہل علم کو کبھی کسی کا فیصلہ نہ لینا چاہیئے کیونکہ اس سے بھی بدگمانی ہوتی ہے جس کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے وہ ان سے بدگمان ہو جاتا ہے اور مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کیونکہ اوّل میں بعض مواقع میں مجھ سے ایسی غلطی ہوگئی ہے کہ میں نے فیصلہ لے لیا ہے مگر اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔ پھر مجھے تجربہ ہو گیا۔

چنانچہ اوّل اوّل جب میں وطن گیا تو لوگ اپنے فیصلے لاتے تھے۔ ایک مکان کا فیصلہ تھا میں نے محنت کر کے جزئیات فقہیہ تلاش کیں اور اُس کے موافق فیصلہ لکھا مگر جس کے خلاف تھا اُس نے اُس کو نہیں مانا۔ آخر وہ معاملہ سرکار میں لے گئے۔ میرے فضول کئی دن اس میں برباد ہوئے۔

ایک اور فیصلہ تھا کہ اُس میں ایک فریق تو ایک عورت تھی اور دوسرا فریق ایک مرد تھا۔ اُس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ لو دو ہی مرتبہ میں مجھے تجربہ ہو گیا کہ اہل علم کو ہرگز فیصلے میں نہ پڑنا چاہیئے۔ اُس وقت سے میں نے یہ تجویز کر لی ہے کہ جو میرے پاس فیصلہ لاتا ہے اُس سے کہہ دیتا ہوں کہ فیصلہ تو عمائد کے پاس لیجاؤ انہیں سے فیصلہ کراؤ۔ لیکن اگر شاید وہ مسائل اور احکام شریعت سے واقف

نہ ہوں تو اس وقت یہ ہونا چاہیئے کہ فریقین متفق ہو کر ایک استفتاء لکھیں جس پر دونوں کے دستخط ہوں اور اگر استفتاء کے مضمون پر فریقین کا اتفاق نہ ہو تو اس میں بھی عمائد سے رجوع کریں تاکہ وہ تنقیح کر کے استفتاء کے مضمون کو درست کریں اور جب مضمون منقح ہو جاوے تو اس پر دونوں فریق دستخط کریں اور میرے پاس لاویں تو میں جواب لکھ دوں گا تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک نے کچھ اپنے موافق لکھ کر فتویٰ حاصل کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہو کہ پھر دونوں کو عدالت میں جا کر کھڑا ہونا پڑے اور وہ فتوے بیکار رہ جاویں اور بدنامی بھی ہو کہ کوئی مولوی کچھ لکھتا ہے اور کوئی کچھ لکھتا ہے پس بہتر یہ ہے کہ فتویٰ تو لیں علماء سے اور اس کو نافذ کرائیں عمائد اہل شہر سے کیونکہ فیصلہ کرنا عمائد اور اہل اثر کا کام ہے۔ سو میں نے یہ معمول اختیار کیا ہے۔

فیصلہ لینے میں ضرر یہ دیکھا کہ جب دو فریق باہم مخالف ہو کر فیصلہ کے لئے قضیہ لاویں گے تو ضروری بات ہے کہ فیصلہ ایک کے موافق ہوگا اور دوسرے کے خلاف۔ تو بعض اوقات تو وہ فیصلہ واقع کے موافق ہوتا ہے اور بعض مرتبہ واقع کے خلاف ہوتا ہے کیونکہ فیصلہ کرنے والا عالم الغیب تو نہیں ہے کہ اس کو صحیح واقعات کا علم ضروری ہو۔ پس ممکن ہے واقعات اس فیصلہ کرنے والے سے مخفی رہیں اور معلوم نہ ہو سکیں۔ ہر چند کہ ایک فریق ظاہر کرتا ہے مگر دلیل نہ دے سکنے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ پس اگر فیصلہ واقعات کے خلاف ہوا تو عوام گالیاں دیتے ہیں کہ یہ کیا اندھوں کی طرح فیصلہ کیا ہے بس معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ان کی سفارش کر دی ہے اس وجہ سے ایسا فیصلہ کر دیا۔ سو یہ نتیجہ ہوتا ہے اور ہارنے والے کو اس روز سے اس مقتدار سے دینی تعلق کم ہو جاتا ہے جس سے

اس کا دینی ضرر ہوا۔ اگر فیصلہ واقعات کے خلاف ہے تب تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اور اگر واقعات کے مطابق بھی ہو جب بھی اکثر لوگ اس فیصلہ کرنے والے کو ایک فریق کے ساتھ ضرور سمجھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں اس کا دینی اثر ہونا ممکن تھا وہاں بھی یہ لوگ اس میں کھنڈت ڈالتے ہیں اور ان کو اس کی طرف سے بدگمان کرتے ہیں۔ سو اس کا وہ قصہ ہو جاتا ہے کہ ؎

غضب ایک پیر کے واسطے تو نے بستاں کو جلا دیا

ایک ذرا سے فائدہ کے لئے کہ فیصلہ کرنے سے ہمارا لوگوں میں اثر ہوگا جس سے دینی کام لیں گے۔ بہت لوگوں کو اپنے سے بدگمان کر لیا اور ان پر جو دینی اثر ہوتا اس کو غارت کر دیا۔ اور عجب نہیں کہ حضرت ابوذرؓ کو حضورؐ نے اسی لئے یہ مشورہ دیا ہو کہ

دَتَلِیَنَّ مَالَ یَتِیْمٍ وَلَا تَقْضِیَنَّ بَیْنَ اِثْنَیْنِ

یہ حدیث طویل کا ایک جزو ہے۔ اس میں یہ مضمون ہے کہ حضورؐ نے ابوذرؓ سے فرمایا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں تمہارے لئے وہی پسند کرتا ہوں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ایک تو یتیم کے مال کا متولی نہ بننا۔ دوسرے تم پنچ نہ بننا اور اس کی وجہ یہ فرمائی کہ اِنِّیْ اَرَاکَ ضَعِیْفًا کہ تم ضعیف ہو ان کاموں کا تحمل نہیں کر سکوگے اور عدم تحمل کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ نازک تھے پس جب فیصلہ کرنے کے بعد کوئی مخالفت کرے گا تو پریشان ہو جاویں گے اور ان کی مخالفت اور اعتراضات کا تحمل نہ کر سکیں گے برخلاف اس کے کہ فیصلہ کرنے والا صاحب حکومت ہو جیسے شیخین کہ ان کے فیصلے کی اول تو مخالفت نہیں کی جاتی اور اگر کی جاوے تو وہ مخالفت کو رفع فرما سکتے ہیں۔

برخلاف ایک ایسے بزرگ کے جن کو اختیارات حاصل نہ ہوں کہ وہ مخالفت کو رفع نہیں کر سکتے۔ پس یہ بھی اُس اصل کی ایک فرع ہو سکتی ہے کہ خود غرضی کے ایہام سے بچیں ۔۔۔۔

فقہاء نے ایسا ہی ایک جزیہ لکھا ہے کہ علماء کو گواہی دینا مناسب نہیں اور وجہ یہ لکھی ہے کہ اگر یہ کسی کی طرف سے گواہی دیں گے تو فریق مقابل کو اُن سے عداوت ہو جاوے گی لہٰذا اُن کو گواہی دینا مناسب نہیں ہے۔ پس فقہاء کے اس قول سے اُس امر کی تائید ہوتی ہے کہ علماء کو فیصلہ نہ دینا چاہئے۔ اور فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ علماء کو مناسب نہیں کہ ہر جگہ کی دعوت قبول کریں۔ پس جب انہوں نے دیکھا کہ عوام کا علماء سے کتنا تعلق ہے اور اُن کا منصب کیا ہے تو یہاں تک مشورہ دیا کہ ہر جگہ کی دعوت بھی نہ قبول کی جاوے اور اُس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ لوگ دعوت کر کے حقیر سمجھتے ہیں۔ اور طلبہ کی دعوت تو آج کل اسی خیال پر کرتے ہیں کہ بلائیں دفع ہوں گی تو گویا طلبہ بلا خوار ہوئے۔

عوام کے اس خیال کے قرائن یہ ہیں کہ اکثر صدقہ میں عوام نے کائی چیزیں پسند کی ہیں مثلاً یہ کہ وہ تیل اور ماش دیتے ہیں اور پھر اس کے لئے تجویز کیا ہے مہتروں کو کہ وہ بھی اکثر کالے ہوتے ہیں۔ پس اس شدت کے ساتھ کالے ہونے کی رعایت کرنے سے معلوم ہوا کہ اس بلا کو صدقہ میں لپٹا ہوا خیال کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جو شخص اس کو کھائے گا بلا اُس کے ساتھ ہی جاوے گی تو ایسوں کو تجویز کرد جن کے ضرر پہنچنے سے کوئی رنج نہ ہو۔ اس لئے کہیں تو مہتروں کو تجویز کیا اور کہیں طلباء کو تجویز کیا کہ طلبا سے زیادہ کون مفت کا ہو گا۔ تو یہ حال ہے لوگوں کا۔

میں نے تو اسی لئے اپنے یہاں یہ طریقہ مقرر کر دیا ہے کہ طلباء کو دعوت میں جانے کی اجازت نہیں بلکہ بعض لوگوں نے طلباء کا کھانا اپنے یہاں مقرر کرنا چاہا تو میں نے کہہ دیا کہ اگر اپنے ملازم کے ہاتھ دونوں وقت مہذب طریقہ سے بھیج سکو تو منظور کیا جاوے گا ورنہ نہیں۔ طلباء تمہارے در پر کھانا لانے کے واسطے نہ جاوینگے تو وجہ یہ ہوئی کہ عوام کی حالت سے میں نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ وہ اُن کی تذلیل کرتے ہیں۔ تو اس صورت میں اُن کو اپنی حفاظت کی ضرورت ہے۔

دنیا داروں کو نصیحت

عوام اہل علم کی نسبت بالکل یہ سمجھتے ہیں کہ چندیں شکل برائے اکل (اتنی شکلیں کھانے کے لیے ہیں) کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں سب اپنے کھانے کے لئے کرتے ہیں۔ کوئی مدرسہ قائم کرے اور اُس کی خدمت اور امداد کے لئے چندہ کرے مگر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اپنے لئے وصول کرتے ہیں اور مدرسہ کا صرف بہانہ ہے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ علماء کو اس میں ہرگز نہ پڑنا چاہیے بلکہ علماء تو پڑھاویں اور چندہ کریں اہل دنیا۔ مگر اب اہل دنیا نے اس کام کے لئے بھی علماء ہی کو تجویز کیا ہے۔ سو کام تو سارے علماء کریں اور دنیا دار صرف اُن پر الزام لگانے کے لئے ہوں۔ اور افسوس ہے کہ جتنی کچھ مضرتیں پہنچ رہی ہیں۔ اُن سب کا الزام علماء پر لگایا جاتا ہے۔

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اُن کو چاہیئے کہ تبلیغ اسلام میں سعی کریں اور دنیا کا کچھ کام نہ کریں۔ مگر اس میں علماء کوتاہی کرتے ہیں کہ غیر ممالک میں تبلیغ کرنے نہیں جاتے بلکہ دنیا کے کاروبار میں لگ جاتے ہیں۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ آخر علماء کھائیں کہاں سے۔ اس وقت تو جو صورت کسی کو میسر ہوئی اُس میں مشغول ہیں کہ کوئی

مطلب کر رہا ہے کوئی کچھ کر رہا ہے۔ حالانکہ اہل علم اس سے تنگ ہیں مگر کیا کریں
پس یہ حضرات جو رائے دیتے ہیں ایک مد بھی تو ایسی کھولدیں جس سے اہل علم کی
کفالت ہوتی رہے اور اس وقت تو علماء اپنی معاش کی بھی فکر کرتے ہیں اور جتنی ہو
سکتی ہے دین کی بھی خدمت کرتے ہیں۔ پس یہ عجیب بات ہے کہ یہ حضرات علماءؑ
کو رائے تو یہ دیتے ہیں اور جب ان سے علماء کے کھانے کی صورت پوچھی جاتی ہے
تو کہتے ہیں کہ چندہ کریں۔ تو مولویوں کو اکبر کے بھانڈ کا ہاتھی مقرر کیا ہے۔

مشہور ہے کہ اکبر نے کسی بھانڈ کو ایک ہاتھی انعام میں دے دیا تھا اور
اُس کی خوراک کے لئے کچھ دیا نہیں۔ پس اس بھانڈ نے یہ کیا کہ جب اکبر کی سواری اُدھر
کو نکلی تو اُس طرف اُس ہاتھی کے گلے میں ڈھول ڈال کر چھوڑ دیا۔ اکبر کی سواری جب
وہاں پہنچی اور اُس ہاتھی کو اس حالت میں دیکھا تو اُس بھانڈ کو بُلا کر دریافت کیا کہ تو
نے ایسا کس واسطے کیا۔ اُس نے کہا کہ میرے اندر اتنی وسعت کہاں ہے کہ اس کو
اپنے پاس سے کھلاؤں۔ اس لئے میں نے اس کے گلے میں ڈھول ڈال دیا ہے
کہ بھائی جیسے ہم مانگ کر کھاتے ہیں اسی طرح تو بھی مانگ اور کھا۔

اب ہمارے بھائی علماء کے لئے یہی منصب تجویز کرتے ہیں کہ مانگو اور کھاؤ
کتنی بڑی غیرت کی بات ہے۔ یہ تو آپ غنیمت سمجھتے نہیں کہ علماء آپ کو تنگ نہیں
کرتے اور تقاضا نہیں کرتے حالانکہ اُن کا حق ہے اس لئے وہ تقاضا کر سکتے ہیں
کیونکہ آپ کے ذمے اُن کا دین ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا
کہ صدقہ اُن لوگوں کا حق ہے کہ اللہ کے کام میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ نہ تجارت
کرتے ہیں نہ زراعت کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک شخص سے دو کام نہیں ہوتے تو للفقراء

میں لام استحقاق کا ہے کہ اُن کا حق ہے۔ تو حق تعالیٰ کی تصریح سے اُن کا فرض دیانتہً واجب ہے پس جب کہ ان کا حق ہے تو وہ مطالبہ بھی کر سکتے ہیں مگر غیرت علم کی وجہ سے مطالبہ نہیں کرتے کیونکہ علم وہ چیز ہے کہ صاحب علم کے دماغ میں اُس سے علو اور استغنار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ جو لوگ اس وقت اِدھر اُدھر وعظ کے ذریعہ سے مانگتے اور علماء کے طبقہ کو ذلیل کرتے پھرتے ہیں ان میں دینداری تو کیا استعداد علمی بھی نہیں ہے تو یہ علماء نہیں ہیں۔ بس یہی ہے کہ اِدھر اُدھر کے مضامین یاد کر لئے ہیں۔ اب انہی پر لوگ اور علماء کو بھی قیاس کرتے ہیں حالانکہ جو عالم ہو گا گو با عمل نہ ہو پھر بھی وہ ایسی حرکتوں سے علم کی تذلیل نہ کرے گا۔ اس لئے وہ کونے میں پڑے ہیں نہ تقاضا کرتے ہیں نہ مطالبہ۔ سو اس حالت کو غنیمت نہیں سمجھتے بلکہ ان پر اعتراض کر کے اُن کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم بھی ہمارے عیب نکالو۔ پس یہ رائے بالکل نامناسب ہے کہ علماء چندہ مانگیں۔ چندہ تو اور لوگوں کو کرنا چاہیئے یہ کام علماء کا نہیں ہے کیونکہ اس میں علماء پر خود غرضی کا شبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ علماء جب چندہ مانگتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ چندہ وصول کر کرا کے اپنے پاس رکھ لیں گے۔ پس علماء کو چاہیئے کہ اس سے بچیں۔ تو یہ بھی اسی اصل کی ایک فرع ہے۔

سفارش اور اُس کی حقیقت

ایک فرع اُسی کی یہ ہے کہ پیر کو چاہیئے کہ اپنے مریدوں کے دنیا کے جھگڑوں میں نہ پڑے کیونکہ اس میں بھی خود غرضی کا شبہ ہو جاتا ہے۔ پھر اُن کے معاملات میں سے جو کھلی معصیت ہوں اس میں تو نہ پڑنا اور شرکت نہ کرنا ظاہر ہے اور جو معاملہ ایسا ہو کہ اُس کو اُس کی تحقیق نہیں تو اُس میں بھی نہ پڑے کہ اُس کی تفتیش شروع کر دے اور

اسی میں داخل ہے اپنے معتقدوں کی سفارش کرنا۔ آج کل سفارش بھی نہ کرنا چاہیے اس میں بھی خود غرضی کا شبہ ہے کیونکہ اس زمانہ میں سفارش سفارش نہیں رہی سفارش کی حقیقت ایک قصہ سے معلوم ہوگی

وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت بریرہؓ لونڈی تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا اور شرعی قانون یہ ہے کہ لونڈی جب آزاد ہو تو اس کو اختیار رہے کہ اپنے خاوند سے الگ ہو جاوے۔ پس جب یہ آزاد ہوئیں تو اپنے شوہر سے علیحدہ ہو گئیں۔ حضرت مغیثؓ ان کا نام تھا۔ ان کی یہ کیفیت تھی کہ روتے ہوئے ان کے پیچھے پھرتے تھے تاکہ حضرت بریرہؓ ان سے الگ نہ ہوں۔ ایک مرتبہ حضرت عباسؓ سے حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اس پر تعجب ہے کہ مغیث تو بریرہ سے اس قدر محبت رکھتے ہیں اور بریرہ مغیث سے اس قدر بغض رکھتی ہیں۔ چنانچہ پھر بنفس نفیس خود حضورؐ نے بریرہؓ سے مغیث کی سفارش کی کہ ان سے علیحدہ مت ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ سفارش کرتے ہیں یا امر کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ امر تو نہیں کرتا۔ پس انہوں نے جواب دیا کہ جب امر نہیں ہے تو میں نہیں قبول کرتی ــــــ،

سو حضرت بریرہؓ کیسی قانون داں تھیں کہ دریافت کر لیا کہ امر ہے یا سفارش۔ اگر امر ہو تو اس کا قبول کرنا لازم ہے اور سفارش ہو تو نہیں۔ یہ ہے آزادی۔ خیال تو کیجیے کہ کجا بریرہ اور کجا حضور صلے اللہ علیہ وسلم۔ مگر نہایت آزاد ہو کر سوال کرتی ہیں کیونکہ جانتی ہیں کہ شریعت نے جو دعویٰ کیا ہے اسی پر عمل بھی ہے اور یہ بھی ایک بڑا فرق ہے شریعت اور دوسرے قوانین میں کہ شریعت میں

دعویٰ کے ساتھ عمل بھی ہے اور اور جگہ دعویٰ تو ہے مگر اُس کے ساتھ عمل نہیں۔

مثلاً مساوات کہ اس وقت اصول تمدن میں ہے اور اسی کی ایک شاخ خبط آمیز یہ نکلی ہے کہ عورت اور مرد مساوی ہوں۔ سو ان لوگوں نے مساوات کا مطلقاً دعویٰ کیا ہے اور شریعت بھی ایک حد کے اندر مساوات کا دعویٰ کرتی ہے لیکن شریعت کے دعویٰ میں اور دوسرے لوگوں کے دعویٰ میں دو فرق ہیں۔ ایک تو یہ فرق ہے کہ شریعت نے مطلق مساوات کا دعویٰ نہیں کیا ہے بلکہ اُس کی ایک حد مقرر کر دی ہے اور دوسرے لوگ مساوات مطلقہ کے مدعی ہیں۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ شریعت میں عمل بھی ہے کہ جو متبع شریعت ہیں وہ اس پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں میں جو مساوات مطلقہ کے مدعی ہیں اُن میں عمل نہیں۔

تو شریعت نے جو قانون مقرر کیا ہے عمل کرنے کے لئے مقرر کیا ہے کہ ادنیٰ رعیت سے لے کر پیغمبر تک کو اس پر عمل کرنا ہوگا۔ خیال تو کیجئے کہ خود حضور سفارش کرتے ہیں اور حضرت بریرہؓ اُس پر سوال کرتی ہیں کہ امر ہے یا سفارش ہے اور جب کہا جاتا ہے کہ امر نہیں ہے سفارش ہے تو وہ کہتی ہیں کہ میں نہیں مانتی! اب تو کوئی کسی اُستاد سے یا کسی پیر سے یا باپ سے ایسا کر دیکھے۔ غرض یہ کہ اس قصے سے سفارش کا درجہ معلوم ہو گیا کہ سفارش یہ ہے کہ جس کے پاس سفارش لے جائیں اُس کو مجبور نہ ہونا پڑے۔ خلاصہ یہ کہ اُس پر زور نہ ڈالا جاوے۔

اب آج کل کی سفارش دیکھئے کہ اوّل ہی سے زوردار الفاظ کی فکر ہوتی ہے حالانکہ سفارش کے لئے لازم ہے کہ زور نہ ہو اور یہ قاعدہ ہے کہ اِذَا انْتَفَی اللَّازِمُ انْتَفَی الْمَلْزُوْمُ یعنی جب لازم نہ ہو تو ملزوم بھی نہیں ہو سکتا۔ تو جب سفارش کے

لئے زور نہ ہونا لازم ہے اور اب زور ڈالا جاتا ہے جو لازم کا نقیض ہے تو لازم نہیں پایا گیا پس ملزوم بھی نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ آج کل کی سفارش سفارش نہیں رہی۔

دوسرے سفارش کی یہ بھی پہچان ہے کہ اگر وہ شخص اس کو قبول نہ کرے تو اس سفارش کرنے والے کو گراں نہ ہو اور نہ اُس کے دل میں رنج ہو لیکن آج کل کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ شخص سفارش قبول نہ کرے تو سفارش کرنے والے کو بہت صدمہ ہوتا ہے اور بے انتہا گراں ہوتا ہے پس سفارش کی جو علامت تھی، وہ بھی نہیں پائی جاتی۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں ڈھاکہ گیا اور نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے اُن سے کہا کہ اب لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ میری آپ سے ملاقات بہت ہو گئی ہے اس لئے وہ مجھ سے سفارشیں کرائیں گے۔ پس اگر کوئی مجھ سے آپ کے پاس سفارش لکھوا کر لائے تو آپ اس سے مجبور ہو کر اپنے مصالح کے خلاف نہ کریں۔ انہوں نے ایک عجیب بات کہی کہ میں اس پر عمل ہی نہ کروں گا تاکہ لوگ جلدی ہی آپ کو دق کرنا چھوڑ دیں۔

پس یہ ہے سفارش کہ مخاطب کو بالکل آزادی ہو۔ اس پر کسی طرح کا جبر اور دباؤ نہ ہو۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ آج کل کی کیا حالت ہے۔ سفارش کرنے والے کس قدر زور اور دباؤ ڈالنے کی فکریں کرتے ہیں اور اگر وہ ان کی سفارش پر عمل نہ کرے تو تمام عمر شکایت رہتی ہے کہ ہماری بے قدری ہوئی۔ الغرض آج کل کے لوگوں کی سفارش حضورؐ کی سفارش سے بھی زیادہ ہو گئی۔ حضورؐ کی سفارش کو تو

بریرہؓ نہیں کہ میں نہیں مانتی اور حضورؐ کی بے قدری نہ ہو اور آج کل اگر سفارش نہ قبول ہو تو بے قدری ہوتی ہے۔ تو اس قسم کے قصوں میں پڑنا مناسب نہیں ہے نہ اس وجہ سے کہ سفارش بُری چیز ہے بلکہ اس لئے کہ اب وہ سفارش نہیں رہی البتہ اگر ایسے قیود اس میں مصرح ہوں جس سے مخاطب کو معلوم ہو جاوے کہ ان کو دباؤ ڈالنا مقصود نہیں۔ مثلاً یہ کہ واللہ اگر قبول نہ کروگے تو ہم بُرا نہ مانیں گے۔ اور تم اپنی طبیعت پر بار نہ ڈالنا۔ اگر ایسی صفائی سے کی جاوے تو جائز ہے۔ لیکن اگر ایسا کرو تو خط لے جانے والا ہی نہیں رکھ دے۔ پس ملاحظہ فرمایئے سفارش سفارش نہیں رہی ورنہ سفارش تو موجب اجر ہے اُس سے کیسے ممانعت ہو سکتی ہے۔

غرض آج کل علماء اور مشائخ کو زور ڈالنا مناسب نہیں ورنہ اس سے خود غرضی کا شبہ ہوگا کیونکہ اُن کی غرض آپ کی غرض سمجھی جاتی ہے اور اسی وجہ سے سفارش کے قبول کرنے میں ان پر احسان سمجھا جاتا ہے۔ تو ان کو مناسب نہیں کہ کسی کے احسان کو اپنے اوپر لیں۔ اگر اُس شخص کے ساتھ احسان ہی کرنا ہے تو مناسب ہے کہ خود ہی احسان کریں اور اُس کی حاجت پوری کرنے کو دوسرے کو نہ کہیں کہ وہ ان پر احسان رکھے۔

علماء اور دنیا اسی طرح علماء کو لوگوں کے رشتہ ناتوں میں بھی نہ پڑنا چاہیئے اور مجھے سفارش کرانے والوں پر تعجب ہوتا ہے کہ بزرگوں کو انہیں قصوں کا کر دیا ہے گویا انہوں نے تسبیح اسی لئے لی ہے کہ لوگوں کی دنیا کو درست کیا کریں۔ جس نے اپنی دنیا پر لات ماردی ہے اُسے دوسروں کی دنیا درست کرنے سے کیا غرض۔ اُن کے پاس دنیوی جھگڑے لے جانے کی ایسی

مثال ہے کہ جیسے سنار سے کوئی شخص کھرپا درست کراوے۔ سو علماء اور مشائخ تو صرف اس کام کے ہیں کہ ان سے شریعت کے احکام اور مسائل پوچھو۔ امراض باطنی کا ان سے علاج کراؤ۔ یہ کیا واہیات بات ہے کہ لڑکی کا رشتہ کرتے ہیں وہ لوگ اس کام کے نہیں۔

یہاں سے بطور فرع کی فرع کے سمجھ میں آیا ہوگا کہ جب زندوں سے دنیا کے کام لینا منع ہے تو مردوں سے بدرجہ اولیٰ منع ہوگا۔ اب لوگ قبروں پر جاکر ان سے دنیا کے کاموں میں مدد اور اعانت چاہتے ہیں۔ اور قبروں پر جانے میں بالکل یہی اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ممد (مددگار) و معاون ہو جاویں گے سو یہ اور بھی بے ادبی ہے اس لئے کہ وہ حضرات مقرب ہیں اور جب دنیا میں زندہ رہ کر دنیوی تذکروں اور جھگڑوں کو پسند نہیں فرماتے تھے تو اب عالم آخرت میں جاکر کیسے پسند کریں گے جب کہ امور آخرت میں مستغرق بھی ہیں اور ایسی حالت میں ان سے دنیوی قصوں میں مدد چاہنا دین کے خلاف تو ہے ہی نیز عقل کے خلاف بھی تو ہے کیونکہ جب دنیا ان کے پاس نہیں رہی تو ان سے دنیا مانگنا اور یا دنیوی کاموں میں مدد اور اعانت کی خواہش کرنا کیسے عقل تسلیم کر سکتی ہے۔ ہاں ان سے وہ چیز مانگو جو ان کے پاس ہو۔ تو اب بھی صاحب نسبت ان سے فیض حاصل کر سکتا ہے اور روپیہ اور بیٹا تو ان کے پاس ہے بھی نہیں۔ پھر وہ تم لوگوں کو کیسے دیں گے۔ کوئی قبر کھول کر دیکھے تو وہاں ایک روپیہ بھی نہ ہوگا تو پھر ایسی چیزیں ان سے مانگو جو ان کے پاس بھی نہیں کیسی بے عقلی کی بات ہے۔

رہا یہ خیال کہ وہ دعا کر دیں گے تو ایسا کون خیال کرتا ہے۔ کوئی بڑا ہی خوش

عقیدہ ہوگا کہ اس خیال سے قبروں پر جاتا ہوگا ورنہ عام عقیدہ تو یہی ہے کہ وہ خود دیتے ہیں۔

چنانچہ کانپور میں ایک بڑھیا ایک شخص کے پاس آئی کہ بڑے پیر صاحب کی نیاز دے دو۔ انہوں نے کہا کہ بڑی بی نیاز تو اللہ میاں کی دیئے دیتا ہوں اور ثواب بڑے پیر صاحب کو پہنچائے دیتا ہوں۔ اُس نے جواب دیا کہ نہیں اللہ میاں کی نیاز تو میں دلا چکی۔ اس پر بڑے پیر صاحب ہی کی نیاز دے دو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عوام بزرگوں کو صاحب اختیار بالاستقلال سمجھتے ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ جامع مسجد میں ایک بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ ایک پُرزہ تعزیہ میں لٹکانے کو لکھ دو۔ ہم نے کہہ دیا کہ یہاں کسی سے ایسا پرزہ لکھنا نہیں آتا۔

ایک اور قصہ مجھے یاد آیا۔ ایک صاحب یہاں تک بیان کرنے لگے کہ میں نے تعزیہ میں ایک پتلا موم کا رکھا دیکھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ پتلا کیسا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ پتلا اس واسطے رکھا ہے کہ لڑکا اس شکل کا ہو۔

ایسا ہی ایک اور قصہ ہے کہ ایک شخص نے ایک عرضی لٹکائی اور اولاد کی درخواست کی۔ ایک شخص نے اُس عرضی کے نیچے یہ جواب لکھ دیا کہ تمہاری بیوی بانجھ ہے اُسے طلاق دے کر دوسری شادی کرو اور یہ شعر لکھ دیا ؎

زمینِ شورہ سنبل بر نیارد ۔۔۔ درو تخمِ عمل ضائع مگرداں

یعنی شور زمین میں سنبل نہیں اُگتا اس میں تخمِ عمل ضائع نہ کرو۔

اور اس کے نیچے لکھ دیا۔ راقم امام حسین۔ عرضی والے نے جو اس جواب کو دیکھا تو بہت بگڑے کہ یہ کس نے میرے ساتھ مذاق کیا۔ کسی نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ اور کسی نے لکھ دیا ہے ممکن ہے کہ یہ انہوں نے ہی لکھ دیا ہو کیونکہ اگر وہ اس کے پڑھنے پر قادر ہیں تو لکھنے پر بھی ضرور قادر ہوں گے۔ لہذا ممکن ہے کہ خود حضرت امام ہی لکھ گئے ہوں۔ سو آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے اور یہ ادب اور شریعت اور عقل سب کے خلاف ہو رہا ہے۔

غرضیکہ جب زندوں سے اس قسم کی باتیں کرنا خلاف ادب ہے تو مردوں سے تو اور بھی زیادہ خلاف ادب ہوں گی۔ اُن حضرات کو ایسی باتوں سے ایسی نفرت ہوتی ہے جیسے کسی مہذب مجلس میں پاخانہ پیشاب کے ذکر سے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان حضرات کو تو دنیا کے تذکرہ سے بھی نفرت ہوتی ہے۔

حضرت رابعہ کے یہاں چند بزرگوں نے دنیا کی مذمت کی تو انہوں نے فرمایا کہ تم میرے پاس سے کھڑے ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو دنیا کی محبت ہے مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ۔ (جس شخص کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے اس کا ذکر اکثر کرتا ہے۔)

یہاں ایک طالب علمی شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی تو دنیا کی مذمت فرمائی ہے تو کیا معاذ اللہ حضورؐ کو دنیا کے ساتھ محبت تھی۔ سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے لئے مذمت فرمائی ہے کہ جو لوگ اس کو مذموم نہیں سمجھتے یعنی عوام کے لئے۔ سو وہاں مذمت کرنے کی ضرورت تھی اور جہاں کہ سب زاہد ہوں اور دنیا سے نفرت کرنے والے

اور دنیا کو مذموم سمجھنے والے ہوں۔ وہاں اُس کی مذمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس حضورؐ کے مذمت فرمانے پر اس کو قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ یہ حضرات تو خود دنیا کو مذموم سمجھتے ہیں پھر اُن سے مذمت کرنے کی کیا ضرورت ہوئی۔ البتہ اگر کسی جلسہ میں محبِ دنیا موجود ہوں تو وہاں چونکہ دنیا کی مذمت کی ضرورت ہے لہذا مذمت کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ اہلِ حال کو مذمت کے ساتھ بھی دنیا کا ذکر پسند نہیں ہے۔

اب یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ دنیا کی مذمت کرنے سے اُس کا محب ہونا کیسے لازم آیا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ بلا ضرورت مذمت بھی اُسی شے کی کی جاتی ہے جس کی کچھ قدر ہو۔ دیکھئے پیشاب پاخانہ کی کوئی مذمت نہیں کرتا پس مذمت کرنے سے ایسی حالت میں یہ مقصود ہوتا ہے کہ ہم ایسے عالی ہمت ہیں کہ دنیا جیسی عزیز چیز کو بھی نگاہ میں نہیں لاتے۔ اس وجہ سے حضرت رابعہؒ نے فرمایا کہ تم دنیا کو دوست رکھتے ہو۔

غرض یہ کہ علماء کے پاس دنیا کے جھگڑے نہ لے جانے چاہئیں اور علماء کو بھی ایسا خوش اخلاق ہونا مناسب نہیں ہے کہ لوگوں کے کہنے سے ان قصوں میں پڑنا گوارا کر لیں اور اگر کہئے کہ لوگ دق کرتے ہیں تو یہ کیجئے کہ اُن سے کہئے کہ خود سفارشی مضمون کا مسودہ لکھ دیں اور پھر اسی کی نقل کر کے اُن کو دے دیجئے اور جس کے پاس وہ سفارش کی گئی ہے۔ ایک خط اُس کے پاس براہِ راست بھیج دیجئے کہ اس مضمون کا ایک خط تمہارے پاس آوے گا۔ تم اُس سے متاثر نہ ہونا۔ چنانچہ میں ایسا ہی کرتا ہوں۔

اگر کوئی کہے کہ ایک کلمہ سے کسی کا بھلا ہو جاوے تو اس میں کیا مضائقہ ہے تو میں کہوں گا کہ گو سفارش کرانے والے کا نفع ہوتا ہے مگر اُس بے چارہ کا نقصان بھی تو ہوتا ہے جس کے پاس سفارش کی جاتی ہے کہ اس کو دب کر ماننا پڑتا ہے چاہے اُس کے مصالح کے کتنا ہی خلاف ہو تو یہ اچھی نفع رسانی ہوئی کہ اس سے دوسرے کو نقصان پہنچا۔ ایک کا تو ہوا نقصان اور دوسرے کا نفع۔

حَفِظْتَ شَیْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ اَشْیَاءُ

(یعنی ایک کی نفع رسانی ہوئی دوسرے کے بہت سے مصالح فوت ہو گئے)

اُس کے نفع کا تو خیال ہوا اور دوسرے کے نقصان کا خیال نہ ہوا۔ خلاصہ یہ کہ علماء کو لوگوں کے دُنیا کے قصوں میں نہ پڑنا چاہیئے۔ یہ بھی اسی اصل کی فرع ہے۔ اور بھی بہت سے اس اصل کے فروع ہیں مگر جو کچھ بیان ہو گئے کافی ہیں اس لئے اور ضرورت نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے خود غرضی کا شبہ ہو۔

حقوق والدین

اب میں اصل بیان کی طرف آتا ہوں کہ حضرت لقمان علیہ السلام نے اسی ایہام خود غرضی سے بچنے کے لئے حقوق والدین کا ذکر نہیں کیا تھا اس لئے حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اس کو ذکر فرمایا ہے کہ

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حَمَلَتْهُ الآیۃ

ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی۔ اس کی ماں نے اس کو پیٹ میں رکھا۔

اور حقوق والدین کے بعد فرماتے ہیں کہ والدین کی اطاعت علی الاطلاق نہیں بلکہ اسی وقت تک ہے جب تک خدا کے خلاف نہ کہیں اور اگر وہ خدا کے خلاف کوئی بات کہیں تو۔ نہ مانو اور دنیا میں اُن کے ساتھ بھلائی کرو۔ یہ تو ربط کے لئے بیان کیا گیا۔ اب آگے وہ جملہ ہے جس کا بیان اس وقت مقصود ہے وہ یہ ہے کہ

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ـــــ

یعنی اُن کے رستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کہ میری طرف سے ہٹاتے ہیں اُن کی اطاعت نہ کرو گو ماں باپ ہی ہوں۔ بلکہ اُن کی اطاعت کرو جو کہ میری طرف متوجہ ہوئے اور اس کے مابعد میں وعید فرمائی ہے کہ چونکہ میرے پاس تم سب کو آنا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اُن لوگوں کا اتباع کرو جو کہ میری طرف متوجہ ہوئے ورنہ اگر تم ایسا نہ کروگے تو پھر ہم تم کو بتائیں گے کہ تم نے کیا کام کئے۔ یہ مقام کا حاصل ہوا اختصار کے ساتھ۔

پس اس جملہ کا مطلب تو معلوم ہو گیا۔ اب مجھ کو اس سے ایک مسئلہ کا ذکر کرنا ہے جو بہت ہی معرکۃ الآرا مسئلہ ہے اور ہر چند کہ مسلمان کے لئے وہ کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا مگر ہماری ناحقیقت شناسی کی وجہ سے وہ معرکۃ الآرا ہو گیا وہ مسئلہ ہے اتباع کا۔

اتباع کے معنی — اتباع کے معنی تو سب کو معلوم ہیں لیکن اس کے محل میں اختلاف ہو گیا کہ اتباع کے قابل کون ہے۔ یہ مسئلہ

مسلمان کے لیئے تو معرکۃ الآرا اس لیئے نہ ہونا چاہیئے تھا کہ مسلمان من حیث مسلمان (اس حیثیت سے کہ وہ مسلمان ہے) کو خدا کے حکم کی اطاعت کرنی چاہیئے کیونکہ مسلمان رعیت خدا کی ہے اور جس کی رعیت ہیں اسی کے حکم کی اطاعت بھی کرنی چاہیئے۔

یہ مثال میں اس لیئے اختیار کرتا ہوں کہ آج کل کوئی بات بدون نظیر کے نہیں مانی جاتی۔ سو اس نظیر میں غور کیجیئے تاکہ اس سے یہ سمجھ میں آجاوے کہ مسلمان ہونے کا مقتضا ہی ہے کہ خدا کی اطاعت ہو۔ کیونکہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں بادشاہ کی رعیت ہے تو اس کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ یہی کہ اس شخص کے لیئے اس بادشاہ کا ہر قانون واجب الانقیاد (فرمانبرداری) ہے۔ گو وہ اُس کی سمجھ میں نہ آوے۔ اگر کوئی شخص باوجود رعیت ہونے کے اپنے بادشاہ کے کسی قانون کو نہ مانے تو سب لوگ اُس کو ملامت کریں گے اور کہیں گے کہ تو رعیت ہو کر ایسا کام کر رہا ہے جو رعیت ہونے کی شان کے خلاف ہے۔ گو تیری سمجھ میں نہ آوے۔ مگر چونکہ اپنے بادشاہ کا قانون ہے اس لیئے ماننا چاہیئے اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے اول یہ معلوم ہو جائے کہ اس قانون میں فائدہ اور مصلحت کیا ہے تب عمل کروں گا۔ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ یہ کہنا بغاوت ہے۔ بس اب آپ ہی بتلایئے کہ اس شخص کو جو یہ رائے دی جاتی ہے یہ کیسی رائے ہے۔ ظاہر ہے کہ بالکل صحیح اور درست ہے تو اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ وہ شخص رعیت ہے اور رعیت ہونے کا مقتضا ہی یہ ہے کہ اپنے بادشاہ کا مطیع ہو۔

بس اب سمجھو کہ مسلمان ہیں خدا کی رعیت، تو ان کو خدا کا مطیع ہونا ضروری

اور خدا کے ہر قانون پر عمل کرنا اور اس کا ماننا فرض ہے گو کوئی قانون سمجھ میں بھی نہ آوے جیسا کہ ابھی بیان ہوا کہ رعیت کو بادشاہ کا ہر قانون ماننا چاہیئے۔ افسوس ہے کہ انسان کی رعیت ہونے کا تو یہ اثر ہو کہ اس کے ہر قانون کو ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہو اگرچہ سمجھ میں نہ آوے۔ اور اس میں بحث کرنا بغاوت میں داخل ہو اور خدا کی رعیت ہونے کا یہ اثر نہ ہو بلکہ اس کے حکم میں کھنڈت ڈالتے پھریں اور اس کو بغاوت نہ سمجھیں۔

علماء پر اتہام

ہاں اگر کوئی شخص کہے کہ ہم خدا کے حکم میں کھنڈت نہیں ڈالتے بلکہ ہم کو یہی شبہ ہے کہ یہ حکم خدا اور رسول کا ہے بھی یا نہیں چنانچہ اس وقت بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو علماء نے گھڑ لیا ہے۔ خدا اور رسول کا یہ مطلب نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ جس زمانہ میں جیسی ضرورت ہو ویسا کر لو۔

مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک شخص نے لکھا ہے کہ قرآن شریف میں یہ خوبی ہے کہ وہ سب تحقیقات پر منطبق ہو جاتا ہے۔ سو اپنے نزدیک تو اس شخص نے قرآن شریف کی بڑی مدح کی مگر واقع میں یہ مذمت ہو گئی کیونکہ اُن کے قول پر ان کی ایسی مثال ہو گئی جیسے ایک نجومی کا قول تھا کہ لڑکا نہ لڑکی۔ وہ ایک پرچہ پر لکھ کر دے جاتا تھا۔ اگر لڑکا ہو گیا تو یہ کہتا کہ میں نے جو لکھا تھا وہی ہوا کہ لڑکا۔ نہ لڑکی۔ یعنی لڑکا ہونے کی صورت میں وہ (نہ) کو لڑکی کے ساتھ ملاتا۔ اور اگر لڑکی ہو گئی تو بھی کہتا کہ میرے قول کے موافق ہے کیونکہ میں نے بھی تو یہی لکھا تھا کہ لڑکا نہ۔ لڑکی یعنی لڑکا نہیں ہو گا بلکہ لڑکی ہو گی۔ یعنے اس صورت میں نہ کو ماقبل کے ساتھ ملاتا اور جو کچھ نہ ہوتا تو کہہ دیتا۔ میں نے یہی

کہا تھا کہ لڑکا نہ لڑکی یعنی نہ یہ نہ وہ۔ غرض اس کا انعام ہر طرح زندہ رہتا تھا پس اسی طرح ہمارے بھائی مسلمان چاہتے ہیں کہ معاذ اللہ قرآن مجید کی یہ گت بنا دیں کہ جیسی ضرورت ہو اسی پر اس کے الفاظ کو چپکا دیں۔

تو آج کل جو اس مشرب کے لوگ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ خدا اور رسول کا تو یہ مطلب ہے نہیں بلکہ یہ مولویوں نے گھڑ لیا ہے۔ پس ہمارا اعتراض مولویوں پر ہے نہ کہ قرآن و حدیث پر۔ اور حدیث سے تو ان لوگوں نے انکار کیا ہی تھا کہ بھلا ایسی لمبی حدیثیں لوگوں کو سن کر کیسے یاد ہو گئیں جس کا جواب بحمد اللہ رسالوں میں کافی موجود ہے مگر اب قرآن شریف پر بھی ہاتھ صاف کیا کہ ایسی ایسی تاویلیں اور کھینچ تان کرنے لگے کہ جیسی ضرورت ہو اس پر چپک جاوے۔

میں نے اخباروں میں ایسے مضامین بہت دیکھے۔ اب اخباروں میں مذہبی احکام کے متعلق بھی رائیں شائع کی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اخبار کے متعلق لکھ دیا تھا کہ اُن کا دیکھنا جائز نہیں۔ اس پر اعتراض کیے جانے لگے کہ تو اخبار بھی حرام ہو گئے کہ نہیں دیکھنا چاہیے تو سمجھو کہ میں نے اخبار دیکھنے کو منع نہیں کیا۔ مگر ایک تو ہے خبر اور ایک ہے رائے اور اخبار ہے خبر کی جمع۔ سو خبروں کا دیکھنا تو جائز ہے لیکن وہ ایڈیٹروں کی رائیں اور تحقیقات جو دین کے متعلق ہوں نہ دیکھنا چاہیے۔ تو میں نے اصل میں اخبار دیکھنے کو نہیں منع کیا بلکہ انشات یعنی ایڈیٹروں کی رائیں اور تحقیقات کو دیکھنے سے منع کرتا ہوں۔ وہ بھی جب کہ دین کے متعلق ہوں اور وہ بھی اس لئے نہیں کہ دین میں رائے کو دخل ہی نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ رائیں فاسد ہوتی ہیں۔

ملاحظہ کیجیے کہ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ربوا کے حرام ہونے کی دلیل
قرآن مجید میں نہیں۔ دیکھیے تو کیسے غضب کی بات ہے کہ جس کے بارے میں نص
صریح موجود ہے اُس کا انکار کرتے ہیں اور جب کوئی انہیں جواب دیتا ہے کہ ربوا
کا لفظ تو قرآن مجید میں مصرح ہے اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (یعنی اللہ تعالیٰ
نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے) تو کہتے ہیں کہ اُس ربوا سے
یہ ربوا مراد نہیں ہے بلکہ وہ رُبا ہے بضم را (را کے پیش کے ساتھ) رُبودن سے
اُس سے غصب مراد ہے ——— کیا خوب! قرآن میں فارسی گھس گئی۔

تو یہ تو ایسا ہوا جیسا کہ ایک جولاہے نے ماں کو دینا بند کر دیا تھا ایک
ملا جی نے اُس سے کہا کہ تو ماں کے حقوق کیوں نہیں ادا کرتا۔ تو اُس نے کہا کہ
قرآن میں بیوی کے کھانا کھلانے کا تو حکم ہے اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ (من جوع)
اور ماں کے لیے کہیں یہ حکم نہیں۔ انہوں نے کہا کہ واہ بیوی کے لیے تو کھانا ہی
کھلانے کو کہا ہے اور ماں کے لیے تو یہ حکم کیا ہے کہ ماں کا سب (ما کسب)
مگر وہ بے وقوف تھا ورنہ کہتا کہ لایلاف تبت یدا سے پیچھے ہے یعنی سیپارہ
میں تو وہ ناسخ ہے۔ غرض جیسا کہ اُس نے من جوع کا من جوی کہا تھا انہوں نے
ماکسب کا ماں کا سب بنا دیا۔

اسی طرح آج کل کہتے ہیں کہ ربوا کی ممانعت قرآن میں ہے ہی نہیں اب
کسی نے کہا کہ ظالم ربوا تو قرآن میں موجود ہے، تو کیا کہتے ہیں کہ ہاں ہے تو مگر

؎ جوی بعض دیہات میں بیوی کو کہتے ہیں۔

وہ ربوا نہیں ہے بلکہ رُبا ہے کیونکہ اعراب تو مولویوں نے لگائے ہیں۔ کیا ٹھکانا ہے جہل کا۔

ایک شخص نے راندیر سے خط لکھا کہ ایک شخص بہت دور تک ڈگریاں حاصل کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے تیمم کیا تو جیسے وضو میں کلی کیا کرتے ہیں اس طرح منہ میں مٹی بھر لی۔ غرض خاکش بدہن (اس کے منہ میں خاک) کا مضمون خوب صادق آیا۔ حضرات ان معترضین کے علم کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ پس جس کی معلومات کی یہ حالت ہو اور وہ کرے اجتہاد خیال کیجیے کتنے غضب کی بات ہے۔ سو اس لیے میں کہتا ہوں کہ اخباروں کے اندر جو اس قسم کے مضمون ہوں وہ نہ دیکھیں اور غضب یہ ہے کہ مسلمان تو قرآن و حدیث میں اجتہاد کرتے ہی تھے۔ اب کفار بھی کرنے لگے۔

چنانچہ ایک انگریز صاحب نے کہا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعون اڑ کر لگتا ہے۔ کیونکہ قرآن میں حکم ہے کہ جہاں طاعون پھیلے وہاں کے آدمی دوسری جگہ نہ جائیں۔ تو یہ دوسری جگہ جانے کی ممانعت کس لیے کی۔ اس لیے کہ یہ لوگ دوسری جگہ جائیں گے تو ان سے وہاں کے لوگوں کو لگ جائے گا۔ تو ایک تو یہ غضب کہ ممانعت تو کی گئی ہے حدیث میں اور آپ فرماتے ہیں کہ قرآن میں ممانعت کی گئی ہے اور دوسرے یہ کہ ممانعت کی وجہ اپنی طرف سے تراشتے ہیں۔ گویا کوئی اور وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ تو گویا قرآن و حدیث ایسی چیز ہو گئی کہ غیر مسلم بھی اس میں اجتہاد کرنے لگے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ اب فاسد رائیں شائع کی جاتی ہیں اس لیے منع کیا

جاتا ہے کہ ایسے رسالے اور ایسے مضامین ہی نہ دیکھیں۔ خیر اخبار کا ذکر تو طبعاً آگیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ قرآن وحدیث کا یہ مطلب ہی نہیں جو علماء بیان کرتے ہیں بلکہ اس کے وہی معنی صحیح ہیں۔ جو کہ ہم نے سمجھے۔

قانون کے صحیح مفسر

تو اس شبہ کے اٹھانے کے لئے میں دوسری نظیر دیتا ہوں کہ قانون وہ ہے جو کہ پارلیمنٹ نے تجویز کیا ہے اور اس کے وہ معنی ہیں جو کہ جج سمجھتے ہیں کیونکہ آپ سے براہ راست تو خط وکتابت ہی نہیں۔ جو وہ خود آپ سے اس کے معنی بیان کرتے۔ پس جن لوگوں کو انہوں نے قانون فہمی کا اہل سمجھ کر عہدہ دیا ہے وہ جو معنی قانون کے بیان کریں اُن کو ماننا پڑے گا کہ قانون کے درحقیقت یہی معنی ہیں۔ دیکھئے جب ایک ہائیکورٹ کا جج ایک فیصلہ دیتا ہے تو کیا اس وقت آپ کا یہ کہنا قابل سماعت ہوگا کہ قانون کے یہ معنی نہیں جو تم نے سمجھے۔ ہرگز نہیں اور اگر کوئی ایسا کرے کہ اس کے ساتھ گلخپ ہو اور حکم نہ مانے تو اس کو قانون کی مخالفت قرار دیا جاوے گا اور اس کے لئے سزائے جیل تجویز کی جاوے گی۔ اگر اس وقت آپ یہ کہیں کہ صاحب آپ حکم ہی نہیں سمجھے، قانون کے یہی معنی ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ تو کیا آپ کا یہ عذر قابل سماعت ہوگا۔ ہرگز نہیں! بلکہ یہ جواب ملے گا کہ تم اپیل کرو۔ سو دیکھئے کہ ہائیکورٹ کے جج قانون کے سمجھنے والے تسلیم کرلئے گئے ہیں اور وہ جو قانون کے معنی بیان کریں۔ اس کی مخالفت قانون ہی کی مخالفت قرار دی گئی ہے کیونکہ پارلیمنٹ کے حکام ہر مقدمہ کا فیصلہ خود تو نہیں کرتے بلکہ وہ اصول کلیہ بنا دیتے ہیں۔ اس لئے قانون

کے سمجھنے والے ہائیکورٹ کے جج قرار دیئے گئے ہیں۔ تو ہر چند کہ ہائیکورٹ کی مخالفت کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ میں پارلیمنٹ کے خلاف نہیں کرتا بلکہ جو یہ اس قانون کے معنی بیان کرتے ہیں اس کے خلاف کرتا ہوں مگر اس کا یہ عذر نہیں سنا جائے گا اور اس کو پارلیمنٹ ہی کا مخالف سمجھا جائے گا۔

بس ایسے ہی حضرات ائمہ مجتہدین چونکہ قرآن و حدیث کے سمجھنے والے مان لئے گئے ہیں۔ اس لئے ان کی مخالفت خدا و رسول کی مخالفت ہے گو حدیثیں کسی شخص کو ان سے زیادہ معلوم ہوں مگر کثرت معلومات سے مجتہد نہیں ہو سکتا۔

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد

بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

محبوب وہ نہیں کہ جس کے بال عمدہ، کمر پتلی ہو بلکہ محبوبیت اس کی آن اور ادا میں ہوتی ہے جو محبوب اور دلکش ہوتی ہے۔

مجتہدین کو حق تعالیٰ نے ایک خاص شان عطا فرمائی ہے۔ اب کوئی اللہ میاں سے لڑے کہ ان کے اندر یہ قابلیت کیوں رکھی اور ہمارے اندر کیوں نہیں رکھی۔ تو یہ بات ہم سے پوچھنے کی نہیں۔ خدا تعالیٰ سے پوچھے لیکن پھر کل کو یہ بھی پوچھنا کہ انبیاء کو نبوت دی مجھے کیوں نہیں دی۔ ایک وہ نظم ہے کہ فلاں کو دی پیغمبری میری بار کیوں دیر اتنی کری۔ اول نظم سے اخیر تک خدا کی شکایت ہے۔ تو اگر ایسی ترقی ہے تو خدا خیر کرے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ

آنکس کہ تو نگرت نمے گرداند ۝ او مصلحت تو از تو بہتر داند

یعنی خدا تعالیٰ جو تم کو تو نگر نہیں بناتے وہ تمہاری مصلحتوں کو

تم سے بہتر جانتے ہیں۔

غرض یہ کہ خدا نے مجتہدین میں ایک کمال پیدا کیا ہے جو ہم لوگوں میں نہیں ہے اور اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ اس وقت قرآن سے تم چند ایسی جزئیات استنباط کرو جن کا حکم فقہا کے کلام میں نہ دیکھا ہو۔ پھر اولی معاملات میں فقہا کا قول دیکھو اور اپنے استنباط کو اُن کے استنباط کے ساتھ موازنہ کرو تب معلوم ہو گا کہ فقہاء اور مجتہدین کی کیا شان ہے۔ مگر اس کے لیے بھی ضرورت ہے علم کی۔ سو ایسا کرنے پر بہت آسانی سے فیصلہ ہو سکتا ہے کہ ہم میں اور ائمہ مجتہدین میں کتنا فرق ہے۔

پس اس تفاوت کی وجہ سے عوام کی تو ایسی مثال ہے جیسے عام رعیت اور علماء کی مثال ایسی ہے جیسے وکلاء اور آئمہ مجتہدین جیسے ہائی کورٹ کے جج پس جب ایک رعیت کو ہائیکورٹ کے جج بلکہ ایک معمولی جج کی مخالفت جائز نہیں تو عوام کو علماء کی مخالفت کب جائز ہو گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولویوں سے غلطی نہیں ہوتی بلکہ غلطی ہو جاتی ہے مگر اس کا پکڑنا عوام کا کام نہیں ہے بلکہ علما ہی کا کام ہے اور جب تک کہ ایک متدین عالم کا فتویٰ بلا تعارض موجود ہے عامی کے ذمے واجب ہے کہ اُس کا اتباع کرے تو اب اس کے کہنے کی کہاں گنجائش رہی کہ میں تو علماء کی مخالفت کرتا ہوں۔ خدا و رسول کی مخالفت نہیں کرتا پس معلوم ہوا کہ علماء کی مخالفت کسی طرح جائز نہیں۔ حتیٰ کہ اگر آپ کے سامنے ترجمہ حدیث کا موجود ہو جب بھی آپ کو علماء کی مخالفت جائز نہیں۔ کیونکہ ترجمہ سمجھنے کے لئے بھی علم کی ضرورت ہے جیسے کہ قانون کا ترجمہ ہو گیا ہے مگر پھر بھی کوئی

شخص جج کی مخالفت میں اپنی رائے نہیں پیش کر سکتا گو وہ کسی کتاب کے پیش کرنے کے ساتھ ہو۔ اور اگر کرے تو اب بھی اس کا وہی حال ہوگا جو قانون کا ترجمہ نہ ہونے کی حالت میں ہوتا یعنی قانون کا مخالف قرار دیا جاوے گا۔ تو اسی طرح اگرچہ حدیث کا ترجمہ ہو گیا ہے مگر پھر بھی آپ کو اجتہاد کرنا اور علماء سے مزاحمت کرنا جائز نہیں۔ اور جس طرح حکام کی مخالفت کرنے والا واقع میں گورنمنٹ کی مخالفت کرنے والا ہے۔ اسی طرح علماء کی مخالفت کرنا حضور سے مخالفت کرنا ہے اور علماء کی مخالفت کر کے یہ عذر کرنا کہ ہم خدا اور رسول کے خلاف نہیں کرتے نہایت نازیبا اور لچر عذر ہے۔

اتباع علماء کی ضرورت

بحمد اللہ یہ امر بہت خوبی کے ساتھ طے ہو گیا اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ علماء کا اتباع کریں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کو علم دین سے اتنی بھی مناسبت نہیں جتنی کہ ہر شخص کو طب کے ساتھ ہوتی ہے کیونکہ طب سے تو ہر ایک شخص کو کم و بیش مناسبت ہوتی ہے اور تجربہ بھی ہوتا ہے برخلاف علم دین کے کہ وہاں کسی کا تجربہ کام نہیں دیتا تو جتنی طب کے ساتھ مناسبت ہے اتنی بھی دینیات کے ساتھ نہیں۔ مگر باوجود اس کے کتنا ہی بڑا کوئی شخص ہو مگر جب بیمار ہوگا طبیب ہی سے رائے لے گا کبھی طب کی کتابیں دیکھ کر مسہل نہ لے گا اگر یہ بھی معلوم ہو جاوے کہ صفرا کا فساد ہے جب بھی اپنی رائے سے علاج نہیں کرے گا۔ کیا کسی نے ایسا کیا ہے ہرگز نہیں۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی بولے بھی کہ طبیب کی کیا ضرورت ہے تو کہیں گے کہ بغیر طبیب کے علاج

نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنی عقل اور رائے سے خدا جانے کیا خرابی پیدا ہو۔ اس کے راز سے طبیب ہی واقف ہیں۔

پس طب میں تو باوجود مناسبت ہونے کے اپنی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا مگر علم دین میں باوجود مناسبت نہ ہونے کے ہر شخص اجتہاد کرنے لگتا ہے۔ تو گویا شریعت میں کوئی راز ہی نہیں ہے اور وہ ایسی پامال اور معمولی شے ہے کہ اس کے لیئے علم کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے۔ حالانکہ جیسے وہاں کوئی کیسا ہی عاقل سے عاقل ہو گا مگر بدون اتباع طبیب کے چارہ نہیں اسی طرح امور شریعت میں سوائے اتباع علماء دین کے چارہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ غیر ماہر کو ماہر کا اتباع کرنا ضروری ہے۔

پس عقلی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ علماء کا اتباع آپ کو ضروری ہے اور وہ جو احکام بتاتے ہیں وہ درحقیقت خدا و رسول کے احکام ہیں۔ پس جب یہ خدا و رسولؐ کے احکام ہیں تو ہر مسلمان کو ان کا اتباع کرنا چاہیئے کیونکہ مسلمان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے خدا و رسول کا اتباع کرنا ضروری ہے اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اتباع میں اختلاف نہ ہوتا مگر ہماری نادانی دیکھیئے کہ اس میں بھی اختلاف کیا اور ایسا کام کیا جیسا کہ ایک طالب علم نے کیا تھا کہ دستار فضیلت اُن کے بندھ گئی تھی مگر اُن کو آتا جاتا خاک نہ تھا۔

آج کل یہ بھی ایک مرض ہو گیا ہے کہ لوگ کتابوں کے ختم کرنے کو اصل سمجھتے ہیں اگرچہ سماعت ہی سے ہو۔ اور کتاب کی عبارت ایک دن بھی نہ پڑھنا پڑے اور اب تو بعضوں کی یہ حالت سنی ہے کہ سبق میں شریک بھی ہیں مگر اس

کی خبر نہیں کہ سبق کہاں ہو رہا ہے اور کس مسئلہ کی تقریر ہو رہی ہے۔

لکھنؤ کا ایک عجیب واقعہ سنا ہے کہ ایک مرتبہ صدرا کا سبق ہو رہا تھا اور ایک طالب علم جو اس میں شریک تھے بجائے صدرا کے شمس بازغہ لے کر آئے تھے۔ اتفاق سے ایک مقام پر مدرس کو شبہ ہوا۔ تو انہوں نے ہر طالب علم سے دریافت کرنا شروع کیا کہ تمہاری کتاب میں کیا عبارت ہے اُن حضرت سے جو دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ ابھی میری نظر سے وہ عبارت چوک گئی ہے دیکھ کر بتلاتا ہوں۔ آخر جب انہیں دیکھنے میں بہت دیر ہوئی تو اُن مدرس صاحب نے کتاب اُن کے سامنے سے اٹھالی تاکہ خود دیکھیں، مگر دیکھا تو شمس بازغہ ہے۔ تب انہوں نے کہا کہ کیا تم روزمرہ یہی کتاب لاتے ہو اُس نے کہا جی ہاں! میں تو روزمرہ یہی کتاب لاتا ہوں۔

تو جیسے یہ طالب علم تھے وہ بھی ایسے ہی تھے اُن کی کتابیں ختم ہو گئی تھیں اور دستارِ فضیلت بندھ گئی۔ جب چلے تو استاد سے کہنے لگے کہ مجھے آپ نے پگڑی تو باندھ دی مگر مجھے تو کچھ آتا جاتا نہیں۔ اگر کوئی مجھ سے کچھ پوچھ بیٹھے تو میں کیا جواب دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہیں ایک ایسی بات بتلاتا ہوں کہ ہر سوال کا جواب ہو جاوے۔ جب کوئی شخص تم سے کچھ پوچھے اور اس کا جواب تمہیں معلوم نہ ہو تو یہ کہہ دیا کرنا کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کیونکہ قریب قریب ہر مسئلہ میں کسی نہ کسی عالم کا اختلاف ہے ہی۔ آخر انہوں نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا۔ لوگ سمجھے کہ بڑا ہی وسیع النظر عالم ہے کہ تمام علماء کے اقوال اس کے پیش نظر ہیں۔ پس لوگوں میں اُن کی بڑی دھاک بندھ گئی۔ ایک شخص اس معاملہ کو سمجھ

گئے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ لا الٰہ الا اللہ کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں۔ اُنہیں تو ایک ہی جواب یاد تھا۔ کہنے لگے کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ تب لوگوں پر اُن کی اصلیت ظاہر ہوئی۔

سو ہم نے اس طالب علم کی سی حالت بنا رکھی ہے کہ ہر چیز میں اختلاف، جو چیز اختلاف کی نہ تھی اُس میں بھی اختلاف بنایا۔ لو یہ بھی کوئی اختلاف کی بات تھی کہ خدا اور رسولؐ کا کہنا ماننا ضروری ہے مگر اس میں بھی مسلمانوں میں اختلاف ہوا اور کیا یہ ایسا مضمون ہے کہ اس کے سمجھانے کے لئے کوئی جلسہ کیا جاوے مسلمانوں کے کان میں تو علماء کا یہ قول پہنچ جانا کافی ہونا چاہیئے تھا کہ یہ خدا کا حکم ہے جیسا کہ صاحب جج کا کہنا کہ یہ حکم گورنمنٹ کے قانون کے موافق ہے کافی ہوتا ہے۔ سو اس میں کوئی خفا نہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ اس ظاہر بات میں بھی مسلمانوں کا اتفاق نہ ہو سکا۔ تو گویا یہ ایک جدید مرض مسلمانوں میں پیدا ہوا کہ انہوں نے خدا کے حکم میں بھی اختلاف کرنا شروع کیا۔ مگر چونکہ اب اس مرض میں ابتلا ہو گیا ہے اس لئے اس کا علاج بیان کرنا ضروری معلوم ہوا کیونکہ

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است اگر خاموش بنشینم گناہ است

یعنی اگر یہ دیکھوں کہ اندھا ہے اور اُس کے راستہ میں کنواں ہے اس حالت میں اگر خاموشی اختیار کروں تو گناہ ہے۔

جدید مرض

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ مرض جدید ہے اس لئے اس مرض کا علاج بھی جدید ہوگا۔ مگر قربان جایئے کہ ہر مرض کا علاج قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ بعض مرتبہ طبیب بھی کہہ دیتے ہیں کہ بیماری

سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مرض ہے۔ چنانچہ میں نے ایک شخص کو دیکھا ہے کہ اس کے حلق سے لقمہ پسلی میں جاتا تھا۔ بہت سے طبیبوں کو دکھلایا مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ یہ کمال طب روحانی ہی ہے کہ کسی مریض کو جواب نہیں دیا جاتا۔ وہاں تو طبیب سے جواب بھی مل جاتا ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہے یا یہ کہ اس مرض کا طب کی کتابوں میں ذکر نہیں اور طب روحانی میں یہ کہیں نہیں۔ چنانچہ سب سے بڑھ کر مرض کفر اور شرک کا ہے اس کا علاج بھی مذکور ہے کہ اگر سو مرتبہ بھی ہو تو پھر بھی یہ ارشاد ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے کفر و شرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ تحقیق وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے۔

یہ آیت ایسوں ہی کے بارہ میں نازل ہوئی کہ کفار نے کہا تھا کہ ہمارا کفر کیسے معاف ہوگا تو جواب نازل ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اسی طرح اس مرض کا بھی علاج قرآن مجید میں موجود ہے۔ گو مسلمانوں کا یہ اختلاف ایک مرض جدید تھا۔ اس عنوان سے تو جدید نہیں کہ خدا اور رسول کا کہنا نہیں مانتے مگر اس عنوان سے جدید ہے کہ ہم علماء کا کہنا نہیں مانتے۔ یہ آفت ابھی نازل ہوئی ہے

پہلے نہ تھی۔ تو اتنا جدید مرض مگر اس کا بھی علاج قرآن مجید میں ہے کہ (واتبع سبیل من اناب الیّ (ان کے رستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) ورنہ آسان بات یہ تھی کہ واتبع دین اللہ (اللہ کے دین کا اتباع کرو) فرما دیتے مگر حق تعالیٰ کو تو خبر تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آوے گا کہ لوگ علماء کے اتباع سے بچنا چاہیں گے۔ اس لئے فرمایا کہ سبیل من اناب الیّ (ان لوگوں کے رستہ کا جو میری طرف متوجہ ہیں) کہ ان کا بھی اتباع تمہارے ذمہ ضروری ہے۔ تو یہ کتنا عجیب وغریب قصہ ہے۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ قرآن میں ہر امر کا فیصلہ ہے چنانچہ کتنا جدید مرض تھا مگر اس کا علاج مذکور ہے۔

یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ بہت سے عقلاء جو یہ رائے دیتے ہیں کہ اس زمانہ میں اس کی ضرورت ہے کہ علم کلام جدید تیار ہو۔ علم کلام قدیم آج کل کے لئے کافی نہیں ہے بالکل غلط رائے ہے۔ دیکھئے یہ کتنا جدید مرض تھا مگر پھر بھی قرآن مجید میں اس کا علاج مذکور ہے۔ اسی طرح ہر شبہ کے جواب کے لئے قرآن و حدیث ہی کافی ہے۔

میں ایک جگہ گیا تو ایک معزز عہدہ دار خیر خواہ قوم نے کہا کہ علماء کو چاہئے کہ علم کلام جدید تیار کریں۔ میں نے کہا کہ بہتر ہے۔ کلام جدید تیار ہو جائے گا مگر اس کی صورت یہ ہے کہ دس انگریزی تعلیم یافتہ نوکر رکھئے اور انگریزی کتابیں جمع کیجئے جن میں اسلام پر اعتراض کئے گئے ہیں۔ وہ انگریزی تعلیم یافتہ ان کا اردو میں ترجمہ کریں۔ اس طرح سائنس کا بھی ترجمہ ہو جاوے گا اور پھر جب ترجمہ ہو جاوے تو ان کو تو موقوف کر دیجئے۔ اور ان کی بجائے علماء کو منتخب کر کے رکھئے۔ وہ

ان اعتراضات کے جواب لکھیں جیسے اس کے قبل بادشاہوں نے کیا ہے پھر جب ان اعتراضات کے جوابات مکمل ہو جاویں۔ تو ان کے بجائے پھر انگریزی تعلیم یافتہ رکھے جائیں۔ وہ ان کا انگریزی میں ترجمہ کر دیں۔ تو ایک زمانہ تک یہ سلسلہ جاری رہے۔ اور اس کے اخراجات کے لئے عام طور پر چندہ نہ کیجئے بلکہ دو سال میں سے ایک سو آدمی مقرر کیجئے اور پچیس پچیس روپے ماہوار سب سے لیجئے تو بہت آسانی سے علم کلام جدید تیار ہو سکتا ہے۔ بس یہ سنتے ہی خشک ہو گئے وہ تو علماء پر تشنیع کرنے لگتے۔ میں نے کہا کہ میں ان کا ایسا علاج کر دوں کہ ہمیشہ کے لئے یہ سیدھے ہو جائیں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ جب کبھی ملے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔

سو علماء پر مشتق ہونے کی وجہ یہی ہے کہ چاہتے ہیں کہ چندہ بھی یہی جمع کریں اور کام بھی یہی کریں۔ ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے اور جب ایسی صورت تجویز کی جاتی ہے جس میں انہیں بھی کام کرنا پڑے تو پھر چپ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حاصل یہ کہ جس کو میں نے علم کلام جدید کہا ہے وہ محض عنوان کے اعتبار سے جدید ہے، معنوں کے اعتبار سے جدید نہیں کیونکہ کوئی بات ایسی نہیں ہے جو کلام قدیم میں نہ ہو۔ لیکن آج کل ہمارے اکثر عقلاء یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کافی نہیں۔ اس طرح فقہ بھی کافی نہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ جو ماہر ہو گا وہ سمجھے گا کہ کوئی شبہ ایسا نہیں نکلتا جس کے لئے علم کلام قدیم میں اصول نہ ہو۔ مگر مہارت کی ضرورت ہے ہاں اس معنی کر اس کو جدید کہہ دو کہ اس کا عنوان نیا ہو گیا یہی حال فقہ کا ہے۔ مجھے ایک فقہ کا مسئلہ یاد آ گیا کہ مجھ سے ایک مرتبہ یہ سوال کیا گیا کہ یہ

جو گراموفون ہے اس میں قرآن بھی بھرا ہوا ہوتا ہے اور اُس میں اس کے نقوش ہوتے ہیں۔ تو اس ریکارڈ کو جس میں قرآن بھرا ہوا ہو بلا وضو ہاتھ لگانا جائز ہے یا نہیں۔ میں نے اس کا ایک جواب دیا۔ ممکن ہے کہ کسی کو اُس سے بہتر جواب آتا ہو۔ مگر میں نے یہ جواب لکھا کہ یہ دیکھا جاوے کہ اُن نقوش کی اُن حروف پر دلالت ہے یا نہیں۔ مثلاً ایک ریکارڈ میں قرآن ہے اور ایک ریکارڈ میں اور کوئی مضمون ہے۔ تو کیا ان میں ایسا امتیاز ہے کہ صرف اُن نقوش کو دیکھ کر شناخت ہو جاوے کہ یہ قرآن ہے اور یہ فلاں مضمون ہے۔ اگر اس میں امتیاز ہے کہ اس کو دیکھ کر یہ شناخت مضمون کی ہو جاتی ہے تب تو اس کو بے وضو ہاتھ لگانا ناجائز ہوگا۔ اور اگر اس میں ایسا امتیاز نہیں ہے تو وہ ایسا ہے جیسا کہ حافظ کے دماغ میں قرآن مرتسم (چھپا ہوا) ہوتا ہے۔ اُس کا بلا وضو چھونا جائز ہے۔

غرض کہ جو کلام اور فقہ قدیم کو اچھی طرح پڑھے ہوئے ہوگا اور اُس کو اُس میں مہارت ہو جاوے گی، تو میں ذمہ داری کرتا ہوں کہ وہ اسی پرانے فقہ اور پرانے علم کلام سے ہر سوال کا جواب دے دے گا۔ تو نہ فقہ جدید کی ضرورت ہے نہ کلام جدید کی۔ مگر چونکہ ہر شخص کا ایسا فہم نہیں ہے اس لئے اگر آج کل کے شبہات کے جدید عنوان سے جواب ہو جاویں تو مضائقہ نہیں ہے مجھے اس وقت یاد آیا کہ ایک کتاب ہے میری الانتباہات المفیدہ۔ اس میں شبہات جدیدہ کا خوب حل کیا گیا ہے۔

غرض یہ کہ قرآن مجید ایسی کافی کتاب ہے کہ اس میں جدید مرضوں کا

بھی علاج ہے۔

اتباع میں غلو ایک یہ بھی نیا مرض تھا جس کی نسبت کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہے کہ حکم الہی کے اتباع میں اختلاف کرنے لگے اور پھر اس میں کئی طبقے ہو رہے ہیں جن میں سے ایک تو وہ کہ اُن کے نزدیک اتباع ہی کی ضرورت نہیں جیسا کہ میں نے اُن کی حالت پہلے بیان کی کہ جو خود اُن کی سمجھ میں آتا ہے وہ کرتے ہیں۔ اتباع علماء ہی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتے۔ سو ایسے لوگ ہیں تو بہت کم مگر اُن کا اثر بہت ہے کیونکہ اکثر معزز لوگ ہی اس جماعت میں ہیں۔ اُن کے اثر سے اندیشہ ہے بہت لوگوں کی تباہی کا۔ اس لئے اُن کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے اور ایک وہ لوگ ہیں کہ وہ اتباع کو تو ضروری سمجھتے ہیں مگر اُن کا کوئی معیار نہیں ہے بلکہ وہ حالت ہے کہ ؎

لختے برد از دل گذرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

جو شخص میرے سامنے سے گزرے دل کا ایک ٹکڑا لیجائے
اس لیے کہ میں اپنے صد پارۂ دل کا قاش فروش ہوں۔

جو سامنے آگیا اُسی کے معتقد ہو گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اُن کو اتباع میں اس قدر غلو ہے کہ ہر ایک کے اتباع کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی مزہ خواب میں کہہ دے کہ فلاں فلاں کام کرنا یا کسی کے اوپر بھوت آجاوے اور وہ کہے کہ چوراہے پر مٹھائی رکھ آنا۔ غرض کوئی ہوا نہیں سب کی مان لینا۔ اُن کے ہاں روز ایک معبود تراشا جاتا ہے۔ آج اُس کا اتباع کر رہے

ہیں کل کو دوسرے کا۔ مگر یہ اتباع کون سا ہے۔ یہ زیادہ تر اعتقادی ہے اور عملی کم ہے۔ عملی اتباع صرف اسی کا کرتے ہیں جو نفس کے موافق ہو۔ غرض یہ لوگ بزرگوں کے بھی معتقد ہو گئے اور مجذوبوں کے بھی اور سالکوں کے بھی اور ہر شخص کی خدمت بھی کرنے لگے۔ اور گو کہنا سب کا کرتے نہیں مگر اعتقاد سب کا ہے۔ تو ایک جماعت میں تو اتباع ایسا سستا ہے اور ایک میں اتباع بالکل ہی نہیں پس اس میں دو قسم کے لوگ ہوئے۔ ایک تو سب کے متبع اور معتقد ہونے والے اور دوسرے وہ جو کسی کے بھی متبع نہیں پس ایک جماعت میں تفریط ہے اور ایک میں افراط ہے۔ حق تعالیٰ اس کا فیصلہ فرماتے ہیں کہ

وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ

(یعنی جو لوگ میری طرف متوجہ ہیں ان کے رستہ کا اتباع کرو)

اتبع سے تو اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی اور سبیل من اناب سے علاج ہے اس جماعت کا جو ہر کس و ناکس کے معتقد ہو جانے والے ہیں۔ اور اتباع کا صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے کیونکہ اس جملہ سے حق تعالیٰ نے اتباع کا معیار بتلا دیا اور معیار سے مراد ہے صحیح معیار۔

بزرگی کے معیار

ورنہ یوں تو آج کل معیار بہت ہیں جیسے کشف کہ بعض نے اس کو اتباع کا معیار بنایا اور ہر صاحب کشف کو بزرگ قابل اتباع سمجھا۔ بعض نے معیار بنایا کرامت کو۔ بعض نے وجد و سماع کو۔ بعض نے حرارت کو کہ جس کے اندر حرارت زیادہ ہو اور بہت روتا ہو وہ

بزرگ ہے۔ بعض نے معیار بنایا تصرفات کو کہ ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور مدہوش کر دیا تو سمجھے کہ یہ بڑا بزرگ ہے اور بعض نے معیار بنایا تجرد کو، گو بعض حالتوں میں اس کی اجازت ہے مگر یہ معیار تو نہیں۔ بعض نے معیار بنایا تند مزاجی کو چنانچہ سب سے زیادہ ان کے معتقد ہوتے ہیں جو پتھر ڈھیلے مارے۔ وہ تو ان پر ظلم کرتے ہیں اور یہ اُن کے معتقد ہوتے ہیں اور جو گالیاں دیتے ہیں یہ اُن کو بھی کہتے ہیں کہ مجذوب ہیں کیونکہ صاحب کشف ہیں۔ سو کشف ان کے نزدیک بڑا کمال ہے حالانکہ کشف مجنونوں کو بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ میرے ہاں ایک عورت کو جنون ہوا تو اُس کو کشف ہوتا تھا۔ مگر جب مسہل دیا گیا تو اُس کے ساتھ ہی کشف بھی ختم ہو گیا۔ شرح اسباب میں لکھا ہے کہ مالیخولیا کے مرض میں کشف ہونے لگتا ہے۔ پس کشف کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ لوگ ایسوں کے معتقد ہوتے ہیں جو گالیاں دیتے ہیں۔ میں نے لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ فلاں بزرگ اگر گالیاں نہ دیں تو کام نہیں ہوتا۔ سو انہیں خود تمنا ہوتی ہے کہ ہمیں گالیاں دیں۔ جیسا ہمارے ہاں ایک عورت نے جس کے اولاد نہ جیتی تھی نذر مانی تھی کہ اگر میرے لڑکا ہو اور وہ لڑکا ماں کی گالی کھا کر آئے تو پانچ روپے کی شیرینی تقسیم کروں۔ تو جیسے وہ احمق لڑکے کی گالی کھانے سے خوش ہوتی تھی ایسے ہی یہ مرد بھی گالیاں کھا کر خوش ہوتے ہیں اور ایک حضرت وہ ہیں کہ گالیاں دے کر بھی حضرت رہے۔ میں نے بعض لوگوں کو خود یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ فلاں مجذوب جب سے نرم ہو گئے ہیں کام ہی نہیں

ہوتے۔ غرض بزرگی کے معیار عجیب و غریب قائم کر رکھے ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کو خبر نہیں کہ بزرگی ہے کیا چیز؟ اس فن کو جانتے ہی نہیں اور یہ لوگ تو کیا اکثر اہل علم بھی نہیں جانتے کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ میں نے اہل علم کو بھی دیکھا ہے کہ اکثر ایسوں کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ اور بعضوں کے نزدیک بزرگی کا معیار یہ ہے کہ وہ اکھڑ باتیں بکیں۔

ہمارے ہاں ایک شخص تھا۔ اس سے اکثر سٹے والے پوچھنے جاتے تھے کہ ہم جیتیں گے یا ہاریں گے۔ وہ اس کے جواب میں بڑبڑانے لگتا۔ ان لوگوں نے کچھ اصطلاح مقرر کر رکھی تھی۔ اس اصطلاح کے موافق اُس کی بکواس سے اپنا جواب سمجھ لیتے تھے۔

یہ حال ہے لوگوں کے اعتقاد کا کہ کوئی شخص صوفی بن جائے پھر اُس کی ہر بات بزرگی ہو جاتی ہے۔ خاموش رہیں تو خاموش شاہ کہلائیں اور گالیاں دیں اور خلاف شریعت کریں تو مجذوب کہلائیں۔ ایک دفعہ بزرگی کی رجسٹری ہو جانی چاہیے۔ پھر وہ ایسی پختہ ہو جاتی ہے جیسے بی بی تمیزہ کا وضو۔

مشہور ہے کہ بی بی تمیزہ نام ایک فاحشہ عورت تھی۔ ایک بزرگ نے اُسے نصیحت کی اور وضو کرا کے نماز پڑھوائی اور تاکید کر دی کہ ہمیشہ اسی طرح پڑھا کرنا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ایک مدت کے بعد وہ پھر اُن کو کہیں ملی تو انہوں نے اس سے دریافت کیا کہ نماز پڑھا کرتی ہو۔ اُس نے کہا کہ جی ہاں پڑھا کرتی ہوں۔ انہوں نے کہا اور وضو بھی کیا کرتی ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ وضو اُسی روز آپ نے کرا نہیں دیا تھا۔

سو جیسا اُس کا وضو ایسا پکا تھا کہ نہ بدکاری سے ٹوٹتا نہ پیشاب پاخانہ سے۔ آج کل کی بزرگی بھی ایسی ہی پختہ ہے کہ اُس میں کسی طرح خلل ہی نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اگر نماز بھی نہ پڑھیں تب بھی بزرگ ہیں۔ ایک شخص نے اپنے پیر کی نسبت کہا تھا جو کہ نماز نہیں پڑھتے تھے کہ وہ مکہ میں جاکر نماز پڑھا کرتے ہیں۔

غرض ایک مرتبہ جس سے اعتقاد ہوگیا پھر خلل نہیں پڑتا۔ ہاں ایک صورت میں خلل پڑتا ہے کہ شریعت کی بات بتلانے لگے۔ اگر ایسا کرے تو کہتے ہیں کہ میاں یہ تو نرا ملّا ہے اور جو شریعت کے خلاف کرے تو اُس کو سمندر کہتے ہیں کہ اس کو کوئی معصیت گندہ نہیں کر سکتی۔ یہ تو سمندر ہے۔ سمندر میں چاہے کتنی ہی نجاست پڑ جائے اُس کو ناپاک تھوڑا ہی کر سکتی ہے لیکن اگر سمندر پیشاب ہی کا ہو تو کیا تب بھی وہ پاک ہوگا۔ سو یہ حضرت تو سر سے پیر تک گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایک پیر صاحب اپنی مریدنی کا گانا سن رہے تھے۔ گانا سنتے سنتے آپ کو مستی سوار ہوئی اور تنہائی میں لے جاکر اُس کے ساتھ منہ کالا کیا اور وہاں سے باہر آکر فرماتے کیا ہیں کہ جب آ گیا جوش نہ رہا ہوش۔ مگر مریدوں کے نزدیک پھر بھی بزرگ ہو رہے۔ سبحان اللہ! کیا اچھی بزرگی ہے کہ چاہے کیسا ہی کام کریں۔ مگر پھر بزرگ کے بزرگ۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے وہ درگت بنائی کہ یا تو اتباع ہی نہ تھا اگر ہوا تو بلا معیار ہوا۔ اوّل اتباع کی شکایت تھی پھر جب اتباع ہوا تو ایسا کہ اُس کا کوئی صحیح معیار ہی نہیں۔ سو وہ قصہ ہوا کہ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

علماء کی کوتاہی

آج کل زیادہ لوگ دوسری ہی قسم کے پائے جاتے ہیں اور اول قسم کے لوگ کم ہیں مگر ان کا اثر زیادہ ہے سو واقع میں ان کا علاج حق تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اتباع ضروری ہے اور اتباع سے کیسے چارہ ہو سکتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر تو کوئی عاقل نہیں کہ کفار بھی حضورؐ کے عاقل ہونے کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ میں ایک لطیفہ کہا کرتا ہوں کہ کفار مسلمانوں سے زیادہ حضورؐ کی عقل کے قائل ہیں۔ کیونکہ یہ تو سب کو مسلّم ہے کہ دین اسلام کو بے انتہا ترقی ہوئی۔ مگر اس کے سبب میں اختلاف ہے۔ کفار تو اس کا سبب حضورؐ کی قوت عقل کو مانتے ہیں اور مسلمان اس کا سبب حق تعالیٰ کی نصرت کو مانتے ہیں۔ سو وہ حضورؐ کو اتنا بڑا عاقل سمجھتے ہیں کہ جن کاموں کے لئے ہمارے نزدیک نصرت الٰہی کی ضرورت ہوئی۔ وہ ان کے لئے حضورؐ کی عقل کو کافی سمجھتے ہیں۔ پس آپ کے عاقل ہونے میں کسی کو کچھ شبہ نہیں۔ مگر باوجود اس کے حضورؐ کی کیفیت یہ تھی کہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ خیر البقاع (بہترین جگہ) کون سی جگہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں۔ جبرئیلؑ سے پوچھ کر بتلا دوں گا۔ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے بھی معلوم نہیں رب العلمین سے دریافت کر کے بتلا دوں گا۔ پس وہ دریافت کرنے گئے اور جب واپس آئے تو فرمایا کہ اس مرتبہ مجھ کو حق تعالیٰ سے اتنا قرب ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کل ستر ہزار پردے درمیان میں رہ

گئے تھے۔ اور حق تعالیٰ نے فرمایا کہ خیر البقاع مساجد ہیں۔

سو دیکھئے باوجود اس علم وفضل کے یہ فرما دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔ سو حضورؐ کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات معلوم نہیں ہوتی بے تکلف فرما دیتے کہ مجھے نہیں معلوم اور آپ نے صرف اسی واقعہ میں ایسا نہیں کیا بلکہ اور بہت سے امور میں حضورؐ نے ایسا ہی کیا ہے۔ خود خدائے تعالیٰ حضورؐ کے حق میں فرماتے ہیں وَمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ کہ آپ فرما دیجئے کہ میری یہ عادت نہیں ہے کہ جو بات مجھ کو معلوم نہ ہو اس میں تکلف کروں۔ پس عالم کی یہ شان ہونی چاہئے کہ جو بات معلوم نہ ہو بے تکلف کہہ دے کہ مجھے معلوم نہیں۔ اب عوام کی تو کیا شکایت علماء بھی جہل کو چھپاتے ہیں۔

کانپور میں کسی نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ سور کا چمڑہ پاک ہے یا ناپاک۔ انہیں یہ مسئلہ معلوم نہ تھا۔ اس لئے ٹالنے کے لئے کہا کہ اس مسئلہ کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ اس نے کہا کہ آخر مسئلوں کی مسلمان ہی کو تو ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ یہ بہت دور کا مسئلہ ہے۔ تم کیا سمجھو گے۔ اس نے کہا کہ آخر آپ بتائیے تو سہی۔ تب آپ نے کہا کہ قواعد سے تو پاک معلوم ہوتا ہے۔

غرضیکہ اتنے حیلے حوالے کئے اور پھر مسئلہ غلط بتایا۔ مگر یہ نہیں کہا گیا کہ مجھے نہیں معلوم اور بعضے غلط مسئلہ بتلانے کی تو جرأت نہیں کرتے مگر سائل کو بے وقوف بنا کر اپنی جان بچاتے ہیں۔

چنانچہ ایک گلہری کنوئیں میں گر گئی تھی۔ ایک شخص اس مسئلے کے دریافت

کرنے کے لئے ایک مولوی صاحب کے پاس گیا جو کہ بڑے معقولی تھے انہیں خود بھی اس کا حکم معلوم نہ تھا اور یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس لئے آپ نے شقوق نکالنی شروع کیں تا کہ وہ ساکت ہو جائے۔ پس فرمانے لگے کہ گٹھری کے گرنے میں کئی احتمال ہیں یا تو خود گری ہے یا کسی نے اس کو گرایا ہے۔ اگر خود گری ہے تو دو احتمال سے خالی نہیں یا تو آہستہ چل کر گری ہے یا دوڑ کر۔ اور اگر کسی نے اس کو گرایا ہے تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں یا تو اس کو گرانے والا آدمی ہے یا جانور۔ اور ہر شق کا جدا حکم ہے (اتنا جھوٹ بولا) اب بتلاؤ کہ کونسی صورت واقع ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تو معلوم نہیں انہوں نے کہا پھر مسئلہ ویسے ہی پوچھنے چلے آئے۔ جاؤ کام کرو۔

تو یہ بڑے متقیوں کا حال ہے۔ حالانکہ جناب باری تعالیٰ نے حضورؐ کے حق میں فرمایا وما انا من المتکلفین (میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں)۔ میں نے بڑے بڑے علماء کے فتوے دیکھے ہیں کہ انہوں نے جواب میں لکھ دیا ہے کہ ہمیں نہیں معلوم۔ اب چونکہ علماء میں یہ مرض عام ہو گیا ہے کہ کسی مسئلہ میں اپنی لاعلمی کا اظہار نہیں کرتے۔ اس وجہ سے اب اگر کوئی کہتا بھی ہے کہ مجھے نہیں معلوم تو اس کی بات کا یقین نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے ایک مسئلہ دریافت کیا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم، تو انہوں نے شکایت کی کہ مجھ سے خفا معلوم ہوتے ہیں۔ جو ایسا کہہ دیا ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کو یہ مسئلہ معلوم نہ ہو تو گویا مولوی کو عالم الکل ہونا چاہیئے۔ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تو یہ کیفیت تھی کہ آپ باوجود اس

علم و فضل کے فرما دیتے تھے کہ مجھے معلوم نہیں۔ پھر اور کون عالم اکمل ہو سکتا ہے
غرض جب حضورؐ ہی اتباع کرتے تھے جیسے کہ اس واقعہ سے معلوم ہوا تو پھر اور
کون اتباع سے مستغنی ہو سکتا ہے اور آپ کو اتباع کا حکم بھی تھا۔ چنانچہ حق
تعالیٰ کا آپ کو ارشاد ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا

دیکھیے یہاں شریعت کا لفظ صاف موجود ہے کہ شریعت کا اتباع کیجیے
اس سے کس قدر جی خوش ہوتا ہے کہ مولوی شریعت کے اتباع کو کیسے نہ کہیں
خود اللہ تعالیٰ شریعت کے اتباع کا حضورؐ کو حکم فرما رہے ہیں۔ اور من الامر
میں الف لام عہد کا ہے۔ اس سے مراد امر دین ہے۔ پس معنے یہ ہوئے کہ دین
کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کر دیا ہے آپ اُس کا اتباع کیے جائیے۔

حق تعالیٰ کا اتباع

پس جب اتنے بڑے صاحب علم کو ضرورت ہے
اتباع شریعت کی تو ہم کو کیوں نہ ضرورت ہو گی
تو ہر ایک کو اپنے بڑے کے اتباع کا حکم ہوا۔ حضورؐ سے بڑھ کر تو کوئی تھا
نہیں۔ تو آپ کو حکم ہوا اتباع وحی کا۔ اور صحابہ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم
ہیں۔ اس لیے انہیں حکم ہوا کہ حضور کا اتباع کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے فَاتَّبِعُوْنِيْ
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (سو میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھیں گے) اور عَلَيْكُمْ
بِسُنَّتِيْ (میری سنت کو اپنے اوپر لازم پکڑو)

پس حضورؐ کو تو حکم ہے وحی کے اتباع کا اور صحابہ کو حکم ہے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے اتباع کا۔ پھر علماء کو حکم ہے صحابہ کے اتباع کا اور نیچے آکر عوام

کو حکم ہے علماء کے اتباع کا۔ چنانچہ ارشاد ہے واتبع سبیل من اناب الی اور متبوع مستقل سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ پھر حضور کا اتباع کرنے کو جو کہا گیا ہے سو وہ اس لئے کہ حق تعالیٰ کا اتباع حضورؐ ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید سمجھانے کا وعدہ حضور ہی سے کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (یعنی پھر اس کا بیان کرا دینا ہمارا ذمہ ہے۔) اور حضورؐ فرماتے ہیں عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ (میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی پس اچھی ہوئی میری تعلیم۔)

تو آپ کے اتباع کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے ارشاد کے موافق خدا کے احکام کا اتباع کیا جاوے۔ یہی معنی خلفائے راشدین کے اتباع کے ہیں نہ یہ کہ خلفائے راشدین مستقل متبوع ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے راشدین کو دین خوب سمجھایا۔ اس وجہ سے دین کا اتباع صحابہ کے فرمانے کے مطابق کرنا چاہیئے اور چونکہ خدا تعالیٰ کے احکام کا اتباع صحابہ کے ارشاد کے موافق کیا جاتا ہے۔ اسی لیئے اُن کو صحابہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے کہ سُنَّۃُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ (خلفاء راشدین کی سنت) علیٰ ہذا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے دین کو حضرات ائمہ مجتہدین نے لیا اور سمجھا اور ایسا سمجھا کہ اُن کی تحقیقات دیکھنے سے اُن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لئے علماء کو اُن کی تحقیقات کے موافق اتباع کرنا چاہیئے۔ مگر نہ اس وجہ سے کہ وہ متبوع مستقل ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اگر ہم خود اتباع کرتے تو بہت جگہ احکام الٰہی کے سمجھنے میں غلطی کرتے اور وہ چونکہ ہم سے زائد سمجھتے تھے اس لئے ہم کو ان

کی تحقیق کے موافق اتباع کرنا چاہیئے۔

پس جب کہ ثابت ہو گیا کہ متبوع مستقل صرف حق تعالیٰ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اور ائمہ مجتہدین کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کا اتباع اُن کے ارشاد کے موافق کیا جاوے تو حنفی کہنے اور محمدی کہنے میں جواز و عدم جواز میں کچھ فرق نہ ہوگا کیونکہ اگر اس نسبت سے اتباع بالاستقلال و بالذات مراد لیا جاوے تب تو یہ نسبت دونوں میں صحیح نہ ہوگی کیونکہ ایسا اتباع تو خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اگر اس نسبت کے یہ معنی ہیں کہ اُن کے ارشاد کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کیا جاتا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے دونوں کی نسبت صحیح ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک کی نسبت کو جائز کہا جاوے اور دوسرے کی نسبت کو ناجائز پس معلوم ہو گیا کہ حنفی کہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس نسبت کو کفر شرک کہنا غلطی ہے کیونکہ اس نسبت سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ متبوع مستقل ہیں۔ بلکہ یہی معنی ہیں کہ اُن کی تحقیق کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کرتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ہم کو اُن کے متعلق اجمالاً یہ بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے اس وجہ سے ہم اُن کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں ورنہ بحیثیت مستقل متبوع ہونے کے اُن کا اتباع نہیں کرتے۔ تو جیسی نسبت ہم ابو حنیفہ رح کی طرف کرتے ہیں ایسی نسبت تو خدا کے کلام میں بھی دوسروں کی طرف موجود ہے۔ ارشاد ہے وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ۔ (جو لوگ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں اُن کے راستہ کا اتباع کرو۔) قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ (آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے خدا تعالیٰ کی طرف

بلاتا ہوں) سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسولؐ اور اُن لوگوں کی طرف کی جو حق تعالےٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (وہ اللہ تعالیٰ کے رستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں) میں سبیل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ تو یہ ایسا ہے کہ ؏

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ

(عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی ہے۔) ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

یعنی جو لباس بیاہے پہن لے میں تو قد سے ہی پہچان لیتا ہوں یعنی جو قرآن کا عاشق ہے اُس کو حدیث و فقہ میں بھی قرآن نظر آتا ہے۔

بات یہ ہے کہ جن کو محبت ہوتی ہے وہ محبوب کو ہر حالت میں پہچان لیتے ہیں اسی طرح جنہوں نے دین کو سمجھا ہے اُن کے سامنے وہ قرآن کے لباس میں آوے یا حدیث کے لباس میں وہ یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

کیونکہ لباس کے بدلنے سے ذی لباس تھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔

مجھے ایک واقعہ سے بہت تعجب ہوا کہ میرے ہاں ایک مہمان آئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک شخص مقیم خانقاہ سے اُن مہمان کو دکھلا کر یہ کہا کہ ان کو پہچان لو۔ جب مکان سے کھانا آوے تو انہیں کھلا دینا۔ اُنہوں نے کہا کہ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے جب کھانا آوے گا تو انہیں کھلادوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا آیا تو اُنہوں نے میرے پاس آکر کہا کہ میں نے اُن مہمان صاحب

کو بہت ڈھونڈا اگر وہ کہیں نہیں ملے۔ میں نے کہا یہ بیٹھے تو ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ چادرہ اوڑھے ہوئے تھے ان کے پاس تو چادرہ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ واقعی معقولی قاعدہ سے تو وہ نہیں رہے کیونکہ چادرہ اُتر جانے سے تشخص بدل گیا۔ تو جیسے وہ مہمان ایک چادرہ کے اُتر جانے سے بدل گئے ایسے ہی بعضوں نے حدیث کو اور بعضوں نے فقہ کو صرف عنوان بدلنے سے قرآن سے الگ کر دیا حالانکہ وہ سب اصل میں ایک چیز ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک مطب لکھنؤ کا کہلاتا ہے اور ایک دہلی کا۔ مگر ہیں دونوں طب یونانی۔ سو اسی طرح قرآن و حدیث اور فقہ گو فرعیات کے اندر مختلف ہیں مگر ہیں سب دین الٰہی۔ اگر فرعیات میں تھوڑا سا اختلاف ہو گیا تو کیا وہ دین الٰہی نہیں رہا جیسے طب یونانی اصول کا نام ہے۔ تو کیا لکھنؤ کا مطب اور دہلی کا مطب فرعیات کے اندر مختلف ہونے سے طب یونانی نہیں رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس کو سبیلی (میرا راستہ) فرمایا تھا۔ اُس کو یہاں سبیل من اناب الی (ان لوگوں کا راستہ جو میری طرف متوجہ ہوئے) فرما رہے ہیں۔ پس سبیلی اور سبیل من اناب الی مصداق کے اعتبار سے ایک ہوئے۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا۔ دین کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کر دیا ہے آپ اسی کا اتباع کئے جائیے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے۔ اب اس کے کیا معنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی شریعت محمدیہ کا ایک لقب یہ ہے ملت ابراہیم۔ یہ ہے عنوان کا اختلاف۔ باقی اصل اتباع احکام الٰہیہ کا ہے۔ پھر اتباع علماء کے عنوان سے کیوں متوحش ہوتے ہو۔

لباس کی اہمیت

مگر آج کل لوگ اس لفظ اتباع سے بے حد گھبراتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ علماء کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ مولویوں نے تو شریعت بڑھالی ہے کہ ہر بات کو اس میں شامل کرلیا ہے حتیٰ کہ لباس کو بھی جزو مذہب بنادیا ہے حالانکہ وہ ایک دنیوی امر ہے۔ پس اس کا اتباع کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ لباس کے مسئلہ میں تو ذرا بھی خفا نہیں۔ میں اس کی نظیر دیتا ہوں۔ دیکھئے فوج کی وردی معین ہوتی ہے۔ ہم تو جب جانیں کہ انسپکٹر یا سپرنٹنڈنٹ معائنہ کے لئے آویں اور کانسٹیبل وردی نہ پہنیں۔ تو یہ بھی وہی بات ہے بلکہ شریعت میں لباس کے اندر بہت گنجائش دی گئی ہے کہ جن لباسوں کی ممانعت کی ہے ان کی تعیین کردی ہے اور باقی سب کی اجازت دے دی ہے اور یہاں جس کی اجازت ہے اس کو متعین کردیا ہے اور باقی سب کی ممانعت کردی ہے۔ یہاں وردی کی تعیین میں کلام کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی مگر اللہ میاں چونکہ دنیا میں کچھ نہیں کہتے اس وجہ سے دین کے اندر ہر شخص کو جرأت ہے۔ تو اب اگر ریل پر کچھ نہ کہا تو کیا اسٹیشن پر بھی کچھ نہ کہیں گے۔ اب بہت جلد اسٹیشن پہنچ جاؤگے وہاں بے ٹکٹ بیٹھنے کی سزا ملے گی۔

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ
اَفَرْسٌ تَحْتَ رِجْلِکَ اَمْ حِمَارٌ

آنکھوں کے سامنے سے غبار ہٹنے پر عنقریب معلوم ہو جائے گا
کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر۔

اس وقت حال معلوم ہو جاوے گا جیسا کہ سپرنٹنڈنٹ معائنہ لکھ لے جاوے تو ابھی گو اُس نے کچھ نہیں کہا مگر جب رپورٹ ہوگی اُس وقت پتہ چلے گا۔ اور اگر کوئی کہے کہ ہم کو تو نقد ہی چاہیے اور آخرت میں جو کچھ ہو گا وہ تو ادھار ہے فی الحال تو اس میں کوئی خرابی نہیں۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اندر نقد مضرت بھی ہے کہ کفار جو کہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں اُن کے ساتھ مشابہت ہے تو عنداللہ مبغوض ہونا کیا یہ مضرت نہیں ہے اور نقد ہے۔ اگر اس پر کہا جاوے کہ صاحب کفار کی مشابہت سے کوئی کافر تو نہیں ہو جاویں گے اور اصل مضرت تو یہ ہے۔ تو میں کہوں گا کہ جیسے کفار کی وضع سے کافر نہیں ہو جاتے اسی طرح بیگم صاحبہ کی وضع بنانے سے بیگم نہ بن جائیں گے پھر ہم تو جب جانیں کہ بیگم صاحبہ کی وضع بنالیں اور صرف ایک گھنٹہ کے لئے آگر کرسی پر جلوہ افروز ہو جائیں۔ افسوس کہ یہ عذر یہاں تو مانع ہے اور وہاں نہیں۔

بس حضرت بالکل رسم کا اتباع ہے ورنہ جو خرابی عورت کا لباس پہننے میں ہے وہی کفار کا لباس پہننے میں ہے۔ تو کفار کی وضع اختیار کرنے میں یہ خرابی نقد ہے۔ اس کا کوئی معقول جواب دیں۔ سو ان کے پاس معقول جواب تو کچھ بھی

نہیں اور یوں ہر بات میں لا نسلم (ہم نہیں تسلیم کرتے) کہنا تو طوطے کی طرح دریں چہ شک (اس میں کیا شک) کہنا ہے۔ کوئی معقول جواب لائیں۔ غرض وضع کے اندر مضرت ادھار ہو یا نقد ہو اُس کے متعلق بھی احکام شرعیہ ہیں۔

دین کا اختصار

مگر اب لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ شریعت تو مختصر تھی اور مختصر بھی اتنی کہ من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ (یعنی جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا جنت میں داخل ہو گیا) صرف لا الٰہ الا اللہ ہی کہنا کافی تھا۔ حتیٰ کہ بعض تعلیم یافتوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس میں محمد رسول کے قائل ہونے کی بھی قید نہیں۔ پس منکر رسالت کو بھی نجات ہو گی۔ ایک صاحب اس سے بھی ترقی کر کے کہتے ہیں کہ منکر توحید کو بھی نجات ہو گی۔ کیونکہ توحید امر طبعی ہے اور امر طبعی کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا۔ پس جو شخص زبان سے اُس کا انکار کرتا ہے حقیقۃً اُس کا قائل ہے۔ اس لئے اُس کی بھی نجات ہو جاوے گی۔ گویا لا الٰہ الا اللہ بھی نہ رہا۔ شریعت سے یہاں تک استثناد کی کہ اس کے تمام اجزاد کو مستثنیٰ کر لیا۔ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کے برابر ہو گیا اور مستثنیٰ منہ کچھ بھی نہ رہا۔ معاذ اللہ اس زیادتی کی کچھ انتہا ہے۔ صاحبو! اب ہماری وہ حالت ہو گئی ہے کہ ہم لوگوں کی کوئی بات بھی اصل حالت پر نہ رہی۔ کسی کا شعر ہے ؎

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

اے حضورؐ! ذرا خواب راحت سے اٹھئے تو سہی۔ دیکھئے آپ کی امت کس بلا میں گرفتار ہے۔

تمام عالم میں ایک طوفان برپا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (خشکی و

نری سب میں فساد بہ پا ہے) اور یہ ایسا اختصار ہے جیسا کہ ایک بڑھیا نے ایک باز کو پکڑ لیا تھا اور اُس کے ٹیڑھے ٹیڑھے ناخن اور چونچ دیکھ کر اُس کو بہت ترس آیا کہ یہ ایسے ناخنوں سے چلتا کیوں کر ہوگا اور اس چونچ سے دانہ کیسے چگتا ہوگا۔ پس اُس نے اُن کو مضر سمجھ کر کتر دیا۔

سو جیسے اُس نے باز کا اختصار کیا تھا اسی طرح ہمارے بھائی دین کا اختصار کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولویوں نے شریعت کو پھیلا بہت دیا۔ تو سمجھ لو کہ شریعت مولویوں کی پھیلائی ہوئی نہیں ہے۔ ہاں اس اعتبار سے منسوب ہے مولویوں کی طرف کہ جو خدا اور رسول کے کلام کا مطلب تھا۔ انہوں نے اُس کی تفسیر کر دی ہے۔ اس لئے اس حکم کو اُن کا فتویٰ کہہ دیا جاتا ہے۔ پس اُن کیطرف اس کی نسبت ایسی ہے جیسی کہ اس آیت میں کہ وَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا (ملت ابراہیمی کا اتباع کرو۔) باوجودیکہ حضور مستقل ہیں مگر پھر بھی کہا جاتا ہے کہ وَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاھِیْمَ (آپ دین ابراہیم کا اتباع کیجیے) سو اگر اس کے یہ معنی ہوں کہ جو ان کا طریقہ ہے اُس کا اتباع کیجیے تب تو یہ بڑا سخت مضمون ہے کیونکہ یہ تو امتی کا کام ہے کہ دوسروں کے طریقہ کا اتباع کرے نہ کہ نبی کا۔ تو بے تکلف توجیہ اس کی اس تقریر سے سمجھ میں آجاوے گی کہ ملتِ ابراہیم اُس ملتِ الٰہیہ کا نام ہے۔ اُس کے بہت سے لقب ہیں۔ اُس میں سے ایک لقب ملتِ ابراہیم بھی ہے۔ چونکہ یہ دونوں شریعتیں فروع میں بھی بکثرت متفق ہیں اس مناسبت سے اس ملت کا نام ملتِ ابراہیم رکھا گیا ہے۔ تو واقع میں ملت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع نہیں ہے بلکہ ملتِ الٰہیہ کا اتباع ہے جو کہ ایک مناسبت سے ابراہیم

علیہ السلام کی طرف منسوب کر دی گئی۔ تو جیسے یہاں پر ملت الہیہ کو ملت ابراہیم کہہ دیا گیا ہے اسی طرح اگر اس دین کو مذہب شافعیؒ یا مذہب ابو حنیفہؒ یا قول قاضی خاں کہہ دیا جاوے تو کیا مضائقہ ہے۔

اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو مولوی صاحب کا فتویٰ ہے کوئی خدا اور رسولؐ کا تو حکم نہیں ہے حالانکہ وہ مولوی صاحب کا فتویٰ نہیں بلکہ خدا کا مسئلہ ہے مولوی صاحب نے اس کو سمجھ کر بتلا دیا ہے اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اَلْقِیَاسُ مُظْهِرٌ لَا مُثْبِتٌ (یعنی قیاس حکم شرعی کو ظاہر کرنے والا ہے اس کو ثابت کرنے والا نہیں۔) پس اب بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم علماء ہی کا اتباع لازم ہوا۔ کیا خوب کہا ہے ؎

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ
چارہ نبود در مقامش جز چراغ

یعنی جب آفتاب چھپ گیا تو اب سوائے چراغ کے اور کیا علاج ہو سکتا ہے۔ تو جب صاحب وحی ہماری نظروں سے غائب ہو گئے تو سوائے اتباع علماء کے اور کیا چارہ ہو سکتا ہے ؎

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

یہ شعر بجمیع اجزائہ (اپنے تمام اجزاء کے اعتبار سے) تو یہاں منطبق نہیں ہے کیونکہ گلستان شریعت بحمد اللہ ویسا ہی ہرا بھرا ہے مگر مطلب یہ ہے کہ اب چونکہ صاحب وحی تشریف نہیں رکھتے۔ اس لئے اب دین کو ان لوگوں سے حاصل کرنا چاہئے جن کے اندر صاحب وحی کا فیض موجود ہے کیونکہ اس وقت بھی جو کچھ

فیوض ہیں وہ حضورؐ ہی کے تو ہیں جو مجتہدین اور علماء کو حضورؐ سے حاصل ہوئے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ پس بغیر اُن کا اتباع کئے چارہ نہیں اور اصل میں یہ علماء کا اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول کا اتباع ہے جس کا طریقہ اُن سے معلوم کر لیا جاتا ہے اور گو یہ سبیل من اناب (راستہ اُن لوگوں کا جو منیب ہیں) کہلاتا ہے مگر واقع میں سبیل اللہ اور سبیل رسولؐ ہے۔ علماء چونکہ اُسے ہم کو سمجھا دیتے ہیں اس معنی کر وہ واسطہ ہیں۔ صرف اس مناسبت سے اُن کی طرف منسوب کر کے سبیل من اناب کہا گیا۔

خلاصہ یہ کہ اتبع کے مخاطب تو وہ لوگ تھے جو سرے سے اتباع ہی کو ضروری نہیں سمجھتے اور کسی کا اتباع ہی نہیں کرتے۔ اس سے تو اُن لوگوں کی اصلاح کی گئی ہے۔

معیارِ اتباع

اب رہ گئے وہ لوگ جو اتباع تو کرتے ہیں مگر کوئی معیار صحیح نہیں مقرر کرتے بلکہ ہر کس وناکس کا اتباع کرنے لگتے ہیں سو آگے اُن کی اصلاح کرتے ہیں کہ سبیل من اناب (اُن لوگوں کے راستہ کا جو منیب ہیں) کا اتباع کرو اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھئے کہ واتبع من اناب الی (ان لوگوں کا اتباع جو میری طرف متوجہ ہوئے) نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ایہام ہے اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں۔ اس لئے سبیل کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا واتبع سبیل من اناب الی (اُن لوگوں کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) کہ وہ خود متبوع نہیں ہیں بلکہ اُن کے پاس ایک سبیل ہے وہ ہے متبوع۔ یہ ہے اتباع کا معیار کہ جس شخص کا اتباع کرو اُس کو

دیکھ لو کہ وہ صاحب انابت ہے یا نہیں۔ جو صاحب انابت ہو اُس کا اتباع کرو سبحان اللہ! کیا عجیب معیار ہے۔ پس اتباع اسی معیار کے موافق کرنا چاہیئے اور سب معیار چھوڑ دینے چاہئیں۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے توجہ الی اللہ (اللہ کی طرف توجہ کرنے) کو معیار بنایا۔ اور توجہ الی اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو مانے۔ چنانچہ فرماتے ہیں وَیَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ (یعنی جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو ہدایت کرتے ہیں) کہ توجہ الی اللہ کو ہدایت لازم ہے اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ توجہ الی اللہ کے لئے لازم ہے کہ اُس کے افعال درست ہوں۔ پس اب اناب الی سے مراد وہ شخص ہوا جو کہ با عمل ہو اور عمل بدون علم کے ہو نہیں سکتا۔ تو حاصل یہ ہوا کہ اس کا اتباع کرو کہ جو احکام خداوندی کے علم و عمل دونوں کا جامع ہو۔ بس دو چیزیں اصل ٹھہریں

ایک علمِ دین ——— اور

ایک عملِ دین ——— ،

اور اب تک جتنے معیار لوگوں نے مقرر کر رکھے ہیں اُن میں نہ عمل ہے نہ علم۔ اور علم و عمل کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے وہ توجہ الی اللہ ہے۔ پس سب سے اوّل تو علم ہونا چاہیئے اور پھر اُس پر یہ اثر مرتب ہونا چاہیئے کہ عمل اور توجہ الی اللہ ہو۔ سبحان اللہ! کیا جامع کلام ہے کہ ایک اناب کے لفظ میں تینوں امور (علم و عمل و توجہ الی اللہ) کی طرف اشارہ فرما دیا۔ پس اب معلوم ہوا کہ کامل اور اتباع کے قابل وہ ہو گا کہ جس میں یہ تینوں باتیں ہوں۔ یہ میں اس

لئے بیان کرتا ہوں کہ اس وقت لوگوں کو قابل اتباع اور کاملین کی پہچان نہیں رہی کہ ہرکس وناکس کے معتقد ہو جاتے ہیں اور صرف معتقد ہی نہیں بلکہ غلام بننے کو تیار ہوتے ہیں۔ خواہ کوئی بھی آجاوے یہ اُن کے مرید ہو جاویں گے۔ چونکہ آج کل لوگ اس طرح آنکھ بند کرکے ہر ایک کے متبع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اتباع کا ایک معیار ہونا چاہیئے اور صحیح معیار اُس کا اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ جس میں تین چیزیں (علم اور عمل اور توجہ الی اللہ) ہوں۔ وہ ہے قابل متبوع ہونے کے۔ بس اُس کا اتباع کیجئے۔ پس متبوع میں تین چیزیں دیکھئے ایک علم، دوسرے عمل کہ کسی گناہ کبیرہ میں مبتلا نہ ہو اور صغیرہ پر اصرار نہ ہو اور تیسرے توجہ الی اللہ جس کی شناخت یہ ہے کہ اُس کی صحبت میں ایک خاص برکت ہو۔ اُس کی صحبت حق تعالیٰ کی مذکر (یاد دلانے والی) ہو۔

بس جس شخص میں یہ تمام خوبیاں ہوں وہ ہے اس قابل کہ اُس کے طریقہ کا اتباع کیا جاوے۔ خواہ وہ طریقہ خود اس کی زبان سے بلا واسطہ پہنچے یا کسی معتبر واسطہ سے۔ کیونکہ اتباع کیا جاتا ہے علماء مجتہدین کے طریقہ کا اور تمام علماء مجتہد ہوتے نہیں۔ پس وہ جو علماء کہ مجتہد نہیں ہیں وہ بھی چونکہ مجتہدین ہی کی تحقیقات بیان کرتے ہیں اس لئے ان کا اتباع بھی ضروری ہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجتہدین کا اتباع جو کیا جاتا ہے ان میں درویشی کا رنگ کہاں تھا جس کو اتباع سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے ؎

آں طرف کہ عشق مے افزود درد — بوحنیفہ شافعی درسے نکرد

یعنی جس چیز سے عشق اور درد کو ترقی ہوتی ہے اُس کا ابوحنیفہؒ اور

شافعی رح نے کبھی درس نہیں دیا۔

اگر یہ مولانا کا شعر ہے مجھ کو اس وقت یاد نہیں، تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ اُن کے تصوّف کا لون جدا تھا کہ وہ زیادہ تر عبادات اور معاملات کی اصلاح میں مشغول تھے۔ ان متعارف کیفیات کا وہ اہتمام نہ فرماتے تھے۔

چنانچہ امام ابو یوسف رح کا قصہ ہے کہ وہ مرض وفات میں تھے ایک شخص اُن کی عیادت کو آئے۔ دیکھا تو آپ کچھ سوچ رہے تھے۔ اُنہوں نے دریافت کیا کہ آپ کیا سوچ رہے ہے۔ فرمایا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ رمی جمار راکباً (سوار ہو کر) افضل ہے یا ماشیاً (پیدل ہو کر) تم بتلاؤ کہ ان میں کون سی افضل ہے۔ انہوں نے کہا کہ ماشیاً افضل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اخطأت کہ تم نے غلطی کی۔ پھر اُنہوں نے کہا کہ راکباً افضل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اخطأت کہ یہ بھی صحیح نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے کہ جس رمی کے بعد اور رمی ہو وہ تو ماشیاً افضل ہے اور جس رمی کے بعد رمی نہ ہو تو وہ راکباً افضل ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس کے بعد یہ شخص وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازہ تک نہ پہنچے تھے کہ گھر سے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ معلوم ہوا کہ آپ کی وفات ہو گئی اور یہ شخص حیران رہ گئے کہ اللہ اکبر۔ ان حضرات کو علم دین سے کس قدر محبت ہے کہ مرتے دم تک اسی میں مشغول رہتے ہیں۔

سو ان حضرات کے تصوّف کا یہ رنگ تھا۔ امام محمد سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے تصوف میں کوئی کتاب نہیں لکھی؟ فرمایا کہ کتاب البیوع ہے نہیں

اُس سے معاملات درست ہوتے ہیں اور اکل حلال میسر ہوتا ہے اور اکل حلال سے باطن میں نور پیدا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاملات وغیرہ کا درست ہونا بھی ضروری ہے۔ اب لوگوں کے نزدیک معاملات تصوف میں داخل ہی نہیں رہے۔ آج کل جو اپنے کو صوفی کہتے ہیں اُن کے نہ معاملات درست نہ اخلاق۔ غرض یہ کہ اصل مقصود انابت ہے خواہ کون اس کا کوئی ہو۔ پس جن چیزوں کو اُس کے حصول میں دخل ہوگا وہ تو مقصود ہوں گی اور جن چیزوں کو اس میں دخل نہ ہوگا وہ مقصود نہ ہوں گی۔

کشف وکرامات کی حقیقت

اب دیکھنا چاہیے کہ کشف وکرامت وغیرہ جس کو آج کل لوگ مقصود سمجھتے ہیں یہ چیزیں انابت کے اندر کچھ دخل رکھتی ہیں یا نہیں۔ سو میں اس کی حقیقت بتلاتا ہوں سنیئے! انابت کے لئے قرب ضروری ہے۔ پس جس بات سے قرب ہو وہ تو انابت میں دخل رکھتی ہے اور جس بات سے کچھ قرب نہ ہو اُس کو انابت میں کچھ دخل نہیں۔ کیونکہ اُن سے کچھ قرب نہیں ہوتا اور اگر تین مرتبہ سبحان اللہ کہیے تو اُس سے قرب ہوتا ہے۔ پس ہزار کشف وکرامت سے تین مرتبہ سبحان اللہ کہنا افضل ہے۔ حضرت جن اعمال کو آپ حقیر سمجھتے ہیں وہی اصل مقصود ہیں۔

اس وقت بعضے اہل طریق کو بھی یہ غلطی ہوتی ہے کہ وہ حالات اور کیفیات کو اصل مقصود سمجھ گئے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ مقصود بالذات یہی نماز روزہ ہیں۔ کیفیات وغیرہ تو انہی نماز روزہ کی درستی کے لئے ہیں۔ اعمال اور کیفیات کی بالکل ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک ہوتی ہے غذا اور ایک ہوتی ہے دوا۔

مگر مقصود غذا ہوتی ہے اور دوا صرف اس لئے ہوتی ہے کہ حالت مرض میں چونکہ غذا جزو بدن نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے غذا کے جزو بدن ہونے کی قابلیت ہو جاوے۔ پس دوا مقصود نہیں ہوتی۔

سو جیسے اصل مقصود غذا ہے اور دوا محض معین ہے۔ اسی طرح یہاں اصل مقصود نماز روزہ ہے اور کیفیات بطور دوا کے ہیں کہ اُن کو مجاہدات سے محض اس لئے حاصل کیا جاتا ہے تاکہ اُن کے ذریعہ نماز روزہ کی قابلیت پیدا ہو جاوے جیسے کہ دوا کھائی جاتی ہے کہ اُس سے ہم میں اتنی قابلیت ہو جاوے کہ غذا جزو بدن بنے۔ پس یہ مجاہدات، معالجات کے درجہ میں ہوئے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ نماز کی قابلیت تو کیفیات پر موقوف نہیں ہے جن لوگوں نے مجاہدات نہیں کئے اور اُن کو کیفیات حاصل نہیں ہوئیں۔ وہ بھی تو نماز پڑھتے ہیں۔ تو بات اصل میں یہ ہے کہ نماز کے بھی حقوق ہیں۔ اگرچہ یہ نماز پڑھتے ہیں مگر جو اُس کے حقوق ہیں وہ اُن سے ادا نہیں ہوتے۔ دیکھئے حضورؐ فرماتے ہیں۔ مُقْبِلٌ عَلَیْهِمَا بِقَلْبِهٖ کہ نماز کی طرف دل متوجہ ہو۔ پس نماز کے اندر خشوع اور خضوع بھی ہونا ضروری ہے اور فرماتے ہیں۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ کہ حق تعالےٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا خدا کو دیکھتے ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ خیال کر لیا کرو کہ خدا کو دیکھ رہے ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی عبادت کرو جیسے کہ اگر خدا کو دیکھتے ہوتے تو اُس وقت عبادت کس طرح کرتے اور ظاہر ہے کہ اس وقت نماز کے اندر کسی بات کی فروگزاشت نہ کرتے۔ حضور قلب بھی ہوتا اور

خشوع وخضوع بھی تعدیل ارکان بھی ہوتی ۔پس اب بھی اسی طرح کی عبادت کرو اور فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ یہ اُس کی علت ہے ۔یعنی ایسے اہتمام سے عبادت اس لئے ضروری ہے کہ گو تم خدا کو نہیں دیکھتے مگر خدا تو تم کو دیکھتا ہے اور اس کا مقتضا بھی اسی اہتمام کے ساتھ عبادت کرنا ہے ۔مطلب یہ کہ اگر تم خدا تعالیٰ کو دیکھتے تو جیسے اُس کا یہ مقتضا تھا کہ نماز کے اندر کوئی فروگزاشت نہ ہو اُسی طرح اس کا بھی یہی مقتضا ہے ۔لہٰذا اب بھی ویسی نماز پڑھنی چاہیے جیسی اُس صورت میں پڑھتے ۔

پس یہ معنی ہیں اس حدیث کے اور اسی لئے اس کا نام احسان ہے یعنے نیکو کردن عبادت (یعنی عبادت کو اچھی طرح ادا کرنا) پس مطلوب ایسی عبادت ہے نماز ہو تو ایسی اور قرآن مجید کی تلاوت ہو تو ایسی ہو ۔سو مطلوب تو عبادت کا یہ درجہ ہے اور یہ درجہ ہم کو حاصل ہے نہیں پس اس کو حاصل کرنا ضروری ہے اور تحصیل کے طریق مختلف ہیں ۔تو جن کی استعداد کامل ہے اُن کی تو ذرا توجہ بھی کافی ہے اور جن کی استعداد ضعیف ہے اُن کو صرف توجہ سے یہ بات حاصل نہیں ہوتی ۔بعض دفعہ تو خود حدوث ہی کے لئے یہ توجہ ناکافی ہوتی ہے۔ پس ضرورت اس کی ہوئی کہ توجہ کو یکسوئی کا عادی کریں ۔پھر اُس سے نماز میں کام لیں ۔صحابہ کی استعداد چونکہ کامل تھی ۔اُن کو محض توجہ کافی تھی اور ہماری استعداد میں ہوا ضعف اور ہم کو ہوا حضور سے بُعد ۔اس لئے اب ہم کو ضرورت ہوئی اس بات کی کہ کچھ شغل کریں تاکہ توجہ میں یکسوئی حاصل ہو جاوے ۔پھر اُس سے عبادت میں کام لیں تاکہ جیسی عبادت مطلوب ہے ویسی ہی ادا ہو ۔اس میں دوگون

کو آج کل بڑی غلطیاں واقع ہو رہی ہیں کہ ناواقف لوگ مجاہدات سے کیفیات یا مکاشفات ہی کو مقصود اصلی سمجھتے ہیں اور اُن کی طرف متوجہ ہو کر لذت حاصل کرتے ہیں۔

صاحبو! یہ بہت خطرناک بات ہے۔ اس سے غلطی میں پڑ جانے کا بہت قوی شبہ ہے کیونکہ کیفیات تو اہل باطل کو بھی ہو جاتی ہیں۔ رہے مکاشفات مثلاً الوان و اصوات سو یہ بہت کم ملکوتی ہوتے ہیں بلکہ اکثر متخیلہ کی صورتیں ہوتی ہیں اور اگر ملکوتی بھی ہوئیں تو وہ ہے کیا چیز، وہ بھی مخلوق ہی تو ہے۔ پس جب آپ ان کے تماشہ میں لگ گئے اور اسی سے لذت حاصل کرنے لگے، تو آپ نے ایک مخلوق کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کیا۔ تو ہر حال میں توجہ الی المخلوق (مخلوق کی طرف متوجہ) ہی رہی۔ اور مقصود ہے توجہ الی الخالق (اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا) پس مقصود سے اب بھی دور ہی رہے۔

اسی لئے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ حجابات نورانی حجابات ظلمانی سے زیادہ شدید ہیں کیونکہ طالب ان کو مقصود سمجھ لیتا ہے۔ اس وجہ سے اُن میں مشغول رہ کر حق تعالیٰ سے محجوب ہو جاتا ہے اور حجابات ظلمانی کو ہر شخص مذموم سمجھتا ہے اس لئے اُن کے ازالہ کی فکر کرتا ہے۔ پس چونکہ حجابات نورانی بہت اشد ہیں۔ اسی لئے ہمارے ہاں اس کی نفی کی تعلیم ہے۔ سالک کا تو یہ حال ہونا چاہیے کہ ؎

اے برادر بے نہایت در گہے ست
ہرچہ بروے می رسی بروے مایست

اے بھائی! بے نہایت درگاہ ہے جس مقام پر پہنچو وہاں مت
ٹھہرو بلکہ آگے بڑھو۔

خلاصہ یہ کہ اشغال سے مقصود یہی ہے کہ طبیعت کو اُن کے ذریعہ سے یکسوئی کی عادت ہو اور پھر اس یکسوئی سے عبادت میں کام لیں۔ بس یہ دوا ہیں، غذا نہیں۔ جیسے دوا اصلاح مزاج کے لئے ہوتی ہے اسی طرح یہ اشغال اصلاح حال و اصلاح طبیعت کے لئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ منتہی اشغال کو ترک کردیتا ہے البتہ اگر اُن حالات کے بقاء کے لئے کسی قدر شغل کرتا رہے تو وہ دوسری بات ہے۔ باقی سب اشغال چھوٹ جاتے ہیں غالب ذکر رہ جاتا ہے۔ تو یہ ہے حقیقت اشغال اور کیفیات کی کہ یہ سب توجہ الی اللہ کے اسباب ہیں اور قرب میں خود ان کو کچھ دخل نہیں بلکہ اُس میں دخل ہے اعمال کو جن سے نسبت مع اللہ حاصل ہو۔ جس سے حق تعالیٰ کے احکام بے تکلف ادا ہونے لگیں اور ذکر بے تکلف ہونے لگے اور اس ادائے احکام اور ذکر سے پھر ایک اور شے مقصود ہے یعنی رضائے حق۔ پس جس چیز کو رضا میں دخل ہے وہ تو جزو تصوف ہے اور جس چیز کو اس میں دخل نہیں وہ تصوف سے خارج ہے اور جو اس میں مخل ہو وہ تصوف کے منافی ہے۔

اب تو یہ غضب ہے کہ بعضے لوگ معاصی کو بھی مضر اور تصوف کے منافی نہیں سمجھتے بلکہ شغل سے جو ایک حرارت پیدا ہو جاتی ہے اسی کو کافی سمجھتے ہیں گو اعمال کیسے ہی ہوں۔ حالانکہ صرف اس حرارت کے حاصل ہونے سے مقصود تک رسائی نہیں ہو جاتی۔ ابھی تو مقصود سے اتنی دور ہے جیسے مکہ جانے والا بمبئی پہنچا ہو

تو یہ بمبئی ہے مکہ نہیں ہے مکہ تو ابھی بہت دور ہے۔ پس اب اس حرارت و ذوق سے طاعات میں کام لینا چاہیئے تب کہیں مقصود تک رسائی ہوگی۔ اب بعض لوگ صرف اسی کیفیت کو بزرگی سمجھتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ اس کو بزرگی سمجھنا بہت خطرناک امر ہے۔ کیونکہ جس شخص کا ایسا اعتقاد ہوگا اُس نے اگر غذا حرام کھائی یا کسی پر ظلم کیا تو بزرگی واقع میں تو گئی مگر یہ شخص ابھی تک دھوکا میں ہے کہ اپنے کو ویسا ہی سمجھے ہوئے ہے جیسا کہ پہلے تھا کیونکہ اس کے نزدیک بزرگی نام ہے کیفیات کا اور معاصی سے کیفیات زائل نہیں ہوتیں۔ رات کو ذکر کرنے بیٹھے تو پھر عوطہ سا لگ گیا۔ پس جب اس کی پہلی کیفیت زائل نہ ہوئی تو یہ سمجھے کہ معاصی بزرگی میں کچھ مخل نہیں۔ اس لئے میں بار بار کہتا ہوں کہ جو چیزیں انابت میں مخل ہیں وہ بزرگی کے بھی منافی ہیں۔

منیب کا طریقہ غرض یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس میں انابت دیکھو اُسی کے طریقہ کا اتباع کرو اور وہ طریقہ واقع میں خدا اور رسول کا طریقہ ہے۔ پھر اس کو منیب کا طریقہ جو کہا گیا ہے اُس کی ایسی مثال ہے جیسے کہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی کتاب۔ تو کتاب حقیقۃً تو اُس کی نہیں ہوتی کیونکہ اُس کے تمام مضامین اُس شخص کے نہیں ہوتے۔ مثلاً صحیح بخاری کہ اُس کے اندر جو حدیثیں ہیں وہ امام بخاری کی تو نہیں بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہیں پس کتاب کو اُس شخص کی صرف اس معنی کر کہا جاتا ہے کہ اس نے اُس کو جمع کیا ہے۔ اسی طرح یہ طریقہ حقیقت کے اعتبار سے تو حق تعالیٰ کا ہے اور منیب کا صرف اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ اُس کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ پس اتباع

کا معیار یہ ہے۔ اب جس سے عقیدت پیدا کرتے ہو یہ دیکھ لیا کرو کہ وہ اس معیار کے مطابق ہے یا نہیں۔

اس سے ایک دوسری بات بھی ثابت ہوئی کہ دین کس قدر سہل ہے۔ دیکھئے حق تعالیٰ نے ہم کو کیسا آسان معیار بتلایا ہے۔ اب آج کل لوگ چونکہ اس معیار سے کام نہیں لیتے اور نئے نئے معیار تراشتے ہیں اس لئے بہت پریشان ہوتے ہیں اور ہزاروں فرقے ہوتے جاتے ہیں۔ کوئی اہل قرآن ہے، کوئی عامل بالحدیث ہے۔ بعض نے پنجاب میں نبوت ہی کا دعویٰ کر دیا۔ اب اگر معیار صحیح نہ ہو تو کتنی پریشانی ہے۔ چنانچہ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جنہوں نے اپنی تھوڑی عمر میں مذاہب منسوبہ الی الاسلام (اسلام کی طرف مذاہب منسوب) میں سے کئی کئی مذہب اختیار کئے۔ بعض نے اسلام کو چھوڑ کر دوسرے خارستان کی بھی زیارت کی کہ گویا یصبح مومنا ویمسی کافرا۔ (صبح کرتے ہیں مومن ہو کر اور شام کرتے ہیں کافر ہو کر) کے مصداق ہو گئے اور ان کی وہ حالت ہو گئی کہ ؎

بیزارم ازاں کہنہ خدائے کہ تو داری

ہر روز مرا تازہ خدائے دیگرے ہست

یعنی تمہارے قدیمی خدا سے میں بیزار ہوں۔ مجھ کو ہر روز نئے خدا کی ضرورت ہے۔

آج کل لوگوں کی اس تلون مزاجی کی وجہ سے واللہ اتنی بدگمانی بڑھ گئی ہے کہ اگر کوئی شخص مرتد ہونے کے بعد پھر مسلمان ہو جاوے تب بھی اس کے اسلام پر اطمینان نہیں ہوتا مگر خیر یہ شریعت کی خوبی ہے کہ وہ ہر مرتبہ اس کے اسلام کو

قبول کر لیتی ہے۔ ع

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ ــــــ!

(یعنی سو مرتبہ اگر توبہ توڑ چکے ہو تو پھر آ جاؤ۔) شریعت کا یہ مسئلہ ہے کہ چاہے کیسا ہی شخص ہو جب وہ اسلام میں داخل ہونا چاہے اُس کا اسلام قبول کر لیا جاوے گا کیونکہ شریعت کی یہ تعلیم ہے اس لیے مسلمانوں کی قوم بہت بھولی ہوتی ہے کہ اُن کے ساتھ کسی نے کیسی ہی برائی کی ہو مگر جب وہ عذر کرتا ہے یہ فوراً اُس کو قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ان میں کرم بہت ہوتا ہے۔ حدیث ہے ــــ المومن غر کریم (مومن کریم بھولا ہوتا ہے) پس کرم کی وجہ سے ہر ایک کی بات مان لیتے ہیں اور دھوکا میں آ جاتے ہیں۔ سو کرم علت ہے بھولے ہونے کی مسلمانوں میں سب جگہ ایسا ہی دیکھ لیجئے کہ جو ان سے کہے کہ میں تمہارا دوست ہوں بس یہ اُس کو دوست سمجھنے لگتے ہیں اور اُس کے ساتھ دوستی کا برتاؤ کرنے لگتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ترقی متعارف اُن کو نہیں ہوتی کیونکہ اُس کے لیے چالاکی ضروری ہے۔ غرض یہ شریعت کی خوبی ہے کہ ایسوں کا اسلام قبول کر لیتی ہے۔

حاصل یہ کہ بعضوں نے کفر کی بھی سیر کی۔ سو ان سب خرابیوں کی وجہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے بتلائے ہوئے معیار کو بھول گئے۔ اگر من اناب الیّ کے معیار کو مقرر کر لیتے تو ہرگز یہ خرابیاں نہ ہوتیں۔

متبوع کی شناخت

بعضے اتباع تو اہل انابت ہی کا کرتے ہیں مگر اُس کے ساتھ یہ خود رائی کرتے ہیں کہ ان منیبین میں سے کسی ایک کو اتباع کے لیے متعین نہیں کرتے۔ جس مسئلہ میں اُن میں سے جس کا چاہا

اتباع کر لیا۔ یہ خود رائی بھی بہت مضر ہے۔ مناسب یہ ہے کہ زندہ لوگوں میں سے ایک شخص کو اپنی متبوعیت کے لئے پسند کر لیجئے اور میں یہ بہت فائدہ کی بات بتلاتا ہوں۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ سلامتی اسی کے اندر ہے۔ گو اہل انابت متعدد ہوں مگر متبوع اُن میں سے ایک کو بنا لیا جاوے اور اُسی کے سبیل کا اتباع کیا جاوے۔

پس اب ان میں سے ایک کو ترجیح دینے کا طریقہ معلوم ہونا چاہئے۔ سو وہ یہ ہے کہ جس کی انابت زیادہ ہو۔ یعنی یہ دیکھ لیجئے کہ اس کا علم کیسا ہے تقویٰ کی کیا حالت ہے۔ پھر دیکھئے کہ نسبت مع اللہ کیسی ہے اور یہ معلوم ہوگا کہ اس کی صحبت میں رہنے سے یعنی اگر اس کے پاس بیٹھنے سے دنیا کی محبت کم ہو تو سمجھو کہ اُس کی نسبت کامل ہے اور وہ متبوع بنانے کے قابل ہے اور اگر اپنی استعداد ضعیف ہونے کی وجہ سے اُس کی صحبت کا اپنے اندر یہ اثر محسوس نہ ہو کہ دنیا کی محبّت گھٹ گئی تو صرف اتنی بات سے بدگمان نہ ہو جاوے کیونکہ استعداد ضعیف ہونے کی وجہ سے اثر بھی بہت ضعیف ہوتا ہے۔ جس کا ابھی احساس نہیں ہوتا۔ سالہا سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کیا اثر ہوا۔ پس جب اپنے اندر اثر محسوس نہ ہو تو اُس کے پاس کے رہنے والوں کو دیکھے کہ ان لوگوں کی حالت کیسی ہے۔ اگر اُن میں سے اکثر کی حالت اچھی دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ شخص کامل ہے۔

حضرت یہ تجربہ ہوا ہے کہ جو اہل باطل ہوتا ہے اُس کے مخصوصین اور مقربین نہایت بدتر حالت میں ہوتے ہیں۔ ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ لوگ

اُن کو بزرگ سمجھتے تھے اور اُن سے پانی پڑھوا کر لے جاتے تھے۔ اُن کے مخصوصین کی یہ حالت تھی کہ موٹے موٹے دانوں کی تسبیح لوگوں کو دکھلانے کے لئے پاس رکھتے تھے اور نماز روزہ کچھ نہ کرتے تھے۔

سو اہل باطن کے پاس رہنے والوں میں اکثر کی حالت اچھی ہو تو سمجھ لو کہ ضرور وہ شخص کامل ہے۔ اُس کو متبوع بنالو اور ہرگز نہ چھوڑو اور اگر اُس کے مخصوصین میں اکثر کی حالت خراب دیکھو تو سمجھو کہ اُسی کی حالت خراب ہے۔ خود اُسی کے پاس کچھ نہیں، پاس کے رہنے والوں میں کہاں سے آوے۔

بقول رامپور کے ایک شخص کے کہ وہ اہل باطل میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں جا پھنسا تھا اور بات کی پچ کی وجہ سے اُس کو نہیں چھوڑتا تھا کسی نے اُس سے کہا کہ میاں تم کو پیر سے کچھ حاصل بھی ہوا؟ اُس نے کہا کہ جب سقاوہ ہی میں نہ ہو تو بدھنے میں کہاں سے آوے۔

سو ایسے شخص کو چھوڑو۔ ہاں اتنی بات ہے کہ اُس کو بُرا بھلا مت کہو بُرا کہنے سے کیا فائدہ۔ اگر کسی طبیب کا علاج پسند نہ آوے تو اُس کا علاج نہ کرو مگر اُس کو بُرا بھلا کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس منیبین کے تعدد کی حالت میں جس میں انابت اقوی معلوم ہو اُس کو اختیار کرلو اور اُس کے ہوتے ہی صرف اُسی کا اتباع کرو۔ اسی میں راحت ہے۔ گو فی نفسہٖ یہ بھی جائز ہے کہ مختلف لوگوں کا اتباع ہو۔ مثلاً کسی شیخ سے کوئی شغل پوچھ لیا اور کسی دوسرے سے اور کوئی شغل پوچھ لیا۔ تو اس طرح متعدد کا اتباع بھی فی نفسہٖ جائز ہے۔

سلف اور خلف کا فرق

سلف کی یہی حالت تھی کہ کبھی امام ابو حنیفہ رحہ سے پوچھ لیا کبھی اوزاعی رحہ سے۔ اور اسی سلف کی حالت دیکھ کر آج بھی لوگوں کو یہ لالچ ہوتا ہے۔ سو فی نفسہٖ تو یہ جائز ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے ممنوع ہو گیا ہے۔

اس کے سمجھنے کے لئے اوّل ایک مقدمہ سُن لیجئے۔ وہ یہ کہ حالت غالبہ کا اعتبار ہوتا ہے۔ سو حالت غالبہ کے اعتبار سے آج میں اور اُس وقت میں یہ فرق ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں تدین غالب تھا۔ اُن کا مختلف لوگوں سے پوچھنا یا تو اتفاقی طور پر ہوتا تھا اور یا اس لئے کہ جس کے قول میں زیادہ احتیاط ہو گی اُس پر عمل کریں گے۔ پس اگر تدین کی اب بھی وہی حالت ہوتی تو ایک کو خاص کرنے اور اُس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اب تو وہ حالت ہی نہیں رہی اور کیسے رہتی حدیث میں ہے ثم یفشو الکذب کہ خیر القرون کے بعد کذب پھیل جائے گا اور لوگوں کی حالت بدل جائے گی۔ سو جتنا خیر القرون سے بُعد ہوتا گیا اتنی ہی لوگوں کی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اب تو وہ حالت ہو گئی ہے کہ عام طور پر غرض پرستی غالب ہے۔ اب مختلف لوگوں سے اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ جس میں اپنی غرض نکلتی ہوگی اُس پر عمل کریں گے۔

ہمارے وطن کے قریب ایک قصبہ ہے۔ وہاں ایک مرد کا ایک عورت سے نکاح ہوا۔ پھر بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا۔ ایک شخص میرے پاس دریافت کرنے آئے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا، اُن کا نکاح جائز نہیں ان میں جدائی کر دینی چاہئے۔ کہنے لگے اس میں

تو بڑی بدنامی ہے۔ اب تو کوئی صورت جواز کی نکال ہی دیجئے۔ میں نے کہا کہ تفریق میں اوّل تو بدنامی نہیں بلکہ تفریق نہ کرنے میں ہے کہ لوگ کہیں گے کہ بھائی بہن کو جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے اگر ہو تو ہوا کرے۔ جب شریعت کا حکم ہے تو بدنامی کا کچھ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ کہنے لگے کہ اس نے تو پی کر اگل بھی دیا تھا۔ میں نے کہا کہ خواہ اگلا ہو یا نہ اگلا ہو حرمت کے حق میں یکساں ہے۔

جب میرے پاس سے انہیں صاف جواب ملا تو وہ دہلی پہنچے۔ وہاں اُن کو ایک عامل بالحدیث مل گئے۔ مجھے اس وقت اُن پر طعن کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس شخص کی غرض پرستی بیان کرنی ہے کہ اپنی غرض حاصل کرنے کے لئے عامل بالحدیث کے پاس گیا کہ شاید یہاں کوئی بات مل جائے۔ اُس نے کہا کہ اگر پانچ گھونٹ سے کم پیا ہے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ آپ نے ایک استفتاء تجویز کیا کہ ایک لڑکے نے ایک عورت کا دودھ دو گھونٹ پیا تھا، حرمت ثابت ہوئی یا نہیں۔ انہوں نے جواب لکھ دیا کہ لا تحرم المصة والا المصتان (یعنی ایک یا دو گھونٹ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔) آپ بہت خوش ہوئے اور اُن میاں بی بی کو وہ فتویٰ لا کر دے دیا کہ یہ بھی تو عالم ہی کا فتویٰ ہے اس پر عمل کر لیا جاوے گا تو کون سی خرابی ہے۔

آج کل لوگوں میں ایسی غرض پرستی ہے۔ بھلا اُس سے کوئی پوچھے کہ بندۂ خدا تو کیا گن رہا تھا کہ اُس نے کے گھونٹ پئے تھے اور بالفرض اگر اُس کی تعداد معلوم بھی تھی تو اس کی کیا وجہ اُن کے فتوے کو تو مانا جنہوں نے حلال بتایا اور اُن کے فتوے کو نہ مانا جنہوں نے اس کو حرام بتلایا۔ حالانکہ جنہوں نے حلال

بتلایا یہ شخص اُن کا ہم مذہب بھی نہ تھا۔ ہاں اگر اوّل ہی سے اُس کا وہی مذہب ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر اوّل تو یہ شخص اُن کے مذہب پر نہ تھا۔ جب دیکھا کہ اُن کے مذہب سے کام نکلتا ہے تو اُن کا مذہب لے لیا۔ سو اس نے دین پر دنیا کو ترجیح دی اور افسوس ہے کہ بعضے اہل علم کو بھی اس میں شبہ ہو گیا کہ اس میں کیا حرج ہے۔ ایک مجتہد فیہ مسئلہ میں دوسرے امام کے مذہب پر عمل کر لیا جاوے مگر حضورؐ نے اس کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ انما الاعمال بالنیات کہ نیت کا اعتبار ہے۔ سو آج کل دوسرے امام کے مذہب پر دین ہونے کی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اپنی دنیوی غرض کے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

علامہ شامی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک فقیہ نے ایک محدث کے یہاں اُن کی لڑکی کے لئے پیام بھیجا۔ اُس نے کہا اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ تم رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرو۔ فقیہ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور نکاح ہو گیا۔ اس واقعہ کو ایک بزرگ کے پاس ذکر کیا گیا تو انہوں نے اس کو سن کر سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر سوچ کر فرمایا کہ مجھے اس شخص کے ایمان جاتے رہنے کا خوف ہے۔ اس واسطے کہ جس بات کو وہ سنت سمجھ کر کرتا تھا بدون اس کے کہ اس کی رائے کسی دلیل شرعی سے بدلی ہو، صرف دنیا کے لئے اُس کو چھوڑ دیا۔

لوگوں کی یہ حالت دنیا طلبی کی ہو گئی ہے۔ ایسے وقت میں اگر تقلید شخصی نہ ہو تو یہ ہو گا کہ ہر مذہب میں سے جو صورت اپنے مطلب کی پا دیں گے اختیا

کریں گے۔ مثلاً اگر وضو کرنے کے بعد اس کے خون نکل آیا تو اب امام ابو حنیفہؒ کے مذہب پر تو وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعیؒ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا۔ سو یہاں تو یہ شخص شافعیؒ کا مذہب اختیار کرے گا۔ اور پھر اس نے بیوی کو بھی ہاتھ لگا دیا۔ تو اب شافعیؒ کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا اور حنفیہ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا تو یہاں حنفیہ کا مذہب لے لے گا۔ حالانکہ اس صورت میں کسی امام کے نزدیک بھی وضو نہیں رہا۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تو خون نکلنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور امام شافعیؒ صاحب کے نزدیک عورت کے چھونے کی وجہ سے مگر اس شخص کو اس کی ذرا پروا نہ ہو گی۔ ہر امام کی رائے وہ اسی میں قبول کرے گا جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور جو اس کے مطلب کے خلاف ہے اس کو نہ مانے گا۔ سو دین تو رہے گا نہیں غرض پرستی رہ جاوے گی۔ پس یہ فرق ہے ہم میں اور سلف میں۔ ان کو تقلید شخصی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ان میں تدین غالب تھا اور سہولت اور غرض کے طالب نہ تھے۔

تقلید شخصی کی ضرورت

بخلاف ہمارے کہ ہم میں غرض پرستی غالب ہے ہم سہولت پسند اور غرض کے بندے ہیں۔ اس لئے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی خاص ایک شخص کی تقلید کریں۔ سو ہم تقلید شخصی کو فی نفسہٖ واجب یا فرض نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اور ترک تقلید میں بے انتظامی ہوتی ہے۔ ترک تقلید کی حالت میں اگر تمام مذاہب سے احوط (زیادہ احتیاط والے) کو تلاش کر کے عمل کریگا تو مصیبت میں رہے گا اور اگر آسان کو تلاش کرے گا تو غرض پرستی میں پڑ

جائے گا۔ پس تقلید میں راحت بھی ہے اور نفس کی حفاظت بھی ہے اور جیسے کہ مجتہدین کی تقلید شخصی میں یہ حکمت ہے اسی طرح اس مذہب کے علماء (اخیار نیک) میں سے ایک ہی کو متعین کر لینے میں۔ یہی حکمت ہے کیونکہ زمانہ کی حالت بدل گئی ہے کہ لوگوں پر غرض پرستی غالب ہے اور ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف ہے۔ پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جاوے گا تو اس کے اندر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں نہ پڑ جاویں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا۔ اور اس اختلافِ علماء ہی کی وجہ سے عام لوگ یہ شبہ کرنے لگے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کی جدا رائے ہے ہم کدھر جاویں مگر اس کا تو میرے پاس ایسا جواب ہے کہ اس کا کسی سے رد ہی نہیں ہو سکتا ہے۔

وہ یہ کہ طبیب کے پاس بھی تو آخر جاتے ہی ہو ان میں بھی تو آپس میں اختلاف ہوتا ہی ہے۔ تو جس طرح ان کاموں میں ایک کو منتخب کر لیتے ہو اسی طرح یہاں کیوں پریشانی ہے کہ کس کا کہنا مانیں۔ اس کا بھی یہی انتظام کر لو کہ ایک عالم اور ایک شیخ کو منتخب کر لو۔ پس ہر شخص کو اکثر دو آدمیوں کے متعین کرنے کی ضرورت ہو گی۔ ایک عالم کی اور ایک شیخ کی۔ کیونکہ کئی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک اعمالِ صالحہ کی اور ایک اس کی تکمیل کی۔ پس دو شخصوں سے تعلق پیدا کرو۔ عالم سے تو اعمالِ صالحہ سیکھو اور شیخ سے اس کی تکمیل کرو اور اگر کوئی جامع مل جاوے جس سے دونوں چیزیں حاصل ہو جاویں تو خوش قسمتی ہے اگر

پریشانی سے اپنی نجات چاہتے ہو تو ایسا کرو۔ اور اس کی ہی سخت ضرورت ہے۔

پھر ہر ایک امر میں جو شبہ ہو اُس سے پوچھ لو۔ جو کام کرنا چاہو پہلے اُس سے پوچھ لو۔ اگر وہ جائز بتلائے تو کرو ورنہ نہیں اور یہ بھی سمجھ لو کہ باتیں دو قسم کی پوچھی جاتی ہیں۔ ایک تو احکام دوسرے اُس کے دلائل۔ سو جو بات وہ بتلائے اگر اُس کی دلیل تمہاری سمجھ میں نہ بھی آوے تب بھی اُس شخص کی اطاعت نہ چھوڑو بلکہ اُس کی بات بلا دلیل مان لو۔ دنیاوی امور میں بھی عقلاء کا یہی طریقہ ہے۔ آخر سول سرجن کا قول مان لیتے ہو کچھ اگر مگر نہیں کرتے گو دلیل نہ سمجھ میں آوے۔ اسی طرح دین میں جس کو متبوع قرار دو اُس سے زیادہ گڑبڑ نہ کرو زیادہ محقق نہ بنو عمل کرو۔ اور اگر محقق بننے کا شوق ہو تو مدرسہ میں آکر پڑھو۔ غرضیکہ ایک شخص کو متبوع مقرر کر لینے میں بہت پریشانیوں سے بچ جاؤ گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے اس مسئلہ مختلف فیہا کا جو آج کل بہت معرکۃ الآرا سمجھا جاتا ہے فیصلہ کیا ہے اور دونوں مرضوں کا علاج کیا ہے۔ خود رائی کا بھی اور عدم معیار کا بھی۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اتباع کرو سبیل حق کا مگر بواسطہ من اناب الی (ان لوگوں کے جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے) کے اور گو من اناب میں متعدد اشخاص کے اتباع کرنے کا مضائقہ نہ تھا، لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ ایک کے متعین کر لینے میں راحت اور انتظام اور نفس کی حفاظت ہے۔ پس اس زمانہ میں علماء اور مشائخ کو اس جامع سے جا پہنچے۔ اگر کوئی جامع مل جاوے تو ایک کو ورنہ دو کو منتخب کر کے اُن

کا اتباع کیجئے۔

اگر دین پر چلنا چاہتے ہو تو اُس کا یہ طریقہ ہے ورنہ بدون اس کے آج کل دین سالم رہنے کا کچھ اعتبار نہیں۔ جو شخص اس طریقہ کے خلاف کریگا، کچھ تعجب نہیں جو وہ دین سے بہک جاوے۔ میں نے ایک ایسی بات بتلا دی ہے کہ عمر بھر کے لئے دستور العمل بنانے کے قابل ہے۔ اور جو اس پر عمل کرے گا اُس کو کبھی گمراہی نہ ہوگی۔

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ دُعا کیجئے کہ حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماوے۔ وصلے اللہ تعالیٰ علےٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحبہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

شرط الایمان

شرائط ایمان کے متعلق یہ وعظ ۳ر شعبان ۳۳۰ھ کو انبہٹہ خانقاہ شاہ ابوالمعالیؒ پر کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو ۲½ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ حاضری دو سو کے قریب تھی۔ مولوی محمد عبداللہ صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ و اصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (یعنی پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ اُن کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اُس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ نہ کرائیں۔ پھر اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورے طور پر تسلیم کرلیں۔)

تمہید اس آیت میں حق تعالیٰ نے ایک بہت ضروری مضمون کا ذکر فرمایا ہے کہ جو باعتبار مکلفین کے بھی عام ہے اور باعتبار وقت کے بھی۔ یعنی بعض مضامین تو ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی ضرورت سب مکلفین کو عام نہیں ہوتی ہے کسی کو ضرورت ہوتی ہے کسی کو نہیں ہوتی جیسے زکوٰۃ ہے جس کے پاس مال ہے وہ اس کا مخاطب ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ مخاطب نہیں ہے۔ اور بعض مضامین باعتبار مکلفین کے تو عام ہوتے ہیں لیکن اُن میں باعتبار وقت کے عموم نہیں ہوتا۔ جیسے نماز، دیکھئے طلوع شمس سے نصف النہار تک کوئی نماز نہیں ہے۔ اور بعض احکام وہ ہیں کہ اُن کی ضرورت ہر مسلمان کو ہے اور ہر وقت ہے۔ ایسے احکام متعدد ہیں۔ ان ہی میں سے ایک یہ حکم بھی ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ چونکہ اس حکم میں کوتاہی اور اہمال بہت ہو گیا ہے۔ اس لئے اس کو اس وقت بیان کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ حاجت بیان کرنے کی اُسی مضمون کی ہے جس کی ضرورت ہو۔ ترجمہ آیت سے

اس مضمون کی تعیین ہو جائے گی۔ اور تعیین کے بعد اُس میں جو کوتاہی ہے، وہ بھی آسانی سے تسلیم کر لی جائے گی۔

وجوہِ اطاعت

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ قسم کھا کر فرماتے ہیں فَلَا وَرَبِّكَ اس میں لا حرف نفی کے بعد قسم لے آئے اور منفی کا ذکر بوجہ قرینہ مقام کے چھوڑ دیا گیا۔ یعنی یہ بات نہیں جو منافقین سمجھے ہوئے ہیں کہ باوجود دعوی ایمان کے تحکیم الی الطاغوت (شیطان سے تصفیہ کرانا) کو اختیار کریں اور حضورؐ کے حکم سے اعراض کریں اور قبل از مقصود نفی کا لانا نہایت بلاغت ہے۔ اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ قبل ذکر مقصود کے اُس کی ضد کی نفی کر دیتے ہیں تاکہ اُس سے یکسوئی ہو کر ذہن خالی ہو جائے اور مقصود کی طرف متوجہ ہونے کے لئے آمادہ ہو جائے۔

پس فرماتے ہیں کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم آپ کے رب کی قسم ہے یہاں چند امور قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس مضمون کو قسم کھا کر کیوں فرمایا۔

دوسرے یہ کہ اگر قسم ہی کھانا تھا تو اپنے اسماء میں سے اسم رب کو کیوں خاص فرمایا۔

تیسرے یہ کہ اُس کو حضورؐ کی طرف کیوں مضاف کیا۔

بات یہ ہے کہ جو مضمون اس آیت میں ارشاد ہوا ہے وہ چونکہ نہایت قابل اہتمام ہے اور قسم کھا کر جو بات کہی جاتی ہے طبعی بات ہے کہ وہ نفس میں اچھا اثر کرتی ہے اس لئے تو قسم کھائی۔ باقی رہی یہ بات کہ وربک کیوں فرمایا

واللہ (اللہ کی قسم) یا والرب (رب کی قسم) کیوں نہ فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود اصلی اس آیت کا آپ کا مطاع یعنے واجب الاطاعت ہونا بیان کرنا ہے۔ چنانچہ اِلَّا لِیُطَاعَ (تاکہ آپ کی اطاعت کی جاوے) میں اس کی تصریح ہے۔ اور آدمی جو دوسرے کی اطاعت کرتا ہے اس کی تین وجہ ہوا کرتی ہیں یا تو احسان کہ انسان کا طبعی امر ہے کہ محسن سے اُس کو محبت ہوتی ہے اور یا عظمتِ شان خواہ محسن کبھی نہ ہو۔ چنانچہ حکام کی جو اطاعت کی جاتی ہے اُس کا سبب اُن کی عظمت ہے اور تیسری وجہ محبت ہے گو نہ احسان کچھ ہو اور نہ حکومت وعظمت ہو مگر محبت کا بھی خود اقتضا یہ ہے کہ محبوب کی اطاعت کیجائے جناب باری تعالیٰ کو وربک سے حضورؐ کا تینوں وجہ سے مطاع ہونا بیان کرنا منظور ہے۔

مظہر صفات حق تعالیٰ

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جاننا چاہیے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی بے انتہا صفات ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّىْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی خوبیاں وصفات لکھنے کے لئے سمندر (کا پانی) ہو تو میرے رب کی صفات وخوبیاں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے اگرچہ اس سمندر کے مثل ایک دوسرا سمندر اس کی مدد کے لئے ہم لے آویں۔

اور یہاں پر اللہ تعالےٰ نے اپنی ذات کو ایک خاص صفت سے تعبیر فرما کر اور حضورؐ کی طرف مضاف کر کے قسم کھائی ہے جس کا مطلب بعنوان دیگر یہ ہوا کہ ہم اپنی ذات کی اس حیثیت سے کہ ہم آپ کے مربّی ہیں قسم کھا کر کہتے ہیں۔ تو جیسے قسم میں آپ کی طرف اضافت اعتبار کرنے سے آپ کی عظمتِ شان ظاہر ہوتی اسی طرح وَرَبِّکَ سے بھی آپ کا عظیم الشان ہونا ظاہر ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے اس تعلق کی گویا قسم کھائی ہے۔ اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ بہت سے علاقے ہیں۔ مثلاً خالقیت، رزاقیت ربوبیت وغیرہا۔ ان علاقوں میں سے یہاں ربوبیت کا ذکر فرمایا اور تربیت کے معنی شیئًا فشیئًا (رفتہ رفتہ) ایسی شے کو جس کی شان سے تربیت ہے اس کے کمال پر پہنچانا ہیں۔ پس فَلَا وَرَبِّکَ کے اس تقدیر پر یہ معنی ہوئے کہ قسم ہے ——— آپ کے مربّی کی اور تربیت ایک اعلیٰ درجہ کا احسان ہے پس مربی بمعنی محسن ہوا۔ پس حاصل یہ ہوا کہ قسم ہے آپ کے محسن کی۔ اور ظاہر ہے کہ آپ کی طبیعت اور فطرت بے سلیم اور طبائع سلیمہ کا مقتضی یہ ہے کہ اس صلے میں کہ خالق کا اس پر احسان ہے وہ خلق خدا پر احسان کرتا ہے۔ پس اس قاعدہ سے آپ خلق کے محسن ہوئے۔ یہ تو محسن ہونا آپ کا قاعدہ عقلیہ سے ہوا۔

دوسری وجہ بطرزِ فنِ تصوّف آپ کے محسن ہونے کی اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ صفات حمیدہ حقیقۃً ذات باری تعالیٰ کے لئے ہیں اور مخلوق کے اندر ان کا ظل ہے۔ مثلاً مخلوق کسی مجرم کا قصور معاف کر دے تو یہ صفتِ عفو کا پرتو ہے

اور اگر کوئی کسی کو کچھ دے تو یہ جوادیت کا اثر ہے اور یہ مسلّم ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تمام افرادِ بنی آدم میں سے صفات باری تعالیٰ کے مظہرِ اکمل و اتم ہیں۔ پس صفت احسان کے بھی آپ مظہرِ اتم ہوئے۔ تو آپ تمام جہان کے محسن ہوئے! اور تربیت کا منشاء چونکہ ہمیشہ محبت ہوتا ہے اور اس کی اضافت ہے حضورؐ کی طرف تو گویا یہ فرمایا فلا وربك (آپ کے محب کی قسم) اور جو خدا کا محبوب ہو وہ مخلوق کو بدرجۂ اولیٰ محبوب ہونا چاہیئے۔ پس آپ محبوب بھی ہوئے تمام مخلوق کے۔ تو فلا وربك سے آپ کا عظیم الشان ہونا اور محسن ہونا اور محبوب ہونا سب ثابت ہوا۔ اور چونکہ آپ مظہر صفاتِ حق ہیں اور حق تعالےٰ کی صفت محبّیۃ للمربوب (مربوب کے لئے محب ہونے کی صفت) ثابت ہوئی۔ پس آپ محب بھی اپنے غلاموں کے ہوں گے۔ پس فلا وربك ہر سہ وجہ اطاعت کو مع زیادہ صفۃ المحبیۃ مشتمل ہوگیا۔

سلامتِ فطرت کا مقتضیٰ

پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مقصود اصلی آیت کا حضورؐ کا واجب الاطاعت ہونا بیان کرنا ہے۔ پس قبل دعویٰ کے فلا وربك سے اس کے دلائل اور مناشی بیان کردیئے تاکہ اطاعت آسان ہوجائے۔ اس لئے کہ انسان طبعاً حریت پسند ہے۔ نفس کی جبلت یہ ہے کہ مستقل ہوکر رہے اور کسی قانون کے زیر اثر نہ ہو لیکن حقیقت میں یہ آزادی سلامتِ فطرت کے خلاف ہے۔ سلامتِ فطرت کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ آدمی زیر حکومت رہے۔ اس لئے کہ راحت اور فلاح دنیوی و اخروی اسی میں ہے۔ وہ شخص کبھی راحت نہیں پا سکتا جو آزاد ہو کر

رہنا چاہتا ہو اور کسی کا اتباع نہ کرتا ہو۔ دنیا کے اعتبار سے بھی کہ ہر امر میں متردد رہے گا کہ خدا جانے فلاں امر میں میری رائے درست ہے یا نہیں اور دین کے اندر تو ظاہر ہی ہے کہ بدون اتباع کے چارہ ہی نہیں۔ اطاعت میں سارا بوجھ بار دوسرے پر رہتا ہے۔

صاحبو! بڑا فرق ہے اس میں کہ مریض قرابادین میں خود دیکھ کر نسخہ لکھے اور اس میں کہ طبیب سے پوچھ کر معالجہ کرے۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ اطباء نے لکھا ہے۔ رائ العلیل علیل (بیمار کی رائے بھی بیمار (ضعیف) ہوتی ہے) سو یہ علالت صحیح رائے قائم کرنے سے مانع ہوتی ہے۔

مجھ سے ایک وکیل سفر میں ملے۔ میں نے ان سے سفر کی علت پوچھی۔ کہنے لگے کہ ایک اپنے ذاتی مقدمہ میں جا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کو تو وکیل نہ کرنا پڑتا ہوگا۔ کہنے لگے کہ خود صاحب معاملہ ہونے کے سبب عقل درست نہیں ہوتی۔ اس لئے ہم کو بھی وکیل کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ خود بھی وکیل تھے۔

اکابر کو ہمیشہ سے دیکھا ہے کہ اپنے چھوٹوں تک سے مسئلہ کی تحقیق کرتے ہیں۔ جب ماہرین فن کی حالت یہ ہے تو غیر ماہرین کو تو بطریق اولے ماہرین کی اطاعت ضروری ہے۔

اگر کوئی کہے کہ دوسرے کی اطاعت کی صورت میں بھی بسا اوقات کام بگڑ جاتا ہے تو جواب یہ ہے کہ نبی کی اطاعت میں تو اس کا احتمال ہوتا نہیں مگر مطلق اطاعت میں یہ ممکن ہے۔ لیکن پھر بھی حالت اطاعت میں کام بگڑنے اور حالت عدم اطاعت میں کام خراب ہونے میں بڑا فرق ہے۔ وہ یہ کہ حالت

اطاعت میں کوئی ملامت نہ کرے گا بلکہ معذور سمجھیں گے اور مستقل ہوکر کرنے میں اگر خراب ہوگا تو ملامت اور اعتراض ہوگا اور نیز اپنے کو بھی حسرت ہوگی پس عقل اور طبع سلیم کا مقتضیٰ یہی ہے کہ مستقل نہ ہو۔ لیکن چونکہ ہم نے سلامتی کو ضائع کر دیا ہے اس لئے ہم کو اس کے خلاف کا فطرت ہونا نظر آتا ہے۔ غرض مستقل اور آزاد ہو کر رہنا ہر طرح خطرناک ہے اور اتباع اور تقلید میں کسی وجہ سے بھی خطرہ نہیں۔

بیعت کے معنی

مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک درویش تھے اُن کا لقب تھا رسول نما۔ اور وجہ لقب کی یہ تھی کہ اُن کو ایسی قوتِ تصرف تھی کہ جو شخص طالب ہوتا تھا کہ مجھ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرادو، وہ اُس پر متوجہ ہوتے تھے۔ اُن کی نظروں سے درمیانی حجاب مرتفع ہو جاتے تھے اور وہ زیارتِ جمالِ باکمالِ نبویؐ سے مشرف ہو جاتا تھا۔ وہ بزرگ جس وقت اپنے شیخ سے بیعت ہونے گئے، تو شیخ نے فرمایا کہ استخارہ کر لو کہ سنت ہے۔ وہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر ۵ منٹ سے بھی کم میں واپس آ گئے۔ شیخ نے پوچھا کہ استخارہ کر لیا۔ کہا کہ حضورؐ کر لیا شیخ نے فرمایا کہ اتنی دیر میں آپ نے کیسے استخارہ کر لیا۔ وضو نہیں کیا، نماز نہیں پڑھی، دعا استخارہ نہیں پڑھی۔ کہنے لگے کہ میں نے اس طرح استخارہ کیا ہے کہ میں نے اپنے نفس سے کہا کہ اے نفس! تو جو بیعت کرتا ہے تو بیعت کے معنی دوسرے کے ہاتھ بک جانا ہیں تو تجھ کو اپنے تمام اختیارات سلب کردینے اور بدست غیر ہو جانے سے کیا نفع ہے۔ نفس نے جواب دیا کہ بلا

سے خدا تو ملے گا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ خدا ملے ہی۔ خدا کے ذمے کسی کا قرض تو ہے نہیں۔ نفس نے کہا کہ خیر کچھ حرج نہیں خدا کو خبر تو ہو گی کہ فلاں شخص نے ہم کو طلب کیا تھا۔ اس پر میں کچھ جرح نہیں کر سکا۔ شیخ نے فرمایا کہ تمہارا استخارہ سب[1] سے اچھا ہے۔ پس غلامی واقعی طبعاً گراں ہے لیکن جس کو کچھ ملا ہے اسی کی بدولت ملا ہے۔

وسعتِ رحمت الحاصل اس طبعی گرانی کی ہی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اوّل دلائل حضورؐ کی اطاعت کے واجب ہونے کے بیان فرما دیئے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کے یہاں مثلاً کوئی مہمان آرہا ہو اور کسی کو قرینے سے معلوم ہو کہ اس کو اگر خبر ہو گی تو گراں گزرے گا تو اس کی گرانی رفع کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ تم کو خبر بھی ہے تمہارے یہاں کون آرہا ہے۔ تمہارے یہاں وہ شخص آرہا ہے جو تم کو روپے بھیجتا ہے اور بدیع القدر ہے اور تم اس پر عاشق ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کی وہ شان بیان فرمائی

---

[1] اس سے استخارہ مسنونہ پر تفضیل لازم نہیں آتی کیونکہ محل اس استخارہ کا امر دائر بین الخیر والشر ہے اور یہ مقصود بعلم الہامی خیر محض تھا۔ تو اس استخارے کا محل ہی نہ رہا تھا پس مطلب یہ ہوا کہ ایسے موقع کے لئے جہاں کہ استخارہ مسنونہ کی ضرورت نہ رہے اور جتنے استخارے فرض کئے جائیں ان سب سے یہ افضل ہے اور خود جو شیخ نے اوّل استخارے کے لئے فرمایا تھا کہ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کو بعلم ضروری اس بیعت کا

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۶۸)

جس سے سامع کو بے اختیار محبت اور شوق اطاعت کا پیدا ہو یعنی عظیم الشان ہونا، محسن ہونا، محبوب ہونا۔ تو آپ کی اطاعت کی طرف اب کیوں نہ میلان ہوگا اور آئندہ کے مضمون سے اب کوئی وحشت نہ ہوگی۔

دیکھیے جو شخص کسی کام کو بیگار سمجھے اس کو اگر ابتداءً ہی کوئی کام بتلا دیا جائے تو وہ اس کو گراں ہوگا اور اگر پہلے یہ کہہ دیا جائے کہ تم کو تنخواہ ملے گا۔ پھر کہا جائے کہ فلاں کام کرو۔ اس سے وہ کام سہل ہو جائے گا۔ اسی طرح جو لوگ شریعت کے احکام کو بیگار سمجھتے ہیں ان کی گرانی رفع کرنے کے لئے حق تعالے نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ اسباب سہولت کو ذکر میں مقدم فرمادیا۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ حق تعالیٰ کی بندوں پر کس درجہ رحمت ہے اور کتنی محبت ہے کہ ہماری تربیت کے لئے وہ انداز اور وہ طریقے اختیار فرمائے ہیں جیسے شفیق باپ اپنے بچہ کے ساتھ کرتا ہے اور ہم کو اس طور سے اپنی راہ پر لگانے کے لئے کہ اس میں بھی سراسر ہمارا ہی نفع ہے ایسا پھسلایا ہے جیسے بچوں سے کوئی کام لینے کے لئے ان کو پھسلاتے ہیں۔

حسن تربیت

اہل اللہ نے بھی ہمیشہ ایسی ہی تدبیروں سے کام لیا ہے بعض علمائے خشک ان کی تدابیر پر ہنستے ہیں لیکن یہ تدبیریں ایسی ہیں کہ اگر طبیعت میں ذرا بھی سلامتی ہو تو ضرور ان تدابیر سے اصلاح ہوتی

(بقیہ از صفحہ ۲۷۲) اصلح ہونا معلوم ہو گیا ہے۔ تو نفعاً ان کو احتمال ضرر کا ہوا اس لئے یہ مشورہ دیا فلا تعارض (سوا اس میں کچھ تعارض نہیں) ۱۲ منہ

ہے۔

حضرت شیخ فرید کے ایک مرید کو اُن کی ایک کنیزک کے ساتھ تعلق ہو گیا اور حضرت شیخ کو اس کی خبر ہو گئی بجائے اس کے کہ اُس کو ملامت کریں کیونکہ بعض اوقات عشق ملامت سے بڑھ جاتا ہے۔ آپ نے ایک لطیف تدبیر کی۔ وہ یہ کہ اُس لونڈی کو دوائے مسہل پلا دی۔ چنانچہ مادے کا اخراج شروع ہوا اور بہت سے دست اُس کو آئے اور سب مادے کو ایک طشت میں جمع رکھنے کا حکم دیا۔ دست آنے سے اُس لونڈی کا رنگ و روغن جاتا رہا۔ اس کے بعد اس لونڈی کے ہاتھ کھانا اُس مرید کے پاس بھیجا۔ بجائے اس کے کہ اُس لونڈی کی طرف ملتفت ہو اُس کو ایک نفرت ہوئی۔ اور اُس کی طرف التفات بھی نہ کیا۔ اس لیے کہ اُس کا عشق تو اُس کے رنگ و روغن ہی کی وجہ سے تھا۔ اُس رنگ کے ہی ساتھ عشق بھی رخصت ہو گیا۔

عشقہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

جو عشق محض رنگ و روپ پر ہوتا ہے وہ واقع میں عشق نہیں بلکہ محض ننگ ہوتا ہے یعنی اس کا انجام حسرت و ندامت ہے

عشق با مردہ نباشد پائیدار — عشق را باحی و با قیوم دار

مردہ کے ساتھ عشق کو پائیداری نہیں۔ اس لئے اللہ تعالےٰ حی و قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے۔

حضرت شیخ نے بھنگن کو حکم دیا کہ وہ نجاست لے آوے۔ چنانچہ وہ لائی گئی۔ اس مرید سے فرمایا کہ یہ کنیزک تو وہی ہے۔ اس میں سے صرف یہ نجاست

کم ہو گئی ہے۔ اس سے تمہارا میلان ہو جاتا رہا۔ معلوم ہوا کہ تمہارا محبوب یہ تھا محبوب حقیقی کو چھوڑ کر تم اس گندگی پر گرے تھے۔ طبع اُس کی سلیم تھی، فوراً تائب ہو گیا۔ اور اُس سے نفرت ہو گئی۔

جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بدکاری کی اجازت دے دیجئے۔ اگر آج کل کے علماء خشک سے کوئی یہ کہے تو بے حد برہم ہوں۔ لیکن کیا ٹھکانا ہے تحمل کا۔ بجائے اس کے کہ زجر و توبیخ فرمائیں، فرماتے ہیں کیا تو راضی ہے کہ تیری ماں کے ساتھ ایسا فعل ہو۔ اس نے عرض کیا کہ نہیں۔ پھر فرمایا کیا تو پسند کرتا ہے کہ تیری بہن کے ساتھ ایسا ہو۔ کہا کہ نہیں۔ فرمایا، تو پھر کسی کی ماں بہن کے ساتھ تم کیسے اس کو پسند کرتے ہو۔ اُس کی سمجھ میں آگیا اور توبہ کی۔

لیکن اس طرز سے کام لینا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس لئے کہ اہل مداہنت بھی اپنی مداہنت پر اس سے استدلال کر سکتے ہیں۔ نرمی اور سختی دونوں کے حدود ہیں۔ یہ کام شیوخ کاملین اور اکابر امت کا ہے۔ ہر شخص اپنے کو اس پر قیاس نہ کرے یہ حکیم کا کام ہے جو حکمت موہوبہ من اللہ دا اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکمت موہوبہ کے ساتھ لوگوں کو راہ پر لاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے بھی اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اسی طرز کی ہدایت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط

یعنی آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں

کے ذریعہ سے بلایئے اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔

حقانیتِ اسلام

پس اسی حکمت کا یہاں استعمال کیا گیا کہ چونکہ آپ کی اطاعت بھی طبعاً گراں تھی۔ اس لئے امر بالاطاعت کے قبل اسبابِ میسرہ اطاعت کو جمع فرمادیا۔ اور یہ گرانی کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ انسان کی طبعی بات ہے کہ اپنی ہی نوع کی اطاعت سے استکبار اور استنکاف ہوتا ہے۔ اسی سے انبیاء علیہم السلام کو لوگوں نے اپنے اوپر قیاس کیا تھا۔ چنانچہ کہا کرتے تھے مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔ (تم تو ہم جیسے بشر ہو۔) مولانا فرماتے ہیں ؎

ہمسری با انبیاء برداشتند — اولیاء را ہمچو خود پنداشتند

حضرات انبیاء علیہم السلام سے ہمسری کا دعویٰ کیا اور اولیائے کرام کو مثل اپنے سمجھا۔

گفت اینک ما بشر ایشاں بشر — ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

کہنے لگے کہ ہم بھی بشر ہیں اور یہ انبیاء بھی بشر ہیں۔ ہم اور یہ خواب وخورش کے مقید ہیں۔

مگر واقع میں کتنی بڑی غلطی کی بات ہے کہ محض بشریت کے تشارک سے اطاعت سے استنکاف ہو اور جو کمالات حقیقیہ مابہ الفرق ہیں اُن پر نظر نہ ہو۔ آج کل بھی لوگوں کی یہی حالت ہے کہ ظاہری جاہ وجلال یا خوارق و تصرفات جس میں ہوں اُس کو تو بزرگ سمجھتے ہیں اور جو کمالات باطنی رکھتا ہو اور سچا بزرگ ہو اُس

کو بزرگ نہیں سمجھتے۔ غرض کوئی ما بہ الفرق ظاہر نظر آتا ہو تو معتقد ہوتے ہیں حالانکہ یہ کمالات ظاہرہ کمال اصلی کے سامنے محض گرد ہیں اور وہ کمالِ اصلی طاعت کے اندر استقامت ہے جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا اور دوسرے کمالاتِ ظاہری سب عارض ہیں۔ اسی کمال اصلی کے عدم زوال کو کہتے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یعنی جس کو عشقِ حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہو گئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں اس وجہ سے کہ اس کو لذتِ قرب کامل طور سے حاصل ہو جاتی ہے اس لئے اس کو زندہ کہنا چاہئے لیکن چونکہ وہ دولت عوام کو نظر نہیں آتی اس لئے ایسے شخص کی طرف میلان نہیں ہوتا۔ اسی واسطے کفار نے حضورؐ کی شان میں کہا تھا۔

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝

یعنی یہ قرآن شریف طائف اور مکہ کے کسی بڑے آدمی (یعنی دولت مند) پر کیوں نازل نہ ہوا۔ حالانکہ نبی اگر ہمیشہ صاحب سلطنت اور صاحب مال ہوا کرتے تو ان کا اتباع سلطنت اور مال کی وجہ سے ہوتا اور اس سے حق ظاہر نہ ہوتا۔ حق کا ظہور، اسلام کا دین الٰہی ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ حضورؐ نہ صاحب سلطنت و حکومت تھے نہ پڑھے لکھے تھے، نہ کوئی اور کمال عرفی رکھتے تھے۔ پھر دفعتہً بڑے بڑے سلاطین، بڑے بڑے اہل کمال کی آپ کے سامنے گردنیں جھک گئیں۔ جس طرح خانہ کعبہ اگر وادی

غیر ذی زرع میں نہ ہوتا اور کسی شاداب اور تر و تازہ مقام پر ہوتا، تو اس کی حقانیت ایسی ظاہر نہ ہوتی - یہی وسوسہ ہوتا کہ ظاہری شادابی کے سبب لوگ وہاں جا رہے ہیں بخلاف اس وقت کے کہ سنگستان خشک میں ہے پھر اس کی طرف لوگ مشقتیں اٹھا اٹھا کر جاتے ہیں اور جو ایک مرتبہ ہو آیا، اُس کو پھر ہوس ہے - یہ کیا بات ہے جس سے یہ کھلی دلیل ہے اس کی کہ اس میں غیبی کشش ہے -

غرض کہ جس شخص کے اندر حقانیت ہوتی ہے وہ ظاہری بناؤ سنگار سے مستغنی ہے - اس کو ظاہری ٹیپ کی ضرورت نہیں - ظاہری رونق کی اُسی کو ضرورت ہوگی جس کے پاس حقیقی نور نہ ہو -

سُنا ہے کہ کلکتہ میں ایک دکاندار پیر تھے جو شخص اُن کے حلقے میں شامل ہو جاتا وہ دو روپے فی ماہ دیتا تھا - چونکہ کمال سے خود معرّا تھے، اس لئے لیپ پوت کرتے تھے اور اگر خود کچھ رکھتے ہوتے تو اُن کو مخلوق سے نفرت ہوتی - لوگ پیچھے پیچھے پھرتے اور وہ بھاگتے -

غرض کمالاتِ اصلیہ کے ہوتے ہوئے اس طمطراق کی ضرورت ہی نہیں ہوتی - اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی اس سے منزہ رکھا کہ جو آئے خلوص سے آئے اور وہاں پہلے سے تو کیا مال و متاع ہوتا کہ کوئی اُس کے لالچ میں آتا - وہاں تو یہ کیفیت تھی کہ جو اہل مال آتا تھا وہ بھی مال سے متنفر ہو جاتا تھا - تو مال بیچارہ کیا جالب اسلام ہوتا خود اسلام سالب مال ہو جاتا تھا -

چنانچہ ایک یہودی کا کچھ قرض جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے ذمے ہو گیا تھا۔ وہ ایک روز آکر مانگنے لگا اور کہا کہ آج تو میں بغیر لئے
آپ کو کہیں جانے نہ دوں گا۔ بعض صحابہ برہم ہوئے۔ حضورؐ نے فرمایا خاموش رہو
صاحب حق کو کہنے کا حق ہے۔ چنانچہ حضورؐ تشریف نہ لے گئے اور رات بھر مسجد
میں رہے۔ جب صبح ہوئی تو وہ یہودی سامنے آکر بیٹھا اور کہا،

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ

میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ بجز اللہ تعالےٰ کے کوئی عبادت
کے لائق نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

یارسول اللہ! میں تو آپ کا امتحان لیتا تھا۔ اس لئے کہ میں نے کتب
سماویہ میں پڑھا تھا کہ نبی آخرالزماں کی یہ علامت ہے کہ وہ برائی کا بدلہ بھلائی
سے دیتے ہیں اور میں مسلمان ہوتا ہوں اور مسلمان ہوتے ہی اُس کو مال و دولت
سے ایسی نفرت ہوئی کہ کل مال اپنا اللہ کی راہ میں دے دیا ؎

آں را کہ ترا شناخت جاں راچہ کند
فرزند و عزیز و خانماں راچہ کند

جس نے آپ کو پہچان لیا وہ جان کی کیا پروا کرے گا اور بال
بچوں، مال و اسباب کو لے کر کیا کرے گا۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

ان شعروں میں عشق کی تعریف ہے مجازاً اس کو مخاطب کر لیا ہے
یعنی اے عشق! تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو

جانتے ہیں۔ تجھ سے تمام بیماریوں کا علاج ہو جاتا ہے۔

اے دوائے نخوت و ناموسِ ما

اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

یعنی تجھ سے نخوت و ناموس کا دفعیہ ہو جاتا ہے تو ہمارے لیئے افلاطون اور جالینوس ہے۔

ہر کرا جامہ ز عشق چاک شد   او ز حرص و عیب کلی پاک شد

جس کا جامہ عشق سے چاک ہو گیا۔ یعنی جس کو عشق حاصل ہو گیا۔ وہ حرص اور تمام نقائص و اخلاقِ ذمیمہ سے بالکل پاک ہو گیا۔

ظاہری و باطنی دولت

غرض وہاں تو یہ تھا کہ مسلمان ہو کر گھر سے اور دیتے تھے۔ حضرت ابو طلحہؓ نے اپنا باغ، جو بڑے شوق سے لگایا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ نماز میں ایک مرتبہ اس کا خیال آ گیا تھا حضورؐ میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا باغ میرے لیئے فتنہ ہو گیا ہے اس لیئے میں اُس کو فقراء کے لیئے وقف کرتا ہوں ؎

ہر چہ از دوست وامانی چہ کفر آں حرف چہ ایماں

ہر چہ از یار دُور اُفتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

یعنی جو چیز دوست سے باز رکھے خواہ وہ ایمان کی بات ہو، خواہ وہ کفر کی دونوں برابر ہیں۔ جو چیز محبوب سے تم کو دور رکھے خواہ وہ نقش و نگار اچھا ہو خواہ بُرا دونوں برابر ہیں۔

حضرت غوث پاک قدس سرہٗ کی خدمت میں سنجر بادشاہ ملک نیمروز

نے عریضہ لکھا کہ حضورؒ کی خانقاہ کے لئے میں دو چار گاؤں وقف کر دوں حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوسِ ملکِ سنجرم

یعنی چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو۔ اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو۔

زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب
من ملکِ نیمروز بیک جو نمے خرم

مجھے جب سے ملک نیم شب کی سلطنت حاصل ہے ، ملک نیمروز کی سلطنت میری نظر میں ایک جو کے برابر بھی نہیں۔

پس یہ تھی وہ دولت جوان حضرات کو عطا ہوئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز نہ تھی۔ دنیا کے لوگ اس دولت پر ریجھتے ہیں اور وہ حضرات اُن پر ہنستے ہیں۔ غرض حضورؐ کے یہاں اس ظاہری دولت اور حکومت نہ ہونے سے کفار کہتے تھے۔

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ
یعنے یہ قرآن شریف طائف اور مکہ کے کسی بڑے شخص دولتمند پر کیوں نہ نازل ہوا۔

پس عام لوگوں کا یہ طبعی امر ہے کہ ظاہری حالت پر نظر کر کے اطاعت سے استنکاف ہوتا ہے اور اس سے اطاعت دشوار ہو جاتی ہے اس لئے

مقتضا حکمت کا ہے کہ اطاعت کو سہل کیا جاوے۔ اس لیے حق تعالے نے حضورؐ کی وہ صفات بیان فرمائیں کہ جو اطاعت کو سہل کردیں۔ گویا یہ فرمایا کہ ہم ایسی ذات بابرکات کی اطاعت واجب کرتے ہیں کہ وہ تمہارا محسن ہے محب ہے۔ عقلاً محبوب شے کا ذکر من دلیلہ (اس کی دلیل سے) عظیم الشان عظیم الجاہ ہے۔ اب ان صفات کو سُن کر آپ سے طبعی محبت ہو گئی اور اطاعت سہل ہو گئی۔ اس لیے کہ محبت وہ شے ہے کہ سب کچھ آسان کرا دیتی ہے۔ دیکھو اگر کسی چڑیل مردار سے محبت ہو جاتی ہے تو سب تلخیاں شیریں ہو جاتی ہیں چہ جائیکہ کوئی حقیقت میں بھی محبوب ہونے کے لائق ہو۔

اور حضورؐ کیسے محبوب نہ ہو(ں) گے۔ انہوں نے ہم نکموں کے واسطے کیسی کیسی مشقتیں برداشت کی ہیں کہ راتوں کو کھڑے کھڑے قدم مبارک ورم کر گئے ہیں اور اُمت کے لیئے دعائیں فرما رہے ہیں۔ ایک بار پوری رات آیت

وَاِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

اگر آپ ان کو عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ اُن کو بخش دیں تو بلاشک غالب اور حکمت والے ہیں۔

تکرار فرماتے فرماتے گزار دی۔ اور یہ تعب تمام اُمت کے لیئے تھا کہ جن میں سے موجود تو کم تھے۔ زیادہ وہ تھے جو ابھی تک پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ جیسے کوئی شخص اپنے پوتوں پڑپوتوں کے لیئے جائیداد پیدا کرے اور حضورؐ کی شفقت کا کیا ٹھکانا۔ ہمارے حال پر تو کیوں نہ ہوتی حضورؐ کی عنایت تو اعداء پر بھی

مبذول تھی۔

چنانچہ جب آپ تبلیغ کیلئے طائف تشریف لے گئے تو وہاں کفار حضورؐ کے ساتھ سخت بے ادبی اور استہزا سے پیش آئے۔ اس وقت ملک الجبال یعنی جو فرشتہ پہاڑوں پر مسلط ہے حاضر ہوا کہ اگر حکم ہو، تو ان نالائقوں کو پہاڑوں کے درمیان کچل ڈالوں کہ ابھی پس جائیں۔ فرمایا کہ مجھے اور میری قوم کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ شاید اللہ تعالٰی ان کے اصلاب سے فرمانبرداروں کو پیدا فرمائیں جب کہ حضورؐ کے ہم پر اتنے احسانات ہیں تو بتلائیے اب آپ کے محبوب و محسن ہونے میں کیا شک رہا۔ الحاصل فلا وربک سے مقصود اطاعت کی تسہیل ہے۔ اس لئے کہ محبوب و محسن عظیم الشان کی اطاعت سہل ہوتی ہے۔

شرط ایمان

اب آگے مقصود ارشاد ہے لا یؤمنون ---- الخ یعنے قسم ہے آپ کے رب کی، یہ لوگ مومن نہ ہوں گے جب تک کہ ان معاملات میں جو ان کے درمیان میں ہوتے ہیں، آپ کو حکم نہ بناویں گے۔ یعنی اپنی رائے پر جب تک آپ کے فیصلہ کو مقدم نہ رکھیں گے مسلمان نہ ہوں گے۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اتنی اطاعت تو حاکم ہونے کی حیثیت سے کفار بھی کرتے تھے کہ آپ کو حکم بناتے تھے لیکن اس کو کافی نہ سمجھا گیا بلکہ اس کے ساتھ دو شرطیں اور فرمائیں جو آگے آتی ہیں۔ ان پر نظر کر کے ذرا ایسے لوگ اپنی حالت ایمان کی دیکھ لیں جو احکام شرعیہ کی تعمیل محض ضابطہ پورا کرنے کے لئے کرتے ہیں اور مابعد کی دو شرطوں سے عاری ہیں۔ صاحبو! اس ضابطہ کی اطاعت سے

اگر آپ مخلوق کے سامنے سرخرو ہو گئے تو کیا ہوتا ہے کام تو عالم الغیب و الشہادۃ سے پڑے گا ۔

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام   در غلط اندازی تا ہر خاص و عام

مخلوق کو پورے فریب و دھوکا سے اپنی مٹھی میں لے لیا ہے ہر خاص و عام تک کو تم نے غلطی میں ڈال رکھا ہے ۔

کارہا با خلق داری جملہ راست   با خدا تزویر و حیلہ کے رواست

یعنے مخلوق کے ساتھ تمہارے سب معاملات درست ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ یہ حیلہ و فریب کس لیئے ہے ۔

خدا تعالیٰ محض قانونی حاکم نہیں ہیں اگر اُن کو دل کی بھی (نعوذ باللہ) خبر نہ ہوتی تب بھی محبوبیت کا مقتضیٰ یہ تھا کہ دل سے اطاعت ہوتی ۔ بعض ایسے قانونی لوگ گناہ کرتے ہیں اور اس کی تاویل کرتے ہیں ۔ اس سے تو اگر کھلم کھلا گناہ کرے اور گناہ کو گناہ سمجھے تو اتنا برا نہیں جیسا گناہ کر کے قال اللہ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) اور قال رسول اللہ (رسول اللہ نے کہا) کہنے میں ہے ۔

پنجاب کے بعض لوگوں کا حال معلوم ہوا کہ وہ اباحۃ سود کی کوشش دلائل شرعیہ سے کرنا چاہتے ہیں ۔ میں نے اس کے متعلق ایک مرتبہ انجمن نعمانیہ لاہور کے وعظ میں کہا کہ اگر تم کو سود کھانا ہی ہے تو کھاؤ لیکن اس کو حرام تو سمجھو ۔ گناہ کو حلال سمجھنے سے تو یہ پھر بہتر ہے اور تم جو ایک فقہی روایت کے اتباع کا اس باب میں دعویٰ کرتے ہو ۔ تو یہ اتباع شریعت نہیں ، اتباع ہوائے نفسانی ہے ۔ ہم تو متبع جب سمجھتے کہ تمام امور میں فقہ کا اتباع کامل ہوتا ۔ کیا تمام فقہ میں سے آپ کو یہی مسئلہ

عمل کرنے کے لئے آتا ہے۔

یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی نے کسی آزاد سے پوچھا تھا کہ میاں روزہ رکھو گے کہا، بھائی ہمت نہیں ہے۔ جب دن ختم ہوا پوچھا کہ افطاری کھاؤ گے۔ کہنے لگے کہ افطاری بھی نہ کھائیں تو کیا بالکل کافر ہی ہو جائیں۔ اور جیسے کسی طفیلی سے پوچھا تھا کہ قرآن مجید میں سے تم کو کون سی آیت پسند آئی ہے کہا، کُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ اور پیو)، پھر پوچھا دعاؤں میں کون سی دعا تم کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کہا، رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ (اے رب ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما) صاحبو! یہ فقر پر عمل نہیں ہے یہ ہوائے نفسانی پر عمل ہے۔

ایک شخص ساس سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ ایک مولوی صاحب کو ایک ہزار روپیہ دیا کہ کسی ترکیب سے اس نکاح کو جائز کر دیں۔ انہوں نے ایک ہزار روپیہ لے کر نکاح کر دیا اور تاویل یہ کی کہ بیوی شرک و بدعت میں مبتلا تھی اس لئے اُس سے نکاح ہی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے یہ ساس نہیں ہوئی۔

سینکڑوں واقعات ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حق تعالیٰ کے ساتھ بھی دھوکا کا معاملہ کرتے ہیں۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے صرف یُحَکِّمُوْکَ (یہ لوگ اپنے جھگڑے کا آپ تصفیہ کرائیں) پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اُس کے ساتھ ایک تو یہ فرمایا ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ یعنی حضورؐ کے فیصلے کے بعد اپنے دلوں میں آپ کے فیصلے سے کوئی تنگی نہ پائیں اور پھر عدم وجدانِ حرج کا جزو دعویٰ بھی کافی نہیں۔ بلکہ اُس کے ساتھ دوسری بات وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (اور پورے طور سے تسلیم کر لیں) بھی فرمائی۔ یعنی علامت تنگی قلب نہ

ہونے کی یہ ہے کہ اُس پر عمل بھی نہایت مضبوطی سے شروع کر دیں ورنہ نرے دعوے سے تو کوئی شخص بھی عاجز نہیں ہے۔ اس لئے اُس کی یہ علامت بیان فرمائی۔

یہ حاصل ہے آیت شریفہ کا۔ اس آیت نے اس کا فیصلہ کر دیا کہ ایمان اُس وقت تک میسر نہیں ہوتا جب تک کہ احکام شرعیہ کو دل سے نہ مانے اور کسی قسم کی دل میں تنگی نہ ہو۔ اور اس طرح دل سے ماننے کی علامت یہ ہے کہ عمل شروع کر دے اور اگر دل میں تنگی ہوئی یا تسلیم نہ کیا تو مومن نہیں ہے۔

آج کل کی حالت

دیکھئے خدا تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں اور آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے احکام شرعیہ کو صرف چھوڑا ہی نہیں۔ بلکہ احکام سے مزاحمت کرتے ہیں۔ صدقہ فطر کے بارہ میں ایک لڑکے نے یہ کہا تھا کہ کیا اس گرانی میں بھی ڈیڑھ سیر ہی گیہوں واجب ہیں۔ پہلے تو اناج ارزاں تھا اُس وقت کم قیمت میں آتا تھا۔ اب اس قدر واجب ہونا چاہیئے جتنا اُس قیمت میں آجائے۔ غضب ہے احکام سلطنت میں کوئی شخص معارضہ نہیں کرتا اور احکام شرعیہ میں ہر شخص جسارت کرتا ہے۔

ایک مسئلہ فرائض کا میرے پاس آیا۔ اس میں ایک بیوی، ایک بیٹی ایک عصبہ تھا۔ مسئلہ کا جواب سن کر بیوی اور بیٹی کہتی ہیں کہ اللہ میاں نے (توبہ توبہ) یہ عصبہ کی کہاں شاخ لگا دی۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ عصبہ نہ ہونا چاہیئے میں نے اُن سے پوچھا کہ اگر تم خود عصبہ ہو تو اُس وقت کیا رائے ہے دوسرے وقت تو یہی کہیں کہ سبحان اللہ شریعت میں کیسا عدل اور حق رسانی ہے کہ دور دور

کے رشتے کی بھی رعایت رکھی ہے۔

ایک اور قصبہ کا قصہ ہے کہ ایک شخص کی ہمشیرہ کا نکاح کسی شیعی سے ہوا۔ وہ ہمشیرہ مرگئی اور اس نے خاوند اور دو بھائی وارث چھوڑے۔ بھائی نے چاہا کہ خاوند کو حصہ نہ دوں۔ چنانچہ ایک استفتاء تیار کیا کہ شیعہ مرد کا نکاح سُنیہ عورت سے ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ مکر اس لئے کیا کہ نکاح جائز نہ ہوگا تو وہ شوہر شوہر نہ ہوگا تو تمام جائیداد میرے ہی پاس رہے گی۔ اور اس کی کچھ پروا نہیں ہوئی اور نہ غیرت آئی کہ اتنے دنوں تک بہن بلا نکاح ایک غیر مرد کے پاس رہی۔

شریعت کو لوگوں نے موم کی ناک سمجھ رکھا ہے جس طرح چاہا توڑ لیا۔ غرض اخیر شیعہ ہوائے نفسانی پر کرتے ہیں اور اگر شریعت سے ملے تو شریعت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اگر شریعت سے حصہ نہ ملے تو عدالت میں جاتے ہیں کہ بھائی ہم تو گنہگار ہیں، بال بچے والے ہیں۔ ہم سے شریعت پر کیسے عمل ہوسکتا ہے۔ شریعت پر تو وہ عمل کرے جس کے نہ جورو ہو نہ اولاد، دم نقد ہو جس طرح چاہے اور دنیا دار کو تو ہر قسم کی ضرورتیں پیچھے لگی ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے تاجر اور امراء کا خیال ہے کہ شریعت پر عمل کرنے سے دنیا کے کام اٹکتے ہیں۔ مال حاصل نہیں ہوسکتا، کمائی نہیں ہوسکتی ہے۔

میں اس کے جواب میں ایک موٹی سی مثال پیش کیا کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ مثلاً ایک حاکم مالک خزانہ ہے اور اس خزانہ کی کنجیاں اس حاکم کے پاس ہیں۔ تو اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ خزانے میں سے کچھ مجھ کو مل جائے تو اُس

کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ہر عاقل یہی تجویز کرے گا کہ اُس حاکم کو خدمت و اطاعت کر کے راضی کرنا چاہیئے اور اگر اُس کو ناراض کر دیا تو ہرگز نہ ملے گا بلکہ جو دیا ہے وہ بھی چھن جائے گا۔ اسی طرح حق تعالےٰ خزائن کے مالک ہیں اور اُن کی کنجیاں اُنہی کے قبضہ میں ہیں۔ پس اگر آپ اُن میں سے کچھ لینا چاہتے ہیں تو اُن کی طاعت اختیار کیجئے۔ جب وہ نافرمانی کی حالت میں بھی دیتے ہیں تو فرمانبرداری کی حالت میں کیوں نہ دیں گے اور اُن کی شان رزاقیت تو وہ ہے کہ اگر تم روروکر یہ دعا کرو کہ ہم کو رزق نہ دو، تو اُن کو تمہارے ساتھ اس قدر محبت ہے کہ وہ یہ دعائیں ہرگز نہ قبول فرمائیں گے۔ تو یہ کہنا کہ اتباعِ شریعت سے دنیا نہ ملے گی۔ اس کے تو یہی معنی ہیں کہ مالکِ خزائن کے راضی کرنے سے تو خزانہ نہ ملے گا اور ناراض کرنے سے ملے گا کیسی اُلٹی بات ہے۔

صورت و حقیقت کا فرق

اگر آپ کہیں کہ ہم تو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ فرمانبرداروں کے زیادہ کام اٹکتے ہیں کوئی تنگ دست ہے کوئی بیمار ہے غرض فرماں برداروں پر زیادہ مصائب ہیں۔ جواب یہ ہے کہ کامیابی کی ایک تو صورت ہوتی ہے اور ایک اُس کی حقیقت و روح ہوتی ہے۔ مال اور صحت اور جاہ یہ کامیابی کی صورت ہے اور حقیقت اور روح اُس کی راحت و جمعیت قلب ہے۔ مال اور جاہ و صحت سے مقصود اطمینان اور راحت ہے۔ اگر سب کچھ ہو لیکن قلب پریشان ہو تو اُس کو اہلِ دنیا بھی کامیابی شمار نہیں کرتے۔

چنانچہ اگر ایک شخص کے یہاں مال و دولت حشمت و شوکت سب کچھ

ہو اور اس کو پھانسی کا حکم ہو جائے اور اس کے مقابلے میں ایک شخص فرض کیا جائے کہ جس کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے اور مزدوری کر کے اطمینان کے ساتھ اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس سے اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص کی تمام دولت تم کو ملے گی۔ اگر بجائے اس کے تم پھانسی پر چڑھ جاؤ اور یہ اقرار کر لو کہ قاتل میں ہوں۔ وہ ہرگز منظور نہ کرے گا اور کہے گا کہ میں دولت کو لے کر کیا چولھے میں ڈالوں گا جب میری جان ہی نہ ہو گی تو ایسی دولت کو کیا کروں گا۔ اور اس دولت مند سے اگر پوچھا جائے کہ تم کو خلاصی ہو جائے گی مگر اس شرط سے کہ اس شخص کا فقر و فاقہ تم کو ملے گا تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ کامیابی کی حقیقت مال و جاہ و صحت نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کی اطمینان اور راحت قلب ہے۔

پس ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر اہل اللہ پر فقر و فاقہ اور مصائب خواہ کسی قدر ہوں، اُن کا قلب پریشان نہیں ہوتا اور نافرمان کو کتنی ہی عیش و عشرت ہو لیکن اس کا قلب ہمیشہ پریشان ہے۔ خاص کر مسلمان کو تو نافرمانی میں آرام ملتا ہی نہیں کیونکہ اس کو وہاں کا بھی کھٹکا لگا ہے تو اس کا گناہ تو اور بھی بے لذت ہے۔

اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ فرمانبرداری سے روح عیش میسر ہوتی ہے۔ ظاہری ناداری اور تنگ دستی اس کو پریشان نہیں کرتی۔ کیمیاگر اگرچہ مفلس ہو لیکن وہ ہر وقت خوش ہے کہ جب چاہوں گا سونا بنا لوں گا۔ اسی واسطے بڑے بڑے والیانِ ملک اور حکام وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ پس صاحبو!

جب کہ وہ کیمیا جو تانبے کو سونا بنا دیتی ہے یہ اثر رکھتی ہے تو حقیقی کیمیا یعنے حق تعالےٰ کی محبت اور اطاعت میں کیا یہ اثر نہ ہوگا۔ پس یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے سے کامیابی نہیں ہوتی اور یہ ثابت ہوگیا کہ حقیقی کامیابی اتباعِ شریعت میں ہی منحصر ہے۔

فقدانِ عظمتِ شریعت

اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے فلا وربک میں حضورؐ کی تین شانیں بیان فرمائی ہیں۔ عظمت وجلال ـــــ محبوبیت ـــــ محسنیت۔ چنانچہ تفصیلاً اول گزرچکا ہے اور آگے مقصود کے اندر بھی تین امر کا بیان ہے۔

اول یحکموک

دوسرے ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (یعنی آپ کے فیصلے کے بعد دلوں میں تنگی نہ پائیں۔)

تیسرے وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (پورے طور پر تسلیم کریں)

یہ تینوں امر حضورؐ کے اوصاف ثلثہ سابقہ پر مرتب معلوم ہوتے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عظمتِ شان پر تو یحکموک (یہ لوگ آپ کو حکم بنالیں) مبنی ہے۔ اس لیے کہ حاکم اسی کو بناتے ہیں جو عظیم الشان ہو۔

اس مقام پر ایک امر قابل غور ہے کہ آج کل جو لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کیا ہے کہ احکام شرعیہ کی علتیں دریافت کرتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے حالانکہ احکام سلطنت کی وجوہ دریافت نہیں کرتے۔ سو اس کی وجہ یہی ہے کہ حکام کی عظمت قلب میں ہے اور حضورؐ کی عظمت نہیں ہے۔ عظمت وہ شے

ہے کہ علّت کا سوال تو کیا معنی خطرہ بھی اُس کا نہیں آتا۔ کبھی کسی نے اس کی وجہ دریافت نہیں کی کہ رسیدی ٹکٹ اگر خط پر لگا کر ڈاک میں چھوڑ دیا جائے، تو خط بیرنگ کیوں ہو جاتا ہے۔ حالانکہ محصول پورے سے بھی زیادہ دیا ہے اگر کوئی پوچھے بھی تو یہی جواب ملتا ہے کہ سرکاری حکم ہے۔ بخلاف احکامِ شرعیہ کے کہ اس میں ہر مسئلے کی علّت پوچھتے ہیں۔ یہ صاف دلیل ہے کہ حاکمِ شرع کی دل میں عظمت نہیں ہے۔ صاحبو! افسوس ہے کہ مسلمان ہو کر احکام میں چون وچرا کرو۔

لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں) محبوبیت کا مقتضا ہے کہ محبوب محب کو اگر یہ کہے کہ اپنے سر میں جوتیاں مارتے ہوئے بازار کو نکل جاؤ تو اگر محب صادق ہے تو اُس سے عار وننگ نہ کرے گا اس لئے کہ محبت کا یہ خاصہ ہے کہ عار وننگ نہیں رہا کرتی بلکہ اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ یہ امر عقل کے خلاف ہے تب بھی اُس کے امتثال (فرمانبرداری) میں کوئی تنگی نہ ہو گی۔ بلکہ تنگی تو کیا اُس کے امر کو اپنا فخر سمجھتا ہے۔

یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (پورے طور سے تسلیم کر لیں) حسنیت پر متفرع ہے کہ طبع سلیم کا مقتضی المحسن کے امر کو تسلیم کرنا اور اُس میں چون وچرا نہ کرنا ہے۔

اس مقام پر ایک طالب علمی شبہ یہ ہے کہ کیا اگر ان امورِ ثلثہ میں سے کوئی امر کسی کے اندر مفقود ہو گا تو وہ مومن نہ ہو گا؟

بات یہ ہے کہ تحکیم اور عدم وجدانِ حرج اور تسلیم کے مراتب مختلف ہیں جس مرتبے کی تحکیم اور عدم وجدانِ حرج اور تسلیم ہو گی اُسی مرتبے کا مومن ہو گا

اور مراتب تین ہیں۔

ایک مرتبہ اعتقاد کا ہے، الحمدللہ کہ سب مسلمانوں میں یہ مرتبہ امور ثلثہ (تینوں باتوں) کا موجود ہے اور یہ ادنیٰ ایمان ہے۔ اگر کسی کے اندر مرتبہ اعتقاد میں بھی یہ امور نہ ہوں تو وہ واقعی مومن نہیں ہے۔

دوسرا مرتبہ عمل کا ہے کہ امور ثلثہ پر عمل بھی ہو یعنی اپنے مقدمات اور منازعات میں شریعت کی طرف رجوع ہو۔ عقلاً تنگی نہ ہو اور اس پر عمل ہو اگرچہ طبعاً تنگی ہو اور یہ اوسط درجہ ایمان کا ہے۔

تیسرا مرتبہ طبیعت کا ہے یعنی امور ثلثہ طبعی ہو جائیں۔ یہ اعلیٰ درجہ ایمان کا ہے اور ایسا شخص مومن اکمل ہے۔

ایمان کے درجات

بہرحال جیسے ایمان کے درجات ہیں، ایسے ہی ان امور کے بھی درجے ہیں۔ اب ہر شخص کو اپنے اندر غور کر لینا چاہیئے کہ میں کس درجہ کا مومن ہوں۔ اور کس درجہ کی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ ضرورت تو ہر مطلوب میں کمال ہی کی ہے۔ اب اپنی حالت دیکھ لے کہ اگر صرف درجہ اعتقاد کا ہی ہے تو اس کو گو مومن کہا جائے گا لیکن کمال ایمان کے اعتبار سے وہ مومن نہ کہلائے گا اور عرفاً بھی وہ مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

دیکھو اگر کسی کے پاس ایک روپیہ ہو تو اس کو مالدار نہیں کہتے۔ مالداری کو کہتے ہیں جس کے پاس بہت سا مال ہو۔ پس ایسے شخص کو کمال کی طرف ترقی کرنا چاہئے۔ سو بڑا غضب کی بات ہے کہ مال دنیا اگر قلیل ہو تو اس پر تو قناعت

تو نہیں اور ہر وقت یہی فکر ہے کہ یہ بڑھ جائے اور دین کی ترقی کی فکر نہیں ؎

اَرَی الْمُلُوْکَ بِاَدْنیَ الدِّیْنِ قَدْ قَنَعُوْا
وَمَا اَرٰھُمْ رَضُوْا فِی الْعَیْشِ بِالدُّوْنِ

بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ ادنیٰ و قلیل دین پر قانع ہیں اور میں نے اُن کو نہیں دیکھا کہ قلیل دنیا پر انہوں نے اکتفا کیا ہو

فَاسْتَغْنِ بِالدِّیْنِ عَنْ دُنْیَا الْمُلُوْکِ کَمَا
اسْتَغْنَی الْمُلُوْکُ بِدُنْیَاھُمْ عَنِ الدِّیْنِ

سو تم دین کی وجہ سے بادشاہوں کی دنیا سے مستغنی رہو جیسا کہ بادشاہ اپنی دنیا کی وجہ سے دین سے مستغنی ہیں۔

حالانکہ دین کا کمال تو اس سے زیادہ اہتمام کے قابل ہے۔ غرض ایمان جب ہی کامل ہوگا کہ تحکیم اور عدم وجدان حرج اور تسلیم کا درجہ کامل ہو۔

اب کمال ایمان کی تحصیل کا طریقہ اور دستور العمل مختصراً معلوم کر لینا چاہئے تاکہ اُس پر عمل کرنے سے یہ درجہ ایمان کا میسّر ہو۔ وہ طریقہ مرکب ہے تین اجزا سے۔ اوّل تو علم دین خواہ کتب درسیہ کی تحصیل سے ہو یا اردو رسائل سے یا علماء سے سُن کر ——— دوسرے صحبت اہل اللہ کی ——— تیسرے یہ کہ چوبیس گھنٹہ میں سے ایک گھنٹہ نکال کر اُس میں بیٹھ کر یہ سوچا کرو کہ ہم کو ایک روز یہ دنیا چھوڑنا ہے اور قبر میں جانا ہے اور وہاں دو فرشتے آئیں گے اور سوال کریں گے۔ پھر قبر سے اٹھ کر حساب کتاب ہوگا۔ غرض مرنے سے لے کر دخول جنت یا جہنم تک جو جو واقعات پیش

آنے والے ہیں سب کو مفصلاً سوچے۔ اسی طرح ایک گھنٹہ روزانہ مراقبہ کر لیا کرے۔ حق تعالیٰ سے امید ہے کہ دین و دنیا دونوں کی درستی اس دستور العمل پر عمل کرنے سے ہوگی۔

اب اللہ تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العٰلمین وصلے اللہ تعالیٰ علےٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وآلہ واصحابہ وبارک وسلم

شعب الایمان

یہ وعظ تاج محمد خاں صاحب کے مکان واقع جلال آباد میں ۵ ذیقعدہ ۱۳۳۰؁ھ بروز جمعرات ہوا۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی رحہ نے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ ورسولہ اما بعد فقد قال اللہ تعالےٰ

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا۔

بتحقیق اسلام کے کام کرنیوالے مرد اور اسلام کے کام کرنیوالی عورتیں اور ایمان لانیوالے مرد اور ایمان لانیوالی عورتیں، فرمانبرداری کرنیوالے مرد اور فرمانبرداری کرنیوالی عورتیں، راستباز مرد اور راستباز عورتیں صبر کرنیوالے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں، خشوع کرنیوالے مرد اور خشوع کرنیوالی عورتیں، خیرات کرنیوالے مرد اور خیرات کرنیوالی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنیوالے مرد اور حفاظت کرنیوالی عورتیں اکثرت سے خدا کی یاد کرنیوالے م

مسئلہ مساواتِ نساء

قرآن شریف کے درمیان تین قسم کی آیتیں ہیں۔ یوں تو آیات قرآنی کے بہت سے اقسام ہیں۔ کوئی مکی، کوئی مدنی، کوئی لیلی، کوئی نہاری، کوئی ناسخ، کوئی منسوخ مگر یہ تقسیم ایک خاص اعتبار سے ہے کہ اس کے لحاظ سے آیات قرآنی کی تین ہی اقسام ہیں۔

ایک وہ ہیں جن میں خطاب صرف مردوں ہی کو کیا گیا ہے گو عورتیں بھی تبعاً اس میں شامل ہیں۔ اور چونکہ عورتیں محکوم ہیں اس لئے ان کو جداگانہ خطاب نہیں کیا گیا۔ نیز چونکہ مرد حاکم ہیں، وہ اپنے زور حکومت سے خود کام لے لیں گے جیسے بڑے چھوٹوں سے کام لیتے ہیں۔ پس جب مرد حاکم ہیں تو ہمارے عرف و عادت کے موافق جو حکم حاکم کے لئے ہوتا ہے محکوم کے لئے بھی ہوتا ہے۔ محکوم پر جداگانہ حکم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی عادت کے موافق قرآن میں خطاب کیا گیا ہے تو تمام معاملات میں مردوں کو خطاب کافی ہے عورتوں کو الگ خطاب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور یہاں سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ عورتوں کا کیا درجہ ہے کہ

اُن کے لئے علیحدہ حکم کی ضرورت نہیں۔ جو حکم مردوں کو دیا جائے گا عورتیں بھی اُس کی مکلّف ضرور ہوں گی۔ قرآن کی اس طرزِ خطاب سے بھی عورتوں کا محکوم ہونا بخوبی معلوم ہے تو مسئلہ مساوات نساء میں جو نزاع ہو رہا ہے اس کا فیصلہ یہاں سے ہو سکتا ہے۔

آج کل کے نوجوانوں کا یہ دعویٰ مساوات محض زبان سے ہی ہے عمل میں وہ بھی برابری نہیں کر سکتے۔ ایک متمدن قوم کو دیکھ لیا کہ وہ عورتوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں تو خود بھی اس کا اتباع کرنے لگے مگر یہ نہ دیکھا کہ وہ لوگ کسی مذہب کے پابند نہیں۔ ایسے لوگوں کی تقلید پابند مذہب قوم کیسے کر سکتی ہے پھر اُن کے اس طرز و انداز کے نتائج پر نظر نہ کی کہ اس مساوات کا اثر ان کے حق میں مفید ہو یا مضر۔ غرض بالکل کورانہ تقلید کر کے مساوات نساء کے قائل ہونے لگے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ متمدن قوم جس کی تقلید آج کل ہمارے نوجوان کر رہے ہیں خود اس مساوات کو نباہ نہ سکی۔ چنانچہ عورتیں پارلیمنٹ کی ممبری چاہتی ہیں مگر یہ درخواست منظور نہیں کی جاتی۔ جس کی وجہ سے اُن عورتوں نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے۔ غرض اہل یورپ بھی مساوات نہ کر سکے اور کیونکر کریں جب خدا ہی نے عورت کو تشریعاً و تکویناً محکوم بنایا ہے تو اس کو برابر کون کر سکتا ہے۔ کیونکہ خدا کا عورتوں کو محکوم بنانا جب کہ آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے دلیل عقلی سے بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس بات پر سارا عالم متفق ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں بہت سی باتوں میں۔ اس کا کسی کو انکار نہیں۔ یہاں تک کہ مدعیانِ مساوات اہل یورپ بھی آخر کار اس کو مان گئے کہ بعض عہدوں کے لائق عورتیں ہرگز نہیں اور جس پر ساری دنیا کا اجماع ہو وہ

طبعی تقاضا اور فطری قانون ہوتا ہے۔

عقلی دلیل کے علاوہ حسی دلیل بھی اس بات پر قائم ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ خدا نے عورت و مرد کی خلقت میں کتنا فرق رکھا ہے مرد جسمانی قوت میں عورت سے زیادہ ہے۔ عقل مرد کی زیادہ ہوتی ہے، آواز مرد کی بلند ہوتی ہے۔ مرد عورت سے رائے میں زیادہ پختہ ہوتا ہے۔ اور عورت کو دیکھا جائے تو اس کی ہر چیز مرد سے کم نظر آتی ہے۔ ظاہری اعضا کی بناوٹ میں بھی اور عقل و رائے میں بھی۔ قرآن میں حق تعالےٰ کفار کی خرابی عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا یَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰکُمْ بِالْبَنِیْنَ۔

یعنی کیا خدا تعالیٰ نے اپنے لئے مخلوقات میں سے لڑکیاں تجویز کی ہیں اور تم کو لڑکوں کے ساتھ منتخب کیا ہے۔

پھر فرماتے ہیں۔

اَوَ مَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَ هُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ

کہ خدا تعالیٰ کے لئے تجویز بھی کیں تو لڑکیاں جو ابتداء سے زیور اور گہنے میں پرورش پاتی ہیں۔

اور دوسرے یہ کہ قوت بیانیہ میں نہایت ضعیف ہیں۔ یہ دو باتیں عورتوں میں نقص کی ایسی ہیں کہ آنکھوں سے دیکھ لو۔ واقعی لڑکیوں میں ابتداء ہی سے زیور کا شوق ہوتا ہے اور یہ دلیل ہے اُن کی محدودیت نظر کی۔ چنانچہ خود مردوں ہی میں دیکھ لو جن کو زینت کا شوق ہوگا اُن کے خیالات پست اور محدود ہوں گے اور جو

سادہ ہوگا اُس کے خیالات عالی ہوں گے اور اس کا راز یہ ہے کہ لباس وغیرہ ضرورت کی چیزیں ہیں، اصل مقصود نہیں۔ اب سمجھ لینا چاہیئے۔ سو ظاہر ہے کہ ہر عاقل ضرورت کی چیز سے بقدر ضرورت تعلق رکھے گا۔ اور زیادہ کوشش اصل مقصود ہی میں کرے گا۔ وہ شخص نہایت پست خیال ہے جو غیر مقصود چیزوں کی دھن میں لگا رہتا ہو۔ پس لڑکیوں کو زیور اور زینت سے رغبت ہونا ان کی پستی خیالات کی دلیل ہے۔ مرد اکثر سادہ ہوتے ہیں۔ ہاں جن مردوں پر زنانہ پن غالب ہو یہاں اُن کا ذکر نہیں۔ تعلیم یافتہ قوموں کو بھی دیکھ لیجئے۔ تجربہ کار لوگوں کا بیان ہے کہ اُن کی عورتیں باوجود تعلیم حاصل کر لینے کے پھر مردوں سے بہت کم ہیں۔

ایک شخص کہتے تھے کہ اگر ان میں کسی عورت کو کچھ بیان کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو وہ چند جملے کہہ کر بیٹھ جاتی ہے۔ مردوں کی طرح اُس کی گفتگو میں کبھی بسعت نہیں ہوتی۔ تو یورپ کی عورتیں بھی لیاقت علمی میں مردوں کے برابر ہرگز نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ دستکاری میں یا کسی خاص سلیقہ میں برابر یا زیادہ ہوں۔ غرض جس کو قدرت نے محکوم بنایا ہو اس کو مساوی کون کر سکتا ہے۔

عورت کی حکومت کے نتائج یہ محکومیت عورتوں کے لئے خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور یہ اس لئے کہا گیا تاکہ عورتیں دلگیر نہ ہوں۔ نعمت اس لئے ہے کہ اگر دنیا میں سب برابر درجہ کے ہوتے تو انتظام قائم نہ رہ سکتا۔ تو یہ ضروری بات تھی کہ ایک گھٹا ہوا ہو دوسرا بڑھا ہوا۔ اگر سارے حاکم ہی ہوتے تو کاشتکاری کون کرتا، عمارت کون بناتا، آٹا کون پیستا۔ غرض دنیا کا انتظام اسی کو چاہتا ہے کہ سب ایک درجہ کے

نہ ہوں بلکہ ایک بادشاہ ہو ایک وزیر۔ کوئی حاکم کوئی رعیت۔ کوئی تاجر کوئی مزدور۔ یہ فرق مراتب ضروری تھا۔ ہاں اس فرق مراتب کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ عورتیں بڑھی ہوئی ہوئیں مرد گھٹے ہوئے۔ مگر چونکہ اُن کی عقل و رائے ضعیف ہے اس لئے تمدن خراب ہو جاتا۔ وہ خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتیں دوسروں پر حاکم بن کر اُن کی نگہبانی تو کیا کرتیں۔ بیوقوف کے لئے یہی مصلحت ہے کہ کسی کے تابع ہو کر رہے۔ اگر کسی بیوقوف کو حاکم بنا دیا جائے تو دیکھ لو کیا انجام ہوگا۔ خود بھی ہلاک ہوگا دوسروں کو بھی تباہ کرے گا۔ اگر چھوٹے بچے کو ماں باپ کے تابع نہ کیا جائے تو وہ یقیناً ہلاک ہوگا کیونکہ اُس کو اپنے نفع اور ضرر کی کچھ خبر نہیں۔ تو بیوقوف کے لئے کسی کا ماتحت ہونا ہی مصلحت ہے تاکہ دوسرا اُس کی روک ٹوک کر سکے۔

یہی راز ہے اس حدیث کا جو حضورؐ سے مروی ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس کی حاکم عورت ہو۔ کسریٰ شاہ فارس کی بیٹی جب بادشاہ ہوئی تھی اُس پر آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ یہیں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل ہماری خرابی اور خستگی کا باعث ایک یہ امر بھی ہے کہ ہم نے عورتوں کو اپنے گھر کا حاکم بنا دیا ہے اگرچہ یہ چھوٹی سی حکومت ہے مگر اس کا بھی نتیجہ خراب ہی ہے۔ مثلاً شادی بیاہ کی ساری رسمیں عورتوں ہی کی خواہش سے پوری کی جاتی ہیں جس کا انجام ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ کس قدر خاندان ان رسوم شادی میں تباہ ہو گئے اور یہ سارا فساد عورتوں کے حاکم بنانے کا ہے۔ عورتوں کی دلجوئی کرنا ضروری ہے مگر اُن کے تابع بننا برا ہے۔ اس وقت سارا مال و اولاد عورتوں کے قبضہ میں ہم نے

کر دیا ہے۔ پھر دیکھ لیجئے کہ روپیہ کیسے بے جا مواضع میں صرف ہوتا ہے اور بچوں کی صحت خراب، اخلاق تباہ ہو رہے ہیں۔ عورتیں بچوں کو جو چاہیں کھلا پلا دیتی ہیں جس سے اُن کی زندگی بیماری میں کٹتی ہے۔ محبت و پیار حد سے زیادہ کرتی ہیں جس سے لڑکے شوخ ہو جاتے ہیں۔ تو اپنے مال اور اولاد کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہیئے۔ عورتوں کو حاکم کر دینا سخت باعث تنزل ہے جس کو جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم پہلے سے فرما گئے ہیں۔

اس حدیث پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض متمدن قوموں میں عورتیں حاکم ہوتی ہیں اور بعض جگہ اب بھی ہیں اور پھر اُن کو ترقی ہے۔

تو اوّل تو مال و مادیات کی ترقی فلاح نہیں۔ فلاح قومی کی اصل ترقی اخلاقی و علمی و روحانی ہے۔ تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ جن قوموں میں عورت بادشاہ ہے اُن کو یہ ترقی نصیب ہوئی۔ دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اُن کی ترقی ترقی ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ اس کا اثر ہے کہ اُن میں عورتیں خود مختار حاکم نہیں محض ضابطہ کی حاکم ہیں۔ اصل بادشاہ پارلیمنٹ ہے۔ تو ایسی حکومت کوئی حکومت نہیں نام کی بادشاہت ہے۔ اس سے مضمون حدیث پر کوئی غبار نہیں آسکتا

عورتوں کا عذر لنگ

میں نے اس وقت اس حدیث کو اسی لئے پڑھ دیا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے کہ اس وقت جو ہم نے اپنے گھر باہر کا حاکم عورتوں کو بنا رکھا ہے اس کو بھی ہماری پستی اور تنزل میں دخل ہے۔ اور آج کل ہم پر یہ ایسی تباہی آرہی ہے کہ بجائے متبوع بننے کے عورتوں کے بالکل تابع ہو گئے۔ اور غضب یہ ہے کہ عذر کے موقع میں

کہا جاتا ہے کہ صاحب کیا کریں عورتیں نہیں مانتیں۔ سو یہ کہنا کتنی کم ہمتی کی بات ہے اگرچہ یہ بھی ایک بہانہ ہے جس بات کو خود اُن کا جی چاہتا ہے اسی میں عورتوں کے کہنے سے مجبور ہو جاتے ہیں ورنہ جس بات کو اُن کا جی نہ چاہے مثلاً بعض لوگ اپنی عورتوں کو باپ کے گھر جانے نہیں دیتے۔ اس میں عورتیں لاکھ تقاضا کریں، کبھی نہیں مانتے۔ پس اوّل تو یہ عذر بالکل غلط ہے اور اگر سچ ہے تو اور بھی بُرا ہے کہ مرد ہو کر بیوی کے غلام بن گئے۔

غرض عورت کے لئے یہی مصلحت ہے کہ مرد کے تابع ہو کر رہے اور شریعت نے بھی عورتوں کو محکوم ہی بنایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ (مرد حاکم ہیں عورتوں پر) اور یہی وجہ ہے کہ احکام میں اکثر مردوں کے خطاب پر اکتفا کیا گیا ہے اور بعض جگہ خاص عورتوں کو بھی خطاب ہے کیونکہ یا تو اُن کی دلجوئی مقصود تھی کہ عورتیں دلگیر نہ ہوں کہ ہمارا ذکر قرآن میں نہیں آتا۔ چنانچہ بعض آیتوں میں اس وجہ سے صیغہ مونث استعمال کرنا احادیث سے مفہوم ہوتا ہے۔ یا یہ وجہ ہوئی کہ واقعہ کو ان ہی سے تعلق تھا۔ چنانچہ ان آیات سے پہلے کی چند آیتوں میں صرف عورتیں یعنی ازواج نبی علیہ السلام مخاطب ہیں کہ واقعہ کو اُن ہی سے تعلق تھا۔ اور کہیں مخلوط طور پر خطاب ہے جیسا کہ یہ آیت جس کو میں نے ابھی تلاوت کیا ہے۔ اور ان آیتوں سے مساوات نساء کا ظاہر میں شبہ ہو سکتا ہے کیونکہ ایک ہی مادہ اور ایک ہی صفت دونوں کے لئے الگ الگ بیان کی گئی ہے مگر غور کے بعد یہ شبہ زائل ہو جاتا ہے کیونکہ صیغہ مذکر کو مقدم کیا گیا ہے۔ تو امام و مقتدی اگرچہ ایک ہی جگہ برابر

کھڑے ہوں مگر پھر بھی بڑا فرق ہوتا ہے کہ ایک امام ہے اور ایک امام نہیں چونکہ اس وقت مرد و عورت دونوں وعظ سن رہے ہیں اس لئے ایسی ہی آیت کو پڑھنا مناسب سمجھا تاکہ عورتوں کا جی بھی خوش ہو جائے کہ ہمارا ذکر بھی مردوں کے ساتھ قرآن میں ہے اور نیز یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہمارے ذمہ بھی کچھ احکام ہیں جیسے مردوں کے ذمہ ہیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے ذمے تو بس مردوں کی خدمت ہے۔

چنانچہ بعض دفعہ جو ان کو نماز کے لئے تاکید کی جاتی ہے تو کہتی ہیں کہ ہم کو فرصت کہاں تم تو مرد ہو نہ بچوں کا ساتھ نہ برتن ہانڈی کا کام، بھاڑے پوچھے بیٹھے رہے۔ ہمارا تو بچوں کا ساتھ ہے، برتن ہانڈی میں ہاتھ رہتے ہیں۔ کپڑے ناپاک رہتے ہیں ہم نماز کیسے پڑھیں۔ ان باتوں سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ہانڈی چولہا کرنے، بچوں کا پیشاب پاخانہ دھونا تو ان کے ذمہ ہے نماز ان کے سر سے معاف ہے۔ استغفر اللہ ان سے کوئی پوچھے کہ جب چار عورتیں جمع ہو کر دنیا بھر کے قصے لے کر بیٹھتی ہیں اور باتوں میں پہروں مصروف رہتی ہیں اس وقت ان فضول قصوں کے لئے کہاں سے وقت نکل آتا ہے۔ باقی کپڑوں کے ناپاک رہنے کا عذر بھی بالکل بیہودہ ہے۔ اگر ایک جوڑا نماز کے لئے الگ کر دیا جائے تو کچھ مشکل نہیں۔

اس وقت یہ آیت اختیار کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ عورتوں کے ان فاسد خیالات کی اصلاح ہو جائے۔ یہ تمہید تھی اس آیت کی۔ اس میں گر کوئی بات عورتوں کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو مضائقہ نہیں۔ کیونکہ تمہید کا بیان کرنا

بہت مشکل ہوتا ہے۔

مغفرت کی ضرورت وصورت

اب اصل مضمون کو سہل طریقہ سے بیان کروں گا تاکہ عورتوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ ہمارے ذمہ کیا کیا احکام ہیں۔ نیز اس آیت کے خاتمہ سے یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ یہ جو لوگوں کا عام خیال ہے کہ جو کچھ چاہو کرو اللہ غفور رحیم ہیں تو اُس دعارہ مغفرت میں خاص شرطیں ہیں۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ جو کچھ چاہو کرو پھر بھی اجر عظیم ہوگا بلکہ مغفرت کے لئے کچھ قیود ہیں۔ اب سمجھو کہ وہ باتیں کیا ہیں جن پر مغفرت واجر کا وعدہ ہے۔ مگر پہلے یہ بات بھی معلوم کر لینی چاہیے کہ آیا مغفرت واجر کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ تو ایسا کوئی شخص نہیں ہو سکتا جس کو ان دونوں کی ضرورت نہ ہو۔ کیونکہ جملہ اشیا دو قسم پر ہیں نافع و مضر۔ اور ہر شخص یا تو منفعت کا طالب ہوتا ہے یا مضرت کو دفع کرتا ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ جنّت سے بہتر کوئی نعمت نہیں اور عذاب دوزخ سے بڑھ کر کوئی عذاب اور مضرت نہیں اور جب چھوٹی سی نعمت کے لینے اور ہلکے سے عذاب سے بچنے کی بڑی کوشش کی جاتی ہے تو اس کے لئے کوشش کیونکر ضرور نہ ہوگی۔ تو کوئی مسلمان بلکہ کوئی شخص ان دونوں سے مستغنی نہیں۔ تو یہ دونوں چیزیں سب کے نزدیک مطلوب ہیں۔ جنّت کا حاصل کرنا یہ اجر عظیم ہے اور دوزخ سے بچنا یہ مغفرت ہے کیونکہ جب گناہ معاف ہو گئے تو دوزخ سے نجات ہو جائے گی۔

حق تعالیٰ اس آیت میں ان ہی دونوں باتوں کی تحصیل کا طریقہ بیان فرماتے ہیں کہ اگر دوزخ سے بچنا اور جنت میں پہنچنا چاہتے ہو تو ہم بتلاتے ہیں کہ وہ کیا

کیا کام کرے۔ چونکہ ہر مسلمان پر ثابت ہو گیا کہ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں اس لئے لازم ہے کہ معلوم کریں کہ وہ کون سا طریقہ ہے جس سے جنت و مغفرت حاصل ہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا کسی سے کچھ رشتہ تو ہے نہیں جو بدون کچھ کئے جنت دے دیں جو قانون سے مستحق ہو گا اُس کو دی جائے گی اور جو مستحق نہ ہو گا اُس کو نہیں مل سکتی۔ اگرچہ حق تعالیٰ قانون کے خلاف کرنے پر بھی قادر ہیں مگر ایسا کرتے نہیں۔ کیونکہ اس میں اوّل تو ساری مصالح فوت اور برباد ہو جاتی ہے کیونکہ قانون اسی لئے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اور جو کچھ سزا یا انعام کا قانون بیان کیا گیا ہے اس سے مقصود یہی ہے کہ رغبت و خوف کی وجہ سے اچھی طرح احکام پر عمل ہو۔ اب اگر حق تعالےٰ خلاف قاعدہ مستحق انعام کو سزا یا مستحق سزا کو انعام دینے لگیں تو قانون سزا و انعام بالکل رائگاں اور جو مصلحت تھی وہ بالکل برباد ہو جائے گی۔ اور سزا و انعام کا بیان کرنا بالکل لغو ہو جائے گا جس سے ذات خداوندی پاک ہے البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدرت حق تعالیٰ کو ہر طرح ہے کہ چاہے مستحق انعام کو سزا دیں یا مستحق سزا کو انعام دیں مگر وہ ایسا کریں گے نہیں۔

مذہب اور تمدن میں اس وقت ایسے مسلمانوں سے ملا ہوں جن کا خیال یہ ہے کہ جنت اور دوزخ کوئی چیز نہیں محض تخویف اور ترغیب کے لئے یہ نام بیان کئے گئے ہیں۔ نعوذ باللہ! ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن میں جتنی وعیدیں چوری اور زنا ظلم و ستم کفر و معصیت پر ہیں یہ سب ایسے ہیں جیسے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ چپ رہو ہوّا آ

جائے گا۔ ایسے ہی جتنے انعامات جنت وغیرہ بیان کئے گئے ہیں یہ بھی محض پھسلانا ہے جیسا کہ بچوں کو بہلایا کرتے ہیں۔

میں ان لوگوں سے جواب میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ بات ایک ادنیٰ حاکم کے کلام میں ہونا بھی سخت عیب ہے چہ جائیکہ احکم الحاکمین کے کلام میں ہو کیونکہ اس کو تو جھوٹ موٹ بہکانا بولتے ہیں اور خدا جھوٹ سے بالکل بری ہے تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا (اللہ تعالیٰ اس سے بالکل بری اور برتر ہے) وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (یعنی خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی)، لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جنت و دوزخ محض ترغیب و ترہیب کیلئے ہے اور واقع میں کچھ نہیں تو رغبت و رہبت اسی وقت تک ہو سکتی ہے جب تک کہ مخاطب کو یہ راز نہ معلوم ہو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ بعد اصل حال معلوم ہو جانے کے یہ ترغیب و ترہیب ایک غیر واقعی امر سے ہے۔ رغبت اور رہبت بالکل نہیں رہ سکتی۔ پھر ان لوگوں کا اس امر کے معلوم ہونے کا دعوےٰ کرنا کہ جنت دوزخ کوئی چیز نہیں، سراپا غلط ٹھہرا۔

غرض اول تو اس کے خلاف واقعہ ماننے سے معاذ اللہ کلام اللہ پر لغویت کا دھبہ آتا ہے جس کو کوئی مسلمان کلام الٰہی کے لئے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا پھر جو مقصود شارع کو ان وعیدوں اور انعاموں کے بیان کرنے سے ہے کہ لوگوں کو مکلف و مقید بنایا جائے اس صورت میں ہرگز نہیں حاصل ہو سکتا ایسا شخص جس کا ان وعیدوں کے بارے میں ایسا خیال ہے کہ یہ غیر واقعی ہیں یقیناً ارتکاب جرائم میں دلیر ہو گا۔ اول تو یہ سب کے سامنے جو چاہے کریگا

اور اگر سامنے کرنے میں کسی کا پاس و لحاظ ہوا تو تنہائی میں تو ہرگز نہ چوکے گا۔

مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص اس خیال کا جنگل میں ہے اور وہاں ایک دوسرا شخص بھی موجود ہے۔ سوائے ان دو شخصوں کے وہاں کوئی نہیں۔ نہ پولیس نہ چوکی پہرہ۔ اب فرض کر لو کہ اتفاق سے اس دوسرے شخص کی موت آگئی اور اس کے پاس ایک لاکھ روپے کا نوٹ ہے اور اس کے کاغذات سے اس کا پتہ بھی معلوم ہو گیا کہ فلاں خاندان کا اور فلاں شہر کا باشندہ ہے اور یہ بھی اُسے خبر ہے کہ اس کا وارث ایک یتیم بچہ ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر اس واقعہ کی کسی کو خبر نہیں کہ یہ شخص کہاں مرا۔ اس کے پاس مرتے وقت کیا سامان تھا۔ نہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے نہ مقدمہ چل سکتا ہے۔ بتلائیے ایسی حالت میں یتیم بچہ تک روپیہ پہنچا دینے پر کوئی قوت اس شخص کو بجز خوفِ خدا و عذاب آخرت کے مجبور کر سکتی ہے اور کیا ایسا شخص جو وعید الٰہی کو محض تخویف سمجھتا ہے اس روپیہ کو اصل وارث تک پہنچا دے گا بالخصوص اس صورت میں کہ اس کو روپیہ کی حاجت بھی ہو۔ یہ اسی شخص کا کام ہے جو خدا کے تمام وعدہ و وعید کو حق سمجھتا ہے اور اس کے دل میں عذاب آخرت کا خوف ہے۔ اس گندہ عقیدہ سے جہاں مصالح شرعیہ برباد ہوتی ہیں مصالح تمدنیہ بھی بالکل فوت ہو جاتی ہیں۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ تمدن کے لئے مذہب کی کس قدر ضرورت ہے صرف حکومت سے تمدن ہرگز نہیں قائم ہو سکتا۔ کیونکہ حکومت کا زور

ظاہر تک منحصر ہے۔ دل میں شائستہ اخلاق مذہب ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں مجھے سخت حیرت ہے کہ تمدّن کے مدعی مذہب کی ضرورت سے کیوں ناواقف ہیں۔ اگر تمدّن کوئی ضروری چیز ہے تو مذہب اس سے پہلے ضروری ہوگا مذہب کی ضرورت نہ مان کر کوئی تمدّن قائم کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔ دعوائے تمدّن کے بعد مذہب سے لاپروائی کرنا ایسا ہی ہے کہ ؎

یکے بر سرِ شاخ و بن مے برید　　خداوند بستاں نگہ کرد و دید

باغ کے مالک نے دیکھا کہ ایک شخص ٹہنی کے سرے پر بیٹھا ہوا اسی کی جڑ کاٹ رہا تھا۔

تو یہ لوگ جس تمدّن کی شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں اُسی کی جڑ کاٹ رہے ہیں پس عجیب بات ہے کہ قول سے تو ضرورت تمدّن کی ثابت کی جاتی ہے اور فعل سے اس کی نفی کرتے ہیں۔

غرض آپ کو معلوم ہو گیا کہ جنت و دوزخ واقعی چیزیں ہیں اور یہ اسلام کا مسلّمہ مسئلہ ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ مغفرت اور اجر کی ہر شخص کو ضرورت ہے۔

شرائطِ مغفرت

اب اس مقام پر حق تعالےٰ نے مغفرت و اجرِ عظیم کے لئے کچھ شرطیں بیان فرمائی ہیں کہ جو کوئی عذاب سے بچنا چاہے اُسے یہ تمام شرطیں پوری کرنی ہوں گی۔ اُن میں سے بعض تو ایسی شرطیں ہیں کہ بدون اُن کے حاصل کئے کبھی نجات نہیں پا سکتا اور وہ اسلام و ایمان کی شرط ہے اور بعض ایسی ہیں کہ اُن کے بدون نجات ہو جائیگی

مگر مدید ہو گی۔ اول اصولی شرائط ہیں اور دوسری فروعی۔ جیسے گورنمنٹ کے جرم دو قسم کے ہیں۔ ایک تو باغی ہونا کہ بادشاہ کو بادشاہ ہی نہ سمجھا جائے یہ جرم اصولی ہے۔ جب تک یہ جرم باقی ہے اُس کا مرتکب کبھی قابل معافی نہیں۔ اور ایک جرم فروعی ہے کہ بادشاہ کو بادشاہ مان کر پھر کبھی شرارت نفسانی سے کوئی کام خلاف مرضی شاہ کیا جائے۔ جیسے چوری کی، کسی کا مال چھین لیا، کسی کو ضرب شدید پہنچادی۔ یہاں تک کہ حاکم نے سزا کردی۔ مگر حکام اس شخص سے ایسے ناراض نہیں ہوتے جیسے باغی سے ہوتے ہیں۔ اور دونوں کے اثر میں بھی بڑا فرق ہو گا کہ جرم فروعی کے مرتکب کو میعادی سزا ہو گی۔ مثلاً اگر دس سال کی قید ہوئی اور وہ زندہ رہا تو چھوڑ دیا جائے گا بخلاف باغی کے کہ اصولی جرم کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ اپنی بغاوت سے باز نہ آئے گا تو اس کے لئے حبس دائمی یا کالا پانی یا قتل تجویز کیا جائے گا۔ دنیاوی قواعد میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عقلاً اصولی جرم قابل معافی نہیں ہوتا اور فروعی جرم اکثر معاف کر دیا جاتا ہے۔

پس اسی قاعدہ کے موافق قرآن شریف میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔

خدا تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائیں گے اس کے سوا دوسرے گناہ جس کے لئے چاہیں معاف فرمائیں گے۔

اس آیت میں بھی حق تعالیٰ نے مغفرت و اجر عظیم کا قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ کن کن

شرطوں کے بعد یہ دونوں حاصل ہو سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ایمان واسلام کو بیان فرمایا ہے۔ یہ اصل شرط ہے۔ اس کا چھوڑنا اصولی جرم ہے۔ یہ ہرگز معاف نہ ہوگا اور اس کے تارک کو کبھی نجات حاصل نہ ہوگی۔ اس کے بعد دیگر فروعی شرائط مذکور ہیں جن کے پورا نہ کرنے سے انسان عذاب کا تو مستحق ہوتا ہے مگر بعد میں سزا کے نجات پا جائے گا۔ پس جو لوگ مغفرت و اجر عظیم کے طالب ہیں وہ اس آیت کے مضمون کو بغور سُن لیں کہ مغفرت کن اعمال سے حاصل ہو گی۔ ہم لوگ صرف اسی پر اکتفا کیے بیٹھے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں ہم یقیناً مستحق مغفرت واجر عظیم ہو گئے۔ یہ بڑا دھوکا ہے کہ جس نے ہم کو اصلی کام سے روک رکھا ہے جو کہ شرائط کو بجالانا اور پورا کرنا ہے۔

صاحبو ـــــ بتلایئے کہ اگر کوئی باغی کسی شریف وفادار سلطنت کے گھر میں پیدا ہوا ہو تو یہ اُس کو کچھ نفع بخش ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں! اس سے کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ زیادہ موجب عتاب ہوگا کیونکہ یہ شخص یہ عذر نہیں پیش کر سکتا کہ مجھ کو حقوق سلطنت کا پورا علم نہیں تھا۔ ایک باغی کا لڑکا تو تھوڑی دیر کے لئے یہ کہہ سکتا ہے کہ میں بغاوت میں معذور تھا کیونکہ میرا خاندان سارا باغی ہے۔ مجھے حقوق سلطنت کا علم کافی طور پر حاصل نہیں ہو سکا۔ پس معلوم ہوا کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہونا اُس وقت تک کچھ بھی نفع نہیں دے سکتا جب تک کہ اپنے اندر اطاعت کا مادہ نہ ہو۔ البتہ اگر مسلمان کے گھر میں پیدا ہو کر ہم بھی اطاعت کریں اور احکام کے پابند ہوں تو اُس وقت ہم کو اس سے کچھ نفع ہو سکتا ہے کہ ہم مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ گورنمنٹ کے نزدیک اُس شخص کی

قدر دوسروں سے زیادہ ہوگی جو خود بھی خیر خواہ سرکار ہو اور اُس کی کئی پشتیں بھی سلطنت کی خیر خواہ رہ چکی ہوں اور بعض دفعہ اس شخص کی بھی زیادہ وقعت ہوتی ہے جس کے اسلاف باغی ہوں اور وہ اپنی ذات سے مطیع ہو۔ جب بادشاہ کو خبر ہوگی کہ باغی کا لڑکا مطیع ہو کر آیا ہے اُس کے دل میں ضرور اُس کی عزت و قدر ہوگی۔ مگر شریف کا بیٹا ہو کر باغی ہو جائے تو تمام دنیا کے عقلاء و جہلاء اُس کو بے قدری کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس وقت شرافت و اطاعتِ اسلاف اُس کے کچھ کام نہ آئے گی۔ غرض بزرگوں کا مطیع و تابعدار ہونا خوردوں کے چھوٹ جانے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ تو یہ جو لوگ آج کل فخریہ کہتے ہیں کہ ہم تیرہ سو برس سے مسلمان ہیں بدون اپنی کوشش کے کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔

انضباطِ اوقات

اب تو یہ حالت ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ نماز کیا ہے اور روزہ کیا ہے۔ بریلی میں ایک عورت نے کہا کہ رمضان میں روزہ رکھنا اختیاری ہے خواہ رکھو یا نہ رکھو، کوئی ضروری فرض نہیں۔ افسوس ہے کہ بریلی جیسا شہر اور اس میں ایک عورت کو خبر نہیں کہ روزہ کیا چیز ہے۔ حالانکہ اس وقت تو غیر مذہب والوں کو بھی بہت سی باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔

مجھے ایک جنٹ کے اجلاس میں شہادت دینے کا اتفاق ہوا۔ مجھ سے اُس نے طلاق کے متعلق ایسے سوالات کئے کہ میں دنگ رہ گیا۔ تو وہ لوگ کھود کرید کرتے ہیں۔ اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ مسلمان آج کل اپنے مذہب کو ایسے بھولے ہیں کہ بعضی باتیں جو اسلام کی تعلیم کردہ ہیں دوسروں کی طرف

منسوب کرتے ہیں۔

مثلاً انضباط اوقات کا وصف ہمارے اندر بالکل نہیں۔ انگریزوں کو اس کا بڑا اہتمام ہے۔ مسلمان اس کو ایسے بھولے کہ اب یوں سمجھتے ہیں کہ یہ انہی کی بات ہے۔ اب اگر کوئی مسلمان اپنے اوقات کو منضبط کرے تو اس پر لعن طعن کرتے ہیں۔ حالانکہ انضباط اوقات شریعت کا مسئلہ ہے۔

شمائل ترمذی میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تقسیم اوقات کے متعلق ایک حدیث مشرح مذکور ہے کہ آنحضرت جب گھر میں جاتے تھے تو اپنے وقت کے تین حصے کرتے تھے۔ ایک حصہ خدا کی عبادت کے لیئے، ایک حصہ گھر والوں کے لئے، ایک حصہ خاص اصحاب کے لیئے۔ اس وقت خاص اصحاب اگر عام معاملات کی اطلاع حضورؐ کو کرتے تھے۔ کسی کی سفارش پہنچا دی، کسی کی حاجت کی خبر دی وعلیٰ ہذا۔ مگر اب مسلمان اس طریقہ سے ایسے غیر مانوس ہیں کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ مسئلہ اسلام کا ہے یا انگریزوں کا ایجاد کیا ہوا۔

مسئلہ استیذان دوسرا ایک مسئلہ اور ہے جو اس کی فرع ہے اور وہ استیذان کا مسئلہ ہے کہ جب کسی کے پاس جاؤ تو اس سے اجازت لو۔ اگر اجازت دے تب جاؤ ورنہ واپس چلے آؤ۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مجلسیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ کہ عام ملاقات کے لئے ہو جس میں تخلیہ منظور نہ ہو۔ اس میں استیذان کی ضرورت نہیں بلکہ وہاں پہرہ کھڑا کرنا بھی جائز نہیں۔ ہاں اگر اندیشہ ہو تو جائز ہے۔ جیسے مجلس قضا، مجلس وعظ وغیرہ۔ فقہا نے لکھا ہے کہ قاضی کو الگ مکان نہ بنانا چاہیئے۔ جامع مسجد میں

بیٹھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ اگر کوئی شبہ کرے کہ مسجد میں غیر مسلم کیونکر جا سکیں گے۔ تو جواب یہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں جائز ہے البتہ غیر مسلم کو پاک صاف ہونا ضروری ہے بحالت جنابت مسجد میں نہیں آسکے گا۔ غرض قاضی کو حکم ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر فیصلے کرے۔ اسی میں اجلاس قائم کرو اور گواہ بھی وہاں ہی آویں البتہ سزا وغیرہ فرش مسجد سے جدا ہونی چاہیے۔ مسجد میں کسی کو سزا نہ دی جاتے۔ شریعت نے اس کو دین کا کام قرار دیا ہے اور واقعی یہ دین کا بڑا کام ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ خلقت کو نفع پہنچایا جاوے۔

اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حکومت دین کا کام ہے جب تو اس کے لیے جامع مسجد تجویز کی گئی ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کرنا کھیل نہیں ہے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے کہ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور حکومت کا شوق میں نے ایک نواب زادے کو دیکھا کہ وہ پانچ سو روپیہ ماہوار گھر سے منگاتے تھے اور بے تنخواہ کے ڈپٹی تھے۔

تو اجلاس پہ پہرہ چوکی بٹھانا حاکم کو اس لیے جائز نہیں کہ اس کی مجلس عام ہونی چاہیے تاکہ تمام مخلوق اپنی مصیبت بیان کر سکے۔ ایک قسم کی تو یہ مجلس ہے اس میں استیذان کی ضرورت نہیں۔

ایک مجلس تنہائی کی ہوتی ہے جو ذاتی کام پورے کرنے کے لیے ہوتی ہے جیسے امیروں کی آرام گاہ کہنی چاہیے اور غریبوں کا گھر۔ اس میں جانے کے لیے استیذان کی ضرورت ہے بلا اجازت کے جانا جائز نہیں البتہ اگر قرائن سے اجازت معلوم ہو جائے تب بھی جانا جائز ہے۔ اس صورت میں صاحب مکان کو پورا

اختیار ہے کہ جس کو چاہے آنے دے اور جس کو چاہے روک دے اور یہ حکم ہے کہ اگر اجازت نہ دے تو بلا ملے ہوئے واپس ہو جاؤ۔

تو یہ مسئلہ شریعت کا ہے مگر مسلمان اس سے بالکل واقف نہیں اور اس کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور اگر کوئی اس پر عمل کرے تو اس کو صاحب بہادر سمجھا جاتا ہے۔ ہم لوگوں کی بے توجہی کی یہ حالت ہے کہ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونا ہی اسلام ہے اور یہی کافی ہے کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں اور یہ مرض عورتوں میں زیادہ ہے کیونکہ مرد تو کچھ لکھنے پڑھنے بھی ہیں۔ بہت سی باتیں معلوم کر لیتے ہیں۔ نیز اکثر علماء سے ملتے رہتے ہیں۔ بہت سی باتیں کانوں میں پڑتی رہتی ہیں مگر عورتوں کو سوائے کھانے پکانے کے کسی چیز کی خبر نہیں۔ اگر ہے تو صرف نماز کی ہے۔ جو نماز پڑھتی ہے وہ سب کچھ ہے۔ جو حج بھی کر لے وہ تو اپنے وقت کی رابعہ بصریہ ہے اور جو زیور کی زکوٰۃ بھی دینے لگے تو اس کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ غرض ان کو بجز معدودے چند باتوں کے اور کسی چیز کی خبر نہیں۔

ایک اہم کوتاہی

حق تعالیٰ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں کہ دین کیا چیز ہے۔ آیا مسلمان کہلانا یا مسلمان کہلا کر چند اعمال کر لینا ہی اسلام ہے یا اور بھی ضروری ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ

وَالصَّائِمِیْنَ وَالصَّائِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰکِرِیْنَ اللّٰهَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا۔

میں اس کا ترجمہ کیے دیتا ہوں کہ

اسلام والے مرد اور اسلام والی عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور تھامنے والے مرد اپنی شہوت کی جگہ اور تھامنے والی عورتیں اور یاد کرنے والے مرد اللہ کو بہت اور یاد کرنے والی عورتیں، تیار کی ہے خداوند تعالےٰ نے اُن سب مرد و عورتوں کے لیے مغفرت اور اجر بڑا۔

اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے مگر ہر عمل کے دو درجے ہوتے ہیں ایک ظاہری ایک باطنی۔ اسی طرح اسلام زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے اور اس کا دل سے ماننا یہ ایمان ہے۔ تو اسلام اقرار ہوا اور ایمان تصدیق قلبی یہ تو سب سے مقدم شرط ہے کہ اقرار توحید و رسالت زبان سے کرے اور دل میں اس کی تصدیق ہو کیونکہ یہ اصول میں سے ہے اس کو تو سب جانتے ہیں۔ اس لیے اس کے متعلق اس وقت زیادہ بیان کی ضرورت نہیں۔ البتہ اعمال میں آج کل کوتاہیاں

کی جا رہی ہیں۔ اُن کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

بہت سے لوگوں نے یہ یاد کر لیا ہے کہ من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ کہ جو کوئی لا الٰہ الا اللہ کہہ دے وہ جنتی ہو گیا۔ بس اُس کو کسی کام کی ضرورت نہیں۔ بعض تو یہاں تک گمراہ ہوئے کہ محمد رسول اللہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں جانتے۔ دھوکا اس سے ہوا کہ اس مقام پر صرف لا الٰہ الا اللہ مذکور ہے لوگ یہ سمجھے کہ اتنا ہی کہنا مقصود ہے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک نوخواندہ شخص کو میں نے پانچ سو مرتبہ لاحول پڑھنے کو خط میں بتلایا اور اتفاق سے میں رام پور گیا کہ وہ وہاں ہی رہتے تھے۔ تو اُس نے کہا کہ میں بتلایا ہوا پڑھتا ہوں مگر ابھی میرا کام نہیں ہوا میں نے پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو۔ تو آپ کہتے ہیں کہ لاحول لاحول پڑھا کرتا ہوں۔ میں نے اس پر کہا کہ بندۂ خدا لاحول سے مراد کیا فقط لاحول تھی۔ تو جیسے یہ شخص لاحول سے صرف لاحول پڑھنا سمجھا ایسے ہی بعض بے وقوف لا الٰہ الا اللہ سے صرف اتنا ہی پڑھنا سمجھے حالانکہ مقصود اتنا نہیں ہے بلکہ پورا کلمہ ہے مع دیگر شرائط کے۔

اور دیکھئے اگر کوئی کہے کہ یٰسین پڑھنے سے دس قرآن کا ثواب ملتا ہے کیا اس کے یہ معنی کئے جاویں گے کہ صرف لفظ یٰسین سے اتنا ثواب ملتا ہے۔ میں نے حکیم عبدالمجید صاحب کو دیکھا ہے کہ نسخہ لکھوانے کے وقت شاگردوں کو صرف ایک دو جزو بتلا دیتے تھے اور مراد پورا نسخہ ہوتا تھا۔

تو یہ تو رات دن کا ہمارا ہی محاورہ ہے کہ بولنے میں اختصار کر کے پوری

بات مراد ہوتی ہے۔ پھر نہ معلوم اس محاورہ سے دین میں کیوں کام نہیں لیا جاتا اور من قال لا الہ الا اللہ سے محمد رسول اللہ کو کس طرح خارج سمجھ لیا گیا ہے اور جو لوگ پورا کلمہ مراد بھی لیتے ہیں اُن سے یہ شکایت ہے کہ وہ عمل کو ضروری نہیں سمجھتے جس کا یہ اثر ہے کہ صرف کلمہ پڑھ کر یہ لوگ کسی چیز سے نہیں رکتے۔ نہ چوری سے نہ زنا سے کیونکہ گمان یہ ہے کہ محض کلمہ پڑھ لینا مغفرت اور جنت کے لیے کافی ہے۔ اس خیال کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ نے ایک بڑی فہرست ہم کو بتلائی ہے اُس کو کہاں حذف کر دیا گیا۔ مجھے اس وقت اسی کا بیان کرنا زیادہ مقصود ہے۔

اشاعتِ اسلام کا سبب

دین کے بہت سے اجزاء ہیں۔ لوگوں نے جو اس کا انحصار کر لیا ہے۔ یہ اُن کی غلطی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان زیادہ بدنام ہیں کیونکہ ناواقف غیر مذہب والا یہ سمجھتا ہے کہ جیسے ان کے اعمال ہیں شاید یہی مذہب اسلام کی تعلیم بھی ہے۔ ہماری وہ حالت ہے کہ اس کو دیکھ کر غیر مذہب والے اسلام سے نفرت کرنے لگے۔ کیونکہ ہر مذہب کے لوگ اُس مذہب کے معبر ہوتے ہیں۔ دیکھنے والا آدمیوں کے افعال سے مذہب کی عمدگی یا خرابی پر استدلال کیا کرتا ہے۔

چنانچہ اہل یورپ نے بہت سے دھبے اسلام پر لگائے ہیں جس کا سبب یا عناد ہے یا ناواقفی۔ کہ اُنہوں نے ظالم سلاطین کے طرز و عمل کو یا ہمارے افعال و اخلاق کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ اسلام کی یہی تعلیم ہے۔ صاحبو! کوئی ہمارے

خلفائے راشدین کو دیکھے اور آج کسی جگہ ہمیں اُن کی نظیر دکھا دے۔ اخلاق میں، سیاست میں، عدل و انصاف میں، انشاء اللہ تعالیٰ مخالف اگر انصاف سے بتلائے تو ہرگز اُن کی نظیر نہیں دکھا سکتا۔ اور ہماری صفات کا جیسے یہ اثر ہے کہ اسلام پر الزام لگتا ہے، اُن حضرات کی صفات کا یہ اثر تھا کہ اسلام محبوب ہو کر پھیلتا جاتا تھا۔ اور یہی اصلی سبب ہے اشاعتِ اسلام کا۔

اہل یورپ کا یہ خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کے زور سے کام لیا گیا ہے اور اس کے لئے دلیل میں واقعاتِ جنگ، وہ پیش کرتے ہیں کہ سلاطین اسلام نے کس قدر خونریزیاں کی ہیں۔ میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ یہ تو کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ جنگ مطلقاً تمدن کے خلاف ہے۔ آج متمدن قومیں بھی ضرورت کے وقت جنگ کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بروقتِ ضرورت لڑائی کرنا تہذیب و تمدن کے اعتبار سے جائز ہے۔ پس اب میں ظالم سلاطین کی طرف داری تو نہیں کرتا البتہ خلفائے راشدین کی بابت دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انہوں نے بنا ضعیف پر کبھی جنگ نہیں کی۔ کسی قوی سبب کی بناء پر وہ لڑائی کرتے تھے۔ اور لڑائی کے متعلق اسلامی قانون اگر مخالفین کی نظر سے گزرا ہوتا تو کبھی یہ لفظ زبان سے نہ نکالتے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔

قوانین جنگ اسلام نے بہت سے بتلائے ہیں مگر میں اس وقت ایک مختصر قانون بیان کرتا ہوں۔ اسلام کا مسئلہ ہے اور خلفاء راشدین کا ہمیشہ اسی پر عملدرآمد رہا ہے کہ اگر کوئی شخص مقابلہ کے وقت تمہارے باپ کو تمہارے بیٹے کو تمہارے بھائی کو، غرض سب متعلقین کو قتل کر ڈالے اور عرصہ تک

خونریزی کرتا رہے۔ پھر کسی وقت قابو میں آجائے اور تم اُس سے بدلہ لینا چاہو اور وہ زبان سے لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کہہ دے تو حکم ہوتا ہے کہ اُس کو فوراً چھوڑ دو۔ اگرچہ تم کو یقین کامل ہو کہ اُس نے جان کے خوف سے کہا ہے اور دل سے اسلام نہیں لایا۔ تب بھی فوراً تلوار اٹھالو۔ ورنہ اگر اس کو مارا گیا تو تم جہنم میں جاؤ گے اگرچہ یہ بھی خطرہ ہو کہ یہ اس وقت جان بچاکر پھر تم کو قتل کر دے گا۔ جو کچھ چاہے ہو اب اُس کا مارنا ہرگز جائز نہیں۔

توجس مذہب نے اتنی بڑی سپر دوسروں کے ہاتھوں میں دے دی ہے اب بھی اُس کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ بزورِ شمشیر پھیلا ہے اور اس قانون پر ہمارے سلف صالحین پوری طرح عمل کرتے تھے۔

ہرمزان نے مسلمانوں کو بہت سی ایذائیں پہنچائی تھیں۔ آخر حضرت عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ کے پاس گرفتار کرکے لایا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس پر اسلام پیش کیا مگر اُس نے نہ مانا۔ آپ نے اُس کے قتل کا حکم دیا۔ اُس نے ایک چال چلی کہ حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ آپ مجھے قتل تو کرتے ہی ہیں، تھوڑا پانی منگا دیجئے آپ نے پانی منگایا۔ اُس نے پانی گرادیا[لہ] اور کہا کہ میں کیا خاک پانی پیوں۔ سر

لہ شاید یہ قصہ اس طرح جامع مرحوم نے کہیں دیکھا ہوگا۔ مرحوم کو کتب بینی کا شوق تھا مگر میں نے اپنے وعظ میں اس کو دوسری طرح بیان کیا تھا کہ جب پانی آیا تو اُس نے کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ میں پانی نہ پی چکوں اور جلاد مجھ پر تلوار چلادے۔ آپ نے فرمایا نہیں!

(بقیہ حاشیہ برصفحہ ۳۲۱)

پر تو تلوار کستی ہوئی ہے۔ آپ نے تسلی کے لئے فرمایا لا باس علیک (کچھ خوف نہ کرو) کہ تم اطمینان سے پیو ڈرو نہیں۔ اس کے بعد جو پانی آیا تو اس نے اس کو اطمینان سے پیا اور کہا کہ امیر المومنین! اب آپ مجھ کو قتل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اب آپ مجھ کو امن دے چکے ہیں۔ آپ مجھ سے فرما چکے ہیں کہ لا بأس علیک کہ کچھ خوف نہ کرو۔ اور یہ کلمہ امن کا ہے اور میں نے آپ کا پانی پیا ہے تو میں آپ کا مہمان ہو چکا ہوں۔ آپ نے انکار فرمایا کہ نہیں میں نے تم کو امن نہیں دیا۔ صرف پانی پینے کی اجازت دی تھی۔ مگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ہرمزان کی تائید کی کہ واقعی آپ نے اس کلمہ سے امن دے دیا ہے اگرچہ نیت نہ ہو۔ چنانچہ پھر حضرت عمرؓ اس کو قتل نہیں کر سکے اور فرمایا کہ مجھ کو ایک فارسی نے آج دھوکا دے دیا۔

ہرمزان کو اپنی چال پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ حضرت عمر امن کا کلمہ کہہ کر پھر ہرگز قتل نہ کریں گے۔ آخر حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا کہ جاؤ تم آزاد ہو۔ یہ واقعہ دیکھ کر ہرمزان فوراً اسلام لے آیا کہ واقعی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۲۰) جب تک تم پانی نہ پی چکو گے قتل نہ کئے جاؤ گے یہ سن کر اس نے فوراً پانی زمین پر پھینک دیا اور کہا اب مجھ کو آپ قتل نہیں کر سکتے کیونکہ اس پانی کا پینا اب ممکن نہیں اور اس کے پینے تک مجھ کو امن تھا۔ آپ نے اس کو آزاد کر دیا۔ یہ مجھ کو بھی یاد نہیں کہ میں نے یہ قصہ کہاں دیکھا ہے۔ واللہ اعلم ۱۲۔ اشرف علی۔

یہ دین برحق ہے جس میں مخالف کے ساتھ بھی اتنا سلوک کیا جاتا ہے کہ بلا قصد بھی کلمۂ امن کہہ دینے سے اُس کی جان بچ جاتی ہے اور اُس کو پھر کوئی قتل نہیں کر سکتا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے اور اس پر خلفاء نے اس طرح پابندی کی ہے کہ ان کی نظیر آج کوئی دکھا نہیں سکتا۔ ہاں پچھلے بادشاہوں کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ اگر انہوں نے ظلم کیا ہے بھگتیں گے۔ ہمارے اسلاف نے ان قوانین پر پورا عمل کیا اور ان کو ترقی و عروج بھی ایسا نصیب ہوا کہ جو کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ صحابہ کے طرز عمل کا دوسری قوموں پر ایسا اثر تھا کہ بہت لوگ جاسوس بن کر آئے مگر ان حضرات کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ ایک یہودی نے چرا لی تھی۔ آپ نے اپنے قاضی شریح کے یہاں اس پر دعوےٰ کیا۔ قاضی نے گواہ طلب کئے، تو حضرت علیؓ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور امام حسن رضی اللہ عنہ کو پیش کیا۔ شریح نے حضرت حسنؓ کی گواہی قبول نہ کی کیونکہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول نہیں ہوتی اور مقدمہ یہودی کے موافق فیصل ہوا۔

اس پر یہودی فوراً اسلام لے آیا کہ واقعی یہ دین حق ہے جس میں خلیفہ کے مقابلہ میں ایک رعیت کا یہودی مقدمہ جیت سکتا ہے۔ اس پر میں کہتا ہوں کہ ہمارے اسلاف تو ایسے تھے کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کو اسلام کی طرف رغبت ہوتی تھی۔

اسلام سے نفرت کا سبب

ہم ایسے ہیں کہ ہم کو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے اور وجہ اس کی احکام سے بے خبری ہے اور عمل میں کوتاہی کہ سوائے نماز روزہ کے اور کسی چیز کو جزو اسلام نہیں سمجھتے۔ جب نماز پڑھ لی تو سمجھتے ہیں کہ بزرگ ہو گئے ہیں۔ میں تو اکثر کہا کرتا ہوں کہ آج کل محکمۂ کیمیائی کو ترقی ہے۔ ہر چیز کی روح اور ست نکالا جا رہا ہے۔ ہمارے بھائیوں نے دین کا بھی ست نکالا۔ گورنمنٹ نے آزادی دے رکھی ہے۔ ہر ایک کی ہمت بڑھ گئی ہے جو چاہے کرتا ہے حالانکہ مناسب تو یہ تھا کہ اس آزادی سے نفع حاصل کرتے مگر یہ الٹا اپنا گھر ڈھاتے ہیں۔ گورنمنٹ تو کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیتی اور یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ اسکولوں کے لڑکے زیادہ بے دین نہیں ہوتے جتنے مسلمانوں کے کالجوں کے لڑکے بے دین ہوتے ہیں کیونکہ گورنمنٹ اسکول میں مذہبی گفتگو نہیں ہوتی اور کالجوں میں تو ہر شخص نماز روزہ میں عیب نکالتا ہے۔ ایک خبیث نے نماز کے ترک پر لوگوں کو ترغیب دی تھی اگرچہ بعد میں سیکرٹری نے اس کو نکال دیا۔ مگر بعض سرزمین میں اثر ہے کہ مذہب سے لاپروائی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے میں یہ رائے دیا کرتا ہوں کہ ایسے کالجوں میں لڑکوں کو نہ بھیجا جائے۔

تو آج کل مسلمانوں نے مذہب کا بھی ست نکال لیا ہے کہ نماز روزہ تسبیح کا نام اسلام ہے۔ میں نے بہت لوگ دیکھے ہیں کہ لمبی تسبیح ہاتھ میں رکھتے ہیں اور سود لیتے ہیں اور دو دو مرتبہ مالگذاری وصول کرتے ہیں اور پھر اچھے

خالص مسلمان کے مسلمان ہیں۔ تو آج کل ثقاہت تسبیح کا نام ہے۔ جھوٹ بولتے ہیں اور رشوت لیتے ہیں، زمین دوسروں کی دبا لیتے ہیں، لڑکیوں کا حق نہیں دیتے۔ بہن پھوپی کا حق لے کر ادا نہیں کرتے اور پھر نیک کے نیک ہیں آج کل نیکی بڑی سستی چیز ہو گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگوں نے واقعی دین کا بھی ست اور خلاصہ نکال لیا ہے۔ بہت سی چیزوں کو دین سے نکال دیا ہے اس آیت میں اسی بات کو حق تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ دین کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ فرماتے ہیں۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ۔

یعنی بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں۔

معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان کے بعد صفت قنوت بھی ضروری ہے۔ جس کے معنی ہیں اطاعت یا عاجزی کے۔ اگر پہلے معنی ہیں تو مراد یہ ہے کہ تمام احکام میں اطاعت کرتے ہیں اور اگر اس کے معنی عجز کے ہیں تو یہ قلب کی اطاعت کا بیان ہو گا۔ جس میں ایک بڑے بھاری گناہ کا علاج ہے، جو تمام کبائر کی جڑ ہے یعنی تکبر بلکہ تمام مفاسد دینی اور دنیوی کی جڑ ہی کبر ہے غصہ اور غیبت اور حسد غرض تمام بُرے اخلاق اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً کسی چمار کو بادشاہ سے حسد کرتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا ہوگا کیونکہ وہ غریب اپنے کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ بادشاہی کی آرزو کرے۔ جو لوگ اپنے آپ کو بادشاہی کے لائق اور قابل سمجھتے ہیں، وہی بادشاہوں سے حسد کر سکتے ہیں۔ اسی کا نام تکبر ہے کہ اپنی طرف کسی کمال کو منسوب سمجھے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے ان تمام مفاسد دینی اور تمدنی کی اصلاح کے لئے تواضع اور عاجزی کی تعلیم دی ہے اور تواضع صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ زبان سے اپنے آپ کو برا بھلا کہہ لے بلکہ تواضع تو یہ ہے کہ دل میں اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے۔

ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں قحط سالی ہوئی لوگ دعا کے لئے حاضر خدمت ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ ذوالنون کو شہر سے باہر نکال دو بارش ہو جائے گی۔ اس کے گناہوں کی وجہ سے یہ وبال لوگوں پر آیا ہے اور رونے لگے۔

آج کل اول تو اس طرف کسی کا ذہن ہی نہیں جاتا کہ قحط گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر جاتا بھی ہے تو دوسروں کے گناہوں پر نظر کرے گے۔ اور اگر کوئی اللہ اللہ کرتا ہو تو خدا جانے اس کا تو کہاں دماغ ہوگا۔ جہاں کسی نے اس کی مخالفت کی تو کہتا ہے کہ دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ خدا کا غضب نازل ہوگا۔ ارے بھائی! انبیاء کو تکلیف پہنچا کر تو فوراً عذاب ہوا ہی نہیں تم ذرا سے نماز روزہ کر کے کیا لوگوں کو دھمکاتے ہو۔ اپنی خبر لو۔

اصلاح نفس کی تدابیر

اپنے نفس کی اصلاح کرو۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ تواضع پیدا کرو اور جی چاہتا ہے کہ تواضع حاصل کرنے کی تدبیر بھی بتلادوں۔ اس کی دو تدبیریں ہیں۔ ایک تو آسان ہے ایک مشکل۔ آسان تو یہ ہے کہ کسی وقت بیٹھ کر اپنے عیوب اور دوسرے کے کمالات کو سوچا کرے۔ اور دوسرا اس سے مشکل ہے وہ یہ ہے کہ جس کو اپنے سے کم سمجھتا ہے اُس کی تعظیم کرے، اُس کی جوتیاں سیدھی کرے اور اصل بات تو یہ ہے کہ تواضع پوری طرح اس دوسرے طریق سے حاصل ہوگی ؎

قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دمِ بے قدم
(عمل کی راہ چلنا چاہیے نہ دعویٰ کی کہ دعویٰ بغیر ثبوت کے کچھ حقیقت نہیں رکھتا)

کارکن کار، بگذر از گفتار کاندریں راہ کار دارد کار
(یعنی باتیں بنانی چھوڑ دو، کام میں لگو۔ اس لیے کہ اس راہِ سلوک میں کام ہی مقصود ہے۔)

ہم کو باتیں بنانی تو بہت آتی ہیں مگر صرف باتوں سے کام نہیں چلتا کچھ کرنا بھی چاہیے۔ اپنے سے چھوٹے کی تعظیم کرو تب یہ خناس دل سے نکلے گا۔ اور عورتوں میں تو یہ مرض تکبر کا مردوں سے بھی زیادہ ہوتا ہے، گو یہ کچھ نہیں کر سکتیں کیونکہ ان کی حکومت کچھ نہیں ہے مگر جب کہیں جائیں گی، زیور کو ظاہر کریں گی۔ یہاں تک کہ اگر جھومکوں پر کسی کی نگاہ نہ پہنچی ہو، تو کان کھجلانے

کے بہانہ سے دوپٹہ کانوں پر سے ہٹا دیں گی اور سب کی سب ایک ہی مذاق کی ہیں۔ زیور کی کپڑوں کی فہرست سب کو زبانی یاد ہے۔ غرض ہر چیز پر ان کی نظر ہوتی ہے اور یہ سب تکبر ہے جو خدا کو ناپسند ہے۔ اس لئے عورتوں کو بھی فرماتے ہیں وَالْمُتَوَاضِعَاتِ (اور تواضع کرنے والی عورتیں) عورتوں کو تواضع حاصل کرنے میں زیادہ کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ کمزور کا تکبر اور بھی زیادہ بُرا ہے۔

آگے فرماتے ہیں وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ (اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں)۔ یہ بھی آج کل بہت بڑا مرض لوگوں میں ہوگیا ہے کہ بات بات میں جھوٹ بولتے ہیں اور اگر کبھی سچ بھی کہیں گے، تو کسی قدر نمک مرچ لگا کر، خصوصاً اگر کوئی عجیب مضمون ہو تو اس پر تو جب تک حاشیہ نہ لگا دیں اس وقت تک چین ہی نہیں آتا۔ مگر یہ بہت بڑا مرض ہے اس سے دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے انسان خدا کے یہاں کذابین میں شمار ہو جاتا ہے۔

وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ (اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں) خشوع کہتے ہیں سکون کو۔ یہ شامل ہے قلب کو اور جوارح دونوں کو اس کو جمعیت قلب و جوارح کہتے ہیں۔ مثلاً نماز میں خشوع ضروری ہے یعنی دل بھی ساکن ہو کہ خیالات اِدھر اُدھر پریشان نہ ہوں۔ اور اعضاء بھی ساکن اور پست ہوں اور دوسرے اوقات میں خشوع اس طرح ہوتا ہے کہ تواضع کے ساتھ سکون اور وقار ملا ہو، چھچھوراپن نہ ہو۔ بعض لوگ تواضع کے چھچھورے ہو جاتے ہیں۔ حق تعالےٰ اس کو منع فرماتے ہیں کہ تواضع کے ساتھ سکون اور وقار

بھی چاہیے۔

وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرَاتِ اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔ اس میں صبر کی تعلیم ہے۔ صبر اس کو نہیں کہتے کہ کوئی مر جائے تو روئے نہیں۔ رونا تو جائز ہے۔ صبر کہتے ہیں نفس کو اس کی ناگواری پر مستقل رکھنے کو۔ مثلاً کسی نے بری بات کہی تو ہم اس کا انتقام نہ لیں۔ سخت و سست نہ کہیں یہ تو صبر ہے عادات میں اور تکوینیات میں صبر اس کا نام ہے کہ اگر کوئی مر جائے یا مال چوری ہو جائے یا بیماری پیدا ہو جائے تو جزع و فزع نہ کریں اور عبادات میں صبر یہ ہے کہ گو عبادت میں حظ اور مزہ نہ آئے مگر عبادت کرتے رہیں اس وقت لوگ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں کہ مزہ کے طالب ہیں معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نہیں۔ اگر عاشق ہوتے تو ان کو لذتِ عشق ہی کافی ہوتی کسی مزہ کے طالب نہ ہوتے۔ بعض دفعہ لذتِ عشق ایسی بڑھ جاتی ہے کہ عاشق کو محبوب کے وصال کی بھی پرواہ نہیں رہتی۔

ایک عاشق کا قصہ ہے کہ آخر میں جب اس کا محبوب اس پر رحم کر کے ملنے گیا تو عاشق نے اس سے کہا (اِلَیْکَ عَنِّیْ فَاِنَّ حُبَّکَ قَدْ شَغَلَنِیْ عَنْکَ) بس اب دور رہو مجھے تیری محبت نے تجھ سے مشغول کر دیا ہے۔ مگر یہ حال عشق مجازی میں ہو سکتا ہے۔ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ خدا کی محبت بھی کبھی نعوذ باللہ ایسی ہو سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ سے بے پرواہ کر دے۔

اس کا راز یہ ہے کہ محبوب حادث سبب حدوث محبت کا ہے نہ کہ بقاء محبت کا۔ تو محبوب حادث کی محبت بدون اس کے باقی رہ سکتی ہے کیونکہ بقاء

میں اس کو دخل نہیں اور محبوب قدیم خداوند جل جلالہٗ وعم نوالہٗ کی ذات جیسے سبب حدوث محبت ہے سبب بقاء محبت بھی ہے۔ اس لئے محب خدا کبھی اس سے بے پروا نہیں ہو سکتا۔ اور اس سے یہ راز بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ غیر اللہ کے عشق کو عشق مجازی اور خداتعالیٰ کی محبت کو عشق حقیقی کیوں کہتے ہیں۔ حقیقی اور اصلی محبت وہی ہے جس میں کسی وقت محبوب سے استغناء نہ ہو سکے اور وہ محبت نام کی محبت ہے جس میں محبوب سے استغناء ہو سکتا ہے۔

مگر اس سے کوئی یہ قیاس فاسد نہ کرے کہ عشق مجازی میں تو لذت چونکہ بہت ہوتی ہے یہاں تک کہ کبھی محبوب سے بھی بے پروائی ہو جاتی ہے اس لئے صاحب عشق مجازی کو کسی دوسرے مزہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ صرف عشق کا مزہ کافی ہو جاتا ہے۔ اور عشق حقیقی میں چونکہ کبھی محبوب سے استغناء ممکن نہیں یہ علامت اس کی ہے کہ اس میں لذت کم ہے۔ اس لئے صاحب عشق حقیقی علاوہ لذت عشق کے دوسرے لذات کو طلب کر سکتا ہے۔ تو عاشق حقیقی کو یہ رائے دینا صحیح نہ ہوا کہ اور لذات کا طالب نہ ہو؟

سو یہ خیال اس لئے غلط ہے کہ جب یہ بات مسلّم ہے کہ عشق حقیقی تمام چیزوں سے مستغنی کر دیتا ہے بجز محبوب جل وعلا کے، تو جب لذات معاذ اللہ غیر خدا ہیں تو اُن کے مطلوب ہونے کی گنجائش کہاں رہی۔ اُن کے درپے ہونا یقیناً غیر اللہ کی طرف توجہ کرنا ہے جو علامت ہے نقصان محبت کی۔ جو لذت کا طالب ہے وہ خدا کا طالب نہیں۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

روزہا گر رفت گو رو باک نیست　　تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

(یعنی ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیے۔ اگر گئے بلا سے گئے۔ عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک و صاف ہے اس کا رہنا کافی ہے۔)

بس زبوں وسوسہ باشی دلا گر طرب را باز دانی از بلا

(تم بالکل مغلوب وساوس سمجھے جاؤ گے۔ اگر محبوب کے طرب و بلا میں فرق سمجھو گے۔)

حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(وصل و فراق کوئی چیز نہیں، محبوب کی رضا طلب کرو۔ اس لئے کہ محبوب سے اس کی رضا کے سوا دوسری چیز طلب کرنا افسوس کی بات ہے۔)

غرض مزے کا طالب نہ ہو۔ کام کئے جائے مزہ حاصل ہو یا نہ ہو اپنے معمولات کا پابند رہے تو صبر کی ہر جگہ ضرورت ہے بلکہ ہر بات میں ضرورت ہے۔ کیونکہ طبیعت کے خلاف بہت باتیں پیش آتی ہیں جن پر تحمل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً کھانا سامنے آیا اور نمک ٹھیک نہیں تو اب گھر والوں پر تشدد نہ کرنا چاہیے۔ صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ کوئی ملاقات کے لئے آیا ہے اور اس سے کوئی ناگوار بات صادر ہوئی یہ بھی صبر کا موقع ہے۔

(والمتصدقین والمتصدقات اور صدقہ دینے والے مرد اور عورتیں

صدقہ کا حکم اس لئے فرمایا کہ بعض لوگوں کی نسبت و محبت زبانی ہوتی ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست — ورزر طلبی سخن دریں ست

(یعنی اگر جان مانگو تو مضائقہ نہیں ہے اور اگر مال مانگو تو اس میں کلام ہے۔)

زبان سے بہت دعوے کرتے ہیں مگر محبوب کے نام پر خرچ کرتے ہوئے جان نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا سے محبت ہی نہیں ہے۔ اگر محبوب مجازی گھر مانگتا ہے تو دے دیتے اور کچھ بھی گھر باہر کی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ کیسی خدا کی محبت ہے کہ خدا کے نام پر خرچ کرنے میں باوجود وسعت کے سوچتا اور تامل کرتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ خیر خیرات بھی کرتے رہا کرو تاکہ دنیا کی محبت دل سے کم ہو۔ آج کل ہماری تو یہ کیفیت ہے کہ اگر خرچ کرتے ہیں تو ناموری کی جگہ پر۔ نیک مصرف میں شاید ہی کسی کا پیسہ خرچ ہوتا ہوگا۔ اور جو نیک مصرف میں خرچ بھی کرتے ہیں تو بہت سے مصارف میں سے ایسا مصرف اختیار کریں گے۔ جس میں فخر و مباہات ہو۔ یہ آج کل کے دینداروں کی کیفیت ہے۔ اخلاص تو آج کل بالکل رہا ہی نہیں —— الا ماشاء اللہ!

میں نے ایک مخلص کی حکایت سنی ہے کہ وہ ایک عالم کے وعظ میں آئے اور ایک ہزار روپیہ کا توڑا اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ لوگوں نے ہر طرف سے تعریف کرنی شروع کی۔ اُنہوں نے جو دیکھا کہ ہر طرف سے تعریف ہونے لگی اور دل میں اخلاص نہیں رہا تو تھوڑی دیر میں پھر آیا اور

کہا کہ مولانا وہ روپے میری والدہ کے بھیجے واپس کر دیجئے۔ اپنی لوگوں نے اُسے بہت ہی بُرا بھلا کہا کہ علماء سے تمسخر کرتا ہے۔ مولوی صاحب نے روپے واپس کر دیئے۔ جب وعظ کی مجلس ختم ہو چکی اور مولوی صاحب اپنے گھر پہنچے تو وہ شخص اُن کے مکان پر پہنچا اور عرض کیا کہ مولانا میں نے آپ کو بہت ستایا اور بہت تکلیف دی۔ وہ ہزار روپے میرے ہی بھیجے ہیں اس وقت پیش خدمت کرتا ہوں۔ اُس وقت چونکہ لوگوں کی تعریف کی وجہ سے اخلاص میں کمی ہوتی تھی اس لئے میں نے واپس کر لئے جس پر لوگوں نے مجھے خوب بُرا بھلا کہہ لیا اور نفس کی اصلاح ہو گئی۔ اب تنہائی میں یہ روپیہ لے کر حاضر ہوا ہوں ان کو قبول کیجئے خلوص اس کا نام ہے۔ تو صاحبو! صدقات میں اخلاص ضروری ہے۔

آگے فرماتے ہیں وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ الآیہ اور روزہ رکھنے والے مرد اور عورتیں یعنی اسلام کے لئے ایک اور بھی جزو ہے روزہ رکھنا۔ عورتوں کے اندر یہ تو کمال ہے کہ وہ روزہ بہت شوق سے رکھتی ہیں اور کچھ بہت کمال بھی نہیں کیونکہ ان میں رطوبت زیادہ ہوتی ہے اس لئے بھوک پیاس کم لگتی ہے۔ اس بارہ میں مرد زیادہ ہیٹے ہیں۔ بہت لوگ روزہ نہیں رکھتے اور بعض تو ایسے بے حیا ہوتے ہیں کہ کھلم کھلا سب کے سامنے حقہ اور پان کھاتے پھرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ جب خدا کی چوری نہیں تو مخلوق کی کیا چوری میں کہتا ہوں کہ پھر بیوی کے ساتھ بھی سب کے سامنے ملا کرو کہ جب خدا کی چوری نہیں تو مخلوق کی کیا چوری۔ ان لوگوں کی شرم جاتی رہی خدا کا خوف نہیں رہا۔ روزہ کا توڑنا تو گناہ تھا ہی سب کے سامنے توڑنا بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ اس

سے کھلم کھلا خدا کی مخالفت ہوتی ہے۔ دوسروں کی جرأت بڑھتی ہے۔ تو پہلے مرض لازم تھا اب مرض متعدی ہو گیا۔

آگے ارشاد ہے وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ اور اپنے شرم گاہوں کو حرام سے بچانے والے مرد اور عورتیں۔ شرم گاہوں کا حرام سے بچانا تو عقلاً بھی ہر شخص ضروری سمجھتا ہے اور شریعت نے بھی اس کو فرض کیا ہے اور زنا کو سب برا جانتے ہیں اور شریعت نے بھی اس کو حرام کیا ہے۔ مگر لوگوں نے زنا اسی کو سمجھ رکھا ہے جو مباشرت کے ساتھ ہو۔ حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ سے بھی زنا ہوتا ہے، ہاتھ سے بھی زنا ہوتا ہے، قلب سے بھی ہوتا ہے، کان اور پیر سے بھی ہوتا ہے۔ آنکھ کا زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کو بری نیت سے دیکھے۔ ہاتھ کا زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کو ہاتھ لگائے۔ کان کا زنا یہ ہے کہ اجنبی عورت کی باتیں سنے۔ اُس کی طرف چل کر جانا یہ پیر کا زنا ہے۔ دل میں کسی اجنبی عورت کی محبت اور تصور سے مزہ لینا یہ دل کا گناہ ہے۔ مسلمان شخص کو ان تمام گناہوں سے بچنا چاہیئے کیونکہ یہ بھی اسی زنا کے مثل ہیں اور اس کی حفاظت پوری طرح پردہ سے ہوتی ہے مگر سخت افسوس ہے کہ آج کل کے نوجوان اس کو بھی اٹھا دینا چاہتے ہیں مگر یہ اُن کی بڑی بھاری غلطی ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو بڑی سخت دشواری پیش آئے گی۔

ذکر اللہ کی اہمیت

ان سب کے بعد ارشاد فرماتے ہیں وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ۔ یعنی اور وہ لوگ جو

خدا تعالیٰ کو بہت یاد کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو خدا کو بہت یاد کرتی ہیں۔ گویا اب تک جتنی باتوں کا بیان تھا، وہ سب بمنزلہ درختوں کے ہیں اور یہ اُن کے لئے پانی ہے کہ یہ سب درخت ایمان و اسلام و قنوت و خشوع و صدقہ و عفت کب بارآور ہو سکتے ہیں جب کہ اُن کو خدا تعالیٰ کی یاد کا پانی پلایا جائے اور یہ تجربہ ہے کہ آدمی کتنا ہی بڑا نیک کیوں نہ ہو مگر اس میں پختگی اسی وقت آتی ہے جب ذکر اللہ بھی کرتا ہو۔ اور اس کے بغیر ایسی مثال ہے جیسے بے جڑ کا پھول کہ اس وقت تو تر و تازہ ہے مگر تھوڑی ہی دیر میں کملا جائے گا۔

اس لئے ذکر اللہ کا اہتمام مرد عورتیں سب کریں۔ چوبیس گھنٹہ میں ایک ہی دفعہ کچھ کر لیا کریں اس سے خدا کا قرب ہوتا ہے اور خدا کے قرب کی ایسی مثال ہے جیسے بجلی کا قرب کہ جہاں گرتی ہے مکان کو منور کر دیتی ہے اور اپنی کڑک سے تمام خس و خاشاک کو جلا دیتی ہے۔ اسی طرح ذکر اللہ سے جب قرب خداوندی حاصل ہوتا ہے تو دل منور ہو جاتا ہے اور تمام فاسد خیالات دل سے نکل جاتے ہیں اور انسان بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہ خالی ذکر اللہ ہی کیا کرے اور سب اعمال چھوڑ بیٹھے کیونکہ خالی پانی بھی کچھ کام کا نہیں ہوتا۔ جب تخم ہو اور اُس کو پانی پہنچایا جاوے اسی وقت کچھ کام چل سکتا ہے۔ تو اعمال حسنہ کی تخم پاشی کرو اور ذکر اللہ کا اُسے پانی دو۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا کہ ان لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ نے مغفرت و اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اپنے دین کو جو درست کرنا چاہے۔ وہ ان باتوں کو حاصل کرے۔ اس کے

بعد مستحق اجر و مغفرت ہو گا۔ ہمیں چاہیئے کہ ان سب باتوں پر عمل کریں اور اپنی حالت کو درست کریں۔ اور وعظ اسی لئے ہوا کرتا ہے کہ اپنی اصلاح کی جائے یہ نہیں کہ سُن کر رو پیٹ لئے اور بس۔ تو اس پر عمل کرو اور جو کوتاہی رہے اُس کا علاج دریافت کر لو کیونکہ اس میں بھی ترمیم و تبدیل کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسے بعض دفعہ نسخوں میں ترمیم و تبدیل ہوا کرتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ طبیب اپنی رائے سے بھی ترمیم تبدیل کر سکتا ہے اور عالم جو کچھ ترمیم بھی کرے گا وہ بھی شریعت ہی کی طرف سے ہو گی۔ اور اُس کے موافق ہو گی۔

غرض اپنی اصلاح کی دُھن میں لگ جاؤ۔ یہ ایک دن کا کام نہیں ساری عمر کا کام ہے چاہے تھوڑا ہی کرو مگر ہمیشہ کرو اور ساری عمر کرو۔ انشاءاللہ محرومی نہ ہو گی۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ توفیق کامل عطا فرماویں۔ آمین!

واٰخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین وصلے اللّٰہ تعالےٰ

علےٰ خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلیٰ اٰلہٖ واصحبہٖ اجمعین

الغالب للطالب

اتباع سنت کے متعلق یہ وعظ ۲۶ر محرم ۱۳۳۷ھ بروز یکشنبہ تھانہ بھون میں حافظ ظریف احمد صاحب کے مکان پر کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو دو گھنٹے اور ۴۵ منٹ میں ختم ہوا۔ جہاں ۴۰ کے قریب زن و مرد جمع تھے۔ یہ وعظ کاندھلہ کی ایک صاحب علم واعظ کی درخواست پر ہوا جسے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فعن اَبِی ھُرَیْرَۃَ مَرْفُوْعًا لَمَّا قَضَی اللّٰہُ الْخَلْقَ کَتَبَ کِتَابًا فَھُوَ عِنْدَہٗ فَوْقَ عَرْشِہٖ اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ وَفِیْ رِوَایَۃٍ غَلَبَتْ غَضَبِیْ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت مرفوعاً نقل ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کا خلق مقدر کیا تو اپنے پاس عرش پر ایک کتاب میں یہ مضمون لکھ کر رکھ لیا کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے۔

اہمیتِ حدیث

یہ ایک حدیث ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، بڑے جلیل القدر صحابی ہیں حضورؐ سے اُن کو خاص خصوصیت تھی ہر وقت حضورؐ ہی کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور کوئی کام زراعت تجارت وغیرہ کا نہ کرتے تھے بلکہ متوکل نہ حضورؐ کے دروازہ پر پڑے رہتے تھے اور احادیث نبویہ کو ہر وقت سنتے اور یاد کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ صحابہ میں سب سے زیادہ حافظ حدیث ہیں اُن کے برابر کسی نے احادیث کی روایت نہیں کی۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس وقت اپنی چادر میرے سامنے پھیلا دے اور جب میں اُس میں کچھ دم کر دوں تو چادر کو اپنے سینے سے لگائے۔ تو کوئی بات کبھی نہ بھولے گا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے

اپنی چادر پھیلا دی اور جو حضورؐ نے اس میں کچھ پڑھ کر دم کر دیا تو اُنہوں نے
اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد
سے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات کبھی نہ بھولا۔

یہ چند جملے حضرت ابوہریرہؓ کی تعریف میں اس لیے کہہ دیے تاکہ اُن کی
روایت کی وقعت و عظمت ہو۔

وسعتِ رحمت

اس حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
ایک معاملہ کی ہم کو اطلاع دی ہے جو اللہ تعالیٰ نے
مخلوق کے ساتھ کیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد بھی مذکور ہے۔ ترجمہ
حدیث کا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو مقدر کیا۔ قَضٰی کے معنی لغت
میں فیصلہ کرنے کے ہیں مگر فیصلہ کی دو قسمیں ہیں ایک عملی ایک تجویزی۔ اگر عملی فیصلہ
مراد ہو تو اس کا ترجمہ یوں ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر دیا یعنی انواع
کو کیونکہ افراد تو سب پیدا نہ ہوئے تھے۔ اور اگر تجویزی فیصلہ مراد ہے، تو ترجمہ
یوں کیا جائے گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کا خلق مقدر کیا کیونکہ تقدیر تجویزی
تو ہے۔ غرض یا تو خلق تجویزی ہوا تھا یا عملی اجمالی ہوا تھا۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ
ابھی تک مخلوق سے اعمال صادر نہ ہوئے تھے۔ اور اعمال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک
موجب رحمت، ایک موجب غضب۔ تو اس وقت کسی قسم کے اعمال مخلوق سے
صادر نہ ہوئے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ایک معاملہ ایسا

رمایا کہ اپنے پاس عرش پر ایک کتاب میں یہ مضمون لکھ کر رکھ لیا۔ اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ۔ کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے۔

تو یہ مضمون بڑا معظم ہے جو عرش پر لکھ کر رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے س قرب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو عرش سے خاص تعلق ہے۔ اسی تعلق کو استویٰ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے یہ معنی نہیں کہ جس طرح ہم تم بیٹھتے ہیں اسی طرح معاذ ند وہ بھی بیٹھے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس سے منزہ ہونے پر دلائل عقلیہ اور یہ قائم ہیں۔ دلیل نقلی تو لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (اس جیسا کوئی نہیں ہے) اور دلائل یہ سے علماء واقف ہیں۔

حضرات صوفیہ نے اس مسئلہ کو بہت سہولت سے حل کر دیا ہے۔ واقعی ہ حضرات سچے وارث ہیں انبیاء علیہم السلام کے۔ جس طرح حضرات انبیاء سہل نوان سے مشکل مسائل کو تعبیر کر دیتے ہیں ایسے ہی صوفیہ کی عادت ہے کہ مشکل ے مشکل مسئلہ کو سہل عنوان سے حل کر دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مکان کو متمکن سے کچھ مناسبت و قرب مقدار تو ہونا چاہیے۔ اوّل تو عادۃً مکان مکین سے یادہ ہوتا ہے۔ اگر زیادہ بھی نہ ہو تو مساوات تو ہے اور کم از کم کسی قدر مناسبت و نسبت تو ہونا چاہیے۔ اور عرش کو حق تعالیٰ سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ اگر حالت موجودہ سے کروڑوں گنے بھی بڑا ہو جب بھی اُس کو حق تعالیٰ سے کچھ مناسبت نہ ہوگی۔ کیونکہ عرش محدود ہے اور ذات حق غیر محدود ہے۔

اور محدود کو غیر محدود سے کیا مناسبت؟ کچھ بھی نہیں۔ پھر وہ اس کے لئے مکا
کیسے ہو سکتا ہے البتہ حق تعالیٰ سے عرش کو خاص تعلق ہے اور حق تعالے
کو اُس سے تعلق ہے مگر تحیز کا تعلق نہیں ہے۔ بس وہ صدر مقام ہے نزول احکا
و تجلیات کا۔ اللہ تعالیٰ کی تجلیات سب سے زیادہ عرش پر ہیں (یعنی امکن
میں ورنہ عرش سے زیادہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب پر تجلی حق ہے) تو وہا
جو چیز لکھ کر رکھی جائے گی وہ بڑی عظمت کی ہوگی۔ پس عقیدۃً بھی اُس کا حق
عظمت ادا کرنا چاہیے اور عملاً بھی۔ وہ مضمون یہ ہے۔ اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ
غَضَبِیْ۔

اس مقام پر ایک بات اور بھی سمجھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ کوئی شخص
تعالیٰ کی رحمت و غضب کو اپنے رحم و غضب پر قیاس نہ کرے۔ یہ سخت غلط
ہے۔ کیونکہ جس طرح کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہ معلوم نہیں اسی طرح صفات
کی کنہ بھی معلوم نہیں۔ اسی لئے حضرات علماء نے اس مقام پر بڑی تحقیق سے کام
لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صفات و اسماء الٰہیہ توقیفی ہیں۔ جن میں قیاس جائز
نہیں۔

مقامِ ادب

علماء نے اس قدر ادب کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
کو طبیب کہنا جائز نہیں ہاں شافی کہنا جائز ہے۔ یہاں رائے
و عقل سے کام لینا جائز نہیں کیونکہ ے

دور بیناں بارگاہِ الست　　غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

حالانکہ بظاہر طبیب میں کچھ خرابی نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ طبیب کہتے ہیں۔ تدبیر شفا کو اور اللہ تعالیٰ کے لئے تدبیر ثابت ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ　　پھر عرش پر قائم ہوا۔ وہ ہر کام

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ　　کی تدبیر کرتا ہے۔

مگر چونکہ نصوص میں اللہ تعالیٰ پر طبیب کا اطلاق وارد نہیں۔ اس لئے علماء نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ ممکن ہے کہ طبیب میں کوئی بات ایسی ہو جو کہ عظمت کے منافی ہو۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے وائسرائے میں اگرچہ کانسٹیبل کے اختیارات بھی ہیں کیونکہ کانسٹیبل کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ انہی کے دیئے ہوئے ہیں مگر وائسرائے کو کانسٹیبل کہنا جائز نہیں۔ اور اگر کوئی وائسرائے کو کانسٹیبل کہنے لگے تو مجرم قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔

پس جو حالت ہمارے رحم کی ہے کہ ہمارا دل کڑھتا ہے اس پر حق تعالیٰ کے رحم کو قیاس نہ کرو کہ معاذ اللہ ان کا دل بھی کڑھتا ہوگا۔ یہ اعتقاد باطل اور حرام ہے۔ اسی طرح اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ میں حق تعالیٰ کے استویٰ کو اپنے استویٰ پر قیاس نہ کرو۔

ایک محقق کا ارشاد ہے کہ اِسْتَوٰى کے معنی استقرار کے ہیں مگر ہر شے کا

استقرار جدا ہے۔ جیسے بات کا دل میں جمنا اور ہے اور مکین کا مکان میں جمنا اور ہے پس استواء کی حقیقت کا ادراک مستوی کی حقیقت معلوم ہونے پر موقوف ہے اور کنہ باری معلوم نہیں۔ تو حقیقت استواء پر گفتگو عبث ہے۔ واقعی اس اُمت کے علماء ورثۃ الانبیاء ہیں۔ مگر ایسے جیسے یہ حضرات محققین تھے نہ ہم جیسے علماء۔

اسی طرح غضب کی حقیقت ہمارے اندر جوش کا پیدا ہونا اور بے قابو ہو جانا ہے جس میں بعض اوقات منہ سے کف بھی نکلتا ہے اس پر حق تعالیٰ کے غضب کو قیاس نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے غالب نہیں۔ بَلْ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ط (بلکہ وہ غالب ہیں اپنے بندوں پر)۔ اللہ تعالیٰ قاہر ہیں مقہور نہیں غالب ہیں مغلوب نہیں۔ اُن کا غضب و رحم اختیاری ہے یعنی یہ صفات درجۂ صفات میں قدیمہ ہیں اختیاری نہیں اور قدیم میں تغیر محال ہے۔ ورنہ امکان خلوص عن الصفات لازم آئے گا اور یہ محال ہے مگر ان صفات کا نفاذ اختیاری ہے۔ کوئی صفت قدیمہ بدون ارادہ حق کے نافذ نہیں ہو سکتی۔ تو جس پر قدیم بھی غالب نہیں اُس پر حادث کیسے غالب ہوگا۔

رہا یہ کہ پھر حق تعالیٰ کے غضب و رحمت کے کیا معنی ہیں؟ سو علماء نے رحمت کی تفسیر ارادۃ الثواب اور غضب کی ارادۃ العقاب کی ہے اور میرے نزدیک یہ بھی محض تفہیم کے لئے ایک عنوان ہے۔ یہ بھی حقیقت نہیں۔ میرے نزدیک صفات تو کیا افعال الٰہیہ کی بھی کنہ کسی کو معلوم نہیں۔ اسی لئے حضرات

انبیاء علیہم السلام نے کیفیت افعال سے تو سوال کیا ہے۔

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی وَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا

اے میرے پروردگار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے۔

مگر حقیقت افعال سے کہیں سوال وارد نہیں حضرات انبیاء علیہم السلام بڑے مؤدب تھے کہ جس بات کے سمجھنے کی توقع نہیں ہوتی اس کو پوچھتے بھی نہ تھے اسی لئے سوال عن کیفیۃ الافعال کے بعد دوبارہ سوال حقیقت سے نہیں کیا۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو یہی طریقہ سلامتی کا تعلیم کیا ہے جو حضرات انبیاء علیہ السلام کا طریقہ ہے کہ جو امور فہم میں نہ آسکیں ان میں غور وخوض نہ کیا جائے۔ یہ بڑا ادب ہے اور واللہ اسی میں سلامتی ہے اور سکون واطمینان قلب بھی اسی میں ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے مسئلہ قدر میں غور کرنے سے منع فرما دیا۔ کیونکہ اس کا تعلق افعال وصفات باری تعالیٰ سے ہے جن کی کنہ کا علم تو محال ہے اور اگر وجہ معلوم ہو بھی گئی تو ایک وجہ کے لئے پھر دوسری وجہ ہوگی۔ پھر اس سلسلۂ وجوہ سے وہ حالت ہوگئی کہ ع

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

مگر آج کل بعض لوگ ایسے بد دماغ ہیں کہ اس ادب کی قدر نہیں کرتے بلکہ متشابہات اور مسئلہ قدر میں گفتگو کرتے ہیں مگر ان سے کوئی قسم دے کر پوچھے کہ

کیا تم کو گفتگو اور غور و خوض سے سکون و اطمینان حاصل ہوا؟ ہرگز نہیں! واللہ ایک جاہل مسلمان کو مسئلہ قدر میں جتنا اطمینان ہے۔ ان گفتگو کرنے والوں کو اس کا دسواں حصہ بھی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔

حضرات صحابہؓ کا ادب دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر ضحک فرماتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑ کر جنت کی طرف لائے جاتے ہیں (یعنی جہاد میں بعض کافر زنجیروں میں قید ہو کر آتے ہیں پھر اہل اسلام کی صحبت سے مسلمان ہو جاتے ہیں تو گویا یہ لوگ زنجیروں میں جکڑ کر جنت کی طرف لائے گئے) اس پر صحابہؓ نے یہ سوال نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح ضحک فرماتے ہیں بلکہ یہ حدیث سنتے ہی خوش ہوئے اور کہا یا رسول اللہ جب اللہ تعالیٰ ضحک بھی فرماتے ہیں تو ایسے خدا سے تو ہم کو بڑی امیدیں ہیں واقعی خدا ہمارا ایسا اور رسولؐ ایسے مہربان جنہوں نے ہم کو یہ باتیں بے تکلف بتلا دیں ورنہ دوسرا مصلح تو اسی سوچ میں رہتا کہ اس بات کو بیان کروں یا نہ کروں۔ کہیں مصلحت کے خلاف تو نہیں۔ کبھی لوگ خدا تعالیٰ کی ایسی رحمت و مہربانی کو سن کر دلیر نہ ہو جائیں۔

جیسے حضرت غوث اعظمؒ نے چالیس سال تک رحمتِ الٰہیہ[1] کا بیان فرمایا

---

[1] قال الذہبی فی المیزان فی ترجمۃ ابان ابی عیاش ویروی ان ما لکا رحمہ اللہ

پھر خیال ہوا کہ شاید یہ لوگ دلیر ہو گئے ہوں گے۔ تو ایک دن غضب الٰہی کا بیان فرمایا۔ وہ ایسا غضب کا بیان تھا کہ مجلس میں سے چند جنازے اٹھے۔ کئی آدمی خوف سے مر گئے۔ تو آپ پر بذریعہ الہام کے عتاب ہوا کہ تم نے ہمارے بندوں کا دل توڑ دیا۔ کیا ہماری رحمت اتنی ہی ذرا سی تھی کہ تمہارے چالیس سال کے بیان میں ختم ہو گئی۔

میں کہتا ہوں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خیال ہوتا جو حضرت غوث اعظمؓ کو ہوا تو ہم کو حق تعالیٰ کی رحمت و لطف و ضحک کی خبر کیونکر ہوتی مگر حضورؐ کو ان کے بیان میں ذرا کمی و بیشی نہیں ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ ایسے اور رسولؐ ہمارے ایسے۔ پس یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۴۲) دینار، لقی ابانا فقال الی کم تحدث الناس بالرخص فقال یا ابا یحییٰ انی لارجوان تری من عفو اللہ ما تخرق لہ کونا کہذا من الفرح وددی ان ابانا مدوی فی المنام فقال اوقفنی اللہ بین یدیہ فقال ما حملک علی ان تکثر للناس من ابواب الرجاء فقال یا رب اردت ان احببک الی خلقک فقال قد غفرت لک اھ (ج ۹ ص ۱۲) وفی الجامع الصغیر عن ابی امامۃ مرفوعاً حببوا اللہ الی خلقہ یحببکم اللہ۔ وعزاہ الی الطبرانی فی الکبیر والی الضیاء المقدسی واحادیث الضیاء صحاح علی قاعدۃ السیوطی کما فی کنز

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۴۸)

یارب تو کریمی و رسولِ تو کریم　　صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

اے رب! تو کریم اور تیرا رسولؐ کریم۔ سو شکر ہے کہ ہم دو کریموں کے درمیان میں ہوں۔

اور سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو　　کہ دارد چنیں سیدؐ پیشرو

غرض اللہ تعالیٰ کی صفات و افعال میں قیاس سے کام نہ لو۔ اللہ تعالیٰ صاحب رحمت بھی ہیں، صاحب غضب بھی ہیں۔ وہ ضحک بھی فرماتے ہیں صاحب ید و وجہ بھی ہیں، صاحب قدم و ساق بھی ہیں مگر اپنے ید و وجہ و قدم و ساق پر قیاس نہ کرو اور ہاں اللہ تعالیٰ صاحب فخذ نہیں ہیں کیونکہ نصوص میں اس کا ذکر نہیں اور قیاس جائز نہیں۔ یہ اس لئے میں نے کہہ دیا کہ شاید کوئی عقل کا پورا قیاس سے یوں کہنے لگے کہ جب وجہ و ید و قدم و ساق ہے تو ان کے درمیان کی چیزیں فخذ وغیرہ بھی ہوں گی۔ اس کا یہ جواب دیا جائے گا ؎

تو نہ دیدی گہے سلیمانؑ را　　چہ شناسی زبانِ مرغاں را

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۴۷) العمال ولکن الحدیث ضعفہ الترمذی فقال باسناد ضعیف اھ (ص ۲۰۲ ج ۲) ظفر احمد عفا اللہ عنہ قلت وقال سیدی حکیم الامۃ فی بعض مواعظہ لا اقول انی اجعلکم عاشقین کالجنید والشبلی ولکن اقول سوف اجعلکم للہ عاشقین ان اطعتمونی و عملتم اقول لکم ۱۲۔

تم نے کبھی سلیمانؑ کو آنکھ سے تو دیکھا نہیں پھر تم پرندوں کی بولی کب سمجھ سکتے ہو۔

جیسے ایک بزرگ نے فرمایا تھا اُس شخص کے جواب میں جس نے دریافت کیا کہ شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا باتیں کی ہیں فرمایا ہے

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان
بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

لوگ اولیاء اللہ کو خدا کا راز دار سمجھتے ہیں کہ اُن سے ایسے سوالات کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے کسی مجذوب سے پوچھا کہ یہ بادشاہت کب تک رہے گی۔ مجذوب نے دھمکا کر جواب دیا کہ کیا میں خدا کا رشتہ دار یا سررشتہ دار ہوں جو ان باتوں کی مجھے خبر ہو۔ مجھے غیب کی کیا خبر۔

حالانکہ مجاذیب اکثر امور تکوینیہ کو ظاہر کر دیا کرتے ہیں۔ مگر بعض مجذوب مؤدب بھی ہوتے ہیں۔ جیسے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی تعریف میں نے حضرت حاجی صاحبؒ سے سُنی ہے۔ سالکین کی زبان سے مجذوبوں کی تعریف کم سُنی جاتی ہے مگر حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی تعریف ہمارے حضرت نے بہت کی ہے اور یہ حافظ صاحب صرف ایک کمبل میں رہتے تھے مگر کبھی برہنہ نہیں دیکھے گئے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک بار جلال آباد تشریف لے گئے۔ وہاں کے پٹھانوں

نے کہا حضور نے قدم رنجہ فرمایا۔ تو اُن کو ادب سکھلایا کہ بزرگوں سے یوں نہیں کہا کرتے کہ قدم رنجہ فرمایا۔ کیا ہم کسی کے نوکر ہیں کہ قدم رنجہ فرماتے بلکہ یوں کہا کرتے ہیں کہ حضور نے کرم فرمایا۔

تو وہ مجذوب بھی مؤدب تھے جنہوں نے یہ فرمایا کیا میں خدا کا رشتہ دار یا سررشتہ دار ہوں۔ اس لئے یہ سوال اُن کو ناگوار ہوا جس میں غیب سے استفسار تھا، یہ ایک ضروری مضمون تھا سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ کے متعلق کہ حق تعالےٰ کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس نہ کرنا چاہئے۔

معرفت حق اب میں مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب میں جو عرش پر ہے قبل ہمارے وجود کے اور قبل وجود ان افعال کے جو موجب رحمت وغضب ہیں اپنے پاس یہ لکھ دیا ہے کہ میری رحمت غضب سے بڑھی ہوئی ہے یعنی میری رحمت غضب پر غالب ہے۔ پس بلا تکلف یہ حالت ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

یعنی حق تعالیٰ کا لطف اُس وقت ہمارے شامل حال تھا جب کہ نہ ہمارا وجود تھا نہ ہماری طرف سے کچھ تقاضا تھا۔

یہاں ایک بات اہل علم کے سمجھنے کی یہ ہے کہ سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ غَضَبِیْ پر بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ صفات قدیم میں سبقت وغلبہ کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہاں صفات قدیمہ میں سبقت وغلبہ مراد نہیں بلکہ اُن کے تعلق میں سبقت وغلبہ مراد ہے اور تعلق حادث ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شخص میں اسباب غضب و اسباب رحمت دونوں مجتمع ہوں تو اُس پر رحم ہی ہو جاتا ہے۔ اب اشکال کچھ نہیں۔

یہ تو حدیث کے متعلق لفظی تحقیق تھی۔ اب میں اس سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف ابھی تک ذہن نہ گیا ہو گا۔ اور اس کی ضرورت عوام کو نہیں کیونکہ جس غلطی کا ازالہ اس وقت کیا جائے گا وہ عوام کو پیش نہیں آتی وہ ان امراض سے بری ہیں جیسے وہ بدہضمی کے مرض سے بھی بری ہوتے ہیں۔

چنانچہ ایک دیہاتی کو کسی حکیم نے دیکھا کہ اس نے روٹی کھا کر اوپر سے چھاچھ کا بدھنا بھرا ہوا پی لیا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ کھانے کے بعد چھاچھ پینا مضر ہے اس کو درمیان میں پینا چاہیے۔ تو اُس نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ ارے فلانے چار ٹکڑ (موٹی روٹیاں) اور لے آ، اس چھاچھ کو بیچ میں کر لوں۔ یہ حکیم کہہ رہا ہے کہ اسے بیچ میں کر لے۔ چنانچہ وہ چار جھنگ اور لایا اور چودھری صاحب وہ بھی کھا گئے۔ پھر حکیم سے کہا کہ حکیم جی اب تو نقصان نہ ہو گا۔ حکیم نے کہا کہ بھائی تو قواعد طب سے مستثنیٰ ہے تجھے کسی طرح مضر نہیں۔

تو جیسے عوام بہت سے ظاہری امراض وخطرات سے بری ہیں ایسے ہی بہت سے باطنی امراض وخطرات سے بھی بری ہیں ہاں کبھی خواص سے مل کر

ان میں بھی یہ امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ پھر دیہاتی ہونا ہی بہتر ہے۔ نہیں ہرگز نہیں کیونکہ دیہاتی گو بعض امراض سے محفوظ ہیں مگر بہت سے لطفوں سے محروم ہیں شہر والوں کو لطف بہت حاصل ہیں۔ اسی طرح خواص کو لطف بہت ہے کہ اُن کو عوام سے زیادہ اللہ اور رسولؐ کی معرفت ہے اور معرفت وہ چیز ہے کہ جنت بھی اسی کی ایک فرع ہے۔

چنانچہ حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کو بچپن میں مر جانا اور خطرات سے محفوظ ہونا پسند ہے یا بالغ ہو کر خطرہ میں پڑنا پسند ہے۔ فرمایا کہ مجھے[1] بالغ ہو کر خطرہ میں پڑنا زیادہ پسند ہے بچپن کی موت پسند نہیں کیونکہ بلوغ کے بعد معرفت حق عزّ و جل زیادہ ہوتی ہے جو بچپن میں نہیں ہوتی۔ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ اسی معرفت پر خوش ہو کر فرماتے ہیں ؎

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست

آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

میں نے حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سُنا ہے فرماتے

---

[1] اخرج ابو نعیم فی الحلیۃ بلفظ عن علی قال ما یسرنی لو مت طفلاً و دخلت الجنۃ ولم اکبر فاعرف ربی عزّ و جل اھ کنز العمال ص۱۲۶ ج ۸۔ جامع۔

تھے کہ بھائی جنت کا مزہ برحق، کوثر کا مزہ برحق۔ مگر نماز میں جو مزہ ہے وہ کسی چیز میں نہیں۔ جب ہم سجدہ میں جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اللہ تعالے نے پیار کر لیا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ جب ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں آئینگی تو ہم اُن سے کہہ دیں گے کہ بی اگر قرآن سناؤ تو بیٹھو ورنہ چلتی بنو۔

تو حضرت معرفت ایسی لذیذ شے ہے کہ عارفین کے نزدیک جنت اور حوروں میں بھی وہ مزہ نہیں جو اُس میں ہے۔ اور اس سے نعمائے دنیا کا کہ اُن میں معرفت بھی ہے نعمائے جنت سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ جنت میں میں یہ معرفت ایسی ہو گی کہ وہاں کی نعمت سے زیادہ لذیذ ہو گی۔ تو خود جنت کی بعض نعمتیں بعض سے افضل ہوئیں۔ باقی ہم جیسوں سے کوئی پوچھے تو ہم تو یوں کہیں گے کہ روٹیوں میں زیادہ مزہ ہے نماز میں کیا مزہ! اور فقہاء نے ہم جیسے ضعفاء کے لیئے وسعت بھی دے دی ہے کہ اگر کھانا سامنے ہو اور نماز ہونے لگے، تو روٹی پہلے کھا لو نماز بعد میں پڑھ لینا تاکہ نماز فراغت سے پڑھی جائے ورنہ ساری نماز میں روٹی ہی کا خیال رہے گا کیونکہ تمہارے نزدیک روٹی میں مزہ زیادہ ہے۔ اور اسی لیئے شریعت نے تعجیل افطار کا حکم دیا ہے کہ نماز مغرب سے پہلے افطار کر لینا چاہیئے۔ اور حضورؐ نے یہ بھی فرمایا ہے

لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ الرَّحْمٰنِ ط

کہ روزہ دار کو دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت ہوتی ہے۔ دوسری اللہ تعالے سے ملاقات کے وقت ہو گی۔

ہم لوگوں کو تو افطار کے وقت خوشی اسی کی ہوتی ہے کہ کھانے کو ملا۔ منہ کا تالا کھل گیا مگر حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو جو مسرت تھی وہ اس بات پر تھی کہ منزل پوری ہو گئی۔ خدا کا حکم ادا ہو گیا۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست
آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ما

ہجومِ خطرات بہر حال خواص کے مراتب زیادہ ہیں گو اُن کو خطرات بھی بہت ہیں سو ایک بار مجھ پر ایک سخت حالت تھی۔ اس وقت میں تمنا کرتا تھا کہ کاش میں قرآن کا ترجمہ نہ سمجھتا کیونکہ وہ حالت ترجمہ سمجھنے ہی کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ بعد میں ہوش آیا کہ یہ تمنا ناشکری کی ہے بلکہ ہم لوگوں کو خطرات سے بچنے کی ہمت کرنا چاہیے۔ اور ان لذتوں سے خوش ہونا چاہیے خواص کو خطرہ بے شک بہت ہے مگر اسی کی وجہ سے تو ان کے مراتب زیادہ ہیں ملائکہ سے نوعِ بشر اسی لئے افضل ہے کہ ملائکہ کو خطرہ نہیں اور انسان کو خطرہ ہے حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور اُن کی ذریت کو پیدا کیا، تو ملائکہ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا۔

یَا رَبِّ خَلَقْتَهُمْ يَأْكُلُونَ وَيَشْرَبُونَ وَيَنْكِحُونَ وَيَرْكَبُونَ فَاجْعَلْ لَهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْآخِرَةَ ؎

کہ اے اللہ! انسان کو دنیا دیجیے اور ہم کو آخرت دے دیجیے ارشاد ہوا

؎ اے اللہ! تو نے اُن کو (انسان کو) اس طور پر پیدا فرمایا ہے کہ یہ کھاتے ہیں پیتے ہیں نکاح کرتے ہیں اور سواریاں کرتے ہیں۔ پس ان کو دنیا دیجیے اور ہم کو آخرت۔

لَا اَجْعَلُ مَنْ خَلَقْتُہٗ بِیَدَیَّ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ کَمَنْ
قُلْتُ لَہٗ کُنْ فَکَانَ۔ (کذا فی المشکوٰۃ عن البیہقی ۱۲)

کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیا میں ایسی مخلوق کو جسے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے اُس کے برابر کردوں جس کو کُن کہہ کر پیدا کر دیا۔

تو یہ فضیلت انسان کی اُن خطرات ہی کی وجہ سے تو ہے جو ملائکہ کو درپیش نہیں بعض لوگ ذکر میں لذّت اور مزہ کے طالب ہیں۔ ارے بس رہنے دو یہ مزا نہ آنا بھی رحمت ہے کیونکہ مزہ کے بعد ثواب کم ہو جاتا ہے۔ دیکھو ملائکہ کو عبادت میں لذت حاصل ہے اور انسان عام طور پر طاعات میں لذت سے خالی ہیں مگر ثواب زیادہ انسان ہی کو ہے۔ بس تمہارا تو یہ مذاق ہونا چاہیے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من
دل فدائے یار دل رنجانِ من

پھر بعض دفعہ لذّت سے انبساط بڑھ جاتا اور ادلال ہو جاتا ہے، جو کبھی گستاخی کی حد سے قریب ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ایک دُعا کی۔ اُس کا جواب الہام سے عطا ہوا۔ اُس کے جواب میں آپ نے ایک کلمہ ایسا فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ یا مولانا گنگوہی اُس کو سُن کر کانپ گئے، اور فرمایا کہ یہ اُنہی کا مرتبہ ہے جو ایسی بات کہہ گئے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو کان پکڑ کر باہر نکال دیا جاتا۔

بہرحال خواص کو خطرات سے نہ گھبرانا چاہیے کیونکہ اللہ تعالےٰ دارو دیکھ کر مرض دیتے ہیں۔ خواص کو جس طرح خطرات بہت ہیں اسی طرح اُن میں تحمّل

کی طاقت بھی زیادہ ہے۔ اگر عوام میں یہ امراض و خطرات ہوتے جو خواص کو درپیش ہوتے ہیں تو وہ اُن کا تحمل بھی نہ کر سکتے۔ جیسا کہ بچوں کو خطرات بہت پیش آتے ہیں مگر اُن کی تائید بھی بالغوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ بچے بہت گرتے پڑتے ہیں۔ بعض دفعہ بہت اونچے سے گر جاتے ہیں مگر اُن کے زیادہ چوٹ نہیں آتی۔ بڑا آدمی تو مر ہی جائے۔ میاں جی ظالموں کی طرف سے بچوں پر بہت زیادتی ہوتی ہے۔ اگر میاں جی کو اتنا پیٹا جائے تو وہ بستر ہی سے نہ اُٹھ سکیں مگر بچے اگلے ہی دن آ جاتے ہیں۔

بچوں کی حفاظت پر ایک یہ حکایت یاد آئی کہ ایک عورت ریل میں سفر کر رہی تھی اور اُس کے ایام وضع قریب تھے۔ وہ جو ضرورت سے ریل کے پاخانہ میں گئی اُسی وقت اُس کے درد شروع ہوا اور بچہ نکل کر پاخانہ کی موری میں سے نیچے گر پڑا۔ ماں تو یہ دیکھ کر تڑپ گئی اور سخت بے چین ہو کر باہر آئی اور ریل کی روکنے کی زنجیر کو کھینچ لیا۔ ریل رُکی اور گارڈ وغیرہ کو یہ قصہ معلوم ہوا تو فوراً ڈرائیور انجن کو تنہا لے کر پیچھے لوٹا۔ دُور جا کر بچہ نظر پڑا کہ دونوں پٹریوں کے بیچ میں پڑا ہوا ہاتھ پیر چلا رہا اور انگوٹھا چوس رہا ہے اور اُس کے بدن کو کسی جگہ بھی چوٹ نہ آئی تھی۔ ڈرائیور نے دوڑ کر اُس کو اٹھایا اور خوش خوش واپس ہوا اور ماں کو لا کر دے دیا۔ وہ تو گویا مر کر زندہ ہو گئی۔ پھر ریل روانہ ہو گئی۔

تو جیسے بچوں کی خطرات میں امداد و تائید ہوتی ہے اسی طرح خواص کی تائید ہوتی ہے اس لئے اُن کو نہ گھبرانا چاہئے۔

مقامِ دوست

اب میں اس مضمون کو بیان کرتا ہوں جو اس حدیث سے مستنبط کرنا مقصود ہے گو وہ مضمون دقیق ہے مگر زیادہ دقیق نہیں۔ ہاں عوام و مستورات کے سامنے بیان کرنے کا نہیں تھا اسی لئے مجھے تردد تھا کہ اس کو عورتوں کے مجمع میں بیان کروں یا نہ کروں۔ مگر بعض دفعہ دقیق مضامین بیان کر کے جو مستورات سے پوچھا گیا کہ تم نے کیا خاک سمجھا ہوگا تو انہوں نے کہا کہ ہم تو سمجھ گئے۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے اس لئے ہمت کرتا ہوں۔ میرا ارادہ اس مضمون کے بیان کرنے کا پہلے ہوا تھا۔ مگر یہ خیال تھا کہ مجمع خواص میں بیان کروں گا۔ جب مستورات کی طرف سے درخواست بیان کی ہوئی تو دوسری آیت کے بیان کا ارادہ ہوا یعنی

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي[1]

مگر پھر رائے بدل گئی۔ لیکن اس آیت کا ترجمہ تو کر دوں تاکہ اس آیت کا کچھ بیان بھی ہو جائے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ مسلمان کو مرتے وقت ملائکہ اس طرح بشارت دیں گے کہ اے نفس مطمئنہ تو اپنے پروردگار کی طرف واپس چل اس حال میں

---

[1] اے اطمینان والی روح اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔ پھر ادھر چل کر تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہیں۔ پس تو میرے خاص بندوں (کی جماعت) میں داخل ہو جا اور میری جنت میں پہنچ جا۔ یہ تو ترجمہ ہوا۔

اب ایک نکتہ بھی بیان کر دوں وہ یہ کہ آیت میں اُدْخُلِی فِی عِبَادِی کو اُدْخُلِی جَنَّتِی پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ سو اس کی توجیہ حضرت امام شافعیؒ کے قول سے سمجھ میں آئی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ جنت میں دوستوں کی زیارت و ملاقات ہو گی اس وقت سے مجھے جنت کا اشتیاق ہو گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوستوں کی ملاقات میں جنت سے بھی زیادہ لذت ہے مگر شطرنج باز گنجفہ باز دوست نہیں بلکہ امام شافعیؒ جیسے دوست جو شافعی ہوں یا شافع ہوں۔ اور یاد و عین دونوں جمع ہو جائیں تو نورٌ علیٰ نور ہے اور اگر ایسے دوست نہ ہوں بلکہ محض دنیوی دوستی ہو تو وہ آخرت میں مبدل بعداوت ہو جائے گی۔

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ۔

تمام دنیاوی دوست اُس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے خدا سے ڈرنے والوں کے۔

وہاں وہی دوستی باقی رہے گی جس کا منشاء دین اور تقویٰ ہو۔ بہر حال دوستوں کی ملاقات میں ایسی لذت ہے کہ اس کے بغیر جنت بھی خار ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

با تو دوزخ جنت است اے جانفزا ۔۔۔ بے تو جنت دوزخ ست اے دلربا

ہر کجا یوسف رُخے باشد چو ماہ　　　جنّت ست آں گرچہ باشد قعرِ چاہ
ہر کجا دلبر بود خرّم نشیں　　　فوقِ گردوں ست نے قعرِ زمیں

ایک صحابی کو یہ خیال ہوا کہ اگر جنّت میں ہم نیچے کے درجہ میں ہوئے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم اوپر کے درجوں میں اور اس لیئے آپ کی زیارت نہ ہوئی تو جنّت کو لے کر کیا کریں گے۔ انہوں نے حضورؐ سے سوال کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ط

(اور جو شخص اللہ اور رسولؐ کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی اُن حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالےٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء و صدیقین شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں)

کہ جو لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں وہ اُن لوگوں کے ساتھ رہیں گے جن پر اللہ تعالےٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء و صالحین کے ساتھ (جنّت) میں ہوں گے۔ اور یہ لوگ اچھے رفیق (اور اچھے دوست) ہیں۔ ساتھ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ سب کے سب اُن کے درجہ میں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن کے قریب ہوں گے اور اُن سے زیارت و ملاقات کیا کریں گے۔ کبھی ہم حضورؐ کی زیارت و ملاقات کو جایا کریں گے۔ کبھی حضورؐ بھی

انشاء اللہ ہمارے پاس تشریف لایا کریں گے۔ اس وقت ہم خوش ہو کر یہ کہیں گے

امروز شاہِ شاہاں مہمان شدست مارا
جبرئیل با ملائک دربان شدست مارا

آگے ناز کو قطع کرتے ہیں کہ اپنے عمل پر ناز نہ کرنا۔ ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰہِ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض فضل ہوگا۔ اس کے بعد نفل ہوگا۔ اس کے بعد فضل پر تکیہ کو توڑا دَکَفٰی بِاللّٰہِ عَلِیْمًا ط کہ فضل پر تکیہ کر کے بے فکر نہ ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ فضل کس پر ہوگا کس پر نہیں۔ جس کو دوسرے مقام پر صراحت کے ساتھ بتلا دیا گیا ہے اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ط کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل نیکوکار بندوں سے قریب ہے۔

اہتمامِ صحبت

تو مستورات کی درخواست کے بعد اوّل اس مضمون کے بیان کا ارادہ تھا جس کا ذکر بھی اجمالاً کچھ ہو گیا پھر دوسرے مضمون کا قصد ہوا مگر اس کا منتظر تھا کہ مجمع اس کا سمجھنے والا قدر داں ہو، تو بیان کروں۔ پھر اتفاق سے ایسا مجمع بھی ہو گیا ؎ مگر مجھے تردد تھا کہ مستورات کے سامنے اسے بیان کروں یا نہیں۔ مگر ایک تو مستورات کے اس قول سے کہ ہم تو دقیق مضامین بھی سمجھ لیتے ہیں کچھ ہمت ہوئی۔ پھر خدا پر توکّل اور بھروسہ کر کے بیان کا قصد کر ہی لیا۔ اور ائی مرض کے متعلق بیان کرنا تجویز کر ہی لیا جو کہ اکثر خواص میں ہے اور یہ جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ عوام کو بھی خواص سے مل کر یہ امراض

؎ کیونکہ اہل خانقاہ کا مجمع بھی حاضر تھا ۱۲

لگ جاتے ہیں - اس پر ایک علمی تحقیق یاد آگئی ہے پہلے اس کو بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

وہ یہ کہ امراض جسمانی میں تو تعدیہ نہیں ہوتا جس کے ڈاکٹر قائل ہیں گو شرعی حد میں رہ کر کوئی اس کا بھی قائل ہو تو گنجائش ہے۔ مثلاً کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مرض لگ جاتا ہے۔ اگر حکم الٰہی نہ ہو تو نہیں لگ سکتا۔ اس میں زیادہ محذور نہیں۔ مگر بعض تو اس کے قائل ہیں کہ بدون مشیت حق کے مرض لگ جاتا ہے۔ یہ لوگ دہریہ ہیں۔ یورپ کے ڈاکٹروں کا بھی عقیدہ ہے اور انہی کے اثر سے بعض مسلمانوں میں یہ عقیدہ آیا ہے۔ مگر چونکہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمان بھی ایسے جن کے نام پر سر ہے جیسے سرکنڈے کا سر۔ اور اگر شر کہو تو اور بھی اچھا کہ سر سے زیادہ شرف ہو جائے گا۔ تین نقطے تو بڑھ جائیں گے۔ اس لئے یہ لوگ اسلام کے نام کا لحاظ کر کے یوں کہتے ہیں کہ مرض لگنا تو ہے خدا ہی کے حکم سے مگر اللہ تعالیٰ نے جن امراض کو متعدی کیا ہے اُن میں تعدیہ ضرور ہو گا۔ کیونکہ خدا نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ فلاں مرض ضرور ہی لگے گا۔ اور قانون فطرت بدل نہیں سکتا اس لئے مشیت بھی ضرور ہو گی اور تعدیہ بھی ضرور ہو گا۔ اور ان لوگوں نے استدلال کیا ہے اس آیت سے

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا

سو آپ خدا کے اس دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائیں گے اور خدا کے دستور کو کبھی منتقل ہوتا ہوا نہ پائیں گے۔

مگر یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عادت

یا قانون کو کوئی دوسرا نہیں بدل سکتا نہ یہ کہ وہ خود بھی نہ بدل سکیں پس یہ کہنا غلط ہے کہ مشیّت بھی ضرور ہو گی اور تعدیہ بھی ضرور ہو گا۔ پس تعدیہ میں تین قول ہوئے

ایک یہ کہ بدون مشیّت حق کے مرض لگتا ہے یہ تو کفر و زندقہ ہے۔

دوسرے یہ کہ مشیّت حق سے لگتا ہے مگر مشیّت تو ضرور ہوتی ہے۔ یہ قول غلط و باطل ہے گو کفر نہیں۔

تیسرے یہ کہ مشیت سے لگتا ہے اور مشیّت ضرور نہیں۔ اگر مشیّت ہو گی تو مرض نہیں لگے گا۔ اس میں زیادہ محذور نہیں۔ اگر کوئی اس کا قائل ہو جائے تو گنجائش ہے۔

مگر احادیث صحیحہ سے ظاہراً ترجیح اسی کو ہے کہ تعدیہ کوئی شے نہیں اور ایک کا مرض دوسرے کو نہیں لگتا۔ لَا عَدْویٰ وَلَا طِیَرَۃَ (مرض کے متعدی ہونے اور شگون لینے کی کوئی حقیقت نہیں) حدیث مشہور ہے۔ اسی طرح حدیث اعرابی میں فَمَنْ اَعْدیٰ الْاَوَّلَ (یعنی پہلے میں کس سے تعدی ہو گی) سے صاف عدویٰ کی نفی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔

غرض امراض جسمانی میں تو صحیح قول یہ ہے کہ تعدیہ نہیں ہے مگر امراض باطنیہ میں تعدیہ ضرور ہوتا ہے صوفیہ نے اس کو مسارقہ سے تعبیر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہر جلیس اپنے جلیس کے اخلاق وغیرہ کا اثر اس طرح قبول کرتا ہے کہ نہ اس کو خبر ہوتی ہے نہ دوسرے کو۔ صحبت بد کا بھی اثر ہوتا ہے اور صحبت نیک کا بھی۔ اسی لئے صوفیہ کو صحبت کا اہتمام سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ صحبت بد کے بارہ میں ان کا ارشاد ہے ؎

تا توانی دور شو از یارِ بد　　یارِ بد بدتر بود از مارِ بد

اور صحبت نیک کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

یک زمانے صحبتے با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

صحبتِ صالح کا اثر تو یہ ہے کہ مسارقت کے بعد مشارفت ہوتی ہے کہ دونوں انوار سے منوّر ہو جاتے ہیں اور صحبت بد کے اثر کا کچھ نام صوفیہ نے نہیں لکھا مگر میں کہتا ہوں کہ وہاں مسارقت کے بعد مبارقت ہوتی ہے کہ دونوں طرف سے بجلی سی چمکتی ہے اور سوختن وافروختن کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ دونوں کا دین جل کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ایک عارف صحبت صالح کی تاکید میں فرماتے ہیں

جہدے کن و با مردم دانا بنشیں، با صدق و صفا
یا با صنم لطیف رعنا بنشیں، با شرم و حیا
زیں ہر دو گرت یکے میسّر نشود، از طالع خویش
اوقات مکن ضائع و تنہا بنشیں، در یادِ خدا

مطلب یہ ہے کہ یا تو کسی عارف کے پاس صدق و خلوص سے رہو اگر یہ نہ ہو سکے تو اپنی بیوی کے پاس رہو۔ مگر آج کل نوجوانوں کو بیوی سے تو جاڑہ چڑھتا ہے اگر ماں باپ کی لائی ہوئی دُلہن ہے تو وہاں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صاحب پنچوں کی بلا سر دھر لی گئی۔ کیا کریں دولہا کو پسند نہیں (گو شرافت تو یہ ہے کہ ماں باپ کی لائی ہوئی کی قدر اپنی لائی ہوئی سے زیادہ کی جائے تاکہ ماں باپ کو شرمندگی نہ ہو) مگر زیادہ شکایت تو اُن لوگوں کی ہے جو خود اپنی

طلب ورغبت سے نکاح کرتے ہیں۔ اور پھر بھی بیوی کے حقوق ضائع کرتے ہیں۔ اُن کی قدر نہیں کرتے۔ رات دن دوست احباب کی صحبت میں رہتے ہیں اُن سے دل لگی، مذاق اور فحش مذاق کیا جاتا ہے اور بیوی سے جس کے ساتھ ایسی باتیں کرنا جائز بھی ہے اور ثواب بھی ہے سیدھے منہ بات بھی نہیں ہوتی۔ وہاں منہ کو گوند لگ جاتا ہے اور کہنے کو یہ دعوےٰ ہے کہ ہم کو شرم آتی ہے ارے تم کو مردوں میں فحش مذاق کرتے ہوئے غیرت نہ آئی۔ ڈوب مرو۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو نہ شیخ میسر ہو نہ دلبر رعنا یعنی بیوی بھی میسر نہ ہو خواہ اس واسطے کہ نکاح کا سامان نہیں یا اس واسطے کہ بیوی مر گئی ہے تو اس کو چاہیے کہ یاد خدا میں تنہا بیٹھے اور صحبت بد میں ہرگز نہ بیٹھے ورنہ دین کی خیر نہیں۔ تو صوفیہ کے کلام سے معلوم ہوا کہ اخلاق باطنہ میں تعدیہ ہوتا ہے۔

درجاتِ اتباع

اسی لیے میں نے کہا تھا کہ آج جس مرض پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں عوام اُس سے بری ہیں۔ ہاں خواص سے مل کر کبھی اُن میں بھی یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے سب کے سامنے اس کے بیان کر دینے کا مضائقہ نہیں اور وہ مرض ایسا ہے جو ابھی پندرہ بیس دن ہوئے سمجھ میں آیا ہے۔ اس کی عمر بہت تھوڑی ہے اور جیسے اس کی سمجھ میں آنے سے مسرت ہوئی کہ ایک نیا علم حاصل ہوا ویسے ہی اُس کا غم بھی ہوا کہ اب تک اتنے روز تک ہم جہل میں مبتلا رہے اور اس کے سمجھ میں آنے کے بعد میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں نے اپنی اصلاح کر لی ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ میں اپنی حالت کو نظر ثانی کا

محتاج سمجھنے لگا۔ اور امید ہے کہ انشاءاللہ دس پندرہ روز میں نظرثانی ہو جائے گی اور میں اپنے احباب کو بھی اسی کی وصیت کرتا ہوں کہ آپ بھی اس کو سن کر اپنی حالت پر نظرثانی کیجئے۔

وہ مضمون یہ ہے کہ ہر شخص جس کو طریق کی طلب ہے یہ چاہتا ہے کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا متبع ہو جاؤں پھر اتباع کے دو درجے ہیں۔ ایک یہ کہ فتویٰ علماء پر عمل کرتا رہے۔ جس کو وہ جائز کہیں اس کو کرے اور جس کو ناجائز و حرام کہیں اس سے بچے۔ یہ بھی ایک درجہ اتباع کا ہے کہ مباحات شرعیہ پر عمل کرے۔ گو حضورؐ نے ان مباحات کو نہ کیا ہو اور یہ بھی نجات کے لئے کافی ہے۔ میں غلو نہیں چاہتا گو یہ مضمون میری نظر میں بہت اہم ہے جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اور ایسا اہم ہے کہ میں اس کی بناء پر اپنی حالت کو نظرثانی کا محتاج سمجھتا ہوں۔ مگر میں حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہتا کہ مباحات پر عمل کرنے کو ناکافی کہہ دوں، ہرگز نہیں! بلکہ میں صاف کہتا ہوں کہ مباحات پر عمل کرنا بھی اتباع میں داخل اور نجات کے لئے کافی ہے۔

دوسرا درجہ اتباع کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات و افعال کا اتباع کیا جائے۔ یہ کامل اتباع ہے اور اس کے لئے ضرورت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و افعال و طریق عمل کے معلوم کرنے کی پھر اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک عبادات میں اتباع۔ دوسرے معاملات میں اتباع۔ ان میں تو جہاں تک ہو سکے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا اتباع کرے۔ اور حضورؐ کے طریق عمل کی تلاش کرے کیونکہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے

ہے اور مخلوق سے ہے اور ایک یہ کہ ماکولات و مشروبات میں اتباع کیا جائے کہ جو حضورؐ نے کھایا وہی کھائے۔ جو حضورؐ نے پیا وہی پیئے جو آپ نے پہنا وہی پہنے۔ اس میں جس قدر سہولت ہو سکے اتباع کیا جائے۔ مبالغہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس میں مبالغہ کرنا بعض اوقات ہم جیسے ضعفاء کے تحمل سے خارج ہو جاتا ہے اور یہ اقویاد کا کام ہے۔

جیسے حضرت خواجہ بہاءالدین کی یہی تحقیق ہے۔ جس کا قصہ یہ ہے کہ آپ کی مجلس میں حدیث پڑھی گئی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہ کھاتے تھے بلکہ آٹے کو پیس کر پھونک سے بھوسا اڑا دیا جاتا تھا۔ جو اڑ گیا وہ اڑ گیا باقی کو گوندھ کر پکا لیا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آج سے ہمارے واسطے بھی اسی طرح آٹا گوندھا جائے اور چھلنی میں نہ چھانا جائے۔ شام کو جو روٹی اس طرح کھائی گئی سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ ہم نے بڑی گستاخی کی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا قصد کیا اور اپنے کو اس سنت پر عمل کرنے کا اہل سمجھا۔ ہم اس کے اہل نہ تھے اس لئے تکلیف ہوئی۔ آئندہ سے ہمارے واسطے چھنا ہوا آٹا ہی بدستور پکایا جاوے۔

سبحان اللہ۔۔۔ کیسا ادب تھا کوئی بے ادب ہوتا تو سنت پر اعتراض کرتا کہ اچھا سنت پر عمل کیا تھا۔ عمل بالسنت سے یہ ضرر ہوا۔ مگر حضرت شیخ نے ہم جیسوں کی تعلیم فرما دی کہ ہم اس سنت کے اہل نہ تھے کیونکہ ہمارے قویٰ ضعیف ہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قویٰ ہم سے زیادہ قوی تھے۔ اس لئے

یہ طریقہ حضورؐ ہی کے واسطے مناسب تھا۔

غرض ماکولات و مشروبات و ملبوسات میں اگر ہو سکے تو جتنا بھی ہو سکے اتباع کرے جیسے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کدو رغبت سے کھایا ہے اسی طرح آپ کو دست کا گوشت مرغوب تھا۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی مرغوب تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس میں اپنی ہمت سے آگے غلو نہ کیا جائے۔ زیادہ اہتمام اور کاوش کی ضرورت اُن امور میں ہے جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے یا مخلوق سے یعنی عبادات و معاملات۔ اور ماکول و مشروب کا تعلق تو اپنی ذات سے ہے اس میں بہت کاوش کی ضرورت نہیں۔ ہاں سہولت سے جتنا ہو جائے یہ بھی دولتِ عظیمہ ہے۔ مگر آج کل برعکس معاملہ ہے کہ ماکول و مشروب و ملبوس میں تو اتباع نبوی کاوش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور عبادات اور معاملات میں اتباع کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

اتباعِ سنّت

تو اب میں اُس مرض کے متعلق کہتا ہوں کہ ہم لوگ جو حضورؐ کا اتباع کرتے ہیں تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ اتباع تو کرتے ہیں اپنی طبیعت کا اور بوجہ علم کے اس کے دلائل احادیث سے تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ اپنی طبیعت سے خالی الذہن ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز کو اصل بنائیں پھر اُس کا اتباع کریں۔ میں دوسروں کو کیا کہوں۔ خود اپنے کو کہتا ہوں کہ مثلاً میرے اندر تیزی ہے تو میں عمل تو کرتا ہوں اپنی طبعی حدت پر مگر اس کی تائید میں حدیثیں وہ تلاش کر لی ہیں جن میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے غصہ کرنا ثابت ہے۔ مثلاً حدیث لقطہ میں آپؐ نے

سائل کے اس قول پر کہ لفظ رابل کو کیا کیا جائے، غصہ ظاہر فرمایا۔ اسی طرح دیوار قبلہ پر نخامہ (رینٹ) دیکھ کر آپؐ کو غصہ آگیا۔ نیز صحابہؓ نے مسئلہ قدر میں کلام کیا تو حضورؐ کو سخت ناگوار ہوا اور آپؐ بہت غصے ہوئے۔

میں ابھی آپ کو اپنے سے بدگمان نہیں کرتا کیونکہ بلاوجہ اپنے کو متہم کرنا بھی برا ہے۔ میں نے محض مثال دی ہے کہ ممکن ہے میری یہ تیزی اتباعِ سنت کی بنار پر نہ ہو۔ بلکہ اتباعِ طبیعت پر مبنی ہو اور سنت کو محض آڑ بنا لیا ہو۔ اور ممکن ہے کہ اتباع سنت ہی کی وجہ سے ہو۔ کیا عجب ہے کہ نظر ثانی میں یہ حالت سنت کے موافق ہی نکلے مگر جس کو اتباع سنت کا قصد و اہتمام ہے اس کو احتمال ضرور ہونا چاہئے کہ میری حالت حقیقت میں اتباع سنت کے موافق ہے یا سنت کو محض آڑ بنا لیا گیا ہے کیونکہ آج کل زیادہ تر اتباعِ سنت اسی طرح ہو رہا ہے کہ اتباع تو کرتے ہیں اپنی طبیعت کے تقاضے کا۔ طبیعت کو بدلنا اور اس پر مشقت ڈالنا بالکل نہیں چاہتے اور اس کی تائید میں علم و حفظ کی مدد سے بہت سی احادیث چھانٹ لی ہیں۔

مثلاً کسی کو عمدہ غذا کا شوق ہے اس نے یہ حدیث چھانٹ لی کہ حضورؐ نے عمدہ کھانا بھی کھایا ہے چنانچہ ایک فارسی نے آپ کی دعوت کی تھی اور عمدہ گوشت پکایا تھا۔ کسی کو عمدہ لباس کا شوق ہے اس نے وہ حدیث یاد کر لی کہ حضورؐ کی خدمت میں کسی بادشاہ نے ایک جبہ ہدیہ کیا تھا جس کی آستین وغیرہ میں ریشم کی گوٹ تھی اور آپ نے وہ جبہ زیب تن فرمایا تھا۔ کسی کو روسا کی خوشامد کی عادت ہے اس نے تالیف قلوب کے واقعات یاد کر لئے کسی

میں بخل ہے اُس نے یہ حدیث یاد کر لی کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ کچھ مال تقسیم فرمایا اور ایک شخص کو نہ دیا۔ جس پر حضرت سعد بن ابی وقاص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ انی اراہ مومنًا فقال او مسلمًا۔ اسی طرح ایک شخص لنگی پہنتا ہے وہ لبس ازار کی حدیث یاد کیے ہوئے ہے۔ دوسرا پاجامہ پہنتا ہے وہ احادیث ازار میں تاویل کرتا ہے۔ اب یہ سب احادیث کتابوں میں موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ حضور سے یہ سب افعال صادر ہوئے ہیں مگر اُن کے یاد کر لینے کا نام اتباع سنت نہیں۔

دیکھو، ایک باغ میں پھل بہت قسم کے ہیں۔ ایک درخت انار کا بھی ہے ایک درخت امرود کا بھی ہے۔ ایک دو ناشپاتی کے بھی ہیں مگر یہ بتاؤ کہ اس کو کس چیز کا باغ کہا جائے گا۔ یقینًا جس پھل کا غلبہ ہو گا اور جو پھل زیادہ ہو گا اسی کا باغ کہلائے گا۔ اگر آم زیادہ ہیں تو اُس کو آم کا باغ کہیں گے ایک امرود کے درخت سے اس کو امرود کا باغ کوئی نہ کہے گا۔

اسی طرح یہاں سمجھو کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے واقعات تو بہت ہیں ہر قسم کے واقعات آپ کو احادیث میں مل جائیں گے۔ مگر اس سے آپ کا طرز ثابت نہیں ہو سکتا۔ آپ کی طرز و عادت وہ ہے جو غالب و مستمر ہو۔ پس غالب حالت اور دائمی عادت کو دیکھو اور اس کا اتباع کرو۔ یہ اتباع حقیقی ہو گا اتفاقی واقعات کے اتباع کا نام اتباع سنت نہیں۔ پھر علماء کو تو علم سے اس کا پتہ چلے گا کہ غالب حالت حضورؐ کی کیا تھی اور عوام کو چاہیے کہ کتب واقعات وسیرت کا مطالعہ کر کے دیکھیں کہ غالب واقعات کس قسم کے ہیں۔ جو غالب

عادت ہوا اُس کو اصل قرار دو اور دوسرے کو عارض پر محمول کرو۔

قلت عمل اور مقصودیت

مگر یہاں ایک بات اہل علم کے سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ صورۃً عمل قلیل ہوتا ہے مگر معناً کثیر و غالب ہوتا ہے۔ جیسے تراویح میں عمل تو تین رات ہوا ہے اور خشیت افتراض کی وجہ سے ترک زیادہ ہوا لیکن یہ ترک عارض سے تھا اور عمل اصل، پس اُسی کو راجح کہیں گے اور تراویح کو سنت کہیں گے۔

یہاں سے غیر مقلدوں کا جواب ہو گیا جو کہ تراویح کی آٹھ رکعت پڑھتے ہیں اور بیس کو یہ دعویٰ کر کے بدعت کہتے ہیں کہ حضورؐ نے بیس نہیں پڑھیں۔ سو اوّل تو یہی متکلم فیہ ہے کہ بیس کا ثبوت نہیں لیکن بعد تسلیم کے ہم کہتے ہیں کہ جس طرح حضورؐ نے بیس رکعت نہیں پڑھیں اسی طرح آپ نے تراویح تین دن سے زائد نہیں پڑھیں۔ پس تم بھی عمر بھر میں تین دن سے زائد نہ پڑھو۔ کیونکہ حدیث میں زائد کا ثبوت نہیں۔ اس لئے یہ بدعت ہے۔ پس جس دلیل سے تم استمرار عمل کا بدعت نہ ہونا ثابت کرو گے اور وہ عمل ہے صحابہ کا۔ اسی دلیل سے ہم بیس رکعت کا بھی بدعت نہ ہونا ثابت کر دیں گے۔

خلاصہ یہ کہ عادت غالبہ معلوم کرنے کا مدار صرف کثرت عمل پر نہیں ہے بلکہ کبھی عادت کا غالب ہونا کثرتِ وقوعِ عمل سے معلوم ہوتا ہے اور کبھی غلبہ مقصودیت سے معلوم ہوتا ہے اور اس کے لئے تراویح کی نظیر کافی ہے۔ کیونکہ یہاں وقوع کے اعتبار سے تو عمل قلیل ہے مگر مقصودیت کے اعتبار سے غالب ہے۔ پس یہاں عمل کی قلت و کثرت پر مدار نہ ہو گا۔

اسی طرح رفع یدین و عدم رفع میں فقہاء نے کثرت عمل و قلت عمل کو نہیں دیکھا بلکہ مقصودیت پر نظر کی ہے۔ بعض نے رفع کو مقصود سمجھا کیونکہ نماز فعل وجودی ہے اور رفع بھی وجودی ہے تو دونوں میں تناسب ہے۔ اور بعض نے عدم رفع کو مقصود سمجھا کیونکہ نماز کا مبنیٰ سکون پر ہے۔ حدیث مسلم میں ہے اُسْكُنُوْا فِي الصَّلٰوةِ (نماز میں سکون سے رہو) اور تکرار رفع سکون کے منافی ہے اور کہیں کثرت و مقصودیت دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔ جیسے منبر سے نیچے نماز پڑھنا کہ صلوٰۃ تحت المنبر عملاً بھی کثیر ہے۔ صلوٰۃ فوق المنبر کا وقوع قلیل ہے۔ اور مقصودیت بھی تحت المنبر میں ہے اور زیادہ تر ایسا ہی ہے کہ جو عمل وقوع میں کثیر ہوتا ہے مقصودیت بھی اس میں غالب ہے۔ مگر بعض دفعہ اس کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ اس لئے حضورؐ کے طرز عمل سے آپ کی عادت و سنت کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں بلکہ محقق کا کام ہے۔ یہ بات قابل تحقیق و تدقیق ہے کہ مقصودیت کہاں ہے کہاں نہیں۔ اس لئے کسی بزرگ کے عمل کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل کثیر کے خلاف اور عمل قلیل کے موافق دیکھ کر اُن پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ممکن ہے ان کے نزدیک عمل قلیل ہی میں مقصودیت ہو۔

مثلاً شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحؒ میں تیزی غالب تھی اور یہ بات حضورؐ کی عادت غالبہ کے بظاہر خلاف ہے تو اپنے کو تو تم متہم سمجھو اگر تمہارے اندر ایسا ہو مگر بزرگوں پر اعتراض نہ کرو بلکہ یہ تاویل کرو کہ حضورؐ کی تیزی مقتضیٰ کی وجہ سے تھی یعنی معتوب کی بیہودگی کی وجہ سے اور اس وقت بوجہ سلامت طبائع کے اس مقتضیٰ کا وجود کم تھا۔ اس لئے تیزی کا وقوع بھی آپ سے کم ہوا۔

(اگر حضورؐ کے زمانہ میں بھی مقتضی کا وجود زیادہ ہوتا تو آپ کی تیزی کا وقوع بھی زیادہ ہوتا جیسا کہ موسےٰ علیہ السلام میں ہوا) اور اب مقتضی زیادہ ہے، اس لیے شاہ صاحب میں اس کا ظہور زیادہ ہوا۔

غرض اس طریق میں چین واطمینان اور بے فکری ہوا تک نہیں چنانچہ اتباع سنت کی حقیقت عادت غالبہ کا اتباع بتلایا گیا تھا۔ اب عادتِ غالبہ کی تحقیق میں خدشہ پیدا ہو گیا کہ اس کا مدار بھی محض کثرتِ عمل پر نہیں رہا۔ اب قدم قدم پر غور و فکر کی ضرورت ہے کہ کہاں عمل غالب ہے مع مقصودیت کے اور کہاں مقصودیت، غالب ہے بدون عمل کے۔ پھر چین اور بے فکری کہاں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گہہ چنیں بنماید و گہہ ضد ایں   جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

اور فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش   تا دم آخر دمے فارغ مباش

راہِ سلوک میں بہت تراش خراش ہیں لہذا آخر دم تک ایک دم کے لیے فارغ نہ ہو بلکہ کام میں لگے رہو۔

تا دم آخر دمے آخر بود   کہ عنایت با تو صاحب سر بود

ضرورتِ طلب

بس یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ عمر بھر بے چین رہو اور فکر میں لگے رہو۔ اپنی حالت کو اچھا نہ سمجھو بلکہ متہم سمجھو۔ حضرت حاجی صاحبؒ کا الحزم سوء الظن ط کی تفسیر میں ارشاد ہے کہ ہوشیار وہ ہے جو کہ اپنے نفس سے بدگمان رہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

ہے کہ جس کو تمام عمر کام کرکے ساری عمر میں یہ بات حاصل ہو جائے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا اس کو سب کچھ حاصل ہو گیا۔ مبارک ہے وہ شخص جو عمر بھر اسی ادھیڑ بن میں لگا رہے کہ میری حالت اچھی ہے یا بری۔

صاحبو ـــ طلب ہی مطلوب ہے۔ تمہارا یہی کام ہے پس تم عمر بھر طلب ہی میں رہو۔ یہ بات میں نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنی ہے کہ طلب مطلوب ہے وصول مطلوب نہیں کیونکہ وہ تمہارے قبضہ میں نہیں۔ پس تم کسی وقت اپنے کو فارغ نہ سمجھو۔ جس نے اپنے کو فارغ و کامل سمجھ لیا اور اپنی حالت پر مطمئن اور بے فکر ہو گیا وہ برباد ہو گیا ـ ۔ سن لو خوب غور سے سن لو۔ اطمینان تو اللہ نے چاہا جنت ہی میں ہو گا یہاں اطمینان کہاں؟ ہمیشہ اپنے کو متہم سمجھو۔ کبھی اپنی حالت پر اطمینان نہ کرو اور ہر وقت طلب میں لگے رہو۔ پھر کیا ہو گا ؎

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

جہاں درد ہوتا ہے دوا کی وہیں ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں بیماری ہوتی ہے شفا وہیں جاتی ہے۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

پانی ڈھال ہی کی طرف جاتا ہے۔ جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو حل کی وہیں ضرورت ہوتی ہے۔

اپنے اندر طلب کی پیاس پیدا کرو۔ ابر رحمت کی بارش ہونے لگے گی۔ اپنے کو عاجز و فانی سمجھو۔ حق تعالیٰ تم کو قوت و ہمت عطا فرمائیں گے ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں را یک زمانے خاک باش

برسوں تو سخت قسم کا پتھر بنا رہا۔ آزمائش کے لئے چند روز کے
لئے خاک بن جا۔

خاک ہونے سے کیا ہو گا ؎

در بہاراں کے شود سر سبز سنگ   خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتا ہے۔ خاک ہو جاتا کہ رنگ برنگ
کے پھول کھلیں۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ   جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

عقل اور سمجھ کو تیز کر لینا راہ سلوک نہیں۔ حق تعالیٰ اُس کی دست
گیری کرتا ہے جو شکستگی اختیار کرتا ہے۔

شکستگی اور بندگی و بیچارگی اختیار کرو۔ اپنے اعمال و احوال پر ناز نہ کرو ؎

پیش یوسفؑ نازش و خوبی مکن   جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

ناز را روئے بباید ہمچو ورد   چوں نداری گرد بد خوئی مگرد

عیب باشد چشم نابینا و باز   زشت باشد روئے نازیبا و ناز

چوں تو یوسفؑ نیستی یعقوبؑ باش
ہمچو او با گریہ و آشوب باش

یوسفؑ کے سامنے ناز مت کر۔ سوائے آہ و نیاز یعقوبؑ کے
کچھ مت کر۔ ناز و ادا کے لئے حسین چہرہ چاہیے۔ جب تم حسن نہیں
رکھتے بد خوئی کے پاس مت جاؤ۔ جس طرح نابینا آنکھ کے لئے کھلا
ہوا ہونا بُرا ہے اسی طرح نازیبا شکل کے لئے ناز بُرا ہے۔ جب

تم یوسفؑ نہیں ہو یعقوبؑ ہی رہو اور اُن کی طرح گریہ و آشوب میں رہو۔

مگر یہ جو میں نے کہا ہے کہ اپنے کو متہم نہ سمجھو کبھی اپنے حال پر اطمینان نہ کرو اس کی سرحد ناشکری سے ملی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ یہ بھی سمجھے کہ اس وقت جو کچھ بھی میری حالت ہے جیسی کچھ بھی ہے یہ سب خدا کا فضل ہے بلا بود ے گر اینہم نہ بودے (اگر اتنا بھی نہ ہوتا تو مصیبت ہو جاتی) اب بحمد اللہ تواضع و شکر دونوں جمع ہو گئے۔ اور ناشکری کی سرحد سے بچے رہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں کہ اس طریق میں بحر تلخ و بحر شیریں ساتھ ساتھ ہیں مگر محقق اُس برزخ سے واقف ہوتا ہے جو دونوں کو کبھی ملنے نہیں دیتا ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں　　　در میانِ شاں برزخ لایبغیاں

پھر بتلایئے یہاں بے فکری اور اطمینان کہاں؟ یہاں تو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں جن معمولی بی کی فرمائش پر اس وقت بیان کر رہا ہوں اُنہوں نے ایک رات ہمارے یہاں بھی کرم فرمایا تھا۔ جب رات کے دو بجے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور ادعیہ ماثورہ آواز کے ساتھ پڑھنے لگیں۔ میری آنکھ کھل گئی اور مجھ کو شرم آئی کہ ایک اللہ کی بندی تو ذکر اللہ میں مشغول ہے اور میں پڑا سو رہا ہوں مگر اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ بہت سویرا تھا۔ میرے نفس نے کہا ابھی سو رہو اور یہ تاویل کی کہ نَوْمُ الْعَالِمِ عِبَادَۃٌ کہ عالم کا سونا عبادت ہے مگر اُن کی برکت نے مجھے حرکت پر مجبور کیا اور دل نے کہا ؎

یک شبے در کوئے بیخواباں گذر
خواب را بگذار امشب اے پسر

ان بے خوابوں کی کیا حالت ہے؟ اُن کی یہ حالت ہے ؎

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے
کہ یارے بر خورد از وصل یارے

اور یہ حالت ہے ؎

بفراغِ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

اور یہ حالت ہے کہ ؎

دل آرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور وہ اُس وقت یوں کہتے ہیں ؎

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدخو نکند بکس نگاہے

سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے مگر میں کہ ایک چاند کے خیال میں مست ہوں۔ کیا کروں کہ یہ آنکھ ایک کے سوا کسی طرف دیکھتی ہی نہیں ہے۔

نواب شیفتہ نے اس وقت کا فوٹو خوب کھینچا ہے فرماتے ہیں ؎

چہ خوش است با تو بزمے بنہفتہ ساز کردن
درِ خانہ بند کردن سرِ شیشہ باز کردن

اے اللہ! اے اللہ!! (بکی الشیخ و ولول وصاح واضطراب۔ پھر کسی قدر توقف و سکوت کے بعد فرمایا کہ) پھر میں کھڑا ہو گیا اور کچھ کام کر لیا۔

پھر سو گیا۔ مگر جب بھی آنکھ کھلی اُن کو کام میں مشغول پایا اور ذکر کی آواز آتی رہی۔

شانِ محقق

اس وقت مجھے خیال ہوا کہ صبح کے وقت اُن کو متنبہ کروں گا کہ رات کے وقت جہر بالذکر مناسب نہیں کیونکہ اس میں نائم کی تشویش ہے اور فقہاء نے اس سے منع فرمایا ہے۔ مگر اس خیال کے ساتھ ہی جواب ذہن میں آیا اور غالباً وہ بھی یہی جواب دیتے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک بار تفقدِ احوالِ صحابہؓ کے لئے رات کو اٹھے۔ پھر حضرت ابو بکرؓ کو دیکھا کہ آہستہ آہستہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ زور زور سے بلند آواز کے ساتھ قرآن مجید پڑھ رہے ہیں۔ صبح ہوئی اور حضورؐ نے سب سے فرمایا کہ تم ایسا کیوں کر رہے تھے اور تم ایسا کیوں کر رہے تھے۔ سب نے کچھ وجوہ بیان فرمائے۔ پھر حضورؐ نے فیصلہ فرمایا کہ اے ابو بکرؓ! تم کسی قدر اپنی آواز کو اونچا کر دو اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم اپنی آواز کو ذرا پست کر دو۔ نیز جماعت اشعریین کی حضورؐ نے تعریف فرمائی کہ مجھے اُن کے منازل کا علم اُن کی آواز سے ہو جاتا ہے جب کہ رات کو وہ قرآن پڑھتے ہیں۔ اور آیت وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ آپ رات کو اپنے اصحاب کا تفقد فرماتے تھے اور اس وقت آپؐ صحابہؓ کی آواز سے اُن کے عمل کو معلوم فرماتے تھے۔

اب بتلایئے میں اس ادھیڑبن کو کیا کروں کہ پہلے ایک خیال آیا اور ساتھ ہی اس کا جواب بھی ذہن میں آگیا۔ تو میں خاموش ہو گیا مگر چونکہ اس حدیث میں اور فقہاء کے فتویٰ میں بظاہر تعارض ہوا اس لئے پھر فکر میں لگ گیا۔ چنانچہ

پھر اس تعارض کو اس طرح رفع کیا کہ سونے والے دو قسم کے ہیں ایک وہ جو تہجد کے لیے جاگنا چاہیں۔ دوسرے وہ جو جاگنا نہ چاہیں۔ جو جاگنا چاہیں، اُن کے پاس ذکر بالجہر کی اجازت ہے۔ چنانچہ ہم نے خانقاہ میں رات کو دو بجے کے بعد ذکر بالجہر کی اجازت دے رکھی ہے کیونکہ وہ سب جاگنا چاہتے ہیں اور جو جاگنا نہ چاہے اُس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ خانقاہ میں تمہاری رعایت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ سونے والوں کی جگہ نہیں۔ اور جو لوگ سونا چاہیں اُن کے پاس بیٹھ کر ذکر جہر ممنوع ہے تاکہ اُن کی نیند میں خلل نہ آئے۔

اب اسی مسئلہ میں دیکھیئے کہ فقہاء کا فتویٰ تو یہ تھا کہ سونے والوں کے پاس ذکر جہر مکروہ ہے مگر احادیث میں ایسے واقعات ملے جن سے رات کے وقت ذکر جہر کا نائمین کے پاس ثبوت ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کا قول حضورؐ کے جواب میں یہ تھا۔ کُنْتُ اُطْرِدُ الشَّیْطَانَ وَ اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ۔ کہ میں بلند آواز اس لیے کر رہا تھا کہ شیطان کو بھگاتا اور سونے والوں کو جگاتا تھا۔ ایسے موقعہ میں غلبۂ مقصودیت سے فیصلہ کیا جائے گا۔ اور دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ میں نائمین کے پاس رفع صوت بالذکر عارض کی وجہ سے تھی کہ وہاں سب لوگ رات کو جاگنا چاہتے تھے۔ سب تہجد کے عادی تھے اور اصل مقصود عدم رفع ہے۔

پس اب اُن بڑی بی کے عمل کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ جہاں مہمان ہوا کریں گھر والوں سے پوچھ لیا کریں۔ اور عدم رفع صوت عند النائم کی مقصودیت کی دلیل میں حضرت عائشہ کی حدیث مجھے یاد آئی کہ باوجودیکہ حضرت عائشہؓ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عاشق تھیں کہ حضورؐ کے کسی فعل سے اُن کو ایذا نہ ہو سکتی تھی مگر حضورؐ ان کے سوتے ہوئے ان کے پاس ہر کام آہستہ سے کرتے تھے۔ حالانکہ وہ ایسی عاشق تھیں کہ فرماتی ہیں ؎

لَوَاحِیْ زُلَیْخَا لَوْ رَأَیْنَ جَبِیْنَہٗ

لَاٰثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَی الْیَدِ

زلیخا کی ہمجولیاں اگر میرے محبوب کی پیشانی دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھوں کے ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کر دیتی۔

کسی شاعر نے حضرت زلیخا کے قول ہذا الذی لمتننی فیہ کا ترجمہ خوب کیا ہے ؎

اینست کہ خوں خوردہ و دلبردہ بسے را

بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

زلیخا نے زنانِ مصر سے اُن کی ملامت کے جواب میں کہا تھا کہ لو دیکھ لو میرا محبوب یہ ہے جسے دیکھ کر تم نے مبہوت ہو کر بجائے نارنگی کے اپنے ہاتھ کاٹ لیے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یہ عورتیں اگر حضورؐ کو دیکھ لیتیں تو اپنے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتیں۔ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت یوسف علیہ السلام کے حُسن میں فرق یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کے حُسن کا رُعب اوّل دہلہ میں زیادہ ہوتا تھا کہ تحمل نہ ہو سکتا تھا پھر رفتہ رفتہ تحمل ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت زلیخا کو تحمل ہو گیا تھا اور حضورؐ کے حُسن کا اوّل دہلہ میں تحمل ہو جاتا تھا مگر جُوں جُوں غور کیا جاتا دل قابو سے نکلا جاتا اور تحمل دشوار ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ آپ پر مرد بھی عاشق تھے اور بچے بھی عاشق تھے اور حضرات صحابہؓ نے کیسی کیسی

جانبازی اور جاں نثاری سے آپ کے عشق میں جان دی ہے۔ غرض حضرت عائشہ حضورؐ کی بے انتہا عاشق تھیں، پھر ایسے عاشق کو آپ کی آواز یا آہٹ سے تکلیف کہاں ہو سکتی تھی۔ اور ہوتی بھی تو وہ یوں کہتیں ؎

دل فدائے یار دل رنجانِ من　　　ناخوش تو خوش بود بر جانِ من

تیری وہ باتیں جو بظاہر ناگواری کی ہوتی ہیں میرے لئے وہ باعثِ راحت ہیں اور تجھ جیسے ستانے والے پر دل و جان سے قربان ہوں۔

مگر حدیث میں ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اہل بقیع کے واسطے دُعا کا حکم ہوا تو آپ آدھی رات کے قریب اٹھے اور آہستہ سے جوتا پہنا اور آہستہ سے کواڑ کھولے اور آہستہ سے چلے۔ غرض ہر کام آہستہ سے کیا تاکہ حضرت عائشہؓ کی آنکھ نہ کھل جائے کہ آنکھ کھلنے سے خود بھی اذیت ہوتی ہے اور تنہائی سے بھی وحشت ہوتی ہے آپ کی روانگی کے بعد حضرت عائشہؓ کی آنکھ کھلی اور حضورؐ کو بستر پر نہ پایا تو پریشان ہو گئیں ؎

عشق است و ہزار بد گمانی　　　باسایۂ تو نیز ہم پسندم

یہ وسوسہ ہوا کہ شاید آپ کسی دوسری بیوی کے پاس تشریف لے گئے ہیں، پھر عاشق کو یہ کہاں گوارا کہ محبوب رقیب کے پاس جائے۔ وہ تو رقیب کے لئے محبوب کے ہاتھ سے تکلیف کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ ایسی تکلیف بھی اپنے ہی لئے چاہتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی　　　نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت

آپ کی تلوار سے ہلاک ہونا خدا کرے دشمن کے نصیب میں نہ ہو
دوستوں کا سر سلامت ہے جب چاہیں خنجر آزمائی فرمالیں۔

اور حضورؐ کی محبوبیت تو ایسی تھی کہ جانور تک آپ کے عاشق تھے حدیث میں ہے کہ جس وقت حضورؐ نے حج وداع کیا ہے تو اپنی طرف سے سو اونٹوں کی قربانی کی، جن میں تریسٹھ اونٹ خود اپنے دست مبارک سے نحر فرمائے حدیث میں ہے کلّھنّ یزدلفن الیہ کہ سب کے سب حضورؐ کے برچھے کی طرف بڑھتے اور گردن آگے کرتے تھے کہ پہلے مجھ کو نحر کیجیے۔ اس وقت یہ شعر صادق آرہا تھا ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سر خود نہادہ بر کف
بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

جنگل کے تمام ہرن اپنے سر ہتھیلی پر رکھے اس امید میں کھڑے ہیں
کہ شاید تم کسی روز شکار کے لیے آجاؤ۔

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے حضور مفلس نہ تھے۔ کہیں مفلس بھی سو اونٹ کی قربانی کر سکتا ہے۔ ہمارے حضور بادشاہ تھے اور بڑے بادشاہ تھے کیونکہ بادشاہوں سے بھی ایسا کم سنا گیا ہے کہ کسی نے سو اونٹ کی قربانی کی ہو۔ اور حضورؐ کا جو فقر تھا وہ اختیاری تھا کیونکہ آپ مال جمع نہ کرتے تھے۔ غرض آپ تارک الدنیا تھے متروک الدنیا نہ تھے۔

بہر حال حضرت عائشہؓ بھی حضور کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئیں دیکھا کہ آپ بقیع میں مردوں کے لئے دعا کر رہے ہیں۔ اب چاہئے تھا کہ حضرت عائشہؓ

فوراً لوٹ آئیں مگر شاید خیال ہوا ہو کہ شاید آپ مُردوں سے فارغ ہو کر زندوں کے پاس جائیں۔ اس لئے ٹھہر گئیں۔ جب آپ دُعا سے فارغ ہو کر واپس ہوئے تو حضرت عائشہ رض بھی واپس ہوئیں مگر بقیع کو جاتے ہوئے تو یہ پیچھے تھیں اب حضور ؐ سے آگے ہو گئیں۔ حضور کو شبہ ہوا یہ آگے آگے کون ہے آپ تیزی کے ساتھ چلے۔ حضرت عائشہ بھی دوڑیں۔ چونکہ اس وقت یہ ہلکی پھلکی تھیں اس لئے دوڑ کر آپ سے پہلے گھر پر پہنچ گئیں مگر دوڑنے کی وجہ سے سانس پھول گئی۔ حضور ؐ جو تشریف لائے اور اُن کی سانس پھولی ہوئی دیکھی تو فرمایا یَا عَائِشَۃُ مَالَکِ حَشْیَا رَابِیَۃً کہ اے عائشہ رض! تمہاری سانس کیوں پھولی ہوئی ہے۔ کہا کچھ نہیں۔ فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بقیع سے لوٹتے ہوئے میرے آگے آگے تم ہی تھیں۔ انہوں نے اقرار کیا۔ فرمایا اَخَشِیْتِ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰہُ عَلَیْکِ وَرَسُوْلُہٗ۔ کیا تم کو یہ اندیشہ ہوا کہ اللہ اور رسول ؐ تمہاری حق تلفی کریں گے؟ ہرگز نہیں!

تو حضور ؐ نے اس واقعہ میں اس قدر احتیاط کی حالانکہ حضرت عائشہ رض کی اذیت کا کوئی احتمال نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ حکم مقصود وہی ہے جو فقہاء نے فرمایا ہے۔ اور جن واقعات میں جہر بالقراءۃ صحابہ سے رات کے وقت ثابت ہے وہ عارض پر محمول ہے کہ وہاں سب لوگ رات کو اٹھنے والے تھے۔

مگر اب یہاں یہ سوال ہوگا کہ کیا حضرت عائشہ رض رات کو اٹھنا نہ چاہتی تھیں اگر وہ بھی نہ چاہتی تھیں تو پھر دوسری عورتوں کا کیا ٹھکانا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رض اٹھنا چاہتی تھیں مگر اخیر شب کو اور

اس واقعہ میں حضورؐ سویرے اٹھے تھے اس لئے ان کو جگانا نہیں چاہا (بخاری میں حضرت عائشہؓ کا قول مذکور ہے فَاِذَا اَوْتَرَ اَیْقَظَنِیْ ط کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم جب وتر پڑھنا چاہتے تو مجھے جگا دیتے) یا یہ کہ حضورؐ نے ان سے زیادہ محنت لینا گوارا نہ کی ہو ان کو تھوڑی ہی سی محنت میں کامیاب کر دیا ہو۔

جیسے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ آپ نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے محنت کم لی تھی۔ ایک بار یہ سب حضرات خانقاہ تھانہ بھون میں مجتمع تھے۔ مولانا رشید احمد صاحبؒ وغیرہ تو دو بجے اٹھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے بھی دو بجے اٹھنے کا قصد کیا۔ حاجی صاحب نے منع فرمایا کہ ابھی نہیں ابھی رات بہت ہے سو رہو۔ جب ایک گھنٹہ رات رہ گئی اس وقت جگا دیا کہ اب اٹھو۔ کیونکہ مولانا بہت نازک مزاج تھے۔ اگر زیادہ محنت کرتے تو دماغ پر تعب ہوتا۔

اسی طرح اگر حضورؐ نے بھی ایسا ہی کیا ہو تو کیا عجیب ہے کہ حضرت عائشہؓ سے محنت کم لی ہو۔ محقق وہی ہے جو ہر شخص سے اس کے مناسب کام لے۔ یہ نہیں کہ سب کو چوبیس ہزار ہی اسم ذات بتلایا کرے۔ ہمارے حاجی صاحب نے بعض لوگوں سے صرف اتنا کام لیا کہ تم خانقاہ والوں کی کچھ خدمت کر دیا کرو۔ اور کسی کو ایک ہزار دو ہزار اسم ذات بتلایا اور کمال یہ ہے کہ ہر شخص کامیاب تھا۔ تھوڑی محنت کرنے والا بھی۔ تھوڑی محنت کرنے والے کو منزل پر اس طرح پہنچاتے تھے کہ اسے خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالارانند ۔۔۔۔ کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را

نقشبندیہ حضرات بھی عجب سالار قافلہ ہیں کہ پوشیدہ راستے سے قافلہ کو حرم تک پہنچا دیتے ہیں ۔

محقق کی یہی شان ہے خواہ نقشبندی ہو یا چشتی ہو ۔ پس اتباع سنت کی حقیقت یہ نہیں کہ اپنی طبیعت کے تقاضے پر عمل کیا جائے اور اس کی تائید میں ایک دو حدیث ڈھونڈھ لی جائیں ۔

تقاضائے اتباعِ سُنّت

بلکہ اتباع سنت یہ ہے کہ حضور ؐ کی عادت غالبہ کا اتباع کیا جائے اور اس کے لئے مطالعہ سیرت نبویہ ؐ کی بھی ضرورت ہوگی ۔ سیرت نبویہ ؐ میں میرا رسالہ نشر الطیب مفصل ہے ۔ اگر اتنی فرصت نہ ہو تو حیوٰۃ المسلمین کا مطالعہ کر لیا جائے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا خلاصہ ہے ۔ اس لئے جوش محبت میں یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ ختم ماہ ربیع الاول تک جس کی فرمائش آئے گی اس سے محصول ڈاک بھی نہ لیا جائے گا ۔ اور یہ سخاوت میں اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے اطمینان ہے کہ درخواستیں آویں ہی گی نہیں ۔ مسلمان کچھ ایسے بے فکرے ہیں کہ ہر شخص اپنے کو بنا بنایا کامل سمجھتا ہے ۔ اصلاح حال کی فکر ہی نہیں ۔ حیات المسلمین کا نسخہ اگر لیں گے بھی تو عمل کے لئے نہیں بلکہ محض برکت کے لئے ۔ جیسے شجرہ پڑھا کرتے ہیں ۔ ہمارے حاجی صاحب کا شجرہ تو عمدہ ہے مگر اکثر شجرے تو محض فضول ہیں جن میں بے تکے اشعار ہیں ۔ وہ تو بقول علی حزیں کے محض تذکرۃ الاولیا ہی ہیں ۔ اور صاحبو! آپ کو مثرہ کے ہوتے ہوئے شجرہ

کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں اگر ثمرہ ایسا ہوتا جس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا تو شجرہ کی بھی ضرورت ہو سکتی تھی مگر یہ ثمرہ تو ایسا ہے ؎

خود قوی تر می شود خمر کہن　　خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

پرانی شراب زیادہ تیز ہو جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ کی طرف سے ہو۔

اور اس میں وہ قوت ہے کہ ؎

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروے تو کردم جواں شدم

ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں مگر جس وقت تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں۔

اس ثمرہ میں فساد کا اندیشہ ہی نہیں اس میں تو اصلاح ہی اصلاح ہے بہر حال حضور کی سیرت کا مطالعہ کرو جس کو میں نے مختصر حیوۃ المسلمین میں جمع کر دیا ہے میں نے اس کے اوّل میں یہ شعر لکھا ہے ؎

فتوح فی فتوح فی فتوح　　و روح فوق روح فوق روح

اور اخیر میں یہ لکھ دیا ہے کہ اس مضمون کو روزانہ بلا ناغہ پڑھتے رہیں میں سچ کہتا ہوں کہ اس دو ورقہ کو آپ روزانہ پڑھتے رہے تو ضرور نفع ہوگا ضرور نفع ہوگا۔ ضرور نفع ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ مسئلہ کا بیان تو ہو گیا۔

اب یہ سوال ہوگا کہ حدیث سے اس کو کیا مناسبت و ربط ہے جو شروع میں تلاوت کی گئی ہے۔ سو میں اس کو بھی بتلاؤں گا۔ گو زیادہ ربط نہ ہو مگر مواا رما

میں تو اس سے بھی بڑھ کر بے ربطی گوارا کر لی جاتی ہے۔ جیسے ایک واعظ نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ کی تفسیر میں شہادت نامہ بیان کیا تھا کہ یہ سورت اُس رسولؐ پر نازل ہوئی ہے کہ جن کے نواسے میدانِ کربلا میں شہید ہوئے تھے بس اسی ربط سے آپ نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ کے تحت میں شہادت کا قصہ بیان کر دیا۔

سو میرے بیان میں ایسا مہمل ربط تو انشاء اللہ تعالیٰ نہ ہو گا۔ اس سے تو میں آپ کو مطمئن کرتا ہوں۔ ہاں ضعف ربط شاید ہو۔ میرے نزدیک تو ضعف بھی نہیں۔ مگر سامعین کو میں اجازت دیتا ہوں کہ وہ اس ربط کو اگر ضعیف سمجھیں تو مضائقہ نہیں۔ ربط یہ ہے کہ حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھئے کہ گو غضب بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے مگر چونکہ اس کا وقوع کم ہوتا ہے۔ اس لئے اسماء الٰہیہ میں کوئی نام ایسا نہیں جو صفت غضب پر دال ہو۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا نام رحمٰن ہے، رحیم ہے، ودود ہے، منتقم ہے مگر غضبان یا غضوب خدا کا نام نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعتبار صفت غالبہ کا ہے اور موصوف کو ہمیشہ صفت غالبہ ہی کے ساتھ موسوم کیا جاتا ہے۔ نہ صفت غیر غالبہ کے ساتھ۔

چنانچہ ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں نزع روح کا بیان ہے کہ ملائکہ جب مسلمان کی روح قبض کرنے آتے ہیں تو اس کو بشارت دیتے ہیں۔

اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي اِلٰى رَوْحٍ وَّرَيْحَانٍ وَّرَبٍّ

غَيْرَ غَضْبَانَ ط

کہ اے نفس مطمئنہ راحت اور نعمت اور اپنے رب کے

پاس چل جو غصہ والا نہیں ہے۔

اس کے بعد نزع روح کافر کا بیان ہے مگر وہاں یہ نہیں ہے کہ اخرجی الیٰ رب غضبان غیر رحمٰن۔ بلکہ صرف عذاب کا ذکر ہے۔ پس یوں کہنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی اصل صفت تو رحمت ہی ہے۔ اور اصلی کے یہ معنی ہیں کہ جس کا ظہور مقتضی کے ساتھ بھی ہو اور بلا مقتضی کے بھی ہو۔ یہ خاص اصطلاح ہے جو میں نے تفہیم کے لئے اختیار کی ہے ورنہ صفات قدیمہ سب اصلی ہیں مگر حدیث میں رحمت و غضب میں فرق ثابت ہے۔ اس لئے میں اس فرق کو اس عنوان سے جدید اصطلاح کے ساتھ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اصلی صفت تو وہ ہے جو بلا مقتضی بھی ظاہر ہو اور غیر اصلی وہ ہے جو بلا مقتضی ظاہر نہ ہو پس سبقت رحمت کے معنی یہ ہیں کہ رحمت کا ظہور تو مقتضی سے بھی ہوتا ہے اور بدون مقتضی کے بھی اور غضب کا ظہور ہمیشہ مقتضی ہی سے ہوتا ہے بدون مقتضی کے نہیں ہوتا۔ اور چونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مظہر اتم صفات باری ہیں اس لئے حضورؐ کی بھی یہی شان ہے کہ آپ میں رحمت کا غلبہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ط فرمایا ہے اور سخت کلامی و سنگ دلی سے آپ کی برائت کی ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ

الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ـــــــ الآیہ

پس خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ اُن کے ساتھ نرم رہے
اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ سب آپ کے
پاس سے منتشر ہو جاتے۔

یہ حضورؐ کی اصلی صفت ہے اور غضب۔ عادت آپ کی اصلی صفت نہیں بلکہ کسی عارض و مقتضی کی وجہ سے اس کا ظہور ہوا ہے۔ اب بتلائیے کہ حضورؐ کا اتباع آپ کی صفات اصلیہ کا اتباع ہے یا صفات عارضیہ کا۔ یقیناً ہر شخص یہی کہے گا کہ حضورؐ کا اتباع یہی ہے کہ صفات اصلیہ میں آپ کا اتباع کیا جائے ورنہ حضورؐ سے بعض دفعہ نماز فجر بھی قضا ہوئی ہے۔ تو کیا تم بھی اس عارض کا اتباع کر کے ہر روز نماز فجر قضا کیا کرو گے؟ ہرگز نہیں!

یہ مثال عجیب ذہن میں آئی کہ جس نے راستہ کو واضح کر دیا۔ پھر دوسری صفات میں بھی یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کا ظہور عارض کی وجہ سے ہوا ہے۔ پس حضورؐ کا اتباع یہ ہے کہ جو افعال و صفات آپ کے اصلی ہیں وہ تمہارے اندر بھی اصلی ہوں کہ زیادہ غلبہ اور ظہور انہی کا ہو اور جو صفات اور افعال حضورؐ کے لئے عارضی ہیں وہ تمہارے اندر بھی عارضی ہوں۔ اور یہ اتباع نہیں کہ تم حضورؐ کے عارضی افعال و صفات کو جن کا ظہور کسی مقتضی کی وجہ سے نادرا حضورؐ سے ہوا تھا اپنے لئے اصلی صفات بنا لو کہ اس سے زیادہ تو منع میں نہیں کر سکتا۔

ہاں شاہ فضل الرحمن صاحب جیسے بزرگوں کی طرف سے ہم یہ تاویل کر سکتے ہیں کہ جس عارض و مقتضی کی وجہ سے کبھی حضورؐ صلے اللہ علیہ وسلم نے غصہ

کیا ہے مولانا کے نزدیک وہ مقتضی آج کل زیادہ ہے۔ اس لئے مولانا سے ظہور غضب زیادہ ہو رہا ہے۔ گو ایسے بزرگوں کو بھی مریدوں کی اس تاویل سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اپنی حالت پر نظر ثانی و نظر ثالث کرتے رہنا چاہیئے ۵

اندریں راہ می تراش و می خراش تادم آخر دمے فارغ مباش

بحمد اللہ! اس حدیث سے جس مسئلہ کا استنباط ہوا تھا اس کا ربط بھی حدیث کے ساتھ واضح ہو گیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور جو مضمون اس حدیث کا مدلول مقصود ہے اس کا ذکر واعظ کا غیر مقصود ہو کر پہلے ہو چکا ہے پس یہ بھی ایک لطیفہ ہو گیا کہ غیر مقصود کا ذکر مقصود ہو کر ہو گیا اور مقصود کا غیر مقصود ہو کر۔

اخیر میں تنبیہ کرتا ہوں کہ جو مضمون حدیث کا اصل مقصود ہے اس سے دلیر نہ ہوں بلکہ شرافت کا مقتضی یہ ہے کہ ایسے رحیم و کریم آقا کی اور زیادہ اطاعت کی جائے اور جو مضمون حدیث سے اشارۃً مستنبط کیا گیا ہے اس کو سمجھیں اور اس کے موافق عمل کی کوشش کریں۔

اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرما دیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۵

الاعتصام بحبل اللہ

نہی عن التفرق کے متعلق یہ وعظ صبح کے وقت ۱۲ر جمادی الاول ۱۳۳۶ھ بروز یکشنبہ مطابق ۲۴ر فروری ۱۹۱۸ء مظفر نگر میں مدرسہ کے جلسہ کے موقع پر ڈیڑھ ہزار کے مجمع میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جسے اسعد اللہ نے قلمبند کیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده اللّٰه فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله صلى اللّٰه تعالى عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ٥ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔

اور مضبوط پکڑے رکھو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم متفق بھی رہو اور باہم نااتفاقی نہ کرو اور تم پر جو اللہ تعالےٰ کا انعام ہے اُس کو یاد کرو۔ جب کہ تم دشمن تھے۔ پس اللہ تعالےٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی۔ سو تم اللہ تعالےٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔ اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔ سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکامات بتلاتے رہتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ پر رہو۔ اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونا ضروری ہے کہ نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے پورے کامیاب ہوں گے۔ تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق ڈالی اور باہم اختلاف کر لیا۔ اور اُن کے پاس

احکام واضح پہنچنے کے بعد۔ اور ان لوگوں کے لئے سزائے
عظیم ہوگی اس روز کہ بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض چہرے
سیاہ ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا کیا تم کافر ہوئے تھے
ایمان لانے کے بعد سو سزا چکھو بسبب اپنے کفر کے۔ جن
کے چہرے سفید ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور
وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے

تمہید

جس تقریب کے متعلق یہ جلسہ ہے اُس کے متعلق سب سے اول یہ امر ہے کہ ہم غرض جلسہ کے متقابل سے بالکل خالی الذہن تھے۔ اُس جانب مخالف کا ہم کو کچھ وہم وگمان نہ تھا واقعات مسموعہ سابقہ ذہن نشین تھے۔ یک طرفہ حالات ذہن میں متمکن تھے۔ اس کے بعد روایات سے دگرگوں حالات معلوم ہوئے اور پہلے فوائد میں مفاسد کی جھلک نظر آنے لگی جس سے تردد پیدا ہوا۔ یعنی مخالفت کا قصہ سُنا جس سے علم بدلا اور چونکہ مشورہ علم پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے پہلے اور مشورہ تھا اور اب دوسرا مشورہ ہوا البتہ تحقیق واقعات سے ایک شق کو ترجیح ہو سکتی تھی۔ سو میں نے واقعات کی تحقیق نہیں کی اور حالات کے انکشاف میں سعی سے کام نہیں لیا کیونکہ اُس کا کوئی وسیلہ وذریعہ نہ تھا۔ نیز مجھ کو اس کی کچھ احتیاج بھی نہیں تھی۔ لیکن محض اسلام کی خیر خواہی سے میں نے اپنی رائے کی حالت ظاہر کر دی کیونکہ مقصود تو فقط دین کی خدمت ہے جس طرح ہو سکے۔ باقی سب امور ناقابل التفات ہیں

میرا مضمون اس رائے بدلنے سے پہلے اور تھا۔ اُس میں اور قسم کے مصالح تھے اور انہی کے متعلق ذہن میں ایک خاص مضمون تھا۔ اب تبدیل رائے سے مضمون بھی متبدل ہوا۔ جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے اُس کا مضمون تبدیل رائے کے بعد کا ہے۔ مضمون اوّل بھی بالکل حق تھا اور یہ مضمون بھی بالکل صادق ومطابق واقع کے ہے۔ کیونکہ دونوں مضمون قرآن پاک ہی کے مدلول ہیں۔ اس لئے دونوں کے دونوں اپنے اپنے محل میں صادق وحق ہیں کیونکہ دونوں قضایائے شرطیہ کے تحت میں مندرج ہیں کہ اگر اس شرط کا تحقق ہوا تو یہ جزا مرتب ہوگی اور اگر اُس مقدم کا تحقق ہوا تو یہ تالی مرتب ہوگی اور ان دونوں شرطوں میں کچھ تضاد وتنافی نہیں ہے بلکہ اپنی اپنی شرط کے اعتبار سے دونوں صادق ہیں۔

تبدل واقعہ سے تبدل مضمون کی مثال حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے فتوے کا قصہ ہے کہ ایک شخص حضور پر نور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور صوم میں بوسہ کی اجازت مانگی۔ جناب رسالت مآب نے اُس کو ممانعت فرمادی۔ اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور اُس نے بھی روزہ کی حالت میں بوسہ کی اجازت طلب کی تو آنجناب نے اجازت دے دی۔

اب بظاہر یہ دونوں حکم متعارض ومتناقض معلوم ہوتے ہیں لیکن صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بڑے نکتہ سنج، نکتہ رس، دقیقہ شناس اور باریک بین تھے۔ اُنہوں نے اس ظاہری تعارض کے دفع کرنے کے واسطے ان دونوں حکموں کے اصلی محل تلاش کر لئے۔ اور سمجھ گئے کہ دونوں حکم علیحدہ علیحدہ محل کے واسطے

(براہ کرم ورق نہ موڑیں)

دیں۔ ممانعت کا حکم اس واسطے تھا کہ سائل ایک نوجوان قوی شخص تھا۔ جس سے تحمل واجتناب عن الجماع کی امید نہ تھی۔ اس لئے آنحضورؐ نے منع فرمادیا تاکہ جماع میں مبتلا ہو کر صوم کی اضاعت نہ کرے اور جس شخص کے سوال پر جناب نے اجازت فرمادی وہ شخص ایک کمزور اور بوڑھا تھا۔ اُس کے قویٰ مضمحل تھے اُس سے وقوع فی الجماع کا خوف نہ تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اجازت کی علت محض بوڑھاپا نہ تھا بلکہ اس کی علت فتنہ کا نہ ہونا ہے اور خوف فتنہ ہی پر اجازت و ممانعت کا مدار ہے۔ کہ جس مقام پر اندیشہ فساد صوم ہو، وہاں ممانعت ہے گو بوڑھا ہی ہو اور جہاں فتنہ کا خوف نہ ہو، وہاں اجازت ہے گو جوان ہی ہو۔

بس جیسے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں ارشاد اختلاف واقعہ کی وجہ سے متعارض نہیں اسی طرح میرے دونوں مضمون بھی بوجہ اختلاف واقعہ مسموع کے متناقض نہیں رہے۔ یہ بات کہ واقعہ میں کون سی حالت صحیح ہے۔ آیا یہ فریق حق پر ہے یا وہ فریق حق پر ہے، تو اس کی حاجت اُسی شخص کو ہے جس کو اس سے دلچسپی ہو اور اُس کے پاس اس کی تحقیق کے ذرائع و وسائل بھی موجود ہوں اور اس کی ضرورت و احتیاج بھی سمجھتا ہو۔ ہماری شرطیات کے واسطے کسی واقعہ کی تحقیق کی حاجت نہیں۔ ہم تو دونوں مضمون بیان کئے دیتے ہیں اور دونوں مضمون حق ہیں۔ ہر شخص اپنی حالت کو جس مضمون کے مطابق سمجھے منطبق کرلے۔

تعدد۔ تبدد تردد کی صورت

جو مضمون ذہن میں سابق تھا اُس کا حاصل یہ ہے کہ ایک مطلوب کام میں اُس کے طریق کی دو شاخیں ہوں یا ایک درخت کی دو ڈالیاں ہوں یا ایک لشکر کے دو حصے ہوں۔ غرض کہ ایک شے میں بوجہ انشعاب کے دو یا زیادہ شعبے ہو جاویں۔ تو اس انشعاب کے دو مرتبے ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ تعدد کا ہے جس کی مثال ایک شہر کی مساجد ہیں اور دو شہروں کے مدارس و خانقاہ اور ایک مرتبہ تبدد کا ہے۔ میں لفظ تفرق کا استعمال کرتا لیکن چونکہ طالب علم ہوں اس لئے قافیہ کے لحاظ کی وجہ سے یہ غیر مانوس لفظ اختیار کیا۔ اس کے معنے بھی تشتت و تفرق کے ہیں کہ تعدد کے ساتھ اُس میں تفرق و تزاحم کا بھی پہلو ہو۔

اب سمجھئے کہ مطلوب کے طریق میں مرتبہ تعدد تو مرغوب و مطلوب و مستحسن ہے وَفِیْهِ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (اور حرص کرنے والوں کو ایسی حرص کرنی چاہیئے) بخلاف تبدد کے کہ وہ موجب فساد ہے اور مہیج فتنہ ہے دعنہٗ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔ تعدد کی مثال مساجد ہیں کہ ایک دینی خدمت کی چند شاخیں ہیں۔ اپنی خدمت یہ تھی کہ ایک ایسا مکان تیار ہو جس میں فریضہ صلوٰۃ سے سبکدوش ہوں اور اب اس میں کثرت مصلین وضیق مکان اور دور والے آمد و رفت کی تکلیف کی وجہ سے۔ ایک مکان کافی نہیں تھا۔ لہذا مختلف مقامات پر چند مسجدیں تیار کرائی جاتی ہیں۔ سو یہ تو تعدد ہے کہ ایک دینی خدمت کے ادا کے لئے متعدد مقامات تجویز ہو گئے لیکن تبدد نہیں۔ چونکہ مذموم ہے کیونکہ

تبدد کا مدار ضرورت پر نہیں ہوتا بلکہ اُس کا مبنیٰ داعیہ نفسانی اور غرض فاسد ہوتی ہے۔ تو تعدد مساجد اگر نمازیوں کی کثرت اور تنگی مکان وغیرہ سے ہو تب تو تعدد ہے ورنہ پھر تعدد نہیں بلکہ یہ بھی تبدد ہو جائے گا اور تعدد بعض مرتبہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ بغیر تعدد کے ہم دینی خدمت سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔

مثلاً یہاں مظفر نگر میں تعدد مساجد ہے کہ یا شندہ درجہ ضروری ہے کیونکہ اگر تمام مظفر نگر میں صرف ایک ہی مسجد ہو تو اکثر لوگ مسجد و جماعت اور اُس کے ثواب جزیل سے محروم رہیں۔ لہٰذا لامحالہ تعدد ضروری ہوا۔ اور تبدد پیدا ہوتا ہے باہمی نزاع و مخالفت کی وجہ سے۔ اُس کا مبنیٰ جھگڑا اور فساد ہوتا ہے۔ وہ کسی ضرورت دینی کی انجام دہی کے واسطے نہیں کیا جاتا بلکہ اُس کا مدار صرف آتش حسد و فساد پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ فریق اوّل یقیناً حق پر نہیں ہے وہ قطعاً خطاء فاحش میں مبتلا ہے اور غلطی کا مرتکب ہے۔ اس لیے دوسرے فریق نے اُس کے مقابل دوسرا انتظام کیا۔ سو یہ تو مذموم نہیں۔ مثلاً کسی شخص نے مال حرام سے مسجد تیار کرائی یا ارض مغصوبہ میں مسجد بنائی تو اُس کے مصلی قبل از علم تو معذور ہیں اور بعد از علم دوسری مسجد بنانے میں کچھ حرج نہیں بلکہ واجب ہے کہ مسجد سابق میں نماز نہ ادا کریں اور اس جدید مسجد کے بنانے میں اگر کچھ منازعت پیش آوے اُس کو حدود شرعیہ ملحوظ رکھ کر گوارا کریں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فریق اوّل یقیناً حق پر ہے اُس میں کسی قسم کا

نقص نہیں یا اُس کے حق پر ہونے نہ ہونے میں مساوی درجہ میں تردّد ہے مثلاً پہلی مسجد کوئی شخص اپنی ارض مملوکہ میں مال طیب سے بنوائے اور وہ اپنی وسعت مکانی سے سب اہل محلہ کو کافی ہو۔ غرض کہ اُس میں کسی قسم کی خرابی نہ ہو۔ اب اس مسجد کے مقابلہ میں جو مسجد تیار کرائی جائے گی اُس کا مدار صرف باہمی اختلاف و منازعت ہوگا کہ دوسری پارٹی ہو جاوے۔ یہ صورت تبدد مذموم کی ہے اور ایسی جگہ مسجد بنانا ناجائز ہے۔

اسی طرح تردّد کی صورت کو سمجھئے کہ بانی اوّل کا خطا پر ہونا نہ ہونا یقیناً معلوم نہیں۔ صرف بعض لوگوں کا خیال ہے جو کہ بعض امارات و علامات کی وجہ سے ناشی ہوا ہے کہ بانی اوّل خطا پر ہے تو اُس کے واسطے اَلْیَقِیْنُ لَا یَزُوْلُ بِالشَّکِّ کافی ہے کہ محض شک کی بنیاد پر دوسرے شخص کی مخالفت نہیں چاہیئے مصلحت دینیہ کا مقتضا یہ ہے کہ اوّل تو ہر زمانہ میں عموماً اور اس زمانہ میں خصوصاً تذبذب و تردد کو چھوڑ دے اور بانی اوّل پر بنا بر استصحاب حال کے بدگمانی نہ کرے۔ البتہ اُس کے اعراض و مقاصد دینی کی تکمیل میں جو کچھ نقص ہو اس کی اصلاح میں سعی جمیل کرے۔

اب اس مسجد کی مثال کے ذہن نشین ہونے کے بعد سمجھنا چاہیئے کہ دین کے صرف دو شعبے ہیں۔ ایک علم اور دوسرا عمل۔ اور جس طرح کہ مسجد دار العمل ہے۔ اسی طرح مکاتیب و مدارس دار العلم ہیں۔ یعنی دو قسم کے امکنہ تیار ہونا مطلوب ہے۔ ایک تو فریضۂ عمل سے سبکدوش ہونے کے لئے جن کو مساجد کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے اور دوسرے فریضۂ علم

سے سبکبار ہونے کے لئے جن کو مدارس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اب مسجد و مدرسہ میں اس اعتبار سے کچھ فرق نہیں کہ دونوں کے دونوں دینی خدمات کی انجام دہی کے واسطے مہیا ہوتے ہیں۔ لہذا مدرسہ کے تعدد و تبدد میں بھی وہی تفصیل ہو گی جو مساجد کے تعدد و تبدد میں ہے۔ کہ اگر پہلا مدرسہ بالکل حق پر ہے اور اس میں کسی اعتبار سے کسی قسم کے منقصت نہیں جس کی تکمیل کے واسطے دوسرے مدرسہ کا افتتاح ہو، تب تو اس مدرسہ موجودہ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا مدرسہ بنانا ناجائز ہے کیونکہ یہ تبدد مذموم کے افراد میں سے ہے۔ یا یہ کہ پہلے مدرسہ کے حق پر ہونے نہ ہونے میں تردد ہے تب بھی بمقتضائے مصلحت تعدد کو اختیار نہ کرے۔ اگر ممکن ہو اس کی شکایات کی اصلاح کر دے۔ اور اگر مدرسہ سابقہ یقیناً خطا پر ہے یعنی وہ دینی خدمت انجام دہی سے مجتنب و گریزاں ہے تب دوسرا مدرسہ قائم کرنا ضروری ہے اور جس طرح کہ مساجد میں ایک درجہ ضرورت تعدد کا ہے اسی طرح مدارس میں بھی بعض اوقات بوجوہ مذکورہ تعدد لازمی ہے اور جہاں صرف تعدد ہوتا ہے وہاں کچھ منازعت، و فساد نہیں ہوتا بلکہ سب لوگ ایک ہی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔

چنانچہ بخارا میں تین سو اکسٹھ مدرسے ہیں اور کبھی کچھ شور و غوغا بلند نہیں ہوتا اور دیکھئے سرکاری مدارس میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا کیونکہ سب ایک محکمہ کے ماتحت ہو کر اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتے ہیں۔ انگریزی اسکولوں کالجوں میں کبھی جھگڑا نہیں ہوتا کیونکہ ان مقامات پر صرف تعدد ہی ہوتا ہے اُن میں تبدد کی شان نہیں ہوتی ورنہ وہ بھی تو آدم علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں۔ اُن میں بھی

تو منازعت و مشاجرت کا مادہ ہے۔

غرض تعدد تو قرین مصلحت ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے ورنہ سخت سے سخت مشکلوں کا سامنا پڑ جائے اور تبدد بالکل مذموم اور واجب الترک ہے اب جو شخص مدرسہ سابقہ کے حال سے ناواقف ہو۔ اُن کو تو چاہیئے کہ وہ دونوں مدرسوں کی اتحاد کی کوشش کرے کیونکہ تردد کی صورت میں جو تعدد ہوتا ہے وہ حکماً تبددہی کا فرد ہے۔ اس لیئے بمقتضائے مصلحت دینی اُس سے اجتناب کیا جائے اور جو شخص حقیقت حال سے واقف اور اُس کو اصل حالت معلوم ہو وہ اپنے علم کے موافق فیصلہ کرے۔ چونکہ مجھے بھی معلوم نہیں کہ یہاں پر کون حق پر ہے اور کون غلطی پر ہے اور نہ مجھے اس کی کچھ احتیاج ہے

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار
کار ملکست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

اس لیئے محض اسلام کی خیر خواہی اور دینی خدمت کی انجام دہی کے واسطے میں نے بانیان جلسہ کو یہ رائے دی ہے کہ وہ اس انشعاب و تفرق کو دور کریں اور باہم متحد ہو جاویں اور اپنی متفقہ قوت سے اسلام کے اغراض کو علیٰ وجہ الکمال پورا کریں۔ آئندہ امتثال و عدم امتثال کا ان سب حضرات کو اختیار ہے۔ میرا قول صرف رائے اور مشورہ کے درجہ میں ہے جس کا امتثال و عدم امتثال میرے نزدیک دونوں مساوی ہیں۔

بقائے دین کی صورت

اب میں دوسری جانب بھی یعنی مدرسہ سابقہ والوں کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ بھی اس

منازعت کی مدافعت کی کوشش کریں اور اس کی صورت یہ ہے کہ جو شبہ منشا ہوا ہے مخالفت کا اُس کو دفع کر دیں کیونکہ بدون کسی منشا مخالفت کے مشکل ہے کہ لوگ مخالفت پر آمادہ ہوں۔ ع

تا نباشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا

اکثر تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ منشا مخالفت کی کچھ نہ کچھ اصل ہوتی ہے جس کو مخالفین اور نمک مرچ لگا دیتے ہیں۔ گو بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بدون کسی منشا و اصلیت کے مخالفین طومار باندھ دیتے ہیں۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے اور دوسرے حضرات گو واقع میں کسی شرعی خرابی میں مبتلا نہ ہوں اور نہ عند اللہ اُن سے کچھ مواخذہ ہو لیکن موجودہ حیثیت سے ضرورت ہے کہ وہ اُن شبہات کو جو اُن پر عائد کیے جاتے ہیں دور کر دیں کیونکہ اس امر کی خود مدرسہ کو بھی احتیاج ہے۔ اس لیے کہ آج کل قریب قریب سب مدارس کا دارومدار چندہ پر ہے۔ شخصی مدارس بہت نادر الوجود ہیں۔ جب عوام الناس بدظن ہو جاویں گے تو چندہ کون دے گا اور پھر مدرسہ کس کے بازوؤں کی طاقت سے چلے گا۔ لہٰذا عوام الناس کی جمعیت خاطر اور تسلی تشفی کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ شبہات کو دفع کیا جائے اور باہمی اتحاد سے دینی خدمت کو انجام دیا جائے۔

نیز جناب رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهَمِ کا مقتضا بھی یہی ہے۔ البتہ جو شخص چندہ وغیرہ سے آزاد ہو اور کسی قسم کی پروا نہ رکھتا ہو اُس کو اس دفع شبہات کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ عوام

اگر اُس سے بدظن ہوں گے تو چندہ بند کر لیں گے۔ تو اُس کو کچھ ضرورت ہی نہیں۔ اُس کو نہ اشتہار بازی کی حاجت ہے نہ جلسوں کی ضرورت ہے بلکہ وہ تو عیش وعشرت کے ساتھ اپنی زندگی کے ایام کو بسر کرے گا۔

مثلاً حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تھے کہ تعلیم وتدریس کا کام تو وہاں مدرسوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ خورد ونوش کا انتظام بھی خوب اچھی طرح تھا لیکن مولانا کو کسی کی اعانت کی پروا نہ تھی۔ گو اہل خیر بطور خود طلبہ کی خدمت کرتے تھے لیکن مولانا نے کبھی صراحۃً یا کنایۃً طلب نہیں فرمایا۔ اب کوئی شخص مثلاً یہ مشہور کر دیتے کہ مولانا ایک ہزار روپیہ کھا گئے یا مولانا نے فلاں مال نعوذ باللہ غبن کر لیا تو مولانا کو اس کے دفعیہ کی ضرورت نہ تھی گو طبعی کلفت ضرور ہوتی۔ لیکن کسی مصلحت کا بھی یہ اقتضا نہ ہوتا کہ کسی جلسہ سے یا کسی اشتہار سے اپنی برائت ظاہر فرماتے کیونکہ آپ کسی ضابطہ کے پابند نہ تھے۔ بلکہ خرچ کے خود مختار تھے جس طرح چاہا خرچ کر دیا۔ اگر تحریک چندہ کرتے لوگوں کے سامنے دست طلب دراز فرماتے تب تو حضرت کو ان قیود کا لحاظ ضروری تھا۔ اور جب بالکل استغنا سے کام لیا جائے تو کیا وجہ کہ اس معاملہ میں اظہار صورت حاجت کیا جائے۔ یہی حضرت کا احسان تھا کہ جو لوگ حسبۃً للہ طلبہ کی خدمت کرتے تھے حضرت اُس کے بذل وحفاظت کی مشقت اٹھاتے تھے۔ اب جس کو شبہ ہو مت دو کوئی مانگنے نہیں آتا اپنے گھر جاؤ آرام کرو۔

باقی رہا وہ شخص جس کی طرز وروش ایسی نہ ہو بلکہ وہ ضوابط وقواعد کا

پابند ہو، اشتہار و جلسہ سے کام لیتا ہو اُس کو بحیثیت اجتماع و مصلحت دینی بے شک ضرورت ہے کہ اپنی صفائی کی تدبیر کرے اور اس کی ایک اچھی صورت یہ ہے کہ ایک ذی اثر لوگوں کی جماعت جو عمائد شہر سمجھے جاتے ہوں اور جن میں علماء بھی ہوں طرفین کو جمع کریں یعنی وہ لوگ بھی ہوں جنہوں نے اختلاف کیا ہے اور وہ بھی ہوں جن سے اختلاف کیا ہے اور علماء سے مراد یہ نہیں ہے کہ میں بھی اس کمیٹی میں شامل ہوں کیونکہ نہ تو میں عالم ہوں اور نہ میں اپنے واسطے اس قسم کے فیصلے پسند کرتا ہوں ع

وللناس فی ما یعشقون مذاہب

اور اس مجمع میں یہ کوشش نہ ہو کہ ہماری برائت ہی ہو جاوے بلکہ اصلی واقعات کو من وعن بیان کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر اُس جماعت کی نظر میں شبہات دُور ہو جاویں فبہا ورنہ کام سب اُن ہی کے سپرد کر دیا جاوے اور خود دست بردار ہو جاویں کہ لو تم جانو تمہارا کام۔ جس کو چاہو سپرد کر دو۔ کیونکہ دین کا کام کسی شخص خاص کی ذات پر موقوف نہیں ہے۔

مہتمم مدرسہ مسلمانوں کا وکیل ہوتا ہے اور وکالت کی وجہ سے مسلمانوں کی دینی خدمت کو انجام دیتا ہے اور چونکہ مؤکل کو عزل وکیل کا اختیار ہوتا ہے اس لئے عامہ مسلمین کو کہ جن کا یہ وکیل ہے اُس کے عزل کا اختیار ہے۔ اس میں وکیل کا کچھ زور نہیں۔ جیسے مقدمہ کی پیروی کے واسطے وکیل و بیرسٹر مقرر کئے جاتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں اُس کو معزول کر دیتے ہیں اور دوسرا وکیل بنا لیتے ہیں۔ تو کیا کسی عدالت کے وکیل کو اس امر کا حق ہے کہ وہ سر ہو جائے اور

کہے میں ہی وکیل ہونگا ہرگز نہیں! بلکہ وہ حساب صاف کر کے کہے گا کہ جہاں تمہارا جی چاہے جاؤ۔ اسی طرح مہتمم مدرسہ عامہ مسلمین کا وکیل ہے اور جناب اگر انسان اتنی ہمت کرے تو خود بخود شبہات سے برأت ہو جاتی ہے۔ پھر لوگ اس کو نہیں چھوڑتے۔

چنانچہ جس زمانہ میں میں کانپور میں مدرس تھا وہاں کے لوگوں نے اہل مدرسہ پر کچھ اعتراضات شروع کئے۔ میں نے جواب میں نہ وعظ کہا نہ اشتہار بازی کی، نہ جلسہ کیا بلکہ عمائد مدرسہ کو بلا کے کہا کہ صاحبو! معترضین کے اتفاق سے معلوم ہوا کہ ہم لوگ خدمت مدرسہ کے اہل نہیں ہیں اور خدمت ہمارے حال کے مناسب نہیں۔ اس لئے ہم مدرسہ سے جاتے ہیں آپ جو انتظام چاہیں کریں۔ مدرسہ کا مکان و موجودات وتحویل وغیرہ سب دیکھ لیجیے۔ جناب اُسی جلسہ میں سب اعتراضات وغیرہ رخصت ہو گئے مگر یہ کوئی ترکیب نہیں ہے بلکہ دل میں بھی یہی ہونا چاہیئے کہ اگر کام ہم سے لے لیا جاوے گا تو ہم دل سے راضی رہیں گے۔

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ نیا مدرسہ کرنا چاہتے ہیں اُن کے واسطے تو یہ رائے ہے کہ وہ تعدد وتفرق سے کام نہ لیں اور قدیم مدرسہ والوں کی بابت یہ رائے ہے کہ وہ اپنے اوپر سے شکوک وشبہات کو رفع کر دیں اور اس میں حکم ذی اثر روساء اور علماء ہوں۔ اس کا فیصلہ عوام سے متعلق نہ ہونا چاہیئے البتہ میں اس خدمت سے معذور ہوں کیونکہ میں نے اسی جھگڑے وغیرہ سے بچنے کے لئے کانپور کو چھوڑ دیا۔

ایک مرتبہ تھانہ بھون میں بعض روٴسا کی یہ رائے ہوئی کہ ایک جدید مدرسہ امداد العلوم کے مقابلہ میں قائم کیا جائے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب چاہو نیا مدرسہ کر لو۔ میں پرانے مدرسہ کو بند کر دوں گا۔ مقصود نشر ہے دین کا جس کے ہاتھ سے بھی ہو۔ ایسی حالت میں ایک مدرسہ کیا سو مدرسے بھی ہو جائیں تو کچھ حرج نہیں کیونکہ ہم کو جلب مال مقصود نہیں تاکہ یہ مدرسے اس میں مخل ہوں۔ سو دوسرے مدرسے والوں کا مقصود یہ تھا کہ پہلا مدرسہ نیست و نابود ہو جائے لیکن میرے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا کہ وہی لوگ بیٹھ رہے اور اپنے قصد سے باز رہے۔

ایک مرتبہ مجھے ایک شخص نے پانچ روپے بھیجے تھے کہ طلباء سے دعا کراؤ۔ میں نے روپے واپس کر دیئے کہ مدرسہ دعا کی دکان نہیں ہے اور اس طرز میں عزت دین کی ہے اور عزت دین ہی کی مقصود بالذات ہے اور یہی مدرسہ کی روح ہے پس اصل بقاء دین کا چاہیئے خواہ مدرسہ رہے یا نہ رہے۔

دین کی مقصودیت

ایک مرتبہ ایک رئیس نے میرے پاس مدرسہ کے لئے دو سو روپیہ بھیجے اور لکھا تھا کہ میں جناب کو لینے آؤں گا۔ میں نے لکھا کہ میں یہ روپیہ اس وجہ سے نہیں لینا چاہتا کہ مجھ کو اس مضمون سے شبہ پڑ گیا کہ روپیہ بھیج کر مجھ پر شاید اثر ڈالا جاتا ہو تو اس میں ایک گونہ رشوت کا شائبہ ہے اگر بلانا ہے تو بلانے کے بارہ میں مستقل گفتگو کیجئے اور روپیہ وصول نہیں کئے تو اس کا جواب معذرت سے بھرا آیا کہ آپ مدرسہ کے لئے روپیہ لے لیں اور میں نہیں بلاتا۔ پھر مدت کے بعد مستقلاً

اُنہوں نے بلایا۔

ایسے ہی ایک شخص پانی پت سے آئے اور اُنہوں نے پندرہ روپیہ مدرسہ میں داخل کرنا چاہا۔ میں نے اُن سے سوال کیا تم نے پانی پت کے مدرسہ میں یہ روپیہ کیوں داخل نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے تم نے یہ سمجھا کہ ثواب کا ثواب ہوگا اور وہ شخص بھی یعنی احقر خوش ہوگا۔ کہنے لگے جی ہاں بات تو یہی تھی۔ ع

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دوکار

ایک پنتھ دو کاج۔ میں نے روپے واپس کر دیئے اور کہا کہ میں شرک کی رقم نہیں لیتا جس میں ارضاءِ حق کے ساتھ ارضاءِ خلق بھی مقصود ہو۔ دوسرے دن اُنہوں نے کہا، اب وہ نیت نہیں ہے۔ اب صرف ثواب محض کی نیت ہے، لے لیجئے۔ میں نے لے لیئے۔

غرض جو شخص آزاد ہو وہ کسی کے جھگڑے میں کیوں پڑے گا۔ اس لئے ایسے شخص کو چھوڑ کر دوسرے اہل انتہ اہل علم جمع ہو کر باہم گفتگو کر لیں اور اس میں بڑی ضروری بات یہ ہے کہ اہل معاملہ کی دونوں جماعتیں فیصل کنندوں کے سامنے روبرو گفتگو کریں۔ ورنہ روایتوں حکایتوں میں اور قصہ بڑھ جاتا ہے فیصلہ تو کیا ہوتا اور مخالفت زیادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے ایسے نفقوں میں ایک ثالث کی ضرور احتیاج ہوتی ہے کیونکہ فریقین خود شبہات نہیں رفع کر سکتے اور نہ خود متفق الرائے ہو سکتے ہیں۔ اوّل تو لوگوں کو اپنی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔ دوسرے ہر شخص کی فطرۃً ایک آن ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے

کہ انسان اپنی غلطی سے واقف ہو جاتا ہے لیکن نفس پروری افراد حق میں آڑے بن جاتی ہے۔ لہذا ایک ثالث جماعت فیصلہ کر دے اور طرفین اُس کو مسلّم سمجھیں اور اُس کے فیصلہ کے موافق عمل درآمد کریں۔ میری یہ رائے ہے اور اس سے اچھی صورت میرے ذہن میں نہیں ہے۔ ممکن ہے اور کوئی صاحب اس سے بہتر تجویز کر دیں۔

تو پہلا مضمون ذہن میں تعدد کا تھا جس کی مثال مساجد سے واضح ہو گئی مگر صورت واقعہ سے ممکن ہے کہ اس وقت تعدد کا نتیجہ اچھا نہ ہو۔ لہذا اب پہلے مضمون کی جگہ پر دوسرا مضمون شروع کیا گیا۔ کیونکہ واقعات سے رائے بدل گئی ہے۔

اتفاق کی صورت و حقیقت

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ تم سب لوگ مل کر دین اللہ کے ساتھ تمسک کرو۔ اور سب کے سب دین پر قائم رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود دین ہے۔ اتفاق بھی وہی مطلوب ہے جو تمسک بالدین کے ساتھ ہو۔

آج کل کے عقلاء نے صرف اتفاق کا نام سُن لیا ہے اور اُسی کی رٹ میں رات دن مصروف رہتے ہیں۔ اور اُن کے نزدیک اتفاق کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک شخص دوسرے کا ہم خیال ہو جائے کہ جو شخص حق کو چھوڑ کر باطل پرست کے ساتھ ہو جائے وہ بھی اتفاق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ کوئی صحیح العقل اس کا طالب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کا اتفاق برادری کا اتفاق ہے۔ مثلاً ناچ براے

کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ برا بھی سمجھتے ہیں۔ اگر منع کرو تو کہتے ہیں کیا کریں برادری تو نہیں بگاڑی جاتی۔ خلاف وضع کیسے کریں۔ بزرگوں کا طریقہ چلا آ رہا ہے۔ تو ایک اتفاق یہ بھی ہے۔

قرآن پاک نے فیصلہ کر دیا کہ اتفاق مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ اتفاق کے خاص فرد کی طلب ہے یعنی باطل حق کے ساتھ نہ ہو اور عکس کی صورت مطرود ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ عزاسمہ نے اِجْتَمِعُوا نہیں فرمایا بلکہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا فرمایا کہ وہ اتفاق مطلوب ہے جس میں زمام دین ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اس کی پوری توضیح مثالوں سے ہو جاتی ہے۔

مثلاً دو سلطنتوں میں جنگ ہو اور بازار قتل گرم ہو۔ اب ہی خواہان قوم کیا اتفاق اتفاق وہاں بھی پکاریں گے اور اتفاق کی صورت یہ تجویز کریں گے کہ ایک سلطنت بلا کسی ترجیح کے اپنی حکومت سے دست بردار ہو جائے اور دوسری سلطنت بانیل ومرام واپس پھر سے۔ تو کیا یہ اتفاق ہے؟

یا ایک ظالم شخص ایک مظلوم سے لڑنے لگے۔ اب یہاں اتفاق کی صورت ایک یہ بھی ہے کہ مظلوم محض ساکت کھڑا پٹتا رہے تاکہ اتفاق ہاتھ سے نہ جائے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ اتفاق مطلوب کے معنی یہ ہیں کہ ظالم اس فعل شنیع سے باز رہے اور مظلوم کے ساتھ اتفاق کرے۔ نہ کہ مظلوم بیچارہ مصیبت میں مبتلا رہے۔

ان سب باتوں سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ مطلق اتفاق مطلوب نہیں بلکہ مطلوب ومرغوب فیہ وہی اتفاق ہے جس میں ناحق کو حق کے تابع

کیا جائے نہ کہ بالعکس۔ لہٰذا یہ عنوان کہ آپس میں اتفاق سے رہو نہایت ہی مہمل عنوان ہے۔ اوّل تعیین حق کی ضرورت ہے اس کے بعد جو ناحق پر ہو اس سے فہمائش کی جائے۔ کہ اہل حق کے ساتھ متفق ہو کر رہے نہ کہ علی الاٹکل اتفاق اتفاق پکارنا شروع کر دیا۔

مثلاً ایک ڈپٹی مقدمہ پیش ہونے کے وقت کسی بے جرم کو کسی مجرم کے ساتھ متفق ہونے کا حکم دے تو یہ اتفاق کس درجہ تک صحیح ہوگا۔ یا ایک شخص نے ایک لاکھ روپیہ کا دعویٰ کیا اور روداد سے حاکم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مدعا علیہ جھوٹا ہے اور اس کے ذمہ ایک لاکھ روپیہ واجب الادا ہے لیکن وہ فدائے قوم اپنے اتفاق کی دھن میں مدعی کو ڈگری دلانے کی بجائے یہ کہے کہ تم ایک لاکھ روپیہ چھوڑ دو اور آپس میں مخالفت نہ کرو۔ اتفاق سے رہو تو کیا یہ اتفاق ہے۔ ہرگز نہیں! جہاں قانون ہیں اور جرائم ہیں کیا مطلق نااتفاقی بھی کہیں جرم ہے۔ اگر نااتفاقی جرم ہے تو خاص نااتفاقی ہی جہاں ناحق حق سے نااتفاقی کرے اور باطل حق کے مقابلہ میں اپنی بے جا کارروائی سے باز نہ رہے بلکہ اس قسم کے اتفاق سے فیصلہ کرنا خود بہت بڑا جرم ہے۔ کیوں کہ مغلوب کا دبانا اور مظلوم کو ستانا عدالت میں بہت سنگین جرم ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مطلق اتفاق محمود نہیں بلکہ بعض افراد اتفاق کے ناجائز ہیں اور ہمارے عقلاء اس سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ مثلاً دو مولوی آپس میں لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کا ترکی بترکی جواب دیتے ہیں۔ اب اس میں کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک من ایک سوا من۔ اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ

ایک بالکل خاموش ہے لیکن دوسرا اشتہار بازی کرتا ہے۔ اخباروں میں بیہودہ اور غیر موزوں مضامین شائع کراتا ہے۔ وعظ وغیرہ کے جلسوں میں لاف اور گزاف سے کام لیتا ہے۔ اب حیرت ہے عقلاء سے کہ دونوں کو برا کہتے ہیں نا اتفاقی کا الزام دونوں پر عائد کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک بالکل ساکت ہے اب یہ کیا کر سکتا ہے۔ اپنا بولنا اس کے قبضہ میں تھا اس کو چھوڑ دیا۔ اب دوسرے کو تو بند نہیں کر سکتا۔ اس پر الزام لگانے کے کیا معنی۔ اول ناحق اور حق کی تحقیق کرو۔ پھر جو حق پر نہ ہو اس کو دباؤ۔

دیکھو ایک شخص عدالت میں مقدمہ دائر کرے اور غیر سے جج صاحب مصلح قوم اور لیڈر بھی ہوں اور اتفاق سے لیکچرار بھی ہوں لیکن بحیثیت جج کے مدعی سے کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں تیرا دعوے نہیں سنتا۔ جاؤ مخالفت نہ کرو متفق ہو کر رہو۔ میرا دماغ پریشان کرنے کو کیوں آئے ہو۔ میں تمہارا مقدمہ خارج کرتا ہوں۔ کیونکہ تم نا اتفاقی کے مرتکب ہو۔ اگر وہ ایسا کرے، تو دیکھئے حکام بالا کی طرف سے ایسی صلح کی کیسی گت بنتی ہے۔ سو مصلح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مطلق اتفاق پر عمل کرو بلکہ یہاں پر اصلاح یہی ہے کہ تحقیق کرکے حق دار کا حق ادا کرو۔ یعنی حکومت سے کام لو کاذب کو سزا دو۔ اس سے ڈگری دلواؤ۔ قرقی وغیرہ کراؤ تاکہ آئندہ وہ اس نا اتفاقی کا مرتکب نہ ہو۔ سو کیا کوئی ایسا شخص ہے جو ایسے مصلح کو یہ کہہ سکے کہ وہ صحیح الدماغ نہیں۔ کیونکہ اس نے نا اتفاقی کی معاونت کی ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ شخص اگرچہ اتفاق کو زبان سے نہیں نکالتا لیکن عملاً اتفاق کر رہا ہے۔

مجھ کو آج کل کے ہی خواہانِ قوم کے اتفاق پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک صاحب پٹ رہے تھے لیکن کبھی کبھی قابو پا کر ایک آدھ دھول مار بھی دیتے تھے۔ اُن کے دوست رفیق تشریف لائے اور دوست صاحب کا دست مبارک پکڑ لیا کہ اب اچھی طرح سے مرمت ہو جاوے۔ کسی نے پوچھا یہ کیا حرکت تھی۔ کہنے لگا ع

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست

دوست وہ ہے جو مصیبت کے وقت دوست کے کام آئے۔

تو جس طرح انہوں نے دست گیری کے معنی سمجھے تھے ایسے ہی اتفاق کے معنی سمجھے جاتے ہیں۔ کیوں صاحب کیا اس دست گیر کو بھی حامی اتفاق سمجھا جائے گا کیوں کہ اختلاف رفع کرنے کی ایک صورت تو یہ بھی تھی تو جناب اگر یہی اتفاق ہے تو خدا خیر کرے اور ہمارا تو ایسے اتفاق کو سلام ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصہ میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کیا ہے۔

قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا مَّوَدَّۃَ بَیْنِکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکْفُرُ بَعْضُکُمْ بِبَعْضٍ وَّ یَلْعَنُ بَعْضُکُمْ بَعْضًا۔

اور حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو

تجویز کر رکھا ہے پس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے
ہے۔ پھر قیامت میں تم میں ہر ایک دوسرے کا مخالف ہو
جائے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا۔

دیکھئے مودۃ بینکم سے معلوم ہوا کہ بت پرستوں میں اتفاق تھا مگر انجام اس کا دیکھئے کیا ہے کہ وہاں پر ایک کو دوسرے کی طرف سے لعنت اور پھٹکار ہو گی۔ تو کیا ابراہیم علیہ السلام نے ان میں نا اتفاقی ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ کیا مصلحان قوم کے پاس اس کا کچھ جواب ہے؟ اصول جدیدہ کے موافق تو کامل اتفاق چوروں اور ڈاکوؤں میں ہے یا اور جو بدمعاش طائفے ہیں کہ جان، مال، دین، آبرو گنوا کے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن آج تک کسی مصلح نے نہ تو کسی چور کو انعام دیا نہ کسی ڈاکو کو اتفاق کی وجہ سے رہا کیا۔ ہمارے مصلحان قوم کو ضرورت ہے کہ وہ اتفاق کی تقسیم کریں۔ اور ایک قسم کی تو رغبت دلا دیں اور دوسری قسم کے قلوب میں نفرت بٹھا دیں۔ جس اتفاق سے اصلاح ہوتی ہے وہی اتفاق ہے جس میں باطل کو حق کے تابع کیا جائے۔ ورنہ وہ اتفاق نا اتفاقی سے بھی زیادہ برا ہو جائے گا۔

مثلاً کوئی مسلمان کسی کافر کے اسلام میں کوشش کرے لیکن مشیت ایزدی کا میاب نہ ہو سکے۔ تو کیا اتفاق کی وجہ سے یہ مسلمان ترک اسلام کہہ کر کافر ہو سکتا ہے ہرگز نہیں۔ اس اتفاق سے تو نا اتفاقی ہی اچھی کہ مسلمان مسلمان تو رہیگا دوستی اور اتفاق چاہے رہے یا نہ رہے کوئی عاقل مسلمان ایسے اتفاق کو

تجویز نہیں کر سکتا۔

مقام ازالہ وامالہ

دیکھئے بخل مذموم ہے لیکن مطلقاً نہیں بلکہ بعض افراد بخل کے مستحسن ومحمود بھی ہیں۔ مثلاً معاصی میں خرچ کرنے سے بخل کرنا اچھا ہے۔ پس یہ سخاوت بجمیع افرادہ مستحسن ہے نہ بخل بجمیع افرادہ مستقبح۔ بلکہ ہر شئے اپنے اپنے موقعہ اور اپنے اپنے محل میں اچھی ہے جیسے جراح ہوتا ہے ؎

درشتی و نرمی بہم در بہ است ۔ چو رگ زن کہ جراح ومرہم نہ است

جراح کے دونوں فعل اصلاح ہی ہیں۔ کوئی شخص جراح سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو پھوڑے میں شگاف مت لگا۔ اور مرہم ہی مرہم رکھے جا۔ مثلاً کسی کے ناسور ہو جاوے اور بغیر شگاف کے اچھا نہ ہو سکتا ہو۔ لیکن کوئی رحم دل مصلح قوم جراح کو شگاف نہ لگانے دیں کیونکہ بے رحمی ہے تو جراح اس کا جواب یہی دے گا کہ ہر رحم دلی ہر سختی سے اچھی نہیں بلکہ بعض مقامات پر رحمدلی اچھی ہے اور بعض مواقع میں سختی اچھی ہے۔ تو اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ بعض افراد رحمدلی کے مستحسن ہیں تو ناسور کو شگاف نہ دینا۔ ان بعض میں سے نہیں ہے۔ یا کوئی رحم دل کہنے لگے کہ سانپ کو نہ ستاؤ۔ اللہ کی بے زبان مخلوق پر رحم کرو۔ بچھوؤں کو نہ مارو۔ شیر بھیڑیئے تیندوے کو کچھ نہ کہو۔ اگرچہ ہزاروں انسان ان ناگہانی بلاؤں سے فنا ہو جاویں لیکن تم بوجہ رحم کے ان پر بندوق نہ داغو۔ کیا اس کو کوئی شخص رحم کہہ سکتا ہے؟ اس نے بظاہر تو سانپ وغیرہ پر رحم کیا لیکن اصل یہ ہے کہ اس نے اس قوم پر جو ان سے

بدرجہا افضل ہیں بڑا ظلم کیا۔ یعنی انسانوں کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا

حاصل یہ ہے کہ ہر شے میں مختلف مراتب ہیں اور ہر شے اپنے محل میں مستحسن اور غیر محل میں قبیح ہے (دمن ثمّ قیل وَضعُ الشَّیِٔ فِی غَیرِ مَحَلِّہٖ ظُلمٌ ۱۲ جامع)

مرشدنا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ رذائل کا ازالہ نہیں کرتا بلکہ اُن کا امالہ کرتا ہے۔ مثلاً بخل ایک بُری صفت ہے تو وہ اس کو اُن مواقع کی جانب منصرف کر دے گا۔ جہاں پر بخل کرنا مستحسن ہے مثلاً قمار سے شراب سے بخل ہونے لگے گا۔ اور جو مواقع حسنہ ہیں، جیسے مدرسہ میں دینا، سائل کو دینا، مسجد وغیرہ میں دینا۔ یہاں پر بخل نہ ہوگا۔ حاصل یہ کہ سالک ہر شے کو اُس کے محل میں استعمال کرنے لگے گا۔ سو بخل سے بچنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ بخل کا مادہ بالکلیہ زائل کر دیا جائے۔ اور ایک صورت یہ تھی کہ اُس کو اُس کے مواقع کی جانب مائل کر دیا جائے اور یہی صورت سہل العمل ہے۔

دیکھو ایک انجن ہو اور اُس کی اسٹیم خوب گرم ہو رہی ہو۔ پوری رفتار کی اُس میں بھاپ موجود ہو اور وہ اتفاق سے سب گاڑیوں کو لے کے دوسری جانب کو چل دے تو اُس کے روکنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اُس کی آتش بجھا دی جائے اُس کی بھاپ کو نکالا جائے اور یہ بہت مشکل ہے کیونکہ بھاپ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے شہور کی مسافت ایام میں طے ہو جاتی ہے۔ یہ بیش بہا شے ہے اس کی تضییع ہرگز گوارا نہیں ہونا چاہیے اور نیز اس میں وقت بھی زیادہ خرچ ہوگا۔ دوسری صورت اس انجن کی اصلاح کی یہ ہے کہ دوسری

طرف اس کی کل پھیر دے۔ اس سے امالہ کی ترجیح ازالہ پر بخوبی واضح ہو گئی۔

بس جس طرح انجن کی بھاپ قابل قدر تھی اسی طرح انسان کے تمام اوصاف بھی قابل قدر ہیں کیونکہ حکمت سے پیدا ہوئی ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ حَکِیْمٌ وَّفِعْلُ	اللہ تعالےٰ حکیم ہے اور حکیم
اللّٰہِ الْحَکِیْمِ لَا یَخْلُوْ عَنِ الْحِکْمَةِ	کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

اس لئے اُن کا ازالہ نہ کرے بلکہ مصارف صحیحہ کی طرف منصرف کر دے۔

مثلاً کسی شخص کو عورت وغیرہ سے محبت ہو جائے اُس کے غم فراق میں گلتا گھلتا پگھلتا ہو۔ رات دن گریہ و بکا سے کام ہو۔ اب اس کی دو تدبیریں ہیں ایک تو ازالہ جس کا حال ابھی معلوم ہو گیا۔ دوسرا امالہ جس کو شیخ کامل تجویز کرے گا اُس محبت کو محبوب حقیقی کی جانب منصرف کر دے گا۔ اور وہ گریہ و بکا اور ہموم و غموم سب خالق جل جلالہٗ کی یادیں ہونے لگے گا۔

عاشقی گرزیں سر و گرزاں سر است
عاقبت مارا بداں شہ رہبر است

اس کا یہ مطلب نہیں کہ خوب نظر بازی ہوا کرے اور بالقصد اس حرام فعل کا ارتکاب کیا جائے۔ پھر بھی موصل الی اللہ ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ اگر اتفاقاً اس درد بے درماں میں مبتلا ہو جائے تو شیخ اُس کو حق تعالیٰ کی ذات جامع الصفات کے ساتھ متعلق کر دے اور اسی واسطے مولانا جامی فرماتے ہیں۔

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست
کہ آں بہر حقیقت کارسازیست

یعنی ازالہ کی حاجت نہیں بلکہ اُس کو محبوب حقیقی کی جانب مائل کر دینا چاہیے۔

پس حاصل یہ ہے کہ جیسے ہر رحمدلی اچھی نہیں بلکہ بعض بے رحمیاں بھی اچھی ہیں اسی طرح مطلق اتفاق بھی محمود نہیں بلکہ بعض افراد نا اتفاقی کے بھی پسندیدہ ہیں۔ جیسے بعض افراد بخل و امساک کے مستحسن ہیں۔

شرک باللہ

دیکھو جب ہمارے سردار کامگار آقائے نامدار تشریف لائے تمام عالم پر کفر کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ سب لوگ کافر تھے کیا آج روئے زمین پر کوئی ریفارمر کوئی لکچرار کوئی مصلح قوم، کوئی بھی خواہ قوم ہے جو یہ کہہ دے کہ جناب رسالتمآبؐ نے نا اتفاقی کی۔ کیونکہ ساری دنیا کے مقابلے میں آنحضورؐ نے لا الہ الا اللہ کا باآواز بلند نعرہ لگا کر زمین و آسمان کو گونجا دیا۔ ابھی اور احکام کے اظہار کی نوبت نہیں آئی تھی۔ صرف توحید ہی سے دنیا میں وحشت کے آثار پیدا ہونے لگے تھے مشرکین مکہ کہتے تھے۔

کیا اُنہوں نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا	اَجَعَلَ الْاٰلِہَۃَ اِلٰـھًا وَّاحِدًا۔

مشرک رحمدل بہت تھے۔ اللہ میاں پر رحم کھاتے تھے کہ ایک خدا کہاں کہاں کی خبر گیری کرے گا۔ اور کیا کیا کام کرے گا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ! تھک جائے گا۔ اس وجہ سے اُس کے لئے خلیفہ اور نائب بنانا چاہیے کہ ایک کام کرے اور دوسرا آرام کرے۔ بیچاروں نے سلاطین دنیا پر قیاس کیا کہ جیسے یہ لوگ مقاصد مملکت میں بغیر اعانت غیر کے کامیاب نہیں ہو سکتے اسی طرح

خدا بھی اور چھوٹے خداؤں کا محتاج ہے۔

جیسے مثلاً جارج پنجم ہیں۔ اُن کو پارلیمنٹ، کمشنر، کلکٹر، مجسٹریٹ، جج انسپکٹر وغیرہ کی ضرورت ہے۔ بیچاروں نے یہی سمجھا کہ علیٰ ہذا القیاس خدا بھی ماتحت حکام کا محتاج ہے۔ لیکن یہ خیال اُن کا قیاس مع الفارق تھا اور خیر مشرکین تو کہا ہی کرتے تھے کہ بڑے بڑے کام تو اللہ میاں کرتا ہے اور چھوٹے چھوٹے کام اور دیوتا کرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ بعض مسلمانوں میں اب تک ان مشرکین کے عقیدہ کا اثر چلا آتا ہے۔ چنانچہ اولیاء اللہ کو سمجھتے ہیں کہ خدمات تکوینیہ میں اُن کا دخل ہے اور یہ بالکل شرک ہے۔

کانپور میں ایک نو عمر احمد جان شخص تھے۔ محرم کے مہینہ میں مسجد میں آ رہے تھے۔ رستہ میں ایک بوڑھی عورت ملی اور کہا، بیٹا اس کھانے پر نیاز دے دو۔ اُنہوں نے پوچھا، بڑی بی! کس کی نیاز دے دوں۔ تو بڑی بی نے فرمایا کہ ہائیں! یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بھلا عشرہ میں سوا امام حسین علیہ السلام کے اور کسی کی نیاز بھی ہوتی ہے۔ ان دنوں میں تو اللہ میاں نے اپنی نیاز سے بھی منع کر دیا ہے۔

یہ مسئلہ بھی بڑی بی نے ہی گھڑا۔ یہ لوگ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر کارکن۔ تو صرف صابر صاحب، خواجہ صاحب معین الدین اجمیریؒ ہیں اور اللہ میاں برائے نام۔ تو خوب سمجھ لینا چاہیے۔ کہ یہ شرک باللہ ہے اور اس کی اصل وہی مشرکین کا عقیدہ ہے۔

چنانچہ ایک مرتبہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض مشرکین عرب سے

دریافت فرمایا کہ تمہارے کتنے معبود ہیں۔ کہا سات۔ ایک نہ دو اکھٹے سات آپؐ نے فرمایا، وہ کہاں ہیں؟ کہنے لگے ایک آسمان میں ہے اور چھ زمین میں ہیں۔ مہتم بالشان امور تو آسمان والے خدا کے متعلق ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام زمین والے خدا کرتے ہیں۔

چنانچہ باری تعالیٰ مشرکین کے اس عقیدہ کو اس واقعہ میں نقل فرماتے ہیں

فَاِذَا رَکِبُوْا فِی الْفُلْکِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۔	جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارتے ہیں۔

یعنی جب دریا میں سوار ہوتے تھے اور وہاں تلاطم امواج اور مدوجزر سے غرق کا خوف ہوتا تھا، تب تو خوب گڑگڑا کے دُعا مانگتے تھے کہ

لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ ھٰذِہٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ۔	اے خدا اگر تم نے ہمیں اس مصیبت سے بچا لیا، تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔

کہ اے اللہ! اگر تو ہم کو اس بلا سے نجات دے اور ہم صحیح سالم منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے تو تیری شکر گزاری کریں گے۔

فَلَمَّا اَنْجٰھُمْ اِذَا ھُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۔	پھر جب خدا اُن کو بچا لیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔

اور جب حق تعالےٰ نے اُن کو نجات دے دی تو پھر ملک میں بلا

کسی استحقاق کے سرکشی کرنے لگے۔

ایک بہت ہی تعجب ہے کہ وہ لوگ مخاوف میں تو اللہ ہی کو پکارتے تھے لیکن ہمارے بعض مسلمان اُن سے بھی زیادہ بہادر ہیں۔ وہ ایسی حالت میں بھی غیر اللہ ہی کو پکارتے ہیں۔ چنانچہ میں نے خود سُنا کہ جہاز کی حرکت کے وقت بعضے یا علیؓ کہتے تھے بعض خواجہ صاحب کو بلاتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ مشرکین تو ایسے وقت میں خدا کو پکارتے تھے لیکن یہ موحدین بزرگان دین کو پکارتے ہیں۔ بھلا یہ حضرات کیا کر سکتے ہیں۔ وہ تو خود حق تعالےٰ کے محتاج بندے ہیں

ایک شخص بیان کرتے تھے کہ مداری فقیروں کی ایک مجلس میں تذکرہ ہوا کہ دنیا کے کام کون کرتا ہے۔ تو یہ رائے پاس ہوئی کہ پہلے تو خداوند تعالیٰ کرتے تھے لیکن جب سے مدار صاحب ہوئے ہیں اب تمام دار و مدار مدار صاحب پر ہے۔ وہ دنیا کے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ اب غور کیجیے کہ آج کل کی کمیٹیوں میں ایسے ریزولیوشن پاس ہوتے ہیں۔ یہ تو حالت ہے حق تعالےٰ کے ساتھ تعلق کی۔

ایک دوسرے شخص بیان کرتے تھے کہ ایک شخص سے پوچھا گیا تم کون لوگ ہو۔ کہا مسلمان۔ پھر دریافت کیا کس کی اُمت میں۔ کہا پچھان میں ایک راجہ گجرا ہے (گزرا ہے)

اب دیکھئے یہ بیچارہ جناب حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اس قدر ہی تعلق رکھتا تھا کہ پچھان کا راجہ سمجھتا تھا، پچھان مدینہ کو اس وجہ سے کہا کہ ہندوستان سے حجاز مغرب کی سمت واقع ہے۔ ایسے لوگوں کی حالت سُن سُن کر بہت

رحم آتا ہے کہ بیچارے کیسے دامِ جہالت میں گرفتار ہیں۔ بادیہ ضلالت میں گمراہ ہیں۔ حق تعالےٰ ان کی رہبری فرماویں اور صراطِ مستقیم پر لائیں۔

مگر اس سے زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے واعظین و علماء میں سے کوئی حضرت بھی ایسے اطراف جوانب میں نہیں پھرتے۔ جہاں ضرورت نہیں وہاں تو رات دن علماء کا گزر رہتا ہے اور جس جگہ واقعی احتیاج ہے وہاں ہُو کا عالم ہے۔ جو کچھ قوت و طاقت ہے آپس کی لڑائیوں میں صرف کرتے ہیں سب سامان خانہ جنگیوں میں ختم ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اپنی متفقہ طاقت سے اہل اسلام سے جہل دُور کریں۔ آفتاب اسلام کو عروج دیں۔ حضیض ذلت سے نکل کر اوجِ عزت پر پہنچیں۔ نہ یہ کہ اور پستی کے اسباب پیدا کئے جائیں اور جہلا کی اصلاح تو درکنار علماء کو بھی اپنی غیبت اور بیجا اور ناشائستہ بداخلاقیوں کا ہدف بنایا جائے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ؎

شنیدم کہ مردانِ راہِ خُدا ۔۔۔ دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

میں نے سنا کہ خدا کے راہ پر چلنے والے مرد، دشمنوں کے دلوں کو بھی تنگ نہیں کرتے۔

مگر ہماری یہ حالت ہے کہ ؎

تُرا کے میسر شود ایں مقام ۔۔۔ کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

تجھے یہ مقام کب حاصل ہو سکتا ہے کہ تو دوستوں کے خلاف لڑائی کرتا ہے۔

خیر یہ جملہ تو بطور تفریح کے تھا لیکن اتنی بات اور سمجھنے کے قابل

ہے کہ جہل عذر و حجت نہیں ہو سکتا۔ اس سے قبل میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا قصہ بیان کر رہا تھا کہ آپؐ نے جب توحید کا دعویٰ کیا تو تمام آپؐ کے مخالف تھے کیونکہ نصاریٰ تو تثلیث کے قائل تھے۔ اقانیم ثلثہ مانتے تھے۔ حضرت عیسےٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا اور خدا کا بیٹا مانتے تھے۔ یہود عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے۔ مجوس لوگ اہرمن ویزداں کے قائل تھے خالق شر اہرمن ہے اور خالق خیر یزداں ہے۔ فارس میں آتش پرستی کا غلغلہ بلند تھا۔ ہندوستان میں وثن پرستی کا بازار گرم تھا۔ بعض شمس وقمر کو معبود حقیقی سمجھتے تھے۔ بعض خدا ہی کے منکر تھے اور اس سلسلۂ عالم کو بغیر موجد کے قیام پذیر بتاتے تھے یعنی جو لوگ دہریہ کہلاتے ہیں جیسے فرعون بھی دہری تھا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی موجود تھے۔ غرضیکہ تمام دنیا پر کشش جہت سے بحر کفر کی طغیانی تھی اور کوئی ناخدا نہ تھا جو گرداب ہلاکت سے کشتی کو کنارہ پر پہنچاتا۔ سب لوگ منجدھار میں پھنسے ہوئے تھے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر اِقْرَاْ بِاسْمِ کی ابتدائی تین آیتیں نازل ہوئیں۔ پھر تین سال تک متواتر وحی کا سلسلہ منقطع رہا جس سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر بعض احوال طاری رہا اور آپؐ نے بہت کوفت اٹھائی۔ چنانچہ ایک مرتبہ خودکشی کا قصد فرما لیا تھا۔ بحکم خداوندی جبرئیل علیہ السلام سدِ راہ ہوئے۔

کفار کا توکل

غرضیکہ تین سال بعد اور قرآن شریف نازل ہوا۔ چونکہ پہلی وحی میں تبلیغ کا حکم نہ تھا اور خدا کا نام لینا تو ہمیشہ سے حضورؐ کے لئے لابدی امر تھا۔ تو اب تک یہ کیفیت تھی کہ جناب فخر عالمؐ

کا کوئی منکر نہ تھا بلکہ سب لوگ آپؐ کے تقدس اور کریم النفس ہونے کے قائل تھے۔ آپ اُن لوگوں کے مقدمات میں حکم بن کر فیصلہ فرماتے تھے سب آپؐ کی امانت داری کی صفت کے معتقد تھے۔ چنانچہ آپؐ کو محمدؐ الامین کہا کرتے تھے۔

اوائل میں کے زمانہ کا ایک عجیب وغریب واقعہ ہے کہ قبائل عرب نے جب خانہ کعبہ کی مرمت کی تو حجر اسود کے اٹھانے کے وقت بہت جھگڑا ہوا۔ کہ اس کو اس کے محل میں کون چسپاں کرے۔ سب لوگ رئیس وعمائد تھے اور ہر شخص کا قصد یہی تھا کہ میں اس سرخروئی سے مشرف ہوں۔ قریب تھا کہ آپس میں کشت وخون ہو جائے اور شمشیر بے نیام ہو جائے۔ کیونکہ قبائل عرب میں بوجہ جہالت وضلالت کے قتال کوئی بڑا کام نہ تھا اُن کے ہاں تو موروثی جنگیں چلی آتی تھیں۔ خیر اُن کو ایسے جوش وخروش کے وقت یہ سوجھی کہ آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کر لو۔ تعجب ہے کہ ایسی جنگجو قوم کا ایسے موقعہ پر کیسے اتفاق ہوا۔

غرض کہ وہ لوگ حجر اسود کو چھوڑ کر ایک علیحدہ مقام پر مجتمع ہوئے اور یہ بات قرار پائی کہ مسجد حرام میں جو شخص سب سے اول داخل ہو، وہی ہمارا اس قضیہ میں حکم ہے اور اسی کے فیصلہ کے موافق ہم لوگ عمل کریں گے وہ جس فریق کو تجویز کر دے گا وہی اس کو اٹھائے گا۔ اور فریق ثانی کو کچھ چون وچرا کا حق حاصل نہ ہو گا۔

اس سے اُن لوگوں کا باوجود کفر کے توکل معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ

پر کیسے معتمد تھے کہ اوّل جو شخص داخل ہوگا وہ حکم بننے کے بھی قابل ہوگا۔ ایک آج کل ہمارا زمانہ ہے کہ باوجود اسلام کے توکل تو مفقود ہے لیکن اُس کی جگہ تاکل موجود ہے۔ چنانچہ ہر بات میں پالیسی حکمت عملی تلاش کی جاتی ہے سادگی بھولاپن، خلوص، اخلاص ناپید ہو گئے۔ یہ اوصاف حسنہ تو قدیم ہی لوگوں میں تھے۔ اب تو ایسے لوگوں کو احمق و بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ مگر خوب سمجھ لو آج کل کے لوگ عاقل نہیں آکل ہیں بلکہ باقل ہیں۔ اب تو صرف ظاہری نمائش و تزئین رہ گئی ہے۔ غرض کہ قدیم زمانے میں کفار و مشرکین تک بھی متوکل تھے۔

خیر سب سے اوّل مسجد حرام میں جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم ہی رونق افروز ہوئے۔ سب لوگ چلّا اٹھے کہ

جاء محمدٌ الامین ——— جاء محمدٌ الامین

کہ محمدٌ الامین تشریف لے آئے۔ حضورؐ کو دیکھ کر سب لوگوں نے خوشی کی کہ اب انصاف خوب ہوگا اور سب لوگ آپ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو گئے کہ ہمارا قلب بھی یہی چاہتا تھا کہ جناب تشریف لائیں اور آپ ہی ہمارے اس قضیہ کے حکم ہوں۔

یہ ایک ایسا عجیب واقعہ تھا کہ جس کے فیصلہ کرنے میں بڑے بڑے عقلاء بھی چکرا جاتے۔ کیونکہ جس فریق سے اٹھوائیں دوسرا فریق مدمقابل ہو جائے اور کہنے لگے اُس فریق کی طرفداری کی۔ آپ نے فرمایا کہ ایک چادر لاؤ اور چادر میں حجر اسود کو رکھ لو۔ پھر سب لوگ مل کے چادر کے کونے پکڑو

کے خانہ کعبہ تک لے چلو اور میں تمہارا سب کا وکیل ہو جاؤں۔ میں چادر میں سے اٹھا کر خانہ کعبہ میں رکھ دوں گا اور چونکہ وکیل کا فعل مؤکل کا فعل ہوتا ہے اس لئے وہ تم سب کا فعل ہو جائے گا۔ چنانچہ سب راضی ہو گئے اور آپؐ نے اس طرح حجر اسود خانہ کعبہ میں رکھ دیا اور سب نزاع و فساد رفع ہو گیا۔

تو دیکھو کفار کے قلوب میں حضورؐ کی یہ عقیدت و عظمت تھی لیکن جب آپؐ نے لا الہ الا اللہ فرمایا اور ساتھ ہی نبوت کا دعویٰ کیا۔ اغیار تو اغیار اعزہ و اقارب عقارب بن گئے۔ سب لوگ جان کے دشمن ہو گئے۔ ہر جگہ دو دو مذہب ہو گئے۔ تو کیا کوئی متنفس یہ کہہ سکتا ہے کہ آپؐ نے نااتفاقی کی بلکہ آپ تو عین اتفاق کے واسطے تشریف لائے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے اتفاق ہی کی جانب اُن کو مدعو کیا۔ تو حاصل یہ ہے کہ جو باطل پر ہو اُس کو حق والے کے ساتھ متفق کرو اور بالعکس معاملہ سے تحرز کرو۔

قیام علی الحق

جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا تو مکہ کے چند عمائد مجتمع ہو کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہم لوگ قوم کی جانب سے ایک وفد ہیں اور جناب والا کی خدمت میں ایک درخواست ہے۔ وہ یہ کہ آپ خطۂ حجاز میں شورش نہ پھیلاویں اور جو مقصود ہو اُس کو بیان فرما دیں۔ ہم آپ کے مطلب کو پورا کر دیں گے۔ اگر جناب مال و دولت کے متمنی ہوں، تو ہم ایک بڑا خزانہ جمع کر دیں۔ اپنے سب اموال سے دست بردار ہو جاویں اور آپ کے سپرد کر دیں۔ اپنے اوپر قیاس کیا۔ جیسے خود مال کے حریص و لالچی تھے اسی طرح خساست نفس سے حضورؐ کو

بھی تصور کیا۔ بھلا حضورؐ کے سامنے مال کی کیا پرواہ تھی۔ آپؐ سے تو کوہ التجا کرتے تھے کہ ہم سونے کے ہو جائیں اور آپ ہمیشہ انکار فرماتے تھے۔ آپؐ تو سلطان دو جہاں تھے۔

خیر پھر عتبہؓ نے کہا، اور آپؐ کو عورتوں کی حاجت ہو تو قریش کی سب کنواری لڑکیاں حاضر کر دی جائیں۔ جتنی آپؐ چاہیں پسند فرمالیں۔ چونکہ حضور سرور کائناتؐ بہت عالی نسب تھے اس لیے ان کو اپنی لڑکیاں دینا عار نہ تھا بلکہ اور باعثِ فخر تھا۔ یا آپؐ ہم پر حکومت کرنا چاہتے ہوں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں لیکن خدا را ان باتوں سے دست بردار ہو جائیے۔

آپؐ نے ان سب باتوں کے جواب میں فرمایا مجھ کو کسی شئے کی حاجت نہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا بجز اعلاء کلمۃ اللہ کے فقط ایک ہلکی سی بات کہہ لو کہ لا الٰہ الا اللہ۔ اس پر مشرکین نے کہنا شروع کیا۔

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلٰهًا وَّاحِدًا	کیا اس نے اتنے معبودوں کی
إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ۔	جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا واقعی
	یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔

اور یہ بھی کہا،

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ	ہم نے تو یہ بات پہلے مذہب
الْآخِرَةِ	میں نہیں سُنی۔

اور یہ بھی کہا،

أَؤُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ	کیا ہم سب میں سے اس شخص

پہننا۔
پر احکامِ الٰہی نازل کیا گیا۔

یعنی آپؐ تو مالدار ہیں نہ حاکم ہیں نہ پڑھے لکھے ہیں۔ آپؐ پر وحی کیسے نازل ہوئی۔ اس کے مستحق تو ہم تھے۔ ہم پر کیوں نازل نہیں ہوئی۔ تو یہ یہ مخالفتیں پیش آئیں اور پھر بھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا اتفاق کے واسطے تشریف لانا مسلّم ہے تو معلوم ہوا مطلق اتفاق محمود نہیں۔ میں پوچھتا ہوں تم نے اتفاق سیکھا کس سے صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کیونکہ کسی غیر کا اتفاق تو معتبر نہیں۔ تو بس حضورؐ کا عملی اتفاق دیکھ لو اور اُسی کے موافق تم بھی عمل کرو۔ تمام فرق باطلہ، دہریہ ملحدین صابئین، گبر، مجوس، یہود، نصاریٰ، مشرکین آپ سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ سب مخالفت پر کمر بستہ تھے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم استقلال سے کام نہ لیتے تو بہت سخت مشکل کا سامنا تھا۔ ہزاروں لوگ قتل کے درپے تھے۔ ایک یکہ وتنہا ذات پر اتنا ہجوم! خدا کی پناہ۔ نہ اتنی قوت تھی نہ مال تھا نہ اس قدر صحابہؓ اور رفقاء تھے۔ ادھر ارشاد تھا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔

اے رسولؐ! جو کچھ آپؐ کے رب کی جانب سے آپؐ پر نازل کیا گیا آپؐ سب پہنچا دیجئے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا۔ اللہ آپؐ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

آپ اس وحی کے بعد صحابہؓ میں تشریف لائے۔ اُس زمانہ میں صحابہ

جناب کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا، جاؤ اب کسی کی حاجت نہیں۔ اب حافظ حقیقی میرا نگہبان ہے۔ میں تنہا کام کروں گا۔ ایک بے سامان شخص کے واسطے ایسی اولوالعزمی بہت مشکل کام ہے۔ پھر دیکھئے قدرتِ حق کا نمونہ کہ سب لوگ آپؐ کے ساتھ ہوئے اور سب متفق ہو کر بود و باش کرنے لگے۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اتفاق مطلق مطلوب نہیں۔ ورنہ ایسا اتفاق تو حضورؐ کو قبل از دعا نبوت حاصل ہی تھا بلکہ اتفاق وہی معتبر ہے جس میں اہل باطل کو اہل حق کے ساتھ متفق کیا جائے۔ جیسے کہ اس مقصد میں حضورؐ کو بعد از تبلیغ کامیابی ہوئی۔ اسی واسطے آیت میں اَجْتَمِعُوا کا لفظ نہیں فرمایا بلکہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ فرمایا۔ جیسے کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مطلق اجتماع مراد نہیں بلکہ وہ اجتماع جس میں دین اللہ ہو وہ مطلوب ہے۔ اور دین اللہ ہی مطلوب و غیر مطلوب کا معیار ہے۔ جس اجتماع میں دین اللہ فوت ہوتا ہو اس کو دور ہی سے سلام کرنا چاہیے۔ اگرچہ ساری قوم کے خلاف وضع اختیار کرنی پڑے مگر دین اللہ سے ہرگز منہ نہ موڑے۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو شخص حق پر ہو اس کو اتفاق کی کوشش کی ضرورت نہیں بلکہ بس حق پر قائم رہنے کی ضرورت ہے۔ دیکھو مقناطیس کو جذب حدید میں کسی عملی تدبیر کی ضرورت نہیں بلکہ قدرۃً اس میں کشش آہن کا مادہ موجود ہے اسی طرح حق میں فطری تاثیر ہے کہ باطل کو اپنی جانب جذب کر لیتا ہے کسی سعی و تدبیر کی حاجت نہیں بجز قیام علی الحق کے۔ اس سے باطل یا تو منعدم

ہو جائے گا یا حق میں منجذب ہو جائے گا۔

اصلاح کی صورت

ایک مرتبہ تھانہ بھون میں میرے ایک عزیز نے ترک رسوم کے بارہ میں ایک مجمع کیا اور کہا صاحب مصلحت شرعی و عرفی کا مقتضا یہ ہے کہ ان رسومات جہل کو اٹھا دینا چاہیئے اور آپس میں معاہدہ کر لینا چاہیئے کہ آئندہ نہ رسومات خود کریں گے نہ اور جگہ شریک ہوں گے۔ ایک صاحب نے اس وعظ و نصیحت کے بعد اٹھ کر یہ کہہ دیا، اجی کیا ہمارے بزرگ بیوقوف تھے جو یہ رسومات کرتے تھے اُن کو اتنی عقل نہ تھی۔ بس سب پر پانی پھیر دیا اور سب مجمع منتشر ہو گیا۔ میں بھی اُس مجمع میں تھا۔ میں نے کہا، اس طرح تو کامیابی مشکل معلوم ہوتی ہے ایک عملی اور شرعی تدبیر کرو۔ چنانچہ ایک تو میں نے رسوم کے بارہ میں اصلاح الرسوم ایک کتاب لکھی۔ دوسرے یہ کہا کہ کسی کو کچھ مت کہو عمل شروع کر دو سب درست ہو جاویں گے۔ ہم نے اپنے گھر میں عمل شروع کیا۔ رفتہ رفتہ سب قصبہ نے عمل شروع کر دیا اور بفضلہ اس بلا سے تمام قصبہ مامون ہے۔ اور اگر کہیں ہے بھی تو شاذ و نادر۔ بلکہ خود رسوم کے کرنے والے بھی متاثر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں نامعلوم وہ پہلی سی رونق کہاں گئی۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

آپ کہہ دیجیے کہ حق آیا اور باطل گیا گزرا ہوا۔ واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے۔

اگر تم کسی کو راہ پر لانا چاہتے ہو تو اپنی اصلاح کر لو وہ خود بخود ٹھیک ہو

جائے گا۔ اس کی پروا نہ کرے۔ اور اگر ہم اپنی اصلاح نہ کریں گے تو لوگ طعن تشنیع کریں گے۔ اور کہیں گے بڑے بزرگ بنے، بڑے مولوی صاحب ہیں بلکہ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ (وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہیں کریں گے) کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ سے جو اسلام پھیلا وہ اُن کی اصلاح نفوس کی وجہ سے پھیلا۔ یہ جو لوگ مشہور کرتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے ذریعہ سے پھیلا بالکل غلط ہے۔ شمشیر کا اسلام قلب میں نہیں اُترتا۔ وہ تو لسان ہی پر مقصور رہتا ہے۔ یہ بات کہ صمیم قلب میں گھس جائے ادیان باطلہ سے نفرت ہو جائے صرف اصلاحِ باطن ہی سے ہوتی ہے

اسلام اور تلوار

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں فارس کا ہرمزان شہزادہ گرفتار ہو کر آیا۔ اسلام کے قاعدہ کے موافق اُس پر اسلام کو پیش کیا گیا۔ اُس نے قبول کرنے سے انکار کیا اور مطیع ہو کر رہنے سے بھی۔ حضرت عمرؓ نے قتل کا حکم دیا۔ اُس نے درخواست کی کہ مجھ کو تھوڑا سا پانی پلا دیجئے۔ تو چونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔

اِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَۃَ جب تم قتل کرو تو اچھی طرح کیا کرو

کہ آسانی اور سہولت سے قتل کیا کرو۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے پانی پینے کی اجازت دی۔ اُس نے گلاس منہ سے لگا کر علیحدہ کر لیا اور کانپنے لگا۔ سبب پوچھا کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں پانی پیتے ہوئے میری گردن پر تلوار نہ چلے۔ آپ نے فرمایا، نہیں ایسا نہ ہوگا۔ اُس نے کہا، اچھا وعدہ کر لیجئے کہ جب تک میں یہ پانی

نہ پیوں قتل نہ ہوں۔ آپ نے سادگی سے وعدہ کر لیا۔ آپ کو اس کی کید مضمر کی کچھ خبر نہ تھی۔ اس نے عہد لیتے ہی پانی زمین پر پھینک دیا کہ نہ قیامت تک یہ پانی ہوگا نہ میں پیوں گا۔ اور نہ قتل ہوں گا۔ حضرت عمرؓ بہت حیران ہوئے اور فرمایا کہ جاؤ بے فکر رہو ہم وعدہ خلافی نہیں کریں گے۔ اس نے فوراً ہی خلوص دل سے کہا،

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

اور یہ کہا کہ میں نے یہ حرکت اس وجہ سے کی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے شمشیر کے خوف سے اسلام قبول نہیں کیا اور نہ مجھ پر اسلام کے قبول کرنے میں کچھ دباؤ ہوا۔ ورنہ مسلمان تو میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کفار نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ شمشیر سے کام نہیں لیتے کیونکہ جنگ سے دوسروں کے اخلاق پر کیسے اثر ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ اخلاق ہی سے اسلام پھیلاتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں آپ کی ایک زرہ گم ہوگئی۔ آپ نے اس کو ایک یہودی کے پاس دیکھا جو ہر اعتبار سے ذلیل تھا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ زرہ میری ہے۔ اس نے کہا ہماری ہے اور دینے سے انکار کر دیا۔ دیکھئے آزادی قابل غور ہے۔ جانتا تھا کہ یہ لوگ عادل ہیں بغیر حجت کے کبھی دار وگیر نہ کریں گے۔ اسی وجہ سے اس قدر گستاخی سے پیش آیا اور کہا جائیے نالش کیجیے۔ حضرت شریح تابعی قاضی تھے اور حضرت علی کے ماتحت حضرت علیؓ ان کے دار القضا میں گئے۔ دیکھئے حضرت علیؓ کی تواضع کہ خود باوجود خلیفۃ المسلمین ہونے کے دار القضا میں تشریف لے گئے۔ یہ نہیں کیا کہ قاضی صاحب

کو بلوا لیتے۔ باقاعدہ دعوئے کیا۔ حضرت شریح نے بمقتضائے البینۃ علی المدعی حضرت علیؓ سے گواہ طلب کئے۔ دیکھئے اسلام کی آزادی، اسلام کا عدل وانصاف کہ خود ملازم نے بادشاہ سے اس طور پر ثبوت مانگا جیسا کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے مانگا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ نے ایک تو حضرت حسنؓ کو پیش کیا۔ دوسرا آپ کا آزاد کردہ ایک غلام تھا۔ حضرت شریح نے فرمایا کہ غلام کی شہادت تو مقبول ہے کیونکہ آزاد کردہ ہے البتہ آپ کے لئے حضرت حسنؓ کی شہادت حجت نہیں ہے لہذا دعویٰ خارج کیا گیا (یہ مسئلہ اجتہادی ہے حضرت علیؓ بیٹے کی شہادت باپ کے لئے حجت مانتے تھے اسی لئے اُن کو پیش کیا۔ حضرت شریح نہ مانتے تھے اس لئے قبول نہیں کیا) حضرت علیؓ ہنسی خوشی دارالقضا سے باہر تشریف لے آئے۔ یہودی بھی آپ کے پاس آیا اور کہا،

اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد رسول اللہ

کہا مجھ کو مذہب اسلام کی حقانیت ثابت ہوگئی کہ آپ نے اپنی زرہ پہچانی آپ نے مجھ سے زبردستی نہ لی۔ قاضی نے ڈگری مجھے دی اور آپ چیں بجبیں نہ ہوئے۔ اس کے بعد زرہ واپس کردی اور خدام میں داخل ہوگیا۔

اس طرز عمل سے لوگ مسلمان ہوئے ہیں۔ اس واقعہ میں اُنہوں نے کون سی شمشیر زنی کی تھی۔ دیکھئے ایک زمانہ تو وہ تھا کہ کفار مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام کی طرف رغبت کرتے تھے۔ ایک آج کل کا زمانہ ہے کہ ہم کو دیکھ کر مسلمین بھی نفرت کرتے ہیں۔

چنانچہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں کسی نے ایک مجوسی سے کہا

کہ تو مسلمان ہو جا۔ اُس نے جواب میں کہا کہ اگر بایزید جیسا مسلمان ہونا مراد ہے تو یہ مجھے مشکل ہے اور اگر تم جیسا ہونا مراد ہے تو تم سے تو میں ہی اچھا ہوں۔ خیر یہ تو اُس کی حماقت تھی کہ مجوسیت کو اسلام پر ترجیح دیتا تھا۔ خواہ وہ کسی درجہ کا اسلام ہو لیکن مقصود اس حکایت سے یہ ہے کہ بعض لوگوں کے اسلام کو کفار بھی پسند نہیں کرتے۔

حاصل یہ ہے کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ دیکھو ہم لوگوں میں گو وہ بات نہیں ہے اور اسلام کے ویسے محاسن ہم میں نہیں تاہم ہمیں کو دیکھ دیکھ کر سینکڑوں مسلمان ہوتے ہیں تو اب ان کی گردن پر کون تلوار رکھتا ہے۔ یہ صرف اسلام کی حقانیت ہے البتہ آج کل اہل اسلام ضرور ضعیف ہیں۔ باقی اسلام میں وہی قوت ہے وہی کشش ہے۔ یہ اُسی کا اثر ہے۔ جن لوگوں نے ابتداء اسلام میں اسلام قبول کیا تھا اُن میں کیا کیا آفتیں نہ آئیں، تلواریں چلیں، خاندان چھوٹے مال و دولت ہاتھ سے گئی لیکن سب کو گوارا کیا۔ اُن پر کون سی تلوار چلی تھی۔ البتہ جن لوگوں نے جان کر شرارت سے اس میں مزاحمت کی اُن کے لئے یہ قانون مقرر کرنا ضرور تھا کہ اسلام ہو یا استسلام ہو کر باج گزار، خراج گزار ہو کر رہو۔ حلقہ اطاعت و انقیاد اپنے گوش میں آویزاں کرو یا مسلمان ہو کر لذتِ دارین حاصل کرو ورنہ تلوار کے گھاٹ اُترو۔ دیکھئے سب سے پہلے اسلام کی ایک بڑی ہستی یعنی فخر عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات۔ تو کیا وہ ایک ذات تلوار سے سب کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اصل سبب اُس ذات کی برکت تھی جس نے تمام عرب و عجم، فارس و روم، یورپ و ہند میں اسلام کے پرچم اڑائے

جس کے نشانات اب تک ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں ؎

ہنوز آں ابر رحمت دُرفشانست　　خم و خمخانہ بامہر و نشانست

ابھی وہ ابر رحمت موتی بکھیر رہا ہے۔ خم اور خم خانہ بارونق ہے۔

اب تک وہی آب و تاب ہے۔ اس لئے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ اسلام ضعیف نہیں بلکہ اہل اسلام ضعیف ہیں۔ اسلام کے اندر جو کسی کو ضعف معلوم ہوتا ہے وہ فی الحقیقت اپنا ضعف ہے۔

ہمارے قصبہ میں ایک گنوار عورت اپنے بچہ کو پاخانہ کرا کر چاند دیکھنے کو اٹھی اتفاق سے ناخن میں کچھ پاخانہ لگا رہ گیا تھا۔ انگلی کو ناک پر رکھا جیسے کہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ تو ناخن میں سے پاخانہ کی بُو آئی کہنے لگی اوئی اب کے کیسا سڑا چاند نکلا ہے۔

سو ایسے ہی ضعف اپنے اندر ہیں مگر اسلام کے سر جپکتے ہیں۔ اسلام کی حقیقت تو عقائد اور دیانات، معاملات، معاشرت اعمال ہے۔ سو ان احکام میں کیا ضعف آگیا۔ اس میں ضعف خلط مبحث سے ہوتا ہے۔ سو اسلام اس سے بالکل محفوظ ہے۔ حق و باطل تمام تر ممیز ہے۔ اسلام آئینہ کی طرح صاف ہے۔ اس میں میل کا نام نہیں۔ دیکھئے جتنی کتابیں ہیں سب میں تحریف ہے لیکن قرآن پاک ہے کہ اس میں ایک نقطہ کا بھی ردّ و بدل نہیں اور نہ ہو سکے اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ارشاد ہے۔ اور دیکھو کہ قرآن پاک کے لاکھوں کروڑوں حافظ ہیں۔ اگر ایک بڑے سے بڑا مولوی غلطی کرے ایک بچہ روک

سکتا ہے۔ یہ کیفیت ہے کتاب اللہ کی۔ اور ہر دین کی خدمت کتابوں اور اُن کتابوں کے حاملین سے ہوتی ہے۔ سو اسلام کی تمام تعلیمیں مدوّن ہیں اور اہل حق ہمیشہ رہیں گے۔

روحی طاقت چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے۔ لَا یَزَالُ طَائِفَۃٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ۔

اب اس کے بعد بتاؤ کہ اسلام میں ضعف کہاں ہے۔ البتہ اہل اسلام میں بے شک ضعف ہے جس کی مثال بعینہٖ یہ ہے کہ کھانا اچھا عمدہ موجود ہے لیکن کھانے والا بیمار ہے کہ بُرا معلوم ہوتا ہے یا کھانے والے کو صفرا ہوا ہے کہ کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ تو اب خرابی کھانے میں ہے یا کھانے والے میں؟ اسی طرح مسلمان ضعیف ہے یا اسلام ضعیف ہے ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشانست ‏ ‏ ‏ خم و خمخانہ با مہر و نشانست

ابھی وہ ابرِ رحمت موتی بکھیر رہا ہے۔ خم و خمخانہ بارونق ہے

یہ تو قوتِ اسلام کی لمی دلیل تھی اور اسلام کے مضبوط ہونے کی دلیل انی یہ ہے کہ جو شخص اس کو اختیار کرے وہ کمزور نہیں رہتا۔ تو اگر دین میں یہ اثر نہیں تو یہ قوت کہاں سے آئی۔ اگر لاٹھی مضبوط نہ ہو تو انسان بے خوف نہیں چل سکتا۔ اور اگر لاٹھی مضبوط ہو تو انسان بے خوف و خطر چلا جاتا ہے اسلام میں اگر طاقت نہ ہو تو انسان خوف کرے لیکن اسلام کی طاقت تو روز بروز ترقی پر رہتی ہے۔ اس لئے معلّم کامل کی حالت پیرانہ سالی میں یہ

رہتی ہے ؎

خود قوی تر مے شود خمر کہن — خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

پرانی شراب تیز ہو جاتی ہے۔ خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو۔

اور فرماتے ہیں ؎

ہر چند پیر وخستہ و بس ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن جس وقت تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ حضرت حاجی صاحبؒ باوجود ضعف کے جب کچھ بیان فرماتے تھے تو بہت بلند آواز سے فرماتے تھے اور گھنٹوں بیان کیا کرتے تھے حالانکہ بعد میں آہ آہ کرنے لگتے تھے۔ میری موجودگی میں مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی کی عمر سو سال سے زیادہ تھی۔ ایک مرتبہ فجر کے وقت خوب سردی کے زمانہ میں خادم سے کہا کہ غسل خانہ میں گھڑا رکھ دے۔ مجھے کچھ شبہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر کھلے غسل خانہ میں کھڑے نہائے اور خود آکر امامت کی تو اس عمر میں اول تو شبہ ہی مستبعد ہے۔ دوسرے ایسے موقع میں نہانا پھر امامت کرنا سب باتیں طاقت کی علامتیں ہیں۔ گو یہ ضروری نہیں کہ جسمی قوت بھی ہو مگر روحی طاقت تو ضرور ہوتی ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ روحی اثر جسمی طاقت کو بھی تا دیر قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے بزرگ باہمت ہوتے ہیں۔

اُن میں ضعف اور بوداپن نہیں ہوتا - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق میں بڑی قوت ہے -

چراغ خداوندی بعض لوگ اسلام کی مثال بیوہ عورت سے دیتے ہیں کہ اس وقت اس کا کوئی اعانت کرنے والا نہیں ہے بالکل غریب و محتاج ہے - لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ -

اسلام محتاج نہیں اور نہ کسی شخص کا اسلام کی خدمت سے اسلام پر احسان ہے ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی   منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

اگر تم سلطان کی خدمت کرتے ہو تو تم کو احسان نہ رکھنا چاہیے
بلکہ خود سلطان کا احسان ماننا چاہیے کہ تم کو خدمت میں رکھا -

اسلام کا احسان ہے کہ تم کو خادم بنایا - اسلام کسی ذات کے وجود و عدم پر موقوف نہیں - دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا - حضورؐ کے تشریف لے جانے سے اسلام کا نشان تک نہ رہتا - لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور برکات حضورؐ کی اب تک موجود ہیں - تو معلوم ہوا کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تشریف بری سے اسلام میں کچھ تذبذب نہ آیا تو اور کسی شخص کے معدوم ہو جانے سے اسلام پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور جس کو زعم ہو وہ چھوڑ کر دیکھ لے -

بعض لوگ چندہ دے کر احسان رکھا کرتے ہیں - وہ چندہ موقوف کر کے دیکھ لیں کہ خدا کا کام انجام پذیر ہوتا ہے یا نہیں - ہاں ہم ان کے ذمہ دار

نہیں کہ وہ کام اسی جگہ انجام پذیر ہو۔ یہاں نہیں اور جگہ ہوگا مگر ہوگا ضرور۔ دیکھو گورنمنٹ کے محکمے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ بالکلیہ ہی معدوم ہو جاویں دوسری جگہ قائم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً پولیس کا محکمہ کہ ایک گاؤں سے توڑ دیا جاتا ہے مگر دوسری پولیس سے اس گاؤں کا انتظام متعلق ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ بستی کا مدرسہ تو ٹوٹ گیا۔ تو بھائی دوسری جگہ کے مدرسہ سے اس بستی کی تعلیم کا انتظام ہو گیا۔ انعدام نہیں ہوا، انتقال ہوا ہے۔ جیسے سرکاری محکمہ جات منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح خداوندی محکمے بھی منتقل ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ دین کا چراغ بجھ نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ روشن رہتا ہے ؎

اگر گیتی سراسر باد گیرد   چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

اگر ساری زمین میں آندھیاں آجاویں تو بھی اہل اللہ کا چراغ گل نہیں ہو سکتا۔

تو چراغ تو نہیں بجھتا البتہ ایسا ہوتا ہے کہ باد مخالف کے جھونکے کی وجہ سے۔ یا کسی کی ناقدری کی وجہ سے کہ اس کے گل کرنے کی فکر میں لگ گئے اس طاق میں سے دوسرے طاق میں رکھ دیا جاتا ہے اور تبدیل طاق میں چراغ کی کوئی مصلحت نہیں۔ اسی جگہ کے لوگوں کی مصلحت سے ایسا کیا گیا۔ یہ روشنی سے محروم نہ ہوں یا اس وجہ سے کہ مبادا یہ نادان اپنے ہاتھ پیر نہ جلالیں۔

ایک مرتبہ بچپن میں میں اور میرے ایک اور عزیز کہ وہ بھی بچے تھے گھر میں شرارت کرنے لگے۔ اور چراغ کو پھونک مار کر گل کرنے لگے۔ گھر والوں نے اس کو ایسی جگہ رکھ دیا کہ پھونک نہ پہنچ سکے۔ ہم نے ٹوپی اچھالنا شروع کر دی

اُنہوں نے اور اونچا رکھ دیا۔

تو مقصود یہ ہے کہ بے قدری کرنے کی بدولت ان سرکشی کرنے والوں سے چراغ دور ہو جاتا ہے بجھتا نہیں۔ بعض بزرگوں کی کرامت منقول ہے کہ آندھی سے اُن کا چراغ نہیں بجھتا تھا۔ تو اللہ میاں کے چراغ کو کون بجھا سکتا ہے ؎

چراغے راکہ ایزد برفروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

جس چراغ کو اللہ تعالیٰ نے روشن کیا ہو اُس کو گل کرنے کے لئے جو پھونک مارے گا اُس کی داڑھی جل جائے گی۔

اس ریشش بسوزد پر مجھ کو لطیفہ کے طور پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک احمق نے کسی کتاب میں دیکھا کہ جس شخص کی داڑھی لمبی اور سر چھوٹا ہو، وہ بے وقوف ہوتا ہے۔ آپ کو شبہ ہوا۔ آئینہ میں چہرہ مبارک ملاحظہ فرمایا۔ اپنی صورت پر حماقت کی علامت کو منطبق پایا۔ آپ کو درستی کی فکر ہوئی۔ قینچی وغیرہ تلاش کی کچھ نہ ملا۔ مجبور ہو کر داڑھی کو چراغ کے سامنے کر دیا کیونکہ سر کو بڑا کر نہیں سکتے تھے۔ داڑھی کو چھوٹا کرنے لگے۔ جتنی داڑھی باقی رکھنا تھی اُس کو مٹھی میں لے لیا۔ باقی کو جلانے کے واسطے چراغ پر رکھنا تھا کہ آگ کی لپیٹ سے ہاتھ علیحدہ ہو گیا اور داڑھی کا صفایا ہو گیا۔

احمق تھا نا علامت کو علّت سمجھا کہ رفع مستلزم ہے رفع معلول کو۔ دوسری بے عقلی یہ کی کہ اس قدر عجلت سے کام لیا۔ خیر بعد میں معترف ہوئے کہ واقعی کتاب میں سچ لکھا ہے۔ میں ضرور احمق ہوں۔ ہاں اس داڑھی کے

جلنے کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ اتنی سمجھ فوراً آ گئی کہ میں احمق ہوں۔ علامت کے دفع ہوتے ہی حماقت معلوم ہو گئی۔ اسی طرح چراغ خداوندی کو بجھانے والے کی ریش جل جاتی ہے۔

تو مقصود یہ ہے کہ اللہ میاں بندوں کی مصلحت کی وجہ سے مقام تبدیل فرماتے ہیں۔ اسی راز کو سمجھ کر محقق مشائخ کسی خلیفہ کو سجادہ نشین نہیں بناتے بلکہ جو شخص کسی جگہ ہو اس مقام کو حاصل کر لے وہی سجادہ نشین ہے اور اس سجادہ پر بیٹھنے سے صاحب مقام تھوڑا ہی بنتا ہے۔ وہ تو مقام باطن ہے خواہ ہرات میں ہو خواہ کوفہ بصرہ میں۔

حقیقی مقام

ایک خوب لطیفہ یاد آیا۔ ایک صاحب علم کو حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنے پاس بیٹھنے کو فرمایا۔ وہ تواضع کرنے لگے۔ کہنے لگے ؎

دلا تا بزرگی نیاری بدست ۔۔۔ بجائے بزرگاں نباید نشست

فرمایا، بجائے بزرگاں سے مراد یہ حسی جگہ نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اُن سے مساوات کا دعوے نہ کرے۔ اور جگہ میں کیا رکھا ہے! اور اگر جائے بزرگاں سے ہی مقام مراد ہے تو پھر اس میں تفصیل ہے۔ کسی ظریف نے تو بلا تفصیل اس کی جگہ یہ کہا ہے ؎

بجائے بزرگاں بباید نشست ۔۔۔ کہ شاید بزرگی بیاید بدست

خیر یہ تو شاعری ہے مگر اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بزرگ کہیں تو بیٹھ جائے ورنہ نہ بیٹھے کیونکہ بے ادبی ہے۔ جب کہ وہ جگہ انہی کے ساتھ مخصوص

ہو جیسے تکیہ مسند ورنہ بغیر کہے بھی کچھ حرج نہیں۔

مولانا رفیع الدین صاحب دیوبند میں چارپائی پر پائنتی کی جانب بیٹھے تھے۔ میں حاضر ہوا تو سرہانے بٹھانے لگے۔ میں نے عذر کیا تو مولانا نے فرمایا کہ کہنے کے بعد انکار نہیں کرنا چاہیئے اور اس کی تائید میں یہ حکایت بیان فرمائی (یا شاید میں نے کسی اور سے سنی ہے کچھ شک ہو گیا ہے) کہ دارا شکوہ اور عالمگیر میں اختلاف تھا اور ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ تخت و تاج میرے قبضہ میں ہو اور اُس کی مختلف تدابیر میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ دارا شکوہ کو ایک صاحب حال درویش کا پتہ لگا۔ اُن کی خدمت میں جا کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔ اُن نے اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں بیٹھنے کو کہا۔ دارا شکوہ نے ادب کے سبب عذر کر دیا۔ کیونکہ یہ درویشوں کے بے حد معتقد تھے خیر وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ پھر دارا شکوہ نے تخت کے واسطے کہا۔ درویش صاحب نے فرمایا، میں تو تخت پر بٹھلاتا تھا مگر تو نے انکار ہی کر دیا۔ بہت افسوس ہوا اور اُن نے کسی سے نہیں کہا۔ کہیں عالمگیر کو خبر نہ ہو جائے۔

پھر ان صاحب حال کا عالمگیر کو پتہ چلا۔ دارا شکوہ تو جاہل تھے اور عالمگیر عالم تھے۔ گو دارا شکوہ کتابی علم رکھتا تھا۔ مگر اس کی حقیقت صرف زبان دانی ہے۔ زبان دانی دوسری شے ہے اور علم دوسری چیز۔ زبان دان تو سب سے زیادہ عرب میں ابو جہل تھا (ابن جہل بھی نہیں) غرض جب عالمگیر اُن کے پاس پہنچے تو وہ تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ اور اپنی جگہ چھوڑ کر

وہاں اُن سے بھی بیٹھنے کو کہا۔ یہ بے تکلف جاکر بیٹھ گئے اور کہا کہ تخت و تاج دلوایئے۔ فرمایا تخت پر تو تم بیٹھے ہی ہو اور تاج میرے قبضہ میں نہیں ہے پوچھا وہ کس کے متعلق ہے۔ کہا وہ تمہارے فلاں خدمت گار کے قبضہ میں ہے وہ اگر تمہارے سر پر ٹوپی یا عمامہ رکھ دے تو بس تاج مل گیا۔ دیکھئے ایک خدمتگار کو تاج بخشی کی طاقت حاصل تھی ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم   شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

؎ گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں
که ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

؎ خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر   تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اُنہوں نے اس خدمتگار کا نام وغیرہ پورا پتہ بتا دیا۔ پھر مکان پر واپس آکر اس خدمت گار کو بلایا۔ اسی آن بان سے اور اسی صولت و شوکت سے جب وہ آیا۔ کہا وضو کے واسطے پانی لاؤ۔ زبردستی وضو کرنا شروع کر دیا۔ نہ وقت تھا نہ ضرورت تھی۔ عمامہ اتار کر علیحدہ کر دیا۔ پھر تولیہ منگایا۔ اس کے بعد کہا ہمارے سر پر یہ عمامہ رکھ دو۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا، میری کیا مجال عمامہ کو ہاتھ لگاؤں۔ اُس نے ڈانٹ بتلائی کہ نہیں جو ہم حکم دیتے ہیں کرنا پڑے گا جناب زبردستی اُس سے تاج لے لیا۔ وہ بیچارہ عمامہ رکھ کر اس فقیر کو کوستا ہوا چلا گیا کہ خدا اس فقیر کا ناس کرے جس نے مجھے رسوا کیا۔

یہ مضمون استطراداً اس شعر کی تفسیر پر آگیا تھا۔ ع

بجائے بزرگاں نباید نشست

اصل مضمون یہ تھا کہ جو شخص خدمتِ دین میں خلیفہ ہوتا ہے وہ حقیقی مقام نشین ہوتا ہے اُس کو گدّی سے بلکہ گدھے سے تعلق نہیں ہوتا۔ آج کل تو سجادہ نشینی کی محض رسم رہ گئی ہے۔ بزرگی وغیرہ سب رخصت ہو گئی فقط دکانداری باقی ہے۔ بعض نابالغ بچے بھی سجادہ نشین کیئے جاتے ہیں اور سب سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ مریدین (دس تار) دستار باندھ کر سجادہ نشین بناتے ہیں حالانکہ وہاں ایک تار بھی نہیں ہوتا مگر ہے یہ اچھی بزرگی کہ مریدین سے حاصل ہوتی ہے۔

ضرورتِ توکّل

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حق تعالےٰ کے دین کو کسی خادم کی ضرورت نہیں۔ جس خادم کو شرف حاصل کرنا ہو وہ اپنی غرض سے اُس کی خدمت کرے۔ اب رہی ظاہری اعانت اور اُس کا دخل اُس کے بقا میں، تو اس کا امتحان کر لو اور دینا بند کر کے دیکھو۔ معلوم ہو جائے گا کہ کسی پر تو دارو مدار نہیں ہے۔ تو اہلِ مدرسہ کو بھی چاہیئے کہ استغناء سے کام لیں۔

اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَ تَوَكَّلُوْا عَلَیْهِ۔ بڑے پیمانہ پر کام نہ ہی، مختصر ہی تجویز کر لو۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مدرسہ و طلبہ اہلِ دنیا کی نظروں میں حقیر نہ ہوں گے۔ جیسے آج کل حقارت کا مرض وباءِ عام کی طرح پھیل رہا ہے۔

ایک تحصیلدار صاحب کے یہاں ایک طالب علم مدرسہ کا کھانا لینے جایا کرتے۔ اور انتظار میں بہت بیٹھنا پڑتا۔ ایک دفعہ اُنہوں نے تحصیلدار صاحب سے کہا کہ آپ کا لڑکا بہت کھیلا کرتا ہے۔ کہیئے تو میں یہاں بیٹھنے

کے وقت اس کو کچھ عربی پڑھا دیا کروں۔ فرمایا، مولانا عربی پڑھنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ آپ نے عربی پڑھی تو میرے دروازہ پر روٹی مانگنے آئے۔ یہ عربی پڑھے گا تو آپ کے دروازہ پر مانگنے جائے گا۔

دیکھیے یہ نتیجہ ہوتا ہے امراء کے دروازہ پر جانے کا۔ دین کی عظمت کا مقتضاء تو یہ تھا کہ اس کے بعد سے وہاں نہ جاتے اور انکار کر دیتے اور خدا پر توکل کر کے بیٹھ رہتے ؎

ہیں توکل کُن ملرزاں پاؤ دست
رزقِ تو بر تو عاشق تر است!

کسی حکیم نے کہا ہے ؎

بے مگس ہرگز نماند عنکبوت رزق را روزی رساں پر می دہد

کہ رزق کے پر لگا دیئے جاتے اور بغیر طلب کے ملتا ہے۔ ع

حیف باشد دلِ دانا کہ مشوش باشد

افسوس ایک دو نان کے واسطے دو نان کی طرح ذلت اٹھائی جائے

بئس المطاعم حین الذل تکسبہا ؎
فالقدر منتصب والقدر مغفوض

قدر کے معنی ہانڈی کے ہیں اور قدر آبرو کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے مطاعم سے ہانڈی تو بلند ہوتی ہے لیکن آبرو گھٹ جاتی ہے۔ تو چندہ کے لیے کسی کے در پے مت ہو۔ خطاب خصوصیت سے بالکل دست بردار ہو جاؤ۔ ضروریات مدرسہ کا صرف اعلانِ عام کر دو

چلنا پھرنا چھوڑ دو۔ ایک جگہ آرام سے بیٹھ رہو۔ بس اگر چندہ زیادہ ہو کام زیادہ کرو۔ اگر چندہ کم ہو کام کم کرو۔ چندہ ختم ہو جائے کام ختم کرو۔ ذرا ہمت کر کے تھوڑے دنوں اس پر عمل کرو۔ دیکھو تو خود بخود چندہ آنے لگے گا۔ جیسا مستغنی عن الدنیا کے لئے دعارہ نبوی ہے اَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ (اُن کے پاس دنیا خود خواہشمند بن کر آتی ہے)

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اس پر فرماتے تھے کہ ہم نے اس کا منظر حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کے یہاں دیکھا ہے کہ بڑے بڑے امراء و عہدہ دار ڈپٹی کلکٹر وغیرہ خدمت میں آیا کرتے تھے۔ اور مولانا حجرہ میں ہوتے تو اُن کے انتظار میں حجرہ کے باہر ٹوٹے پھٹے گرد آلود بوریہ پر بیٹھے رہتے۔ یہ تو اہل استغناء کی حالت ہے اور جو لوگ مانگا کرتے ہیں، لوگ اُن کے آنے سے گھبراتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ بس اب چندہ مانگیں گے۔ اُن سے پوشیدہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ جس قدر کام اغراضِ دین کی حفاظت رکھتے ہوئے کر سکتے ہو وہ کام کرو۔ زیادہ فکر میں مبتلا نہ ہو۔ کیونکہ یہ تو سرکاری محکمہ ہے اس میں تبدیل اور عزل سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اس کو روزی کا وسیلہ سمجھنا خواہ مخواہ موجب شبہ ہوتا ہے۔ اگر تم حق پر ہو تو حق تو خود سب کو جذب کرے گا۔ تم کو کسی کے در پہ جانے کی حاجت نہ ہوگی اور یہی ہے حبل اللہ یعنی دین کی قوت جو سب کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ بس اب تم خدا کے ہو جاؤ۔ خدا خود سامان کرے گا اور اسی پر توکل کرو۔ ورنہ سمجھا جائے گا کہ

تم خدا کے معتقد نہیں! ورنہ تمہاری مثال اس حکایت کی طرح ہو جائے گی۔

ایک مولوی صاحب بسم اللہ کے فضائل بیان کر رہے تھے کہ جو کام بسم اللہ پڑھ کے کیا جائے اس میں ایسی برکت ہوتی ہے۔ وہ خوب اچھا ہوتا ہے۔ ایک گھسیارہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اچھا ہوا یہ نسخہ ہاتھ لگا۔ روزانہ دریا سے پار اترنے کا پیسہ دینا پڑتا تھا۔ اب پیسہ روز بچے گا۔ چنانچہ وہ پانی میں سے بسم اللہ پڑھ کے پار ہو جاتا تھا اور کسی قسم کا خطرہ نہ ہوتا تھا۔ اس نے ان مولوی صاحب کی دعوت کی کہ جن کی بدولت یہ دولت ملی ہے ان کی دعوت تو کرنا چاہیے۔ جب مکان کو لے چلا تو راستہ میں دریا آیا۔ مولوی صاحب رک گئے۔ اس نے کہا مولوی صاحب چلو۔ مولوی صاحب نے فرمایا کشتی تو ہے نہیں کیسے چلوں۔ اس نے کہا، جی بسم اللہ پڑھ کر چلئے اس دن آپ ہی نے تو وعظ میں مجھے نسخہ بتایا تھا۔ جب اس پر بھی مولوی صاحب کی ہمت نہ ہوئی تو اس نے کہا چلئے میں آپ کو لے چلوں۔ چنانچہ مولوی صاحب کا بھی اس نے ہاتھ پکڑ کر پار کر دیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا بھائی تو تو عامل ہے اور میں نرا عالم ہوں۔

تو ایسے ہی ہم لوگ بتلاتے تو ہیں مگر ہمارے قلوب میں عظمت نہیں ہے جب تم ہی اپنے عقائد پر مستقیم نہ رہو گے تو دوسرے کو کیا بلاؤ گے مگر خیر پھر بھی نہ بلانے سے بلانا اچھا ہے۔

حبل اللہ یہ وہ حبل اللہ ہے کہ جو شخص اس حبل اللہ کے ساتھ تمسک کرتا ہے اس کے بارہ میں ارشاد ہے۔

فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقیٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ پس اُس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا۔

کہ اُس کا تعلق قرب قیامت تک بلکہ قیامت کے بعد بھی منقطع نہیں ہوتا بہر حال ضعف اسلام میں نہیں۔ صرف اہل اسلام میں ہے۔ سو ان اہل اسلام کی تقویت کے واسطے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ ولا تفرقوا کہ آپس میں تفرقہ اندازی نہ کرو۔ اور اب دیر ہو جانے کے سبب میں ترجمہ کر کے اس مضمون کو ختم کئے دیتا ہوں۔

وَاذْکُرُوا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اور تم حق تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَاءً جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ۔ تو تمہارے قلوب میں حق تعالیٰ نے محبت و الفت کا تخم بو دیا۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا۔ تو تم اُس کے احسان سے بھائیوں جیسی محبت کرنے لگے وکنتم شفا حفرۃ من النار۔ تو تم قعر جہنم کے کنارہ پر پہنچ چکے تھے فقط اس میں گرنے کی دیر تھی۔ فَاَنْقَذَکُمْ مِنْهَا۔ تو تم کو حق تعالےٰ نے اُس سے نجات دی۔ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیَاتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ حق تعالےٰ تم کو کھلی کھلی علامتیں دکھاتا ہے تاکہ تم راہ راست پر آجاؤ۔ وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ۔ یعنی ایک جماعت تم میں سے ایسی ہونا چاہیئے، جو داعی الی الخیر ہو۔ یعنی جو دین کی بقا میں کوشاں ہو اور شرعی امور اور دینی معاملات کا انتظام کرے۔

اور امۃ منکم اس لئے فرمایا کہ اگر سب ہی کرنے لگیں تو کھیتی کون

کرے گا اور نوکری تجارت وغیرہ کون کرے گا۔ یہ شریعت کا انتظام ہے کہ زراعت تجارت وغیرہ کو فرض کفایہ کیا ہے۔ اگر سب چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہگار ہوں کیونکہ مجموعہ کو اسباب معیشت کی بھی حاجت ہے ورنہ سب ہلاک ہو جاویں اور نہ دنیا رہے نہ دین۔ اور جو لوگ تارک اسباب ہیں اُن کی جمعیت و توکل بھی مباشرین اسباب ہی کی بدولت ہے۔ گو اُن کے احاد کی تعیین نہیں مگر مجموعہ میں ایسے احاد کا ہونا ضروری ہے۔ خصوص ہم جیسے ضعفاء کے لئے تو اگر ظاہری سامان نہ ہو تو تشویش سے دین ہی میں خلل پڑنے لگے۔

ایک ظریف درویش کی مجلس میں کسی نے کسی کو دُعا دی کہ ایمان کی سلامتی اور عاقبت بخیر نصیب ہو۔ درویش کہنے لگے اس کے معنی بھی جانتے ہو لوگوں نے کہا ترجمہ سے زیادہ تو معلوم نہیں۔ اُنہوں نے ظرافت سے کہا کہ ایمان کی سلامتی تو یہ ہے کہ روٹی اچھی طرح مل جائے اور عاقبت بخیر یہ ہے کہ پاخانہ کھل کے ہو جاوے۔

جب تک آرام سے بسر ہوتی ہے تب ہی تک ہمارا سب دینداری تقویٰ طہارت ہے۔ جو لوگ کماتے ہیں ان ہی کی برکت سے یہ رتبہ حاصل ہے جن کو تم تحقیراً سگان دنیا کہا کرتے ہو حالانکہ تم سوتیلان دنیا ہو۔ یعنی وہ دنیا کے سگے ہیں اور تم سوتیلے ہو۔

اس پر حکایت یاد آئی کہ چھوٹے بچے سے کسی نے پوچھا کہ فلاں شخص تمہارے سگے بھائی ہیں۔ کہا سگے نہ کہیے۔ سگ تو کتے کو کہتے ہیں۔ حقیقی بھائی کہیے۔

حاصل یہ ہے کہ دنیا سے سب کو تعلق ہے کوئی سگا ہے کوئی سوتیلا اور مطلق مذموم بھی نہیں کیونکہ دنیا مطلقاً بُری نہیں ہے بلکہ دنیا جو معصیت ہے صرف وہ بری ہے۔ اس لیئے باری تعالےٰ نے دلتکن فرمایا کونوا نہیں فرمایا۔ جیساکہ اوپر وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا فرمایا۔ اس لئے مقصود تو یہ ہے کہ دین تو سب میں ہو لیکن ایک ایسی ہی جماعت ہو جو مولویت ہی کا کام کریں اور کچھ دوسرا کام نہ کریں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا۔ جو لوگ مولوی لوگوں کو الزام دیتے ہیں کہ یہ لوگ ترقی نہیں کرتے غلط ہے۔ کیونکہ اہل علم کی ترقی یہ ہے کہ علم میں کمال پیدا کریں۔ اگر وہ تجارت میں مشغول ہو جاویں تو ظاہر ہے کہ علم ضائع ہو جائے گا جس کی بقا کی ضرورت آیت دلتکن منہم بتلا رہی ہے۔ جیسے کہ اہل تجارت اگر تبحر علمی میں مشغول ہوں تو تجارت ضائع ہو جائے۔

اب رہا مولویوں کے کھانے کا سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب فرماتے ہیں۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى۔

غرض ایک جماعت وعظ و تدریس وغیرہ کے واسطے ضرور وقف ہونی چاہیئے اور اُن کو رزق حق تعالیٰ دیں گے۔

مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ میرا ایک بھتیجا جو بہت ذکی ہے بالکل بچہ تھا۔ میں نے اُس کو بلایا اور پوچھا کہ بتلاؤ عربی اچھی ہے یا انگریزی۔ کہنے لگا کہ

عربی اچھی۔ میں نے کہا کہ عربی کیوں اچھی۔ کہا کیونکہ قرآن شریف عربی میں ہے۔ میں نے پوچھا لیکن عربی پڑھ کے کھائے کہاں سے۔ اسے سن کر نہایت سنبھال کر جواب دیا جو میں اسی کے لفظوں میں نقل کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی عربی پڑھتا ہے وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور جب خدا کا ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے کہ اسے دو۔ وہ دیتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ میں نے کہا یہ بھی ٹھیک ہے لیکن لوگ ایسے شخص کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ کہنے لگا، ذلت تو جب ہوتی کہ وہ کسی سے مانگتا۔ وہ مانگتا ہے کب۔ لوگ تو ہاتھ جوڑ کر دیتے ہیں۔ میں اس کا حیرت سے منہ تکتا تھا کہ اس عمر میں اور یہ سمجھ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ سعادت بازو کی طاقت سے حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک
اللہ تعالیٰ نہ بخشے بخشنے والا۔

وہ اگرچہ آج کل انگریزی پڑھتا ہے لیکن اس میں اب تک دین کا غلبہ ہے۔ چنانچہ جب کبھی وہ پاس ہوتا ہے تو اسکول سے آکر مجھ سے دین کی باتیں پوچھا کرتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایسے لوگ دین کا کام کریں لیکن آج کل انتخاب غلط ہے جو فہم و ذکا کے سبب عربی کے قابل ہوتا ہے اُسے انگریزی پڑھواتے ہیں اور جو احمق سمجھا جاتا ہے اس کو عربی پڑھاتے ہیں۔ غرض ہر کام اُلٹا۔

میں نے یہ حکایت اس سوال کے جواب میں بیان کی ہے کہ کھائیں گے کہاں سے اور یہ امور صرف دلائل ہی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ غور کر کے دیکھو کہ کیسی سہولتیں ہوتی ہیں اور کسی کا احسان نہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ ہاتھ جوڑتے

ہیں اور نہیں لیتے تو دل شکنی ہوتی ہے۔

مولانا فتح محمد صاحب کیرانہ میں تھے۔ ایک طالب علم مثنوی شریف پڑھنے آیا۔ آپ نے پوچھا کہ روٹی کہاں سے کھائے گا۔ اُس نے کہا، اللہ میاں روٹی دے گا ورنہ جان لے لے گا۔ آپ نے فرمایا، بیشک بھائی تو پڑھ لے گا۔ چنانچہ اسی وقت سے پڑھانا شروع کر دیا اور اس کی اسی روز سے دعوتیں ہونا شروع ہو گئیں۔ کئی مہینے کیرانہ میں رہا برابر دعوتیں کھاتا رہا اور اگر کوئی خوشی سے اہل دین کی خدمت نہ کرے تو مالک الملک اسباب ایسے مسلط کر دیتے ہیں کہ جھک مار کر خدمت کرنا پڑتی ہے۔

چنانچہ مولانا فتح محمد صاحب ہی نے حکایت بیان کی کہ پانی پت میں ایک طالب علم قاری عبدالرحمٰن صاحب کے پاس قرائت سیکھنے گئے وہاں اہل محلہ نے کھانے کا انتظام نہیں کیا۔ اتفاقاً ایک آدمی مر گیا اور وہاں قاعدہ تھا کہ مردہ کے گھر سے چالیس دن تک کسی محتاج کو کھانا کھلایا جاتا تھا بس اُن کا کھانا مقرر ہو گیا۔ چالیس دن پورے نہ ہوئے تھے کہ دوسرا مر گیا۔ اور اُس کے چلہ کے بعد تیسرا کھسکا۔ قاری صاحب نے فرمایا یہ سب محلہ کو کھا جائے گا ورنہ اس کا کھانا مقرر کر دو۔ چنانچہ کھانا مقرر کر دیا گیا۔

حاصل یہ کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو اور پھر اُس سے دوسری شاخیں پھیلیں۔ وعظ کی شاخ، درس کی شاخ، تصنیف کی شاخ، تربیت باطن کی شاخ وغیرہ وغیرہ۔ آگے اس جماعت کی اور صفات ارشاد ہیں۔ یَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کہ اچھے کاموں کا حکم بتادیں

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور برے کاموں سے روکیں۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یہی لوگ سعادت اور فلاح حاصل کرنے والے ہیں۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا۔ سبحان اللہ! کیا قرآن پاک کی بلاغت ہے اوپر تو خود تفرق سے نفی فرمائی۔ اب یہاں ارشاد ہے کہ تفرق کی مشابہت بھی نہ کرو کیونکہ مشابہت کرنے سے تم متفرقین کی طرح بن جاؤ گے۔ چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ گو بعض لوگوں نے اس حدیث کی تضعیف کی ہے لیکن آیت تو ضعیف نہیں۔ خوب سمجھ لو۔ آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ لَا تَكُوْنُوْا كَالْكُفَّارِ کیونکہ الذین تفرقوا کا مصداق کفار ہی ہیں اور یہ ممانعت اعمال میں تھی جو ہر وقت مشاہد بھی نہیں اور جو امور ہر وقت مشاہد بھی ہیں اور جو امور ہر وقت ظاہر رہتے ہیں جیسے لباس وغیرہ تو ان میں مشابہت کیسے جائز ہو سکتی ہے۔

اب میں پھر ترجمہ شروع کرتا ہوں۔ وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ اور انہوں نے کھلی کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد باہم اختلاف کیا۔ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ اور ایسے لوگوں کے واسطے بہت بڑا عذاب ہے يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ یہ عذاب اس دن ہو گا جس میں بہت سے چہرے سیاہ ہو جاویں گے بہت سے سپید ہو جاویں گے۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ۔ سیاہ چہرہ والوں سے خطاب ہو گا کیا تم ایمان کے بعد کافر ہو گئے اور ایمان سے مراد ایمان فطری ہے جس کی بابت ارشاد ہے (كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ) فَذُوْقُوا الْعَذَابَ

بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ۔ تو اب تم اپنے کفر کے عوض میں عذاب بھگتو۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ۔ اور سپید چہرے والے اللہ تعالیٰ کی رحمت میں ہوں گے اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان آیات میں مسلمانوں کے واسطے اتفاق کی تعلیم ہے کہ دین کے واسطے ہو اور علماء کی اتباع کے ساتھ ہو۔ کیونکہ اگر عوام علماء کا اتباع نہ کریں تو پھر کوئی دوسری صورت ہی نہیں۔ پس مسلمانوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک خواص ایک عوام۔ دین پر قائم رہنا تو واجب مشترک ہے اس کے بعد عوام کے ذمہ یہ ہے کہ علماء کی تعلیم کے موافق عمل کریں اور خواص کی خدمت یہ ہے کہ ان کو بتائیں۔

اب بفضلہ سب ضروری اجزاء بیان ہو گئے۔ میں نے کلی مضامین بیان کر دیئے تاکہ جزئیات پر منطبق کر لیا جائے ورنہ جزئیات تو کتابوں میں موجود ہیں۔ نیز کلیات کے بعد جزئیات کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اب میں دعا کرتا ہوں سب صاحب دعا فرمایئے۔

الیسر مع العسر

ضد سے بھی ضد میں مدد ملنے کے متعلق یہ وعظ ۱۱ر شعبان ۱۳۴۱ھ کو بعد نماز جمعہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو ۲½ گھنٹوں میں ختم ہوا۔ حاضری ۵۰۔۶۰ کے قریب تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ وَقَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا صَوْمَ اِلَّا عَنْ رَمَضَانَ (قلت اخرجہ فی المقاصد الحسنۃ بلفظ فلا صوم حتی رمضان وعزاہ الی احمد والدارمی والاربعۃ وقال صححہ ابن حبان وابو عوانۃ وغیرھما والدینوری فی المجالسۃ کلھم من حدیث العلاء بن عبد الرحمن عن ابیہ عن ابی ھریرۃ بہ مرفوعا اھ ص ۱۶) ترجمہ آیت وحدیث:۔ بیشک دشواری کیساتھ آسانی ہے بیشک دشواری کیساتھ آسانی ہے۔ فرمایا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب نصف شعبان گزر جائے پھر نہ روزہ رکھے مگر رمضان ہی کا۔۔۔۔۔!

تمہید

آج میں نے خلافِ معمول آیت و حدیث دونوں کی تلاوت کی ہے۔ حالانکہ میرا ہمیشہ کا معمول یہ ہے کہ بیان کے لئے یا صرف آیت قرآن کی تلاوت کرتا ہوں یا صرف حدیث کی۔ مگر آج ایک ضرورت کی وجہ سے میں نے ایسا کیا ہے۔ وہ یہ کہ اوّل میرے ذہن میں ایک مضمون جزئی آیا تھا اُس کے مناسب یہ حدیث ذہن میں آئی۔ پھر مضمون اوّل سے ایک دوسرے مضمون کلی کی طرف ذہن منتقل ہوا۔ اُس کے مناسب یہ آیت ذہن میں آئی۔ پھر گو یہ ممکن تھا کہ میں صرف آیت پر اکتفا کرتا حدیث کی تلاوت نہ کرتا لیکن اس کو جی نہ چاہا کہ جو چیز اوّلاً ذہن میں آئی تھی اُس کو ترک کروں۔ کیونکہ اس میں فی الجملہ اعراض کی سی صورت تھی۔ علاوہ ازیں احادیث نبویہ قرآن کے لئے بمنزلہ شرح کے ہیں۔ اس لئے بھی حدیث کے ترک کو جی نہ چاہا بلکہ یہی صورت اچھی معلوم ہوئی کہ دونوں کی تلاوت کر دی جائے تاکہ حدیث سے آیت کی شرح ہو جائے لیکن تلاوت میں آیت کو مقدم رکھا

گو اس کی طرف ذہن بعد میں منتقل ہوا تھا کیونکہ آیاتِ قرآنیہ کا رتبہ احادیث سے بڑھا ہوا ہے۔ دوسرے وہ بمنزلہ متن کے ہیں اور احادیث بمنزلہ شرح کے اور متن شرح سے پہلے ہی ہوا کرتا ہے۔

الفاظِ حدیث سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس وقت جو مضمون بیان ہوگا اُس کا تعلق ماہ شعبان سے ہے لیکن آیت کا تعلق غالباً ابھی سمجھ میں نہ آیا ہوگا تو بات یہ ہے کہ اس وقت شعبان کے متعلق جو مضمون بیان کرنا ہے اُس میں دو پہلو ہیں۔ ایک جزئیت کا دوسرا کلیت کا تو جزئیت کے طور پر اس مضمون کو حدیث سے تعلق ہے اور کلیت کے طور پر آیت سے تعلق ہے اس وقت اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے۔ آگے تفصیل بھی معلوم ہو جائے گی۔ اب اُس مضمون کو سمجھنا چاہیئے۔ اور مناسب یہ ہے کہ پہلے مضمون کلی کو بیان کر دیا جائے۔ کیونکہ اوّل تو کلی مقدم ہوتا ہے جزئی سے۔ جزئیات کلی کے اندر مندرج ہوتی ہیں تو کلی کو معلوم کر لینے سے فی الجملہ جزئیات کا علم ہو جاتا ہے۔ دوسرے وہ مضمون کلی آیت سے مستنبط ہے جس کو میں نے تلاوت میں مقدم کیا ہے۔ اس لئے پہلے مضمون کلی ہی کا بیان مناسب ہے۔

بشریت و ملکیت

تو سنیئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ بےشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ آگے مکرر تاکید ہے کہ بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ یہ سورۂ الم نشرح کی آیت ہے اور وہ مکی صورت ہے اور مکہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو قسم قسم کی کلفتیں پیش آتی

تھیں جن کے متعلق حق تعالیٰ نے جا بجا مکّی سورتوں میں آپ کی تسلّی فرمائی ہے منجملہ اُن کے ایک سورت یہ بھی ہے جس میں آپ کی تسلی کی گئی ہے اور کلفتوں کے بعد آسانی کی بشارت دی گئی ہے۔

ظاہر نظر میں تو مکہ میں آپ کو ایک کلفت تھی وہ یہ کہ کفار کو آپ سے عداوت تھی۔ وہ آپ کو زبانی اور جسمانی اذیتیں پہنچاتے تھے مگر نظر غائر میں آپ کی اصلی کلفت روحانی تھی اور راز ان سب کلفتوں کا یہ تھا کہ آپ دو شانوں کے جامع تھے —— بشریت و ملکیت —— جس میں حق تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ اگر آپ میں بشریت کے آثار نہ ہوتے تو آثار ملکیت کو دیکھ کر لوگ یہ سمجھتے کہ آپ ملک بصورت بشر ہیں۔ اور جو لوگ شرک کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ تو آپ کو اِلٰہ بصورت بشر سمجھتے۔

چنانچہ مشرکین کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق تعالیٰ کے لئے حلول فی الاجسام کو جائز رکھتی ہے۔ یہ لوگ جب کسی انسان میں بشریت سے زیادہ آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں اُس کو اوتار کہنے لگتے ہیں کہ خدا نے اس میں حلول کر کے صورت انسانی میں ظہور کیا ہے (نعوذ باللہ) یہ لوگ اگر حضورؐ کو دیکھتے تو آپ کو اِلٰہ بصورت بشر ہی کہتے۔ جیسا کہ نصاریٰ کا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ ان لوگوں کو عیسیٰ علیہ السلام میں ان آثار کے مشاہدہ ہی سے یہ دھوکا ہوا۔ جو دوسرے انسانوں سے زیادہ اُن میں تھے اور آج کل بعض لوگوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ایسا غلو کیا ہے۔ چنانچہ میرے استاد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس ایک سوال آیا تھا کہ کیا

حضورؐ بشر تھے؟ اس شخص کو حضورؐ کے بشر ہونے پر تعجب تھا اور اس تعجب کا منشا یہی ہوا کہ آپ میں بشریت کے علاوہ بعض وہ کمالات بھی تھے، جو دوسرے انسانوں میں نہیں جس سے ناواقف کو دھوکا ہو جاتا ہے کہ آپ بشر نہیں ملک بصورت بشر ہیں۔ یا نعوذ باللہ اٰلہ بصورت بشر ہیں۔

بعض لوگوں کو یہ جرأت تو نہ ہوئی مگر انہوں نے آپؐ کی ولادت شریفہ کے متعلق ایک مضمون اختراع کیا ہے جس سے گویا آپؐ کو بشریت سے جدا کرنا چاہا ہے بلکہ آپؐ سے تجاوز کرکے اہل بیت و ائمہ اطہار کی نسبت بھی یہ اختراع کیا ہے کہ ان کی ولادت موقع معتاد سے نہیں ہوئی بلکہ حضورؐ اور ائمہ اطہار ران سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس اختراع کی طرف داعی یہ ہوا کہ ان لوگوں نے حضورؐ کی ولادت کو موضع نجاست سے مستبعد سمجھا۔ مگر ان کے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں سوائے گستاخی کے پھر حضورؐ کے متعلق تو علماء کا یہ قول بھی ہے کہ آپ کے تمام فضلات پاک ہیں۔ اس لئے آپؐ کے متعلق محل نجاست سے پیدا ہونے میں اگر کسی کو استبعاد بھی ہو تو کسی درجہ میں ایک وجہ استبعاد اُن کے پاس موجود بھی ہے کہ جب علماء آپؐ کے فضلات تک کو پاک کہتے ہیں تو ایسے پاک صاف ذات کو محل نجاست سے نہ پیدا ہونا چاہیئے بلکہ موضع طاہر سے پیدا ہونا چاہیئے۔ مگر ائمہ اطہار کی بابت تو کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اُن کے فضلات بھی پاک ہیں۔ اُن کے متعلق یہ اختراع کیوں کیا گیا۔

اب میں حضورؐ کے متعلق اس استبعاد کا جواب دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم

تسلیم نہیں کرتے کہ رحم محل نجاست ہے۔ بلکہ رحم موضع بول و براز سے بالکل الگ ہے اور نجاست اصلیہ بول و براز ہی میں ہے کہ یہ دونوں نجس العین ہیں۔ سو رحم کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ پس موضع معتاد سے ولادت میں یہ اشکال لازم نہیں آتا کہ اس میں محل نجاست سے خروج ہے کیونکہ وہ محل نجاست ہی نہیں بلکہ محل طاہر ہے۔ اور ولادت کے وقت جو رطوبت جسم جنین کے ساتھ لگی ہوتی ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ طاہر ہے۔

(قَالَ فِي الشَّامِيَةِ رُطُوبَةُ الْوَلَدِ عِنْدَ الْوِلَادَةِ طَاهِرَةٌ وَكَذَا السَّخْلَةُ إِذَا خَرَجَتْ مِنْ أُمِّهَا وَكَذَا الْبَيْضَةُ فَلَا يَتَنَجَّسُ بِهَا الثَّوْبُ وَلَا الْمَاءُ إِذَا وَقَعَتْ فِيهِ اهـ ص ۳۶۱ ج ۱ جامع)

رطوبت بچے کی پیدائش کے وقت پاک ہے۔

اور اگر کسی کے نزدیک وہ رطوبت ناپاک بھی ہو تو اس کی ناپاکی عارضی ہے جو دھونے سے زائل ہو جاتی ہے۔ دھونے کے بعد جسم بالکل پاک ہو جاتا ہے اور ایسی عارضی ناپاکی کا جسم کو لگ جانا کچھ محل استبعاد نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم و لباس پر بعض دفعہ بچوں کا پیشاب کر دینا اور آپؐ کا اس کو دھلوانا ثابت ہے۔ بس اس سے زیادہ یہ رطوبت نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی عارضی طور پر جسم کو لگ گئی جو دھلنے سے پاک ہو گئی اور یہ بھی علی سبیل التنزل ہے۔ اگر اس رطوبت کا ناپاک ہونا تسلیم کیا جاوے ورنہ امام صاحبؒ کے نزدیک تو رطوبت ولد جو ولادت کے وقت جسم

سے لگی ہوتی ہے پاک ہے۔ اس قول پر تو کچھ اشکال ہی نہیں۔

مجھے اتنی تقریر اس مسئلہ میں محض ان گستاخ لوگوں کے اس اختراع کی وجہ سے کرنا پڑی تاکہ ان کے استبعاد کا جواب ہو جائے ورنہ اس مسئلہ میں گفتگو کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میرے پاس خود ایک سوال آیا تھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بطریق معتاد پیدا ہوئے تھے۔ میں نے بڑا تعجب کیا کہ یہ شخص اپنے کو حضورؐ کا محب کہتا ہے اور ایسی بحث لے کر بیٹھا ہے جس میں ولادت کے اندرے پترے کھولتا ہے۔ اس کو ایسی گفتگو کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ کیا اپنی ماں کے متعلق بھی وہ ایسی گفتگو کر سکتا ہے۔ میرا دل نہ چاہتا تھا کہ اس کو جواب دوں مگر غلطی کی اصلاح ضروری تھی۔ اس لئے میں نے جواب دیا کہ احادیث میں وارد ہے وُلِدَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ کذا۔ کہ حضورؐ کی ولادت فلاں شب کو ہوئی اور ولادت کی حقیقت یہی ہے کہ بطریق معتاد پیدائش ہو اور الفاظ میں اصل معنی حقیقی ہی ہوتے ہیں۔

فَلَا یُصْرَفُ عَنْہُ اِلَّا بِلَا دَلِیْلٍ یعنی حقیقت سے بدون دلیل کے عدول نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا ہم کو دلیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو شخص حقیقت کو چھوڑ کر ولادت کے دوسرے معنی بیان کرتا ہے اُس کو دلیل قائم کرنا چاہیے۔ جواب تو میں نے لکھ دیا مگر میرا قلم کانپتا تھا۔

غرض یہ لوگ چاہتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بشریت سے بعید

کر دیں۔ حالانکہ آپؐ کا کمال یہی ہے کہ آپ بشر ہیں اور پھر ایسے کمالات سے متصف ہیں جو بشریت سے بعید ہیں۔ کسی نے آپؐ کی شان میں خوب کہا ہے۔

بَشَرٌ لَا كَالْبَشَرِ بَلْ كَالْيَاقُوْتِ بَيْنَ الْحَجَرِ ۔ یعنی آپؐ بشر تو ہیں مگر اور انسانوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ آپؐ ایسے ہیں جیسے پتھروں میں یاقوت ہوتا ہے۔

حقیقت تو یاقوت کی بھی پتھر ہی ہے مگر اس میں اور دوسرے پتھروں میں ایسا زمین آسمان کا فرق ہے کہ اُس فرق پر نظر کر کے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھر نہیں کچھ اور چیز ہے۔ پس یاقوت کا کمال یہی ہے کہ وہ پتھر ہو کر ایسا قیمتی اور ایسا خوشنما ہے۔ اگر حجر نہ ہوتا ذہب ہوتا تو کوئی عجیب بات نہ تھی اسی طرح حضورؐ کا کمال یہ ہے کہ آپؐ انسان ہو کر سب انسانوں سے بڑھے ہوئے ہیں اگر ملک ہوتے تو کچھ کمال نہ تھا۔ پس چونکہ حضورؐ میں بشریت بھی کامل تھی اس لئے آپؐ کو اذیت کی بات سے اذیت ہوتی تھی۔

شفقتِ نوحؑ یہ تو بس اذیت کی علت تھی اور چونکہ آپ لطیف المزاج سب سے زیادہ تھے۔ اس لئے بہ نسبت دوسروں کے آپ کو زیادہ اذیت ہوتی تھی۔ کیونکہ جب مزاج میں لطافت زیادہ ہوتی ہے، تو ناگوار امور سے کلفت بھی دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ بھلا حضورؐ کی لطافتِ مزاج کو تو ہم کیا ہی سمجھ سکتے ہیں آپ کے غلاموں میں بعض حضرات ایسے لطیف المزاج ہوئے ہیں کہ ان کے قصے سُن سُن کر

حیرت ہوتی ہے۔ اہل اللہ کی لطافتِ مزاج کی بادشاہوں کو ہوا بھی نہیں لگی۔ چنانچہ حضرت مرزا جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ اس اخیر زمانے میں بہت ہی لطیف المزاج گزرے ہیں۔ اُن کو لوگوں کی ادنیٰ ادنیٰ بے عنوانی سے وہ تکلیف ہوتی تھی جو ہم کو گالی سننے سے بھی نہیں ہوتی۔

آج کل لوگ بزرگوں کو تیز مزاج کہتے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر اُن کو غصہ آجاتا ہے۔ لوگ اُن کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں کہ بس جتنی کلفت ہم کو ہوتی ہے ناگوار بات سے اتنی ہی اُن کو ہوتی ہوگی۔ حالانکہ یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ جس بات کو تم خفیف سمجھتے ہو اُن کے نزدیک وہ پہاڑ سے زیادہ بھاری ہے۔ اسی واسطے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اُوْذِیْتُ فِی اللّٰہِ مَا لَمْ يُؤْذَ اَحَدٌ۔

یعنی مجھ کو اللہ کے راستے میں اس قدر ایذا پہنچی ہے جو کسی کو نہیں پہنچی۔ (قلت اخرجہ فی المقاصد الحسنۃ بلفظ ما اُوْذِیَ اَحَدٌ مَا اُوْذِیْتُ فِی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ ابو نعیم فی الحلیۃ عن انس بہ مرفوعًا وأصلہ فی البخاری اھ ص ۱۷۰)

بظاہر اس پر حیرت ہوتی ہے اور یوں شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو نوح علیہ السلام کے برابر تو ایذا نہیں پہنچی۔ نوح علیہ السلام کا صرف زمانہ وعظ ساڑھے نو سو برس تھا۔ اتنی مدت تک وہ کفار کی ایذائیں سہتے رہے حضور نے تو صرف ۲۳ سال ہی تبلیغ فرمائی ہے۔ تو کیا ۲۳ سال میں حضور کو اتنی ایذا پہنچی جو نوح علیہ السلام کو ساڑھے نو سو برس میں بھی نہیں پہنچی۔ پھر نوح علیہ السلام

کو کفار نے بہت تنگ کیا تھا۔ سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار وعظ کے وقت اُن کو لہولہان کر دیتے تھے۔ اللہ اکبر! پھر اُن کی شفقت و ہمت کا یہ حال تھا کہ لہولہان ہو کر بھی تبلیغ سے نہ رکتے تھے۔ ساڑھے نو سو برس تک یہی حال رہا۔

بعض ظالم مصنف نوح علیہ السلام کی بابت کہتے ہیں کہ اُن میں شفقت و رحم نہ تھا اور دلیل یہ لکھی کہ اُنہوں نے اپنی قوم کے لئے بہت ہی سخت بد دُعا کی ہے۔

يَا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ خداوندا! کافروں میں سے زمین پر ایک بھی بسنے والا نہ رہے

میں کہتا ہوں کہ اس شخص نے نوح علیہ السلام کی بد دُعا کو تو دیکھ لیا مگر اس کو نہ دیکھا کہ اُنہوں نے اس ظالم قوم کی ایذائیں کتنی مدت تک برداشت کیں۔ اس شخص کو بڑا ہمدردیٔ قوم کا دعویٰ ہے۔ ذرا دہ نو مہینے ہی ایسی تکالیف برداشت کر کے دکھلا دے نانی یاد آجائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ نوح علیہ السلام کا ساڑھے نو سو برس تک تبلیغ کرتے رہنا اور قوم کی اصلاح میں سعی کرتے رہنا اور اُن کی ایذاؤں کو سہتے رہنا جس کا ذکر اسی آیت میں ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا اِلٰى قَوْلِهٖ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ثُمَّ اِنِّيْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ــــــ الآیہ

یہ اُن کی غایت درجہ شفقت کی دلیل ہے۔ جب اصلاح سے مایوس

ہی ہو گئے اور یہ مایوسی بھی وحی سے واقع ہوئی جیسا اس آیت میں ہے۔

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّہٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِکَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ اِلٰی قَوْلِہٖ وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّھُمْ مُّغْرَقُوْنَ

اور یہ سمجھا کہ اب اُن سے مسلمانوں کو ضرر پہنچنے کا سخت اندیشہ ہے اور بظاہر نہ یہ خود ایمان لائیں گے نہ اُن کی اولاد میں کسی کے مومن ہونے کی امید ہے اس وقت اُنہوں نے بد دُعا کی۔ چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں

اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا۔

جب تک اُن کو اصلاح کی امید رہی اس وقت تک تبلیغ کرتے رہے مصائب جھیلتے رہے۔ جو ایک سال دو سال کی مدت نہ تھی بلکہ اکٹھے ساڑھے نو سو برس اسی حال میں گزر گئے۔ جب ان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور مسلمانوں پر اُن کے وجود سے خطرہ ہونے لگا اس وقت مسلمانوں کے حال پر رحم کر کے کفار پر بد دُعا کی۔ تو یہ بد دُعا بھی حقیقت میں رحمت تھی اور اس کا منشا بھی شفقت ہی تھی یعنی مسلمانوں کے حال پر۔ مگر لوگوں میں مرض یہ ہے کہ وہ صرف ایک پہلو کو دیکھ کر اعتراض کر دیتے ہیں۔ دوسرے پہلو پر نظر نہیں کرتے۔ بھلا ہمارا اور آپ کا کیا منہ ہے جو نوح علیہ السلام پر زبان کھولیں ؎

اے ترا خارے بپا نہ شکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

تیرے پیر میں کانٹا بھی نہیں چبھا۔ تم کو ان شیروں کی حالت کی کیا خبر ہے جو تلوار کے زخم کھائے ہوئے ہیں۔

جس کے کبھی کانٹا بھی نہ لگا ہو اُس کا کیا منہ ہے کہ نوح علیہ السلام پر اعتراض کرے۔ جو ہزار برس تک پتھر کھاتے رہے۔ یہ بہت گستاخی کا کلمہ ہے جو ان لوگوں کی زبان پر آتا ہے۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا۔

غرض نوح علیہ السلام کی ان کلفتوں کو دیکھ کر بعض لوگوں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ کیا حضورؐ کو نوح علیہ السلام سے بھی زیادہ ایذا پہنچی۔ حالانکہ کمًّا وکیفًا اُن کی ایذاء بظاہر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ حضور کو اتنی مدت تک نہ تو ایذاء پہنچی نہ ایسی شدید ایذا ہوئی۔ پھر آپ کیسے فرماتے ہیں کہ میرے برابر خدا کے راستہ میں کسی کو ایذا نہیں ہوئی۔

تو سنئے ظاہر میں بے شک نوح علیہ السلام کی تکالیف بڑھی ہوئی ہیں مگر حقیقت میں آپ کی تکالیف اُن سے زیادہ تھیں۔ بات یہ ہے کہ مؤثر اور متاثر اور بنائے تاثر کے تفاوت سے اثر میں تفاوت ہو جاتا ہے جیسے ایک دیہاتی کے پیر میں کانٹا لگ جائے۔ دیہاتی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کیونکہ جنگل میں بکثرت چلنے پھرنے سے ان لوگوں کے پیر سخت ہو جاتے ہیں۔ اُن کو کانٹے سے تو کیا پیر میں چاقو لگ جانے سے بھی ایذا نہ ہوگی اور اس کے مقابل میں ایک نازک اندام لطیف المزاج شخص کے پیر میں ذرا سی پھانس لگ جائے تو اُسے کیا کچھ نہ ایذا ہوگی

لطافتِ مزاجِ عارفین

میں نے حضرت مولانا گنگوہی رح سے مرزا صاحب رح کی ایک حکایت سُنی ہے کہ تھانہ بھون کے ایک رئیس حضرت کی خدمت میں زیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے اُن کے ساتھ اُن کے مصاحب بھی تھے۔ وہ جو کسی ضرورت سے اٹھ کر گئے اور اُدھر پشت ہوئی۔ مرزا صاحب نے اس وقت اُن کے پاجامہ کے نیفے میں سلوٹیں بے ڈھنگی طرح پڑی ہوئی دیکھیں۔ مرزا صاحب نے اُن رئیس سے فرمایا تمہارا ان کے ساتھ کیسے گزر ہوتا ہے ان کو پاجامہ پہننا بھی نہیں آتا۔ دیکھو تو نیفے میں سلوٹیں کس طرح پڑی ہوئی ہیں کہ ایک طرف کم ایک طرف زیادہ۔

ایک مرتبہ مرزا صاحب مراد آباد تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کا ایک قصہ ایک صاحب نے بیان کیا کہ اُن کے واسطے ایک نواب صاحب کے یہاں سے چارپائی منگائی گئی مگر اُن کو نیند نہیں آئی۔ پوچھنے پر آپ نے فرمایا چارپائی میں کان ہے اس کی ناگواری سے نیند نہیں آئی۔ ناپ کر دیکھا تو واقعی تھی مگر بہت ہی خفیف کہ مشکل سے پتہ لگا۔

ایک بار اور بھی ایسا ہی ہوا کہ صبح کو خدام کے دریافت کرنے پر فرمایا ہاں کچھ خنکی کا اثر معلوم ہوا تھا اس لئے نیند نہیں آئی۔ اُس وقت مجلس میں ایک بڑی بی موجود تھیں، اُنہوں نے حاضرین مجلس سے خطاب کر کے کہا کہ حضرت کے واسطے دُلائی میں تیار کروں گی۔ کوئی اور صاحب فکر نہ کریں۔ چنانچہ اُس نے دن بھر میں محنت کر کے دلائی تیار کی اور عشاء کے بعد جب آپ لیٹے

گئے اس وقت لے کر حاضر ہوئی۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے اوپر ڈال دو۔ وہ ڈال کر چلی گئی۔ صبح کو اٹھے تو آنکھوں میں پھر بھی جاگنے کی سرخی موجود تھی۔ خدام نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ دلائی اوڑھنے سے خنکی تو معلوم نہیں ہوئی مگر اس میں نگندے ٹیڑھے پڑے ہوئے تھے۔ اس سے ایسی اُلجھن ہوئی کہ نیند پھر بھی نہ آئی۔ بھلا لحاف میں منہ لپیٹ کر نگندوں کا ٹیڑھا پن محسوس ہو جائے۔ یہ عجائبات میں سے ہے مگر اس واقعہ کے راوی بڑے بڑے ثقات ہیں اس لئے انکار نہیں ہو سکتا۔ پھر نگندوں کے ٹیڑھے ہونے سے نیند نہ آنا بہ نہایت لطافت مزاج ہے۔

نیز مرزا صاحب کے لئے لکڑیوں کی آگ میں کھانا نہ پکتا تھا۔ ایک دن غلطی سے ایک کوئلہ کچارہ گیا جس نے دھواں دیا۔ مرزا صاحب نے کھاتے ہی فرمایا کہ کھانے میں دھوئیں کی تلخی ہے۔

اس حالت میں اگر مرزا صاحب یہ فرمائیں کہ مجھ کو مخلوق سے اس قدر ایذا ہوتی ہے جو کسی مربی یا مصلح کو نہ ہوئی ہو گی تو یقیناً اُن کی تصدیق کی جائیگی مرزا صاحب کے واقعات سے اس حدیث کی شرح ہوتی ہے۔

اُوْذِیْتُ فِی اللّٰہِ مَا لَمْ یُؤْذَ	یعنی مجھ کو اللہ کے راستہ میں
اَحَدٌ	اس قدر ایذا پہنچی، جو کسی کو نہیں

پہنچی ہے۔

جب حضورؐ کے خدام میں ایسے ایسے لطیف المزاج گزرے ہیں، تو پھر حضورؐ کی لطافت کا تو کیا پوچھنا۔

میں نے حضرت حاجی صاحب سے یہ حکایت سنی ہے کہ ایک شخص نے دہلی میں چار حضرات کی دعوت کی تھی جس سے مقصود امتحان تھا اس وقت دہلی میں چار بزرگ موجود تھے۔ ایک حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ۔ ایک خواجہ میر درد صاحبؒ۔ ایک مرزا صاحبؒ۔ ایک مولانا فخر نظامی صاحبؒ یہ بزرگ عجیب تھے ان کی وضع حقیقت میں تو شرع کے خلاف نہ تھی مگر ظاہری حالت اُن کی ایسی تھی جو لوگوں کو خلاف معلوم ہوتی تھی۔ اہل اللہ میں ایک جماعت ایسی بھی ہوتی ہے جو ظاہری وضع سے ناواقفوں کو خلاف شرع معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو آج کل فرقہ ملامتیہ کہا جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں کیونکہ ایک باغ کے پھول مختلف ہوتے ہیں پھل بھی مختلف ہوتے ہیں، درخت مختلف ہوتے ہیں بلکہ بعض دفعہ خود ایک ہی درخت کے پھل مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شاخ کا پھل شیریں ہے اور دوسری شاخ کا ترش ہے۔ یہی حال خدا تعالےٰ کے باغ کا ہے کہ اس میں بھی مختلف درخت اور مختلف پھل ہیں۔ بلکہ حق تعالےٰ کے باغ کی ایک عجیب شان یہ ہے کہ ایک ہی درخت مختلف موسموں میں مختلف قسم کے پھل لاتا ہے۔ عارفین پر مختلف حالات گزرتے ہیں اور یہ تلوین ناقصین ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تلوین کاملین کو بھی پیش آتی ہے۔ یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آتی ہے:

شانِ کیفیاتِ انبیاءؑ

حضرت یعقوب علیہ السلام کی شیخ شیرازیؒ نے یہ حالت لکھی ہے ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

ایک تو وہ وقت تھا کہ مصر سے قاصد پیراہن یوسفی لے کر چلا اور کنعان میں آپ کو اُس کی خوشبو پہنچ گئی اور حاضرین مجلس سے فرما دیا۔ اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ۔ یعنی اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے سے حواس میں فتور آگیا ہے تو میں ایک بات کہوں۔ وہ یہ کہ مجھے یوسفؑ کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہاں تو مصر سے پیراہن کی خوشبو کا احساس ہو گیا اور ایک وہ وقت تھا کہ خود یوسف علیہ السلام کو اُن کے بھائیوں نے کنعان کے جنگل میں ایک کنوئیں کے اندر قید کر دیا اور چند روز تک وہ اُسی میں رہے مگر یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہوئی۔ یہ بھی خبر نہ تھی کہ یوسفؑ زندہ ہیں یا نہیں۔ صدمہ فراق میں اتنا روئے کہ آنکھیں جاتی رہنے کے قریب ہو گئیں۔

اس کے متعلق کوئی روایت تو نہیں ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں رونے سے نابینا نہ ہوئی تھیں بلکہ صرف کمزور ہو گئی تھیں مگر بعض مفسرین نے وَابۡيَضَّتۡ عَيۡنٰهُ (اور دونوں آنکھیں اُن کی سفید ہو گئیں) کی یہی تفسیر کی ہے اور درایت سے راجح یہی ہے۔ درایت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ایسے عیوب سے منزہ ہوتے ہیں جو عرفاً عیب شمار ہوں۔ کیونکہ یہ امر متکبرین کو اتباع سے مانع ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت اسی غرض کے لئے ہوتی ہے کہ لوگ اُن کا اتباع کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اور ہم نے تمام پیغمبروں کو
اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ خاص اسی واسطے مبعوث

فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی اُن کی اطاعت کی جاوے۔

جس کے لوازم میں سے ہے موانع اتباع کو مرتفع کر دینا۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام میں کسی ایسے عیب کا ہونا جو عرفاً منکرین کو اتباع سے مانع ہو، اس آیت کے خلاف ہے (مگر بعض مفسرین نے آیت کو ظاہر پر رکھا ہے کہ بیاض عین سے متبادر یہ ہے کہ بینائی بالکل زائل ہو گئی تھی اور اس کے بعد فارتد بصیرا۔ سے بھی بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے اور اس آیت کا جواب یہ دیا ہے کہ عرفاناً بینائی سبب عار وہ ہے جو خلقی ہو اور کسی عارض سے نابینا ہو جانا سبب عار نہیں جیسے پیدائشی لنجا ہونا عیب ہے اور لڑائی وغیرہ میں ہاتھ کٹنے سے لنجا ہو جائے تو عرفاً یہ عیب نہیں)

اسی واسطے یحییٰ علیہ السلام کے بارہ میں جو حصور آیا ہے اس کی تفسیر بعضوں نے عنین سے کی ہے محققین نے اس کو غلط بتلایا ہے اور دلیل یہی بیان کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام ایسے عیوب سے منزہ ہوتے ہیں بلکہ حصور کے معنی ہیں نفس کو روکنے والا یعنے یحییٰ علیہ السلام اپنی نفسانی خواہشوں کو دبانے والے ہوں گے۔ اس لئے وہ کبھی عورت سے نکاح نہ کریں گے اور لغت سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ حصر کے معنی روکنے کے ہیں حصور اسی سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی میں عنین کہنا صحیح نہیں۔ باقی اُن کے نکاح نہ کرنے سے اس پر استدلال نہیں ہو سکتا کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام بھی اس صفت میں مثل یحییٰ علیہ السلام کے تھے کہ انہوں نے بھی عمر بھر نکاح نہیں کیا (اُن کی شریعت میں قادر علی النفس کے لئے اشتغال بالطاعات

اشتغال بالنکاح سے افضل تھا جیسا کہ ہماری شریعت میں بھی امام شافعیؒ کے نزدیک یہی افضل ہے مگر امام ابو حنیفہؒ نے اس کی مخالفت کی ہے اُن کے نزدیک اشتغال بالنکاح افضل ہے بشرطیکہ مہر و نفقہ پر حلال طریقہ سے قادر ہو) مگر حدیث میں ہے کہ نزول من السماء کے بعد وہ نکاح کرینگے

(اِتِّبَاعًا لِسُنَّةِ نَبِيِّنَا صَلَّے اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْهِ تَائِيْدٌ لِقَوْلِ اَبِي حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰہُ اِنَّ فِي شَرْعِنَا الْاِشْتِغَالُ بِالنِّكَاحِ اَفْضَلُ

۱۲ جامع

پیروی کرتے ہوئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی اور اس میں امام ابو حنیفہؒ کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ ہماری شریعت میں مشغول ہونا ساتھ نکاح کے افضل ہے۔

اور اس کے ساتھ یہ لفظ بھی ہے وَيُوْلَدُ لَهٗ یعنی نکاح کے بعد عیسے علیہ السلام کے اولاد بھی ہو گی۔ معلوم ہوا کہ قوت رجولیت اُن میں موجود تھی مگر پہلے کام نہ لیا۔ اب کام لیں گے۔ بوجہ اتباع شریعت محمدیہؐ کے کہ اس شریعت میں اشتغال بالطاعات سے اشتغال بالنکاح افضل ہے پس یحییٰ علیہ السلام کا نکاح نہ کرنا دلیل عنت نہیں ہو سکتا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق بھی سیر میں ہے کہ وہ نابینا تھے مگر سوائے روایت سیر کے اس پر کوئی دلیل نہیں۔ اس لئے اس کو

تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے متکبرین کے لئے اتباع سے ایک مانع ہوگا اور اسی لئے حق تعالیٰ نے تمام انبیاء کو اعلیٰ نسب اور اعلیٰ خاندان میں مبعوث فرمایا ہے تاکہ کسی کو اتباع سے عذر کرنے کا موقعہ نہ رہے۔ اولیاء تو چھوٹی قوموں میں ہو سکتے ہیں بلکہ زیادہ ہوتے ہیں مگر انبیاء چھوٹی قوموں میں کبھی نہیں ہوئے اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ چھوٹی قوموں میں جو اولیاء ہوئے ہیں وہ زیادہ تر وہی ہیں جن کے متعلق ارشاد و تبلیغ کا زیادہ کام نہیں ہوتا اور جن اولیاء کے متعلق زیادہ تر ارشاد و تبلیغ کا کام ہوتا ہے وہ چھوٹی قوموں میں نہیں ہوتے بلکہ اکثر خاندانی لوگ ہوتے ہیں جو نسب میں ممتاز ہوں۔

اس نکتہ پر مجھے ایک بزرگ نے متنبہ کیا جن کا نام حاجی عبداللہ تھا۔ وہ کرانہ کے رہنے والے تھے اور قوم کے گوجر تھے۔ بہت نیک آدمی تھے اور بالکل اَن پڑھ۔ میں ایک مرتبہ اُن کے سامنے اپنی قوم کی یعنی شیخ زادوں کی مذمت کر رہا تھا کہ اس قوم میں ہوشیاری چالاکی اور تکبر بہت ہے۔ اسی قسم کی باتیں میں کر رہا تھا۔ وہ بزرگ کہنے لگے کہ تم نے اس قوم کے عیوب تو گنا دیئے۔ خوبیاں بھی تو گناؤ۔ میں نے کہا، حضرت وہ آپ بیان کر دیجئے۔ کہنے لگے کہ میں جاہل آدمی ہوں اور کچھ تو جانتا نہیں مگر اتنی بات تو میں دیکھتا ہوں کہ اس زمانہ میں جن بزرگوں کے ہاتھ سے دین کی خدمت و اشاعت ہوئی ہے اور جن کے فیض سے مخلوق کی اصلاح زیادہ ہوئی ہے وہ اکثر اسی قوم میں سے ہیں۔ پھر چند بزرگوں کے نام گنائے جو سب شیخزادے ہی تھے۔ پھر جو میں نے غور کیا تو یہ بات صحیح معلوم ہوئی اور راز اس میں یہ

ہے کہ جو حضرات خدمت ارشاد پر ہوتے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام کی طرح مقتداء ہوتے ہیں۔ اس لئے انبیاء کی طرح ایسے اولیاء بھی اکثر خاندانی اور شریف النسب ہوئے ہیں تاکہ اُن کی اقتداء سے متکبرین کو عار نہ ہو بخلاف اُن اولیاء کے جن میں مقتدائیت کی شان نہیں ہوتی تو وہ چھوٹی قوموں میں بھی ہوتے ہیں بلکہ زیادہ ہوتے ہیں۔

الغرض یعقوب علیہ السلام کے متعلق بعض محققین کی رائے یہی ہے کہ وہ نابینا نہ ہوئے تھے۔ بلکہ روتے روتے بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ (اُنہوں نے اَبْيَضَّتْ عَيْنَاهُ کو ضعف بصر پر محمول کیا ہے اور فَارْتَدَّ بَصِيرًا سے اسی ضعف کا زوال مراد لیا ہے۔ وَلَا يَبْعُدُ اِرَادَتُهٗ لِلْحِكْمَةِ الَّتِي ذَكَرْنَا هَا۔ پس بعید نہیں لوٹ آنا بینائی کا بوجہ حکمت کے جو ہم نے ذکر کی) تو دیکھئے یعقوب علیہ السلام کو ابتداء میں یوسف علیہ السلام کی اطلاع نہ ہوئی کہ وہ کس حال میں ہیں حالانکہ وہ اس وقت کنعان ہی کے کنوئیں میں تھے۔ پھر اس کے بعد عرصہ تک معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں کس حال میں ہیں اور بعد میں مصر سے قمیص کے روانہ ہوتے ہی خوشبو پہنچ گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی ایک وقت میں اور شان تھی اور ایک وقت میں اور شان تھی یہی میں کہہ رہا تھا کہ تلوین انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آئی ہے۔ ایک نبی کو مختلف اوقات میں مختلف حالات پیش آتے تھے اور یہ بات سالکین کو بھی پیش آتی ہے۔

رہا چند انبیاء کے حالات میں اختلاف ہونا۔ یہ تو مشاہد ہے کسی میں کوئی رنگ غالب تھا کسی میں کوئی رنگ غالب تھا۔ سب کے الوان متحد نہ تھے

——پس اسی طرح اولیاء میں بھی مختلف شانیں ہوتی ہیں۔

اقتضاءات بشریہ کا کمال

اُن میں ایک شان وہ بھی ہے جو مولانا فخر نظامی کی تھی کہ وہ ایسی وضع سے رہتے تھے جس پر عوام کو خلاف شرع ہونے کا وہم ہوتا تھا مگر واقع میں وہ خلاف نہ تھے۔ اس لیے کسی پر اعتراض کا حق نہیں۔ سب باغ الٰہی کے درخت ہیں کوئی کسی قسم کا، کوئی کسی قسم کا۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ ہاں اعتراض جب ہو سکتا ہے جب حقیقت میں شرع کی مخالفت ہو۔ سو مولانا فخر نظامی ایسے نہ تھے۔ وہ صرف وضع سوز تھے عزت وناموس کو پھونکنے والے تھے شرع سوز نہ تھے۔

غرض اُس شخص نے ان چار حضرات کو دعوت میں جمع کیا۔ جب سب حضرات اُس کے گھر پر تشریف لے گئے تو اُس نے یہ حرکت کی کہ ان صاحبوں کو بہت دیر تک بٹھلایا۔ پان وغیرہ سے خاطر تواضع کرتا رہا۔ جب بہت دیر تک بٹھلالیا تو آخر میں سب کو ایک ایک آنہ دے دیا اور کہا کہ حضرت کھانے کا انتظام نہیں ہو سکا۔ یہ ایک آنہ لیجیے اور بازار سے کچھ لے کے کھا لیجیے۔ خواجہ فخر نظامی نے تو ایک آنہ کے پیسے سر پر رکھے اور داعی کو بہت دُعائیں دیں اور خواجہ میر درد اور شاہ ولی اللہ صاحب نے نہ دعائیں دیں نہ بُرا بھلا کہا۔ نہ پیسوں کو سر پر رکھا۔ دونوں خاموش چلے گئے۔ خواجہ میر درد محض شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ بڑے کامل ولی ہیں۔ اُن کی کتاب علم الکتاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑے عارف ہیں۔ اس کتاب میں انہوں

نے معارف منازل بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اور مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس بیہودہ حرکت سے سخت تکلیف پہنچی مگر بہت تحمل سے کام لیا۔ عارفین لطافت مزاجی کے ساتھ متحمل بھی دوسروں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا جو مرزا صاحب کے برابر نازک مزاج ہوتا تو نہ معلوم کیا آفت برپا کرتا مگر آپ کے چہرہ پر بل بھی نہ پڑا ایسے بے کر اتنا فرمایا کہ میاں بزرگوں کا امتحان نہیں لیا کرتے۔ نہ معلوم کس وقت کیسا وقت ہے۔

اس واقعہ میں ظاہر بینوں کو خواجہ فخر نظامی کی حالت رفیع معلوم ہوتی ہوگی کہ اُن کو ناگوار واقعہ سے ایذا ہی نہ ہوئی بلکہ فرحت و مسرت ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ وہ اس واقعہ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے تھے اور ہر چہ از دوست میرسد نیکوست کا اُن کو مشاہدہ تھا اور اُن کی یہ حالت تھی ؎

چو گزندت رسد ز خلق مرنج | کہ نہ راحت رسد نہ خلق مرنج
از خدا داں خلافِ دشمن و دوست | کہ دلِ ہر دو در تصرفِ اوست

اور اس کی نظیر یہ ہے کہ بعض عارفین کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا تو وہ ہنستے تھے اور بعض عارفین کو رنج و غم ہوا وہ روتے تھے تو ظاہر بین پہلے شخص کو دوسرے سے افضل سمجھتے ہیں۔ مگر واقع میں کمال یہ ہے کہ رنج کی بات سے رنج ہو۔ پھر اس پر صبر و رضا حاصل ہو۔ پس وہ عارف جس کو اپنے عزیز کے مرنے سے صدمہ ہوا اور وہ اس پر صبر کر کے راضی برضائے الٰہی رہا اس سے اکمل ہے جس کو رنج ہی نہ ہوا بلکہ برعکس مسرت ہوئی۔ اسی

طرح اس واقعہ میں کمال حضرت مرزا صاحب کا ظاہر ہوا کہ باوجود ایذاء شدید پہنچنے کے نہایت تحمل سے کام لیا۔ چہرہ پر بل بھی نہیں پڑا اور محض اس شخص کی اصلاح کے لئے اتنی بات پر اکتفا کیا کہ بزرگوں کا امتحان نہیں لیا کرتے نہ معلوم کس وقت کیسا وقت ہے۔

یہ بات کہ ایذا کی بات سے ایذا ہی نہ ہو یہ غلبۂ حال ہے جس نے اقتضاءات بشریہ کو زائل یا مضمحل کر دیا ہے اور کمال مقصود یہ ہے کہ اقتضاءات بشریہ سب بدرجۂ کمال موجود ہوں۔ پھر مستقل رہے کہ شریعت سے تجاوز نہ ہو اور یہ بات مرزا صاحب کو حاصل تھی کہ ان میں اقتضاء بشری بھی بدرجہ کامل موجود تھا اور اتباع شرع بھی کامل تھا۔ تکلیف کی بات سے ان کو کلفت ہوتی تھی اور پھر صبر فرماتے اور تحمل سے کام لیتے تھے۔ تو اس واقعہ میں مولانا فخر نظامی صاحب حال تھے اور بقیہ حضرات صاحب مقام تھے اور ان میں چونکہ حضرت مرزا صاحب کو لطافت مزاجی کی وجہ سے ایذا زیادہ پہنچی اس لئے ان کا تحمل سب کے تحمل سے بڑھا ہوا تھا۔

یہ جو کہا گیا ہے۔ ع

چو گزندت رسد ز خلق مرنج

اس کا مطلب یہ ہے کہ عقلی رنج نہ ہونا چاہئے۔ یہ مطلب نہیں کہ طبعی رنج بھی نہ ہونا چاہئے۔ اسی طرح۔ ع

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ پیش آوے اس کو عقلاً بہتر

سمجھنا چاہئے اور یہ سمجھ کر اُس پر راضی رہنا چاہئے۔ یہ مطلب نہیں کہ بیماری اور صحت کو یکساں سمجھا کرو۔ دونوں میں کچھ فرق ہی نہ کرو۔

غرض آثار بشریہ کا زائل یا مضمحل ہو جانا کمال نہیں بلکہ اُن کا بدرجۂ کمال موجود ہونا اور پھر مستقل رہنا یہ کمال ہے۔ چونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم میں روحانی آثار کے ساتھ آثار بشریہ بھی بدرجۂ کمال موجود تھے اس لئے آپ کو ایذاء کی بات سے ایذاء ہوتی تھی۔ رنج کی بات سے رنج بھی ہوتا تھا۔ پھر لطافت مزاج کی وجہ سے آپؐ کو دوسروں سے زیادہ رنج ہوتا تھا۔ پھر سب باتوں پر صبر و تحمل فرمانا اور اخلاق میں تغیر نہ آنا یہ آپؐ کا غایت درجہ کمال تھا۔ اگر آپ کو ایذاء اور رنج ہی نہ ہوتا۔ تو پھر اخلاق میں تغیر نہ آنا بڑا کمال نہ تھا۔ کمال یہی ہے کہ ایذا کا احساس کامل ہو اپھر بھی اخلاق کریمانہ میں ذرا تغیر نہ آیا۔

یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو اس کی تمنا کرتے ہیں کہ ہمارے نفس میں دنیا کی طرف میلان ہی نہ رہے۔ گناہ کا وسوسہ بھی نہ آئے بس بالکل پتھر بن جائیں کہ کسی حسین کو دیکھ کر میلان ہی نہ ہو۔ سو یاد رکھو یہ کمال نہیں۔ کمال یہی ہے کہ آثار بشریت اور قوت میلان کے ہوتے ہوئے پھر مستقل رہو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن ست — کہ ازو حمام تقویٰ روشن ست

یعنی شہوت دنیا کی ایسی مثال ہے جیسے حمام کے لئے ایندھن اور ظاہر ہے کہ حمام بدون ایندھن کے گرم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تقویٰ کے

حمام کی گرم بازاری اسی شہوت دنیا سے ہے۔ تو یہ شہواتِ دنیا موجب نقص نہیں بلکہ یہی موجبِ کمال ہیں۔ ٹاٹ کا پردہ زانی نہ ہو تو کیا کمال ہے اندھا نظر بد نہ کرے تو کیا کمال ہے۔ وہ تو دیکھنا بھی چاہے تو آنکھیں کہاں سے لائے۔ لنگڑا آدمی ناچ میں نہ جائے تو کیا کمال ہے۔ کمال یہی ہے کہ خدا نے تم کو آنکھیں دی ہیں اور پھر تم اُن کو غیر محل میں استعمال نہیں کرتے قوت رجولیت دی ہے اور محل حرام میں اُس کو صرف نہیں کرتے۔ چلنے کے لئے پیر دیئے ہیں پھر بھی ناچ میں نہیں جاتے۔ حسن کا ادراک اور اُس کی طرف میلان طبیعت میں ہے پھر بھی نامحرم کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے اور جس کو حسن کا ادراک ہی نہ ہو اُس کا نہ دیکھنا کیا کمال ہے۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیو ٹھنڈا پینا ہر بُن مُو سے الحمد للہ نکلے گا۔ اور گرم پانی پی کر زبان تو الحمد للہ کہے گی مگر اندر سے دل ساتھ نہ دے گا۔ پھر فرمایا کہ جس طرح ٹھنڈا پانی نعمت ہے اسی طرح پیاس بھی نعمت ہے کیونکہ اس سے نعمت کی قدر ہوتی ہے۔ سبحان اللہ! یہ ہیں علوم۔ اس ارشاد سے پیاس کا نعمت ہونا معلوم ہوا حالانکہ وہ بھی آثار بشریت اور شہوات دنیا میں سے ہے۔

پس حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اندر آثار بشریت کا ہونا بھی موجب کمال تھا۔ اگر آپ میں آثار بشریت نہ ہوتے تو پھر کفار کی ایذاؤں پر صبر کرنا زیادہ موجب کمال نہ ہوتا۔ اس مسئلہ میں زیادہ تفصیل میں نے اس لئے کی کہ شاید کسی کو بعض مغلوب الحال اولیاء کے واقعات سن کر اور یہ دیکھ کر کہ ان

براہ کرم ورق نہ موڑیں

کو ایذا رساں واقعات سے ایذا ہی نہ ہوتی تھی یہ شبہ ہو جائے کہ یہ حالت اکمل ہے تو وہ خوب سمجھ لیں کہ یہ حالت اکمل نہیں بلکہ اکمل یہی حالت ہے کہ آثار بشریہ موجود رہتے ہوئے پھر اُن پر قابو یافتہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص میں بشریت کے ساتھ لطافت کامل ہوگی اُس کو ناگوار باتوں سے ایذا زیادہ ہوگی۔ چونکہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم میں کمالات نبوت کے ساتھ لطافت بھی سب انبیاء سے زیادہ کامل تھی۔ اس لیئے آپ کو سب سے زیادہ اذیت پہنچی۔

حقوق العباد کی اہمیت

اب دوسری علت آپ کی اذیت کی عرض کرتا ہوں جو نظر غائر سے معلوم ہوتی ہے گو وہ بھی نصوص ہی سے مفہوم ہے مگر قدرے استنباط کی حاجت ہے اور یہی وہ بات ہے جس کے متعلق شروع میں کہا گیا تھا کہ نظر غائر سے آپ کی اصلی کلفت روحانی تھی اور وہ یہ ہے کہ آپ کو اُمت کے ساتھ شفقت بے حد تھی جو جابجا آیات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے دو درجے ہیں۔ ایک تو اپنی اُمت کی مطلق تکلیف سے قلق۔ یہ تو منصوص ہے دوسرا درجہ یہ کہ وہ تکلیف میرے سبب سے ہو کہ وہ میری تکذیب کریں اور معذب ہوں۔ تو گویا میری وجہ سے اُن کو عذاب ہوگا۔ بس یہ خیال کہ میری وجہ سے مخلوق کو عذاب ہوگا آپ پر پہاڑ سے زیادہ گراں تھا اور یہ درجہ محتاج استنباط ہے۔ حدیثوں میں یہ تو تصریح ہے

مَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہ　　　حضورؐ نے اپنے نفس کا کبھی

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهِ فِي شَيْءٍ   کسی سے بدلہ نہیں لیا۔

فقط (متفق علیہ)

اور طائف کے واقعہ میں وارد ہے کہ جب وہاں آپ کو کفار نے تکلیف دی تو جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا ان اللہ قد سمع قول قومك وما ردوا علیك اور یہ بھی کہا کہ یہ پہاڑوں کا فرشتہ حاضر ہے آپ اس کو جو حکم دیں گے عمل کرے گا۔ خود اس فرشتہ نے عرض کیا کہ میں ان کو پہاڑوں کے درمیان دبا دوں؟ آپ نے فرمایا۔

بَلْ اَرْجُوْا اَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ اَصْلَابِهِمْ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ۔ (متفق علیہ)

بلکہ امید رکھتا ہوں میں کہ حق تعالیٰ اُن کی اولادوں میں سے ایسی اولاد پیدا فرمادے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرینگے۔

اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی وجہ سے بھی کسی کی تکلیف گوارا نہیں تھی۔ اور بعض جگہ جو آپؐ سے بددُعا منقول ہے وہ کسی عارض سے ہے۔ اصل و غالب مذاق حضور اقدسؐ کا یہی تھا۔ شاید کسی ذہین کو یہاں یہ شبہ ہو کہ اس میں غم کی کیا بات تھی۔ یہ تو حق العبد تھا۔ آپ معاف فرما دیتے تو کچھ بھی مواخذہ نہ ہوتا۔

تو بات یہ ہے کہ اوّل تو آپ کی ایسی مخالفت درجہ کفر میں تھی آپ کفر کو کیسے معاف فرماتے۔ دوسرے یہ کہ محبوبیت کے درجے ہوتے ہیں ایک درجہ محبوبیت کا یہ ہے کہ محبوب کے ایذا دینے والے سے ہر حال میں مواخذہ ہوتا ہے محبوب معاف بھی کردے جب بھی جرم معاف نہیں ہوتا

علاوہ ازیں یہ کہ حق العبد میں حق اللہ بھی ہوتا ہے۔ وہ عبد کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتا۔ اس نکتہ سے اکثر لوگ غافل ہیں۔ عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حق العبد میں محض بندہ ہی کا حق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا حق نہیں ہوتا۔ یہ غلط ہے کیونکہ بندہ کا وہ حق اللہ تعالیٰ ہی نے تو مقرر فرمایا ہے۔

مثلاً حکم دیا ہے کہ مظلوم کی امداد کرو۔ مسلمان کی غیبت نہ کرو۔ کسی کو ایذا نہ دو تو جب ان احکام کے خلاف کسی کو ایذا دی جائے گی تو جیسے بندہ کا حق فوت کیا ہے ایسے ہی خدا تعالےٰ کا حق بھی فوت کیا ہے کہ اُن کے حکم کی مخالفت کی۔ اس لئے حقوق العباد تلف کرنے میں محض بندوں کی معافی کافی نہیں بلکہ حق تعالیٰ سے بھی توبہ و استغفار کرنا چاہیے۔ تو اگر حضور کی معافی سے آپ کا کوئی حق جو معافی کے قابل ہوتا معاف بھی ہو جاتا تو حق اللہ تو پھر بھی باقی تھا جس کی وجہ سے مواخذہ ہو سکتا تھا (اور گو عام حقوق العباد میں بندہ کی معافی کے بعد حق تعالیٰ اکثر اپنا حق بھی معاف کر دیتے ہیں مگر بعض اوقات محبوبان خاص کی حق تلفی میں اُن کی معافی کے بعد حق تعالیٰ اپنا حق معاف نہیں فرماتے بلکہ مواخذہ ضرور ہوتا ہے)

تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کی اس حالت سے رنج ہوتا تھا اور بھلا حضور کی تو بڑی شان ہے حضرات اولیاء اللہ میں بعض بزرگ ایسے محبوب ہوئے ہیں کہ اُن کے ایذا دینے والوں پر قہر حق متوجہ ہوتا تھا اور باوجودیکہ وہ سب معاف کر دیتے تھے اور حق تعالیٰ سے درخواست کرتے تھے کہ ہماری وجہ سے کسی پر مواخذہ نہ ہو مگر یہ درخواست قبول

نہ ہوتی تھی۔

چنانچہ حضرت مرزا جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قصہ اور یاد آیا کہ آپ لوگوں سے بہت کم ملتے تھے۔ کسی نے اس کی وجہ دریافت کی کہ حضرت آپ الگ الگ کیوں رہتے ہیں۔ فرمایا کہ بھائی مجھے لوگوں کی بد تمیزیوں سے بہت تکلیف ہوتی ہے اور میری ایذاء کی وجہ سے حق تعالیٰ کا انتقام ان لوگوں پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ میں نے بہت دُعا کی کہ میری وجہ سے کسی پر بلا نازل نہ ہو مگر یہ دعا منظور نہیں ہوتی۔ اس لیئے اب میں نے ملنا ہی کم کر دیا کہ نہ ملوں گا نہ کوئی مجھے ایذا دے گا نہ میری وجہ سے کسی پر مواخذہ ہوگا۔

سُبحان اللہ! کیا شانِ محبوبیت تھی اور مخلوق کے حال پر کس درجہ شفقت تھی۔ واقعی لوگوں کو قہر سے بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ آپ ہی ملنا ترک کر دیں کیونکہ آپ لطافت فطری اور لطافت ذکری کی وجہ سے اتنے نازک واقع ہوئے تھے کہ لوگوں سے آپ کے مزاج کی رعایت دشوار تھی۔

اس نزاکت کے متعلق ایک واقعہ اور یاد آیا۔ مرزا صاحب کے ایک مخلص مرید تھے۔ وہ ہر سال میں دو بار حاضر خدمت ہوتے تھے اور کئی کئی دن تک قیام کرتے تھے۔ ایک سال جو حاضر ہوئے تو اُن کو محبت کا جوش ہوا مرزا صاحب سے عرض کیا کہ حضرت آپ مجھ سے کوئی فرمائش فرماویں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ بھائی کیا فرمائش کروں۔ بس تم محبت سے ملنے آجاتے ہو یہی کافی ہے۔ اُس نے اصرار کیا کہ حضرت نہیں کچھ فرمائش ضرور فرمائیے۔

جب بہت اصرار کیا تو فرمایا، اچھا برا تو نہ مانو گے۔ اُس نے کہا حضرت بھلا آپ فرمائش فرمائیں اور میں برا مانوں کیا مجال۔ فرمایا بھائی تمہارے اصرار پر یہ فرمائش کرتا ہوں کہ تم میرے پاس سال میں بجائے دو مرتبہ کے ایک مرتبہ آیا کرو۔ وہ بچارا سہم گیا کہ شاید مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ فرمایا کہ میں ناراضی کی وجہ سے یہ بات نہیں کہتا بلکہ بات یہ ہے کہ تم کھاتے بہت ہو اور تمہیں اتنا کھاتے ہوئے دیکھ کر میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور اس کے تصور سے میرے پیٹ میں ایسا خلل واقع ہوتا ہے کہ تمہارے جانے کے بعد مجھے مسہل لینا پڑتا ہے۔ تو سال میں ایک بار تو مسہل لے لینا تو آسان ہے دو بار بڑا مشکل ہے۔

اس راز کو سن کر اس شخص کا فرمائش کر کے بہت جی خوش ہوا ہوگا؟ کہ اس سے تو فرمائش ہی نہ کرتا۔ مگر نہیں طالب کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر شیخ ساری عمر صورت دکھانے کو منع کر دے تو اس پر بھی راضی رہے اور یہ کہے

میلِ من سوئے وصال و میلِ او سوئے فراق
ترکِ کامِ خود گرفتم تا بر آید کامِ دوست

اور یوں کہے

اُرِیْدُ وِصَالَهٗ وَ یُرِیْدُ ھَجْرِیْ
فَاَتْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

یعنی میں ملنا چاہتا ہوں اور محبوب ملنا نہیں چاہتا۔ تو میں اپنی مرضی کو اُس کی مرضی کے سامنے چھوڑ دیتا ہوں۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت وحشی بن حرب قاتل حمزہ رضی اللہ عنہما سے جب وہ اسلام لاکر حاضر خدمت ہوئے، یہ فرمایا۔

هَلْ تَسْتَطِيعُ اَنْ تُغَيِّبَ وَجْهَكَ عَنِّي — کیا تم مجھ سے اپنے چہرہ کو غائب رکھ سکتے ہو۔

انہوں نے بدل وجان اس ارشاد کو قبول کیا اور عمر بھر آکر صورت نہ دکھائی۔ ہائے کیا اُن کے دل پر سانپ نہ لوٹتا ہوگا۔ کیسے کیسے عشق کے شرارے اٹھتے ہوں گے۔ بھلا صحابی کو حضورؐ کے دیدار سے صبر ہو سکے بہت سخت مجاہدہ ہے۔ مگر حضرت وحشی نے طلب رضا کے لئے سب کچھ جھیل لیا۔ اپنی جان پر مشقت گوارا کی مگر حضورؐ کو تکلیف نہیں دی کیوں کہ آپ کو ان کی صورت دیکھ کر اپنے چچا کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

اسی طرح حضرت مرزا صاحب کے مرید نے اس ارشاد کو بدل وجان قبول کیا۔ بلکہ اگر سچا عاشق ہوگا تو سال میں ایک دفعہ کا آنا بھی ترک کر دیا ہوگا یا بہت کھانے کی عادت چھوڑ دی ہوگی۔

عالم ارواح کی نسبت

حضرت مرزا صاحبؒ کا ایک اور واقعہ یاد آیا۔ کہ آپ کی خدمت میں ملّا نا غلام یحییٰ بہاری جن کا حاشیہ رسالہ قطبیہ پر مشہور ہے حاضر ہوئے۔ اُن کی داڑھی بہت بڑی تھی کہ ایک مشت سے بھی بہت زیادہ تھی بعض لوگوں کو داڑھی بڑھانے کا شوق ہوا کرتا ہے۔ بس مرزا صاحب کے جو سامنے پہنچے اور آپ کی نظر اُن کی داڑھی پر پڑی، فوراً آنکھوں پر ہاتھ دھر لیا اور

فرمایا جلدی کہو جو کچھ کہنا ہے۔ کیسے آئے ہو۔ عرض کیا کہ بیعت ہونے آیا ہوں۔ فرمایا پیر و مرید میں مناسبت شرط ہے اور آدمی اور مجھ میں کوئی مناسبت نہیں۔ مجھ سے آپ کو فیض نہ ہوگا۔ مولانا غلام یحییٰ نے ایسی بات کب سُنی تھی وہ تو مولانا اور مقتدا بنے ہوئے تھے۔ اس جواب پر خفا ہو کر چلے گئے کہ ہم کسی اور سے بیعت ہو جائیں گے کوئی آپ ہی ایک شیخ نہیں رہ گئے۔ کہنے کو تو کہہ گئے مگر سارے جہان میں مرزا صاحب جیسا کوئی نہ ملا۔ یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں کوئی اور شیخ ہی نہ تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی سے مناسبت نہ ہوئی۔ بس وہ حال تھا ؎

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیالِ ماہے
چہ کنم کہ چشم بد خو نہ کند بکس نگاہے

اور مناسبت کا ہونا نہ ہونا یہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ یہ تو عالمِ ارواح میں ہو چکی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے

اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْھَا اِئْتَلَفَ وَمَا تَنَاکَرَ مِنْھَا اخْتَلَفَ۔

ارواح لشکر جمع کردہ ہیں جن میں وہاں آشنائی ہو چکی ہے وہ باہم مالوف و مانوس ہیں اور جن میں وہاں تناکر (تنافر) ہو چکا ہے وہ یہاں بھی اختلاف رکھتے ہیں۔

عورتیں اس مسئلہ کو خوب سمجھتی ہیں۔ جب کسی لڑکی کا نکاح بُری جگہ ہو جاتا ہے تو اُن کو زیادہ رنج نہیں ہوتا بلکہ یوں کہتی ہیں کہ سنجوگ یوں ہی ملا ہوا تھا اور

کہتی ہیں کہ اللہ میاں نے جوڑیاں بلدی ہیں جس کا جوڑ جس کو بنایا ہے اُسی سے نکاح ہوتا ہے۔ اسی طرح مریدین و مشائخ میں بھی جوڑیاں بلی ہوئی ہیں جس کو جس سے مناسبت ہوتی ہے اُسی سے تعلق حاصل کرتا ہے۔

شیخ شمس الدین ترک پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ترکستان سے شیخ کی تلاش میں چلے مگر کوئی ایسا بزرگ نہ ملا جس سے مناسبت ہو۔ آخر ہندوستان پہنچ کر شیخ علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ سے مناسبت ہوئی۔ اور اُن سے ہی فیض ہوا۔ آخر کار مولانا غلام یحییٰ بعد میں پھر آئے اور اس وقت داڑھی ٹھیک کر کے آئے یعنی ایک مشت سے جو زائد تھی اُس کو ترشوا دیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ ہاں اب آدمیوں کی صورت سے آئے ہو۔ اب مجھ سے مناسبت ہو جائے گی۔ چنانچہ بیعت فرمایا اور خانقاہ میں رکھا۔ پھر تو یہ حال ہو گیا۔ ع

جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے اُسے صاف دل سے بھلا دیا

چنانچہ مرزا صاحب سے رخصت ہو کر جب مولانا غلام یحییٰ لکھنؤ پہنچے تو وہاں کسی اُستاد شاگرد میں رسالہ قطبیہ کے حاشیہ میں ایک مقام پر اختلاف ہو رہا تھا۔ اُن کو معلوم ہوا کہ خود مصنف لکھنؤ میں آئے ہوئے ہیں۔ تو خیال ہوا کہ چلو مصنف ہی سے اس کو حل کیا جائے۔ یہاں جو آئے اور مولانا کو وہ مقام دکھلایا تو کچھ دیر غور کر کے فرمایا کہ میری بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اللہ اکبر! علوم رسمیہ کو کیسا دل سے نکالا کہ اپنی تصنیف کو بھی نہ سمجھ سکے۔

میں مرزا صاحب کی لطافت مزاج کا ذکر کر رہا تھا کہ مولانا غلام یحییٰ کی فوق الحد داڑھی دیکھ کر آپ پریشان ہو گئے اور بیعت سے انکار کیا۔ غرض اس

قدر نازک مزاج تھے کہ بادشاہوں کا دماغ بھی ایسا نازک نہ تھا اور اس میں لطافت ذکر کا بھی اثر تھا۔ اللہ کا نام لینے سے مزاج میں لطافت بڑھ جاتی ہے۔ پھر ایسے شخص کو مخلوق کی بے تمیزی سے کلفت ضرور ہو سکتی ہے اور اس پر حق تعالےٰ کی طرف سے انتقام بھی ہو سکتا ہے اس لئے مرزا صاحب مخلوق سے نہ ملتے تھے۔

شفقتِ رسولؐ جب حضورؐ کے غلاموں کی لطافت کا یہ حال تھا، تو حضورؐ کی لطافت کا تو کیا حال ہوگا۔ آپؐ کی شان تو بہت عالی و رفیع ہے۔ آپ کو ایذا دینے والا مواخذۂ حق سے کب بچ سکتا ہے۔ اس لئے بھی حضورؐ کو سخت کلفت ہوتی تھی کہ میری وجہ سے مخلوق پر مواخذہ ہو۔ کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شفقت کچھ اُمت اجابت کے ساتھ مخصوص نہ تھی اُمت دعوت پر بھی آپؐ کو بے حد شفقت تھی۔

ملّا دو پیازہ نے ایک آل نامہ لکھا ہے۔ اُس میں ایک جملہ یہ بھی ہے الرسول خیر خواہ دشمناں۔ واقعی انبیاء علیہم السلام کی شان یہی ہے کہ وہ دشمنوں سے بھی نہایت شفقت و خیر خواہی کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام کا ارشاد اپنی قوم کے ہلاک ہونے کے بعد قرآن مجید میں مذکور ہے:۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۔

شعیبؑ ان سے منہ موڑ کر چلے اور فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تم کو اپنے پروردگار کے احکام پہنچا دیئے اور میں نے

تمہاری خیر خواہی کی۔ پھر میں ان کافر لوگوں پر کیوں رنج کروں۔

اس میں تکییف آسیٰ اپنے دل کو سمجھانے کے لئے فرمایا۔ دراصل اُن کو اپنی قوم کی بدحالی پر صدمہ اور رنج تھا۔ جس کو لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَاتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ کے بعد ظاہر کرنا چاہتے تھے مگر بجائے اظہارِ حزن کے اپنے دل کو سمجھاتے ہیں کہ کافر قوم پر کیا افسوس کروں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو صدمہ سخت ہوا تھا جس کی وجہ سے دل کو بھلانا پڑا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ

ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو اُن کے اقوال مغموم کرتے ہیں سو یہ لوگ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ حضور کو کفار کی حالت سے بہت صدمہ اور رنج تھا اور ظاہر ہے کہ رنج وہیں ہوتا ہے جہاں شفقت ہو۔ اگر حضور کو امت دعوت کے حال پر شفقت نہ ہوتی تو اُن کی بدحالی پر رنج کیوں ہوتا اور بہت آیتوں میں آپ کا حزن مذکور ہے اور احادیث میں تو اس شفقت کی بہت ہی تصریح ہے۔

چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری اور تمہاری مثال اس شخص جیسی ہے جس نے آگ جلائی اور جس پر پروانے گرنے

لگے اور وہ چاروں طرف سے اُن کو ہٹاتا ہے۔ اسی طرح تم سب جہنم کی آگ میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہاری کمر پکڑ کر اُس سے ہٹاتا ہوں اور تم میرے ہاتھ سے نکلے جاتے ہو اور اُس میں گرتے ہو۔

غرض اس سے حضورؐ کو سخت تکلیف ہوتی تھی کہ لوگ اپنے ہاتھوں جہنم میں جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔ — شاید آپ اُن کے ایمان نہ لانے پر جان دے دیں گے۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا۔ — سو شاید آپ اُن کے پیچھے اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دینگے۔

مع العسر یسرا کی تفسیر

غرض مکہ میں آپؐ کو سخت ایذائیں پہنچتی تھیں جن کے متعلق اس آیت میں حق تعالیٰ نے آپؐ کی تسلی فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ اس میں الف لام عہد کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ایذائیں اس وقت آپ کو دی جا رہی ہیں اور جو دشواری اس وقت موجود ہے۔ اس کے بعد آسانی ہونے والی ہے۔

یہ تفسیر حق تعالیٰ نے میرے قلب پر القاء فرمائی ہے۔ اس سے بہت سے اشکالات رفع ہو گئے۔ اگر لام عہد کے لئے نہ مانا جائے

تو ایک اشکال تو یہ ہوتا ہے کہ ہم بہت سی مشکلات کو آسان ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ خیر مسلمانوں کی مصائب کے متعلق تو یہ جواب بھی دے سکتے ہیں کہ آخرت میں یسر ہو جائے گا۔ لیکن اگر العسر کو عام رکھا جائے تو اس میں کفار کے مصائب بھی داخل ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ اُن کی مصائب قیامت میں بھی حل نہ ہوں گی۔ اب لام کو عہد کے لیے ماننے سے کوئی اشکال نہ رہا۔

لیکن اس پر یہ سوال باقی رہے گا کہ پھر بزرگوں نے اس کو عام طور پر ہر جگہ کیوں پیش کیا ہے۔ جیسا کہ حضرت علی رضؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آپ سے اپنی پریشانی عرض کی تو آپ نے فرمایا لَنْ یَغْلِبَ عُسْرٌ یُسْرَیْنِ اور ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اسی آیت کی طرف ہے کہ ایک عسر دو یسر پر غالب نہیں آسکتا۔ بوستان کے ان اشعار میں۔ ع

کسے مشکلے بُرد پیشِ علیؓ ـــــ الخ

یہی حکایت مراد ہے۔ بعض نے اس حکایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے جواب میں فرمایا تھا ؎

اِذَا ضَاقَتْ بِکَ الْبَلْوٰی فَفَکِّرْ فِی اَلَمْ نَشْرَحْ

فَعُسْرٌ بَیْنَ یُسْرَیْنِ اِذَا فَکَّرْتَہٗ فَافْرَحْ

اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یوں نہیں بلکہ اس طرح ہونا چاہیے ع فَیُعْسَرُ الْعُسْرِ یُسْرَانِ اِذَا فَکَّرْتَہٗ فَافْرَحْ۔ آپ نے قبول فرمایا۔ اور یہ دونوں شعر اس میں تو مشترک ہیں کہ عسر ایک ہے اور یسر دو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ

اصولی قاعدہ ہے کہ معرفہ کا اعادہ اگر تعریف کے ساتھ ہو وہ عین اول ہوتا ہے اور نکرہ کا اعادہ اگر تنکیر کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ غیر اوّل ہوتا ہے تو آیت میں عُسر تو ایک ہوا اور یُسر دو ہوئے۔ اس میں تو دونوں شعر مشترک ہیں اور اس میں مختلف ہیں کہ یہ دو یُسر عُسر واحد کے بعد ہیں یا اس کے طرفین میں ہیں مگر اشکال مذکور دونوں صورتوں میں ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ قول اوّل تو بطریق اسناد حضرت علیؓ سے ثابت نہیں اور ثابت بھی ہو تو یہ علم اعتبار کے طور پر ارشاد فرمایا ہوگا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے معاملات کبھی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ایک عُسر کے ساتھ یا بعد، دو یُسر عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ معاملہ نص سے ثابت ہے اور دوسروں سے نفی نہیں۔ تو امید رکھو کہ حق تعالیٰ تم سے بھی یہی معاملہ فرمائیں گے۔ وانا عند ظن عبدی بی کو ملا کر یہ مضمون زیادہ قوی ہو گیا کہ اس امید سے انشاء اللہ تمہارے ساتھ ضرور ایسا ہی معاملہ ہوگا۔ تو اس سے تسلّی حاصل کرو۔ یہ حاصل ہوگا حضرت علیؓ کے قول کا۔ تو وہ میری تفسیر کے منافی نہیں۔

بہرحال اس آیت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو تسلّی ہے۔ نیز میرے ذوق میں ظاہر یہ ہے کہ اس میں اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا کا تکرار محض تاکید کے لئے ہے اور تاکید میں نکتہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں مختلف قسم کی تکلیفیں تھیں۔ تو ایک مرتبہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا فرمانے سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید کسی خاص نوع عُسر کے زوال کی خبر دی گئی ہے اس

کے بعد یہ فکر ہوتا کہ نہ معلوم کون سی عسر کے زوال کی خبر دی گئی ہے۔ تکرار جملہ سے یہ شبہ رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ ہر قسم کے عسر کے لئے آسانی کا وعدہ ہے اور یہ استغراق عہد کے منافی نہیں۔ مراد افراد معہودہ کا استغراق و عموم ہے اور لفظ مع میں نکتہ یہ ہے کہ گو مراد معنی لعل ہیں مگر لفظ بعد سے یہ وہم ہوتا کہ نہ معلوم کتنی مدت کے بعد یسر ہوگا۔ اس لئے لفظ مع اختیار فرمایا کہ کچھ زیادہ دیر نہیں۔ ایسی بعدیت ہے کہ گویا معیت ہی ہے —— یہ گفتگو تو تفسیر کے متعلق تھی۔

احتمالاتِ عقلیہ

اب میں اس آیت سے وہ مضمون بیان کرتا ہوں جو بطور کلیت کے اوّل میرے ذہن میں آیا تھا اور مضمون کلی سے حدیث اِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانَ (جب نصف شعبان گزر جائے) کی تائید بھی ہو جائے گی۔ وہ مضمون کلی یہ ہے کہ ایک ضد کبھی دوسری ضد کے حصول کا سبب ہو جاتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ضد دافع ضد ہو جائے۔

اِنَّ الضِّدَّیْنِ لَا یَجْتَمِعَانِ دو ضدیں کبھی جمع نہیں ہوتیں۔

مگر کبھی ضد جالب ضد بھی ہوتی ہے گو بواسطہ سہی۔ واقعات میں اس کی نظیر یہ ہے جیسے پیاس لگی جس سے پانی کی تلاش ہوئی اور قاعدہ ہے مَنْ جَدَّ وَجَدَ (جو کوشش کرتا ہے وہ پا لیتا ہے) آخر پانی ملا تو پیاس بجھ گئی۔ یہاں پیاس سیرابی کا سبب ہو گئی۔ یہ اجمال بیان ہے اس مضمون کلی کا۔ اب میں اوّل اس کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ پھر آیت سے اس کا تعلق بیان کرونگا پھر اس حدیث کی تفریع اس مضمون کلی پر عرض کروں گا۔

اب سمجھئے کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا کر جب دیکھا جائے تو اُس کی تین حالتیں ہوں گی۔ یا تو دونوں میں مناسبت ہوگی یا منافات ہوگی یا نہ مناسبت ہے نہ منافات ہے۔ یہ تو مطلق تعلق و عدم تعلق کے اعتبار سے تقسیم تھی۔

اب دوسرے اعتبار سے تقسیم کرتا ہوں یعنی خاص تعلق سببیت کے اعتبار سے۔ وہ یہ کہ ایک شے یا تو دوسری شے کے حصول کا سبب ہے یا رفع کا سبب ہے یا نہ سبب حصول ہے نہ سبب رفع ہے۔ اس وقت میں اُن چیزوں سے تو بحث نہیں کرتا جن میں باہم کوئی علاقہ ہی نہیں نہ مناسبت کا نہ منافات کا۔ کیونکہ جب اُن میں کوئی تعلق ہی نہیں، تو سببیت و مسببیت کا تعلق بھی نہ ہوگا اور میں اس وقت اسباب میں گفتگو کر رہا ہوں پس تقسیم اول اور تقسیم ثانی کی ایک ایک شق میری بحث سے خارج ہے۔ صرف ہر تقسیم کی دو شقوں میں گفتگو ہے۔

اب مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ اشیاء میں باہم یا مناسبت ہے یا منافات ہے۔ پھر اُن میں سے یا تو ایک دوسرے کے حصول کا سبب ہے یا رفع کا۔ غرض دو قسم کی چیزیں ہیں اور دو قسم کے اثر ہیں۔ احتمالاتِ عقلیہ کل چار ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شے یا دوسرے کی مماثل ہے یا منافی۔ پھر ہر ایک میں دو احتمال ہیں۔ یا تو ایک دوسرے کا جالب ہے یا سالب ہے۔ تو مماثلین کی بھی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک وہ جو مماثل آخر کا جالب ہے۔ دوسرے وہ جو اپنے مماثل کا سالب ہے۔ اسی طرح متنافیین

کی بھی دو قسمیں ہوئیں۔ یا تو منافی آخر کا جالب ہے یا سالب ہے۔ ان چار صورتوں میں دو احتمال تو قرین قیاس ہیں کہ مماثل جالب مماثل ہو اور منافی سالب منافی ہو۔ اور دو بعید از قیاس ہیں کہ مماثل سالب مماثل ہو اور ضد جالب ضد ہو۔ جو صورتیں قرین قیاس ہیں اُن کا وقوع بکثرت ہے اور ظاہر ہے۔

مثلاً سرد اشیاء کے استعمال سے کسی شخص کے مزاج میں برودت کا غلبہ ہو گیا تو مماثل جالب مماثل ہو گیا۔ اسی طرح یہ بھی بکثرت واقع ہے کہ برودت کا غلبہ تھا اور حرارت سے کام لیا گیا تو ضد رافع ضد ہو گئی۔

مگر عجائب قدرت سے یہ ہے کہ دوسری دو صورتیں بھی واقع ہیں کہ مماثل سالب مماثل ہو۔ اور اس کو بھی بعض عقلاء یعنی اطباء نے تسلیم کر لیا ہے چنانچہ ویدک اور طب ہندی کی بنا اسی پر ہے۔ یہ لوگ علاج بالمثل کرتے ہیں یعنی مثلاً حرارت کو ادویہ حارہ سے رفع کرتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ اس طریق علاج سے بھی نفع ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے۔ اب یا تو

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔

کے طور پر یہ نفع ہوتا ہو (کہ بندہ خدا کے ساتھ جو گمان کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر دیتے ہیں۔) یا اُن لوگوں کو یہ مسئلہ مکشوف ہو گیا ہے کہ مماثل بھی سالب مماثل ہوتا ہے۔

کشف کوئی کمال دینی بھی نہیں۔ ورنہ ظاہر میں تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن عقلاء کے مان لینے سے اس میں بھی زیادہ بُعد نہیں رہا۔ مگر حیرت

در حیرت یہ ہے کہ احتمال رابع کا وقوع بہت ہی زیادہ ہے۔ اور باوجود اس کے عقلاء میں سے اس کی طرف کسی کی نظر نہیں گئی کہ ضد جس طرح سالب ضد ہوتی ہے اسی طرح جالب ضد بھی ہوتی ہے۔ اس کی طرف شریعت مقدسہ نے اشارہ کیا ہے۔ جیسا عنقریب بیان ہوتا ہے۔ اس کی ایک نظیر تو میں نے اوپر بتلائی ہے کہ پیاس سیرابی کا سبب ہوتی ہے۔ بھوک سیر شکمی کا سبب ہوتی ہے۔ کیونکہ بھوک لگنے کے بعد کھانے کی تلاش ہوتی ہے پھر محنت کر کے کھانا حاصل کیا جاتا ہے جس کے کھانے سے سیر شکمی ہو جاتی ہے۔

اور لیجیے مصائب سبب ہو جاتی ہیں رفع مصائب کا۔ یا تو اس طرح کہ مصیبت کے بعد حصول راحت کی تدبیریں کی جاتی ہیں یا اس طرح کہ مصیبت پر صبر و تحمل کیا جاتا ہے وَالصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْفَرَجِ۔ (یعنی صبر کے بعد بہت جلد راحت حاصل ہوتی ہے) تو مصیبت سے صبر حاصل ہوا اور صبر سے راحت حاصل ہوئی۔ اس طرح مصیبت سبب راحت ہو گئی۔

نیز کبھی جبن سبب ہو جاتا ہے شجاعت کا۔ کیونکہ بزدل آدمی کو دشمن سے خوف جو زیادہ ہوتا ہے تو وہ مقابلہ کے وقت مدافعت میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتا ہے اور شجاع بے خطر ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقابل کو زیادہ وقیع نہیں سمجھتا۔ اس لئے معمولی طور پر حملہ کرتا ہے۔ جس سے بعض دفعہ کمزور و بزدل غلبہ حاصل کر لیتا اور شجاع مغلوب ہو جاتا ہے۔ پھر جب بزدل کو ایک دفعہ کسی بڑے بہادر کے مقابلہ میں کامیابی ہو جاتی ہے، تو آئندہ کے

لیے اُس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ جُبن کی بدولت چند روز میں شجاع بن جاتا ہے۔

اسی طرح غنا سبب ہو جاتا ہے افلاس کا۔ کیونکہ غنا سے بے فکری ہوتی ہے اور بے فکری میں فضول خرچی ہوتی ہے جس سے افلاس تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور افلاس کا سبب غنا ہونا تو کثرت سے مشاہد ہے۔ سو یہ امر عجائب میں سے ہے کہ ضد جالب ضد ہوتی ہے اور سنیئے حدیث میں آتا ہے۔

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کی، اللہ تعالیٰ نے اس کے درجے کو بلند فرمایا۔

یہاں پستی بلندی کا سبب ہو گئی۔

قبض و بسط اور لیجیے معاملات باطن میں کبھی قبض سبب ہوتا ہے بسط کامل کا۔ کیونکہ حالتِ قبض میں یہ شخص توبہ و استغفار و گریہ و زاری کرتا ہے۔ اور رضا بحق پر راضی رہتا ہے جو صبر کا اعلیٰ درجہ ہے وَالصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْفَرَجِ۔ اس لیے قبض کے بعد پہلے سے بھی زیادہ بسط حاصل ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آید تو در وے بسط بیں تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں!

مولانا نے یہاں پر در وے بسط بیں فرمایا ہے کہ عین قبض میں تم بسط دیکھو۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا فرمایا ہے اور جس طرح

آیت میں مع بمعنی بعد ہے۔ اسی طرح مولانا کے کلام میں در دے بمعنی بعد دے ہے۔ جس کو مبالغۃً زیادت تسلی کے لیے در دے سے تعبیر فرمایا۔

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک بات ایسی فرمائی تھی جس سے در دے بسط ہیں اپنے حقیقی معنوں میں بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب قلب پر وساوس و خطرات کا ہجوم ہو اور کسی طرح بند نہ ہوتے ہوں (اور یہی قبض کی حالت میں پیش آتا ہے) تو تم اُس وقت اُن خطرات ہی کو حضور و جمعی کا اس طرح سبب بناؤ کہ یوں سوچو کہ خدا تعالیٰ کی کیا قدرت ہے کہ میرے دل میں ایک دریا خیالات کا بہا دیا جس کے بند کرنے سے بندہ عاجز ہے۔ اس وقت تم ان خطرات ہی کا مراقبہ کرو اور انہی سے قدرت حق کا مطالعہ کرو۔ اب یہ خطرات جو اوّل سبب بُعد تھے سبب قرب بن جائیں گے اور عین قبض کی حالت میں در دے بسط ہیں کا منظر سامنے ہو جائے گا کہ وساوس بھی ہیں جو قبض ہے اور قدرت کا مشاہدہ بھی ہے جو بسط ہے۔

سبحان اللہ! یہ ہیں علوم جن کو علوم کہنا چاہیے۔ پھر قبض کے بعد جو بسط ہوتا ہے اُس وقت جو فرحت سالک کو ہوتی ہے اُس کا اندازہ نہیں ہو سکتا عارف شیرازی کے کلام میں بکثرت قبض و بسط کا بیان ہوا ہے۔ ایک مقام پر قبض کے متعلق فرماتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبتِ گل بایدش
بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال
مُرغِ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

اور ایک مقام پر بسط کی حالت میں فرماتے ہیں ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمتِ شب آبحیاتم دادند

اس کلام کے سننے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسی فرحت خوشی حاصل ہوئی ہے اور چونکہ یہ بسط مرشد کی توجہ سے حاصل ہوا تھا، اس لئے آگے فرماتے ہیں ؎

کیمیائیست، عجب بندگی پیر مغاں
خاک اوگشتم وچندیں درجاتم دادند

نافع توجہ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توجہ مرشد کب نافع ہوتی ہے جب کہ اُس کی اطاعت کی جائے اور اُس کے بتلانے کے موافق عمل کیا جائے اور اپنے کو اُس کے ہاتھ میں مثل مردہ بدست زندہ کر دیا جائے کہ وہ جس طرح تم میں چاہے تصرف کرے۔ اس کے بعد جو مرشد کی توجہ ہوتی ہے وہ واقعی کیمیا ہوتی ہے۔ اس سے میں اُن لوگوں کے کان کھولنا چاہتا ہوں جو ہوس ناک ہیں جو ایک توجہ سے کامل ہونا چاہتے ہیں تو وہ سمجھ لیں کہ توجہ کی دو قسمیں ہیں

۱. ایک توجہ بلا عمل۔ یہ عادۃً بے اثر ہے۔
۲. ایک توجہ مع العمل۔ یہ موثر ہے۔

سو یاد رکھو کہ توجہ بلا عمل کا اثر یہ محض موجود ذہنی ہے۔ اس کا خارج میں وقوع نہیں اور جہاں تم اس کا وقوع سمجھتے ہو وہاں بھی عمل ضرور موجود ہے گو تم کو اس کی خبر نہ ہو۔ کیونکہ اعمال کی دو قسمیں ہیں۔ اعمال جوارح و اعمال قلبیہ۔ اعمال جوارح کی اطلاع تو دوسروں کو ہو سکتی ہے مگر اعمالِ قلب کی اطلاع خدا کے سوا یا خاصانِ خدا کے سوا دوسروں کو نہیں ہوتی۔ تو بعض طالب ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے ظاہری اعمال کچھ زیادہ نہیں ہوتے نہ وہ کچھ زیادہ مجاہدے کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اعمال قلبیہ اُن کے زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت قلب کی نگہداشت میں مشغول ہوتے ہیں اور یہ ظاہری مشاہدہ سے بھی اشد ہے۔ تو جن کو تم بلا عمل کے توجہ سے کامیاب ہوتا دیکھتے ہو، وہ اس عمل شاقہ کے عامل ہیں۔ حقیقت میں وہ بلا عمل کے توجہ محض سے کامیاب نہیں ہوئے بلکہ توجہ مع العمل ہی سے کامیاب ہوئے ہیں۔

بس اس توجہ کے نفع کا طریقہ یہ ہے کہ شیخ نے ایک کام بتلایا اور طالب نے اُس کے موافق عمل کیا۔ شیخ کو اس کی اطلاع ہوئی۔ وہ جوش میں آ کر اُس کے لئے دعا کرتا ہے اور اُس کے طرف توجہ پہلے سے زیادہ کرتا ہے اس سے بے شک نفع ہوتا ہے۔ کیونکہ ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں ۔۔۔ می دہد یزداں مراد متقیں

اللہ تعالیٰ مقبولین کی مراد کو پورا کرتے ہیں۔ جب وہ کسی شخص کی کامیابی چاہتے ہیں تو حق تعالیٰ بھی اُس کو کامیاب ہی کر دیتے ہیں۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جب عمل کی ہر حالت میں ضرورت ہے اور توجہ بلا عمل ہی سے نافع

ہوتی ہے تو پھر توجہ کی کیا ضرورت ہے؟

تو بات یہ ہے کہ کام دونوں ہی کے مجموعہ سے چلتا ہے عمل اور توجہ شیخ دونوں ہی کی ضرورت ہے۔ دیکھو جو طالب علم استاد کے کلام کو شوق سے سنتا ہے اُستاد کو اُس پر توجہ زیادہ ہوتی ہے۔ پھر اُس کی توجہ سے اس کو دوسروں سے زیادہ علم حاصل ہوتا ہے۔ کتابیں تو سب ہی ختم کر لیتے ہیں، مگر جس کا نام علم ہے یعنی فہم سلیم اور فقہ فی الدین وہ اُسی کو حاصل ہوتا ہے جس نے توجہ سے پڑھا ہو اور اساتذہ کو راضی رکھا ہو اور جس طالب علم نے محض محنت ہی محنت کی ہو مگر اساتذہ کو راضی نہ رکھا ہو تجربہ کر لیا جائے کہ اُس کو حقیقی علم حاصل نہ ہوگا گو الفاظ یاد ہو جائیں۔

بہرحال توجہ شیخ کی نہایت ضرورت ہے مگر وہ بعد العمل ہی مفید ہے۔ قبل از عمل مفید نہیں۔ الّا نادراً وہو کالمعدوم۔ اور بلا عمل بزرگوں کی توجہ سے تو کیا توقع رکھی جائے خود خدا تعالیٰ کی بھی عادت یہی ہے کہ اُن کو بھی توجہ بعد العمل ہی ہوتی ہے اور اگر کسی کو عمل کے غیر ضروری ہونے کا اس حدیث سے شبہ ہو کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَحَدٌ	کہ جنت میں کوئی اپنے عمل
بِعَمَلِهٖ۔	سے نہ جائے گا۔

اس پر صحابہ رضی نے عرض کیا

وَلَا اَنْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ	یعنی یارسول اللہ کیا آپ
	بھی اپنے عمل سے نہ جائیں گے۔

حضورؐ نے فرمایا۔

وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ۔ — کہ ہاں میں بھی عمل سے نہ جاؤں گا مگر یہ کہ حق تعالےٰ اپنی رحمت میں مجھے ڈھانپ لیں۔

چنانچہ اس حدیث کو بعضے لوگ عدم ضرورت عمل کی تائید میں بیان کیا کرتے ہیں مگر یہ اُن کی غلطی ہے۔ یہ حدیث تو ضرورت عمل کو تبلا رہی ہے کیوں کہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ جنت میں جو کوئی جائے گا خدا تعالیٰ کی رحمت سے جائیگا اب نصوص سے معلوم کرو کہ موردِ رحمت کون لوگ ہیں۔ سنیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ — رحمتِ حق تعالیٰ نیکو کاروں کے قریب ہے۔

معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ بھی عمل ہی کے بعد توجہ فرماتے ہیں۔ بدونِ عمل کے وہ بھی توجہ نہیں فرماتے۔ ایک جواب تو یہ ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث کے یہ معنی نہیں کہ عمل کو دخل ہی نہیں یہ تو نصوص قطعیہ کے خلاف ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ وہ علت تامہ کا جزو اخیر نہیں ہے۔ وہ جزو اخیر رحمت ہی ہے۔ گو عمل بھی علت تامہ کے اجزا میں سے ہو۔ بہر حال عمل کی ضرورت دلائل قطعیہ سے ثابت ہے۔

بس اب جو لوگ محض توجہ سے کامیاب ہونا چاہتے ہیں اور عمل نہیں کرتے وہ بندہ نفس ہیں۔ آرام طلب ہیں۔ اُن میں عشق و طلب نہیں ہے بھلا

عشق اور چین؟ دعوئے محبت اور آرام طلبی؟ ع

ایں خیال ست و محال ست و جنوں

اور میں کہتا ہوں کہ اگر توجہ بلا عمل مفید بھی ہوتی تب بھی عاشق کو بدون عمل کے چین کیوں کر آ سکتا ہے۔ عاشق سے کبھی نہیں ہو سکتا کہ محض دعویٰ عشق پر اکتفا کرے اور عمل سے اُس کا ثبوت نہ دے۔ ایسے عشق کو تو ہم اور آپ بھی قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔

ایک رئیس خانصاحب فرماتے تھے کہ بچپن میں ایک طالب علم مجھ پر عاشق ہوا۔ میں نے کہا اگر تم میرے عاشق ہو تو سیر بھر چونہ بے بجھا کھالو بس یہ سُن کر خاموش رہ گئے۔ میں نے ایک جوتا نکال کر مارا کہ اب سے عشق کا نام نہ لینا۔

ارے جب مخلوق دعویٰ عشق بلا عمل پر راضی نہیں تو خدا تعالیٰ اس عشق کو کیسے قبول فرمائیں گے۔ بس یہ لوگ ایسے عاشق ہیں کہ لینے دینے کے لئے منہ میں خاک محبت رکھیں پاک۔ طالب کی شان تو یہ ہوتی ہے کہ عمل اور مجاہدہ کے بعد اگر ناکامی بھی ہو تب بھی عمل سے دلگیر نہیں ہوتا اور برابر کام میں لگا رہتا ہے۔ ایک عارف فرماتے ہیں ؎

یابم او را یا نہ یابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

میں اُس کو پاؤں یا نہ پاؤں اُس کی طلب میں لگا رہوں گا۔ وہ ملے یا نہ ملے اُس کی آرزو میں لگا رہوں گا۔

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکرست بے مرادی نے مراد دلبرست

عاشق کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ میرے عمل پر کچھ ثمرہ مرتب ہوا یا نہیں اور عمل سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ تو محض محبت کی وجہ سے محبوب کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ چاہے کامیابی ہو یا ناکامی۔ اور یوں کہتا ہے ؎

اُرِيْدُ وِصَالَهٗ وَيُرِيْدُ هَجْرِیْ
فَاَتْرُكُ مَا اُرِيْدُ لِمَا يُرِيْدُ

یعنی میں ملنا چاہتا ہوں محبوب ملنا نہیں چاہتا۔ تو میں اپنی مرضی کو اُس کی مرضی کے سامنے چھوڑ دیتا ہوں۔

معراج یونس

مضمون طویل ہو گیا۔ یہ بات اس پر چلی تھی کہ قبض سبب بسط ہو جاتا ہے حالانکہ دونوں باہم ضدین ہیں لیکن ضد جالب ضد ہو جاتی ہے۔ اسی طرح فنا سبب بقاء ہو جاتا ہے۔ اہل اللہ اسی واسطے اپنے کو مٹاتے ہیں تاکہ بقاء حاصل ہو اور مجاہدہ کے بعد مشاہدہ حاصل ہو بلکہ وہ فناء ہی بقا ہو جاتا ہے اور مجاہدہ ہی مشاہدہ ہو جاتا ہے اور ذلت ہی عزت ہو جاتی ہے کیونکہ بعض عزت بصورت ذلت ہوتی ہے اور بعض قرب بصورت بعد ہوتا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبرؐ کہ معراج مرا نیست برمعراج یونسؑ اجتبا

یہ روایت بالمعنی ہے مولانا اس مقام پر حدیث لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلٰی یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی (مجھے یونس بن متی پر فضیلت نہ دو) کی تفسیر کر رہے ہیں اور یہی حدیث

سرخی میں بھی لکھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری معراج کو یونس علیہ السلام کی معراج پر ترجیح نہ دو۔

یونس علیہ السلام کی معراج کا قصہ یہ ہے کہ آپ نے ایک دفعہ اپنی قوم کو عذاب سے ڈرایا کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب نازل ہوگا اُنہوں نے مدت پوچھی، آپ نے میعاد بتلا دی۔ اُس تاریخ کے قریب کہیں دوسری جگہ چلے گئے۔ پیچھے قوم پر عذاب آیا۔ آثارِ عذاب دیکھ کر لوگ اُن کی تلاش میں نکلے کہ یونس علیہ السلام مل جائیں تو اُن پر ایمان لے آویں مگر یونس علیہ السلام نہ ملے تو عقلاء نے کہا، اگر یونس نہیں ہیں تو ربِ یونس تو ہیں۔ تم اُن سے رجوع کرو اور یونس علیہ السلام پر غائبانہ ایمان لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ایمان کا علم ہو جانا کافی ہے ——————

واقعی یہ لوگ عاقل تھے۔ افسوس آج کل صدیوں کے مسلمانوں کو بھی ان نومسلموں کے برابر عقل نہیں کہ بیعت کے لئے ہاتھ میں ہاتھ دینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر ان نومسلموں کی عقل پر آفرین ہے کہ حقیقت کو بہت جلدی سمجھ گئے کہ بیعت حقیقی اتباع ہے۔ ہاتھ میں ہاتھ دینا ضروری نہیں بلکہ پیر کا سامنے ہونا بلکہ اُس کا جاننا بھی ضروری نہیں۔ چنانچہ وہاں پیر غائب تھے اور اُن لوگوں نے غائبانہ بیعت کر لی۔ جس کی پیر کو بھی خبر نہ تھی۔ مگر وہ ایسی سچی بیعت تھی کہ خدا تعالےٰ کے یہاں قبول ہوئی اور عذاب ٹل گیا۔

جب عذاب کی میعاد گزر گئی تو یونس علیہ السلام نے آنے جانے والوں سے قوم کا حال پوچھا معلوم ہوا کہ وہ تو عذاب سے بچ گئے۔ اب اُن

کو وہاں جاتے ہوئے شرم آئی کہ مجھے جھٹلاویں گے کہ تم تو فلاں تاریخ تک عذاب آنے کو کہتے تھے۔ ہم تو عذاب سے ہلاک نہ ہوئے۔ اس شرم کی وجہ سے قوم کی طرف نہ گئے بلکہ وہاں سے بہت دُور چلے گئے اور وحی کا انتظار نہ کیا۔ اور آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ قوم عذاب سے میری تصدیق ہی کی بدولت بچی ہے۔ اور اگر میں واپس جاؤں گا تو پہلے سے زیادہ تصدیق کریں گے بہرحال آگے بڑھتے چلے گئے۔ راستہ میں ایک دریا پڑا۔ اُس سے پار ہونے کو کشتی میں سوار ہوئے۔ کچھ دُور چل کر کشتی بھنور میں پھنس گئی۔ ناخدا نے کہا، معلوم ہوتا ہے اس کشتی میں کوئی ایسا غلام ہے جو اپنے آقا سے بھاگ کر آیا ہے۔ وہ کشتی میں سے نکل جائے ورنہ سب غرق ہو جائیں گے۔ اس زمانہ کے کافر بھی مصائب کا سبب معاصی کو سمجھتے تھے۔ افسوس آج کل مسلمان بھی ایسا نہیں سمجھتے۔ الا ماشاء اللہ!

یہ سُن کر یونس علیہ السلام کو تنبہ ہوا کہ میرا بدون اذنِ الٰہی قوم کے بلاد سے چلا آنا اچھا نہ ہوا۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے اذن لینا چاہئے تھا۔ اس تنبہ کے بعد آپ سے نہ رہا گیا اور لوگوں سے کہا، بھائی وہ غلام میں ہوں جو اپنے آقا سے بھاگ کر آیا ہوں۔ لوگوں کو آپ کی بات کا یقین نہ آیا۔ اور کہا آپ کی صورت تو غلاموں کی سی نہیں بلکہ سرداروں جیسی ہے۔ بھلا آپ غلام کدھر سے ہوئے۔ سچ ہے ؎

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی　　　نیک بیں باشی اگر اہلِ دلی

خصوصاً انبیاء علیہم السلام کو تو حق تعالیٰ حُسنِ صورت، حُسنِ سیرت، حُسنِ

صورت سب کچھ اتنا عطا فرماتے ہیں کہ اُن کے زمانہ میں کسی کو بھی حاصل نہ ہو پھر ان کمالات ظاہرہ و باطنہ کے ہوتے ہوئے اُن پر غلامی کا کس کو شبہ ہو سکتا تھا۔ غرض آپ اصرار کر رہے تھے کہ بھاگا ہوا غلام میں ہی ہوں۔ تم مجھے دریا میں ڈال دو اور لوگ انکار کر رہے تھے۔ آخر کار قرعہ اندازی پر فیصلہ ہوا کہ جس کے نام کا قرعہ نکل آوے اسی کو ڈال دیا جاوے گا۔ قرعہ میں بھی یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا۔ لوگوں نے کہا، یہ تو اتفاقی بات ہے پھر قرعہ ڈالو۔ تین دفعہ قرعہ ڈالا گیا اور ہر دفعہ یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا۔ اب تو لوگوں نے مجبور ہو کر آپ کو دریا میں ڈال دیا۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ — سو یونسؑ بھی شریک قرعہ ہوئے وہ بھی ملزم ٹھہرے۔

وہاں باذن حق ایک مچھلی منہ کھولے ہوئے تیار بیٹھی تھی جس نے فوراً آپ کو نگل لیا۔ سمندر میں بعض مچھلیاں بہت ہی بڑی ہوتی ہیں۔ نگلنے کو تو مچھلی نے نگل لیا مگر وہاں معدہ کو حکم ہو گیا کہ خبردار! یونس علیہ السلام کو ہضم نہ کرنا اب وہ پیٹ میں صحیح سالم زندہ رہے۔ چالیس دن کے بعد مچھلی نے کنارہ پر آپ کو اُگل دیا۔ جس کا قصہ تفاسیر میں مفصل موجود ہے۔

اس قصہ سے کسی ناواقف کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید یونس علیہ السلام کی یہ حالت کامل نہ تھی۔ خصوصاً جب کہ وہ قرآن کے بعض عنوانات پر بھی نظر کرے جیسے۔

وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ○ لَوْلَا أَنْ

تَدَارَکَہٗ نِعْمَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَاۗءِ وَھُوَ مَذْمُوْمٌ ۝

اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جئے جب کہ یونسؑ نے دعا کی اور وہ غم سے گھٹ رہے تھے اگر خداوندی احسان اُن کی دستگیری نہ کرتا تو وہ میدان میں بدحالی کے ساتھ ڈالے جاتے۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

اور مچھلی والے کا تذکرہ کیجئے جب وہ خفا ہو کر چل دیئے۔ اور انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم اُن پر کوئی دار و گیر نہ کریں گے۔ پس انہوں نے اندھیروں میں پکارا کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں آپ پاک ہیں میں بے شک قصوروار ہوں۔

مُغَاضِبًا کی تفسیر بعض نے تو کچھ اور ہی کی ہے کہ اللہ میاں سے روٹھ کر چلے گئے تھے۔ ہماری تو یہ ہمت نہیں مگر اشکال اس پر بھی نہیں کیونکہ ادلال انبیاء علیہم السلام سے ثابت ہے۔ چنانچہ بدر میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

اَللّٰھُمَّ اِنْ تَھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃُ لَنْ تُعْبَدَ بَعْدَ الْیَوْمِ

اے اللہ! اگر یہ مختصر جماعت مسلمانوں کی ہلاک ہو گئی تو آج کے بعد زمین میں کوئی آپ کی عبادت نہ کرے گا۔

اس میں بجز ادلال کے اور کیا تاویل ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی یونس علیہ السلام کا بدون اذن کے چلا آنا بطور ادلال کے تھا کہ عذاب کیوں نازل نہیں فرمایا اسی کو حق تعالیٰ نے مغاضبت سے تعبیر فرمایا۔

رہا یہ کہ پھر ادلال پر مؤاخذہ کیوں ہوا؟ تو بات یہ ہے کہ جس طرح انبیاء حق تعالیٰ پر ناز کرتے ہیں ایسے ہی کبھی وہ بھی ادلال فرماتے ہیں اور ان کو اس کا زیادہ حق ہے کیونکہ محبوب ہیں۔ تو یہ مواخذہ بھی بطور ادلال کے تھا۔ جس کو دوسری عبارت میں عتاب محبوبانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بہر حال اس قصہ سے کسی کو یونس علیہ السلام کے کمال پر شبہ ہو سکتا تھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حدیث لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلٰی یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی۔ (میری معراج کو یونسؑ کی معراج پر ترجیح نہ دو) میں اس شبہ کو رفع فرمایا ہے کیونکہ ان کی یہ حالت کمال کے منافی نہ تھی۔ یہاں سے لوگ یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ انبیاء علیہم السلام میں باہم ایسا موازنہ نہ کرنا چاہیئے جس سے کسی کی تنقیص لازم آئے اور حدیث لا تفضلونی میں اسی تفضیل کی ممانعت ہے اور یہ صورت اکثر تفصیلی تفضیل میں پیش آتی ہے۔ باقی اجمالی تفضیل کا مضائقہ نہیں جو نصوص میں وارد ہے۔

مولانا اس حدیث کی تفسیر دوسری طرح کرتے ہیں اور غالباً اس کا منشا عموم کے تحت میں خصوص کو داخل کرنا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حدیث میں تفضیل جزئی کی ممانعت ہے اور مطلب یہ ہے کہ میری کسی خاص حالت کو یونس علیہ السلام کی کسی خاص حالت پر فضیلت نہ دو۔ مولانا اسی عموم میں معراج کو بھی

داخل کرتے ہیں کہ میری معراج کو بھی یونس علیہ السلام کی معراج پر فضیلت نہ دو اس کے بعد عجیب بات بیان فرمائی ہے کہ جس قصہ کو تم یونس علیہ السلام کے لئے منافی کمال سمجھتے ہو درحقیقت وہ اُن کی معراج تھی۔ پس مولانا فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کو اس واقعہ میں معراج حاصل ہوئی تھی۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ حضورؐ کے سوا کسی نبی کو معراج نہیں ہوئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس صورت سے آپ کو معراج ہوئی اُس صورت سے کسی کو نہیں ہوئی ورنہ حقیقت معراج جملہ انبیاء میں مشترک ہے۔

حقیقتِ معراج حقیقت کے اعتبار سے ہر پیغمبر کو معراج ہوئی ہے کیونکہ معراج کی حقیقت ہے قرب حق اور ظاہر ہے کہ قرب حق جملہ انبیا کو حاصل تھا۔ اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ قرب حق کسی خاص صورت کے ساتھ مقید نہیں بلکہ کبھی بصورت عروج ہوتا ہے اور کبھی بصورت نزول ہوتا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

قرب نیز پستی ببالا رفتن است قرب حق از قید ہستی رستن است

اور قرب بصورتِ نزول کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے حدیث میں آتا ہے۔

اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ	سب سے زیادہ قرب بندہ
مِنْ رَّبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ۔	کو جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا
اَوْ كَمَا قَالَ۔	ہے وہ حالت سجدہ میں ہوتا ہے

نیز قرآن میں ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ یعنی سجدہ کرو اور مقرب بن جاؤ

جس سے سجدہ کا محل قرب ہونا معلوم ہوا۔ حالانکہ ظاہر ہے وہ پستی اور ذلت و نزول کی حالت ہے۔ اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کو اس واقعہ میں معراج بصورت نزول ہوئی تھی۔ تو یہ واقعہ منافی کمال نہ تھا بلکہ عین کمال تھا کیونکہ معراج کا کمالات سے ہونا مسلم ہے۔

باقی ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ صورت و حقیقت کے جامع ہیں اس لئے آپ کو معراج بصورت عروج ہوئی جس میں حقیقت اور صورت دونوں کو جمع کر لیا گیا۔ پھر آپ کی معراج میں جس طرح عروج تھا نزول بھی تھا اور نزول میں بھی صورت و معنی دونوں مجتمع تھے۔ صورت تو یہ کہ آپ بلندی سے زمین کی طرف تشریف لائے اور حقیقت یہ کہ فنا کے بعد بقا حاصل ہوا اور یہ نزول ہے جس کو اہل سلوک جانتے ہیں۔

اس جامعیت کے متعلق ہمارے حاجی صاحبؒ نے بڑے مزہ کی بات فرمائی۔ ایک دفعہ شریف مکہ کچھ حضرت سے بدظن ہو گیا تھا۔ کسی نے کچھ شکایات پہنچا دی تھی۔ اسی اثنا میں ایک دن حضرت کی مجلس میں شریف صاحب کے ایک درباری حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں کچھ اس کا تذکرہ ہوا۔ حضرت نے ان شکایات کا بے اصل ہونا ظاہر فرمایا۔ پھر حضرت کو جوش آ گیا اور فرمایا کہ اگر شریف صاحب کو ان شکایات کا یقین آ گیا ہے تو مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔ وہ میرا کیا کر سکتے ہیں۔ بس یہی تاکہ مکہ سے نکال دیں گے۔ تو میرا اس میں کوئی ضرر نہیں۔ میں جہاں بیٹھوں گا وہاں ہی مکہ ہو گا اور وہاں ہی ہو گا مدینہ۔ کیونکہ

مکہ کی حقیقت ہے تجلی الوہیت اور مدینہ کی حقیقت ہے تجلی عبدیت، اور یہ عارف کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ تو پھر شریف صاحب میرا کیا بگاڑ لیں گے اگر کوئی سرٹھنگ ہوتا تو بس اتنے کلام پر اکتفا کرتا۔ مگر قربان جائیے حاجی صاحب کے کہ وہ واقعی محقق تھے اتنی بات پر کلام کو ختم نہیں کیا بلکہ اس کے بعد یہ بھی فرمایا مگر جو محقق عارف ہیں وہ صورت و معنی دونوں کے جامع ہوتے ہیں۔ وہ معنی کے ساتھ صورت کی بھی قدر کرتے ہیں اور جب تک ان سے ہو سکتا ہے، مکہ مدینہ کی صورت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ہاں کوئی مجبوری ہی آ پڑے تو خیر۔

سبحان اللہ! جوش کی حالت میں بھی فن پر پوری نظر رہی اور سنبھل کر مسئلہ کو پورا فرما دیا۔ جس پر اب کوئی اشکال نہیں ہو سکتا۔ ورنہ سب سے پہلے حضرت ہی پر اشکال وارد ہوتا کہ جب حقیقت مکہ مدینہ کی آپ کے ساتھ ہے تو پھر صورت مکہ میں آپ نے قیام کیوں اختیار کیا۔

تو اس جامعیت کی وجہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معراج بصورت عروج ہوئی۔ افسوس آج کل بعض لوگ حضور کے لئے معراج جسمانی کے منکر ہیں گویا وہ کمالِ صورت کے منکر ہیں۔ ان لوگوں نے بڑا ظلم کیا ہے اور ان کے پاس انکار کی کوئی بھی دلیل نہیں۔ غرض یونس علیہ السلام کی وہ پستی اور نزول عین ترقی تھی، تو ضد کے جالب ضد ہونے پر کیا شبہ کیا جائے بلکہ اعتبارات بدلنے سے تو ضد عین ضد بھی ہو جاتی ہے مگر باعتبارات مختلفہ۔ اعتبارات کا ملانا تو ضروری ہے۔ وَلَوْلَا الْاِعْتِبَارَاتُ لَبَطَلَتِ الْحِکْمَۃُ۔ یہی وہ مضمون ہے جس کی

طرف آیت اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۔ میں میرا ذہن منتقل ہوا کہ کبھی ضد بھی جالب ضد ہو جاتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سختی و دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ تو اس میں لفظ مع گو سببیت پر دلالت نہیں کرتا محض اقتران پر دال ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقتران محض اتفاقی نہیں بلکہ عسر کو یسر میں دخل ہے کیونکہ عسر سے نفس پامال ہوتا ہے اور عارف کو اس وقت اپنا عجز و فنا مشاہد ہوتا ہے۔ نیز صبر جمیل و رضا بالقضا حاصل ہوتا ہے یہ سب یسر و فتوح کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ جب وہ حدیث ملا لی جائے کہ انبیاء پر تکالیف و شدائد اس لئے زیادہ آتے ہیں تاکہ ان کے درجات بلند ہوں پھر تو عسر کے سبب یسر ہونے میں کوئی بھی اشکال نہ رہیگا اس کے ساتھ اتنا اور سمجھ لیجئے کہ عسر یسر باطنی کا سبب تو ہوتا ہی ہے کیونکہ درجات بڑھتے ہیں مگر اکثر یسر ظاہری کا بھی سبب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَاِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَوَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ وَغَيْرُ ذٰلِكَ مِنَ الْآيَاتِ۔

آخرت متقین کے واسطے ہے اور ہم اپنے رسولوں کی اور مومنین کی ضرور مدد کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے ایمان والوں سے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے کہ ان

کو ضرور زمین میں خلیفہ بناؤں گا۔ اور بے شک زمین کے میرے بندے جانشین ہوں گے۔

عموماً انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے کہ اوّل اُن پر عسر ہوا پھر انجام کار ہر طرح یسر حاصل ہوا کہ ظاہر میں بھی وہ اپنے اعداء پر غالب ہوئے۔ پس یسر باطنی کے اعتبار سے تو مع العسر یسراً میں مع اپنے حقیقی معنوں میں ہے کہ عسر کے ساتھ ساتھ یسر ہے کیونکہ انبیاء کی ترقی درجات عین یسر کی حالت میں ہوتی رہتی ہے۔

یسر ظاہری کے اعتبار سے معنی بعد سے تعبیر فرمایا۔ جو تفسیر لیجیے گا، ویسے ہی مع کے معنی لے لیجیے۔ بہر حال اوّلاً یہ مسئلہ خود بخود میرے دل میں آیا تھا کہ ضد سبب ضد بھی ہو جاتی ہے۔ پھر اس آیت میں بھی اس کی طرف ذہن چلا گیا۔ جس کی تقریر ابھی کر چکا ہوں۔ الحمد للہ مضمون کلی بھی بیان ہو گیا اور آیت سے اس کا تعلق بھی بیان ہو گیا۔

احکام کی عظمت

اب اُس حدیث کی تفریع اس مضمون پر باقی رہی سو عرض کرتا ہوں کہ اُسی مضمون کی ایک فرع یہ حدیث ہے۔

إِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا	کہ رمضان سے پہلے نصف
صَوْمَ إِلَّا عَنْ رَمَضَانَ۔	شعبان کے بعد روزہ نہ رکھو

یہ تو ترجمہ ہوا۔ تفریع کی تقریر آگے آتی ہے۔ اُس سے پہلے اس حکم کی حکمت بیان کرتا ہوں کہ اُس سے تفریع سمجھنے میں سہولت ہو گی کہ اس حکم

کی حکمت کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں گو حکمت کا معلوم کرنا ضروری نہیں اور نہ مسلمان کو عمل کے لئے اس کا انتظار ہونا چاہیئے کہ حکمت کیا ہے لیکن اگر حکمت معلوم ہو جائے تو یہ حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک علم عظیم ہے جس سے احکام کی عظمت کا انکشاف ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ ان دنوں میں خوب گھی دودھ کھا کر رمضان میں قوت ونشاط کے ساتھ روزہ رکھے گا۔ دوسرے یہ کہ رمضان سے پہلے روزہ رکھنے میں رمضان کا اشتیاق کم ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے حضورؐ نے بقاء اشتیاق کے لئے نصف شعبان کے بعد روزہ کو منع کر دیا کیونکہ انتظار و اشتیاق کے بعد جو شے حاصل ہوتی ہے اس میں نشاط زیادہ ہوتا ہے۔ بلکہ ایک شاعر تو یوں کہتا ہے ؎

جو مزا انتظار میں دیکھا پھر نہ وہ وصلِ یار میں دیکھا

مگر یہ ذاتی نقص کا پتہ دے رہا ہے یا عاشق میں یا محبوب میں کہ وصل کے بعد مزہ جاتا رہا یا کم ہو گیا معلوم ہوا کہ یا تو اس شخص کا عشق برائے نام تھا جو کہ جوش کم ہونے سے نیست و نابود ہو گیا۔ یا محبوب ناقص ہے جس سے وصال کر کے حقیقت معلوم ہو گئی کہ بس آپ کا یہ حسن ہے اور یہ کمال ہے ورنہ اگر دونوں کامل ہوں تو پھر انتظار کا مزہ وصال کے مزہ کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ اس وقت محب کا تو یہ حال ہوتا ہے ؎

کنار و بوس سے دونا ہوا عشق مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور محبوب کے حسن کی یہ کیفیت ہوتی ہے ؎

يَزِيدُكَ وَجْهُهُ حُسْنًا   إِذَا مَا زِدْتَهُ نَظَرًا

باقی اس میں شک نہیں کہ جو شئے انتظار کے بعد ملتی ہے اس میں بہ نسبت اس کے جو بلا انتظار کے مل جائے زیادہ نشاط و حظ ہوتا ہے۔ اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے انتظار کو باقی رکھنے کے لئے رمضان سے کچھ پہلے روزہ کو منع فرما دیا۔ ان ہی حکمتوں سے میرا ذہن اسی قاعدہ کلیہ کی طرف منتقل ہوا۔ جس کی تقریر اوپر کر چکا ہوں۔ یعنی میرے قلب میں یہ بات آئی کہ یہاں حضور ؐ نے ایک ضد کو دوسری ضد کے لئے معین بنایا ہے جو کہ ایک قسم کا سبب ہوتا ہے کیونکہ وجود معین کے بعد اکثر مقصود کا ترتب ہو جاتا ہے اور یہی سببیت ہے۔ پس یہ ترک صوم صوم رمضان کے لئے سبب ہو گیا کیونکہ رمضان سے پہلے ترک صوم سے صوم رمضان پر قوت زیادہ ہو گی اور انتظار کی شان پیدا ہو کر رمضان کے روزوں میں نشاط زیادہ ہو گا۔ اور اِذَا انْتَصَفَ شعبان کے عنوان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نصف آخر سے پہلے روزہ مشروع ہے کیونکہ کسی حکم کو ایک میعاد کے ساتھ محدود کر دینا اس کی علامت ہے کہ اس حد سے باہر یہ حکم نہیں۔ پس اذا انتصف کے لفظ سے جو ایک حد معلوم ہو رہی ہے اس سے قبل نصف آخر صوم کی اجازت معلوم ہوتی ہے جو ابھی مذکور ہوتی ہے۔

وہ دوسری احادیث وہ ہیں جن میں لیلۃ النصف من شعبان کی فضیلت وارد ہے یعنی پندرہ شعبان کی رات اور پندرہ کی رات شرعاً وہ ہے جو چودھویں تاریخ کا دن ختم ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے کیونکہ شرعاً لیل مقدم ہے

نہار ہے۔ تو پندرہ کی رات وہ ہے جو پندرہ تاریخ کے دن سے پہلے ہے مثلاً ہمارے یہاں شعبان کی پہلی منگل کی ہے اور پندرہ بھی منگل کی ہے تو پندرہویں رات وہ ہے جو پیر کا دن گزرنے سے شروع ہوگی۔ اس رات کے متعلق حدیث میں یہ حکم ہے کہ

قُومُوا لَيْلَهَا وَصُومُوا نَهَارَهَا۔ — رات میں قیام کرو اور دن میں روزہ رکھو۔

کہ اس رات میں قیام کرو۔ قیام اللیل رات کی عبادت کو کہتے ہیں اور دن میں روزہ رکھو۔ تو اس حدیث میں اخیر نصف شعبان کے قبل روزہ کا شروع ہونا مذکور ہے۔

یہاں شاید بعضوں کو یہ شبہ ہو کہ اس مہینہ میں تاریخ کے اندر اختلاف ہے بعض کے نزدیک پیر کو پندرہ ہے۔ تو اب یہ خلجان ہے کہ پندرہ تو ایک ہی ہوگی یا پیر کو یا منگل کو تو پھر کس دن کا روزہ رکھیں اور کون سی رات کو جاگیں اور دونوں راتوں اور دونوں کی عبادت کرنا یہ گراں ہے۔ تو اب نہ معلوم منگل کی رات اور منگل کے دن میں عبادت کرنے اور روزہ رکھنے سے ہم کو یہ فضیلت حاصل ہوگی یا نہیں۔

تو سمجھ لو کہ تمہارا یہی خیال غلط ہے کہ ثواب کے اعتبار سے پندرہ ایک ہی ہوگی۔ گو حساب میں پندرہ ایک ہی ہو مگر حق تعالیٰ کسی خاص مکان یا زمان میں ایک فضیلت پیدا کر کے اس کے پابند نہیں ہو جاتے کہ دوسرے مکان یا زمان میں اس فضیلت کو پیدا نہ کر سکیں بلکہ وہ ہر رات اور ہر دن میں فضیلت

کو پیدا کر سکتے ہیں۔

رہا یہ کہ امکان سے وقوع تو لازم نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری نصوص سے اس کا وقوع بھی ثابت ہو رہا ہے کہ حق تعالیٰ ایسا ہی کرتے ہیں کہ جو برکت ایک تاریخ میں تمہارے واسطے ہے وہی برکت دوسروں کے لئے دوسری تاریخ میں پیدا کر دیتے ہیں جس کو وہ اپنی تحقیق کے موافق بتدرہ سمجھتے ہیں۔ خدا تعالے کو برکت کا ایک ذات سے دوسری ذات میں منتقل کر دینا کیا مشکل ہے۔ اُن کی تو یہ شان ہے۔

فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمۡ حَسَنٰتٍ۔ کہ حق تعالیٰ گناہ کو حسنہ بنا دیتے اور جرم کو طاعت کر دیتے ہیں

حدیث میں ہے کہ حشر میں اللہ تعالے ایک بندہ سے دریافت فرمائیں گے کہ کیوں تو نے ایسا کیا تھا؟ تو نے فلاں گناہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ اول چھوٹے چھوٹے گناہوں کو گنائیں گے بندہ جس کا اقرار کرے گا اور اپنے دل میں ڈرے گا کہ ابھی سنگین جرائم کا تو ذکر ہی نہیں ہوا۔ دیکھئے اُن پر کیسی گرفت ہو مگر حق تعالیٰ کبائر کے ذکر سے پہلے ہی یہ فرما دیں گے کہ جاؤ ہم نے تم کو ہر گناہ کے عوض ایک نیکی دی۔ اب وہ بندہ خود اپنے گناہ گنوائے گا کہ الٰہی میں نے تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کیے ہیں، اُن کا تو یہاں ذکر ہی نہیں آیا مجھے اُن کے عوض بھی نیکیاں دلوایئے۔ یہ تو آخرت میں ہوگا۔

دنیا میں یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمۡ حَسَنٰتٍ کا مصداق یہ ہے کہ ملکات سیئہ کو مبدل بہ ملکات حسنات کر دیتے ہیں۔ بخل کو سخاوت سے اور

جہل کو علم سے بدل دیتے ہیں اور حسیات میں یہ صورت ہے کہ پانی کو خون کر دیتے ہیں جیسا کہ قوم فرعون پر عذاب، دم مسلط ہوا تھا اور خون کو دُودھ بنا دیتے ہیں جیسا کہ عورتوں اور گائے بکری کے پستان میں مشاہد ہے۔ تو اگر وہ ایک تاریخ کی برکت دوسری تاریخ میں بھی رکھ دیں تو کیا بعید ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بخواہد عین غم شادی شود عین بند پائے آزادی شود

کیمیا داری کہ تبدیلش کنی گرچہ جوئے خوں بود نیلش کنی

واقعی حق تعالےٰ سے زیادہ کیمیا بنانے والا کون ہوگا۔ جب تم کیمیاوی تدابیر سے تانبے کو سونا اور رانگ کو چاندی بنا دیتے ہو، تو وہ پتھر کو سونا بنا دیں تو کیا بعید ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ سونا چاندی اور سب دھاتیں زمین ہی سے نکلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس مٹی ہی سے کیا کیا بنا دیا۔

رہا یہ کہ ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے لئے دوسری نصوص موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شہر اور ہر بستی کے لئے اسی تاریخ میں برکت ہے جو اُن کے حساب سے پندرہ تاریخ ہے۔ حدیث میں ہے۔

اَلصَّوْمُ یَوْمَ تَصُوْمُوْنَ وَالْفِطْرُ یَوْمَ تُفْطِرُوْنَ وَالْاَضْحٰی یَوْمَ تُضَحُّوْنَ۔

روزہ اسی دن کا ہے جس دن تم روزہ رکھو اور عید الفطر کا وہی دن ہے جس دن تم عید الفطر مناؤ اور عید الاضحیٰ اسی تاریخ کو ہے جس دن تم قربانی شروع کر دو۔

اس کا مطلب حضرت استاد نے یہ فرمایا کہ جس تاریخ میں تم اپنی تحقیق کے موافق روزہ شروع کر دو یا تحقیق کر کے روزہ ختم کر دو تو خدا کے نزدیک وہی روزہ کی تاریخ اور افطار کی تاریخ ہے۔ یعنی جو ثواب اور برکت رمضان وعید الفطر وعید الضحیٰ کے دن میں رکھی گئی ہے ہر شہر کے مسلمانوں کو اُن ایام میں حاصل ہو گی جو اُن کے نزدیک رمضان وغیرہ کی تاریخیں ہیں۔ لہذا تم اپنی تحقیق کے موافق جس دن کو پندرہ شعبان سمجھ کر روزہ رکھو گے وہی معتبر ہے اور اُسی دن سے پہلی رات تمہارے لیے پندرہویں رات ہے۔ اختلاف تاریخ سے شبہ میں نہ پڑو۔

قرب الی اللہ و قرب الی النار

مگر خدا کے لیے اس رات میں قرب الی اللہ کے لیے جاگنا، قرب الی النار کے لیے نہ جاگنا۔ قرب النار کے لیے جاگنا یہ ہے کہ آتش بازی کے واسطے جاگا جائے یہ آتش بازی کیا ہے آتش باری ہے۔ رات کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ آگ برس رہی ہے۔ یہ بالکل یاجوج و ماجوج کا سا فعل ہے۔ وہ بھی آسمان کیطرف آسمان والوں سے لڑنے کے لیے تیر پھینکیں گے جن کو حق تعالےٰ کے حکم سے خون سے بھر کر واپس کیا جائے گا۔ اسی طرح یہ لوگ آسمان کی طرف آگ، بیل وغیرہ پھینکتے ہیں۔ اس سے خود بھی بچو اور اپنے بچوں کو بھی بچاؤ۔ کیونکہ اپنے اہل وعیال کو گناہوں سے بچانا بھی گھر کے سردار پر واجب ہے۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفُسَكُمْ — اے ایمان والو! اپنے کو بھی

وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا۔ آگ سے بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی۔

بعض لوگ کہتے ہیں صاحب کیا کریں۔ بچے آتشبازی کے لئے ضد کرتے ہیں۔ یہ محض لغو عذر ہے۔ بھلا اگر بچے زہر کھانے پر ضد کریں تو کیا تم کھلا دو گے ہرگز نہیں! پھر دونوں میں فرق کیا ہے۔ اس کے سوا اور کیا فرق کیا ہے کہ جس چیز کو اطباء جسم کے لئے زہر کہہ دیں اس کو تو تم مضر سمجھتے ہو اور جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم روح ایمان کے لئے زہر تبلا دیں اس کو تم مضر نہیں سمجھتے ذرا ہوش ٹھکانے کر دا اور ایمان کو سنبھالو۔

دوسرے بچوں کا بہلانا ہی کیا مشکل ہے۔ ذرا سی بات میں بچہ بہل سکتا ہے جیسے بدوؤں کا بہلانا آسان ہے۔ بدو چالاک نہیں ہوتے۔ اکثر بھولے اور سیدھے ہوتے ہیں۔

ایک شخص اپنے بدو کو چمچے میں گھی بھر کر دیا کرتے تھے وہ اس پر ضد کیا کرتا تھا کہ چمچہ کو خوب بھرا کرو۔ انہوں نے کیا حرکت کی کہ چمچہ کی تہ میں پہلے کھچڑی جما دیتے پھر گھی بھر کر دے دیا کرتے۔ چونکہ چمچہ ظاہر میں اوپر تک بھرا ہوا ہوتا اس لئے بدو خوش ہو جاتا۔ بس وہ یہ چاہتا تھا کہ چمچہ اوپر تک ہو چاہے نیچے کچھ بھی بھرا ہو۔

ایک دفعہ چند بدوؤں کو کسی کے اسباب میں جیبی گھڑی ملی۔ اس کی جو آواز سنی تو سب حیران ہو گئے کہ اس کے اندر کیا چیز بول رہی ہے۔ آخر یہ رائے قرار ہوئی کہ اس میں جن بول رہا ہے۔ جیسا یہاں بھی جب کسی مریض کا مرض ظاہر میں

سمجھ میں نہ آتا ہو تو اُسے آسیب ہی سمجھتے ہیں۔ بالآخر گھڑی کو ایک پتھر پر رکھ کر اُوپر سے بڑا پتھر زور سے مارا۔ دیکھا تو آواز بند۔ کیونکہ فنر اور بالکمانی کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ اب سب کے سب بڑے خوش ہوئے کہ ہم نے جن کو مار ڈالا۔

بدو ایسے بھولے ہوتے ہیں۔ اُن کا بہلا لینا کچھ مشکل نہیں۔ ایسے ہی بچوں کا بہلانا بھی کچھ دشوار نہیں۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ بچپن میں رمضان کے مہینہ میں ختم قرآن کی شیرینی لینے کو ہمارا جی چاہتا تھا اور ہم ختم کے دن ہر مسجد میں پہنچنا چاہتے تھے لیکن والد صاحب ہم کو منع کرتے اور ختم کے دن کبھی کہیں نہ جانے دیتے اور فرماتے وہاں جاکر کیا لوگے۔ بس بہت سے بہت دو چار جلیبیاں مل جائیں گی۔ لو ہم تم کو بازار سے بہت سی جلیبیاں منگا دیتے ہیں۔ خوب اچھی طرح کھالو اور ختم کے موقع پر نہ جاؤ۔ کھانے پینے کی چیز کے لئے کہیں جانا بُری بات ہے۔ اُنہوں نے اس طرح ہمارے دل سے مٹھائی کی حرص نکالی۔ اور ایسے اچھے طریقے سے نکالی کہ ہم کو ناگوار بھی نہ ہوتا تھا کیونکہ واقعی اپنے گھر اُس دن اتنی مٹھائی کھا لیتے تھے کہ مسجد میں دس آدمیوں کو بھی اتنی نہ ملتی ہوگی۔ اسی طرح آپ بھی اپنی اولاد کے جذبات کی اصلاح کیجئے۔

فضیلت شب براءت

بہرحال شب براءت کی بڑی فضیلت ہے شب قدر کے قریب قریب برابر اس کی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض نے سورۂ دخان میں

لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ کی تفسیر شب برات سے کر دی ہے اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ اور شب برات کے فضائل احادیث میں ملتے جلتے سے ہیں۔ یہی دیکھ کر انہوں نے قرآن میں بھی لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ سے شب برات ہی سمجھ لی۔ مگر یہ خلاف ظاہر ہے۔ کیونکہ آیت میں لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ کی صفت یہ مذکور ہے کہ اس میں نزول قرآن ہوا ہے اور شب برات میں نزول قرآن ہونے کا کہیں ثبوت نہیں۔ اس لئے راجح یہ ہے کہ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ سے قرآن میں تو لیلۃ القدر ہی مراد ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ شب برات کی بھی بڑی فضیلت ہے۔ اس رات میں اور راتوں سے زیادہ عبادت کرنا چاہیے اور صبح کو روزہ رکھا جائے۔

تو جو بات اِذَا انۡتَصَفَ شَعۡبَانُ سے اشارۃً معلوم نہ ہوئی تھی دوسری احادیث سے صراحۃً معلوم ہو گئی کہ نصف شعبان سے پہلے روزہ مشروع ہے بلکہ مسنون ہے۔

اب خاص اس روزہ کی حکمت بھی سمجھیے۔ میرے نزدیک یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رمضان سے پہلے نصف شعبان کا روزہ رمضان کے نمونہ کے لئے مسنون فرمایا ہے تاکہ رمضان سے وحشت و ہیبت نہ ہو کہ نہ معلوم روزہ کیسے ہو گا۔ اور کیا حال ہو گا۔ اس لئے آپ نے پندرہ شعبان کا روزہ مقرر فرما دیا کہ اس دن کا روزہ رکھ کر دیکھ لو۔ چونکہ یہ ایک ہی روزہ ہے اس لئے اس کی ہمت سہولت سے ہو جاتی ہے۔ جب وہ پورا ہو گیا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بس رمضان کے روزے بھی ایسے ہی ہوں گے اور اس تاریخ

میں رات کی عبادت بھی تراویح رمضان کا نمونہ ہے۔ اس سے تراویح کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے کہ جب زیادہ رات تک جاگنا کچھ بھی نہ معلوم ہوا تو تراویح کے لئے ایک گھنٹہ زیادہ جاگنا کیا معلوم ہوگا۔ پس یہ تو اعانت بالمثل علی المثل ہوئی اور پندرہ شعبان کے بعد روزہ سے منع کرنے میں استعانت بالضد علی الضد ہے اور یہ سب ایک ہی جملہ میں موجود ہے۔

بھلا ہے کوئی ایسا بلیغ جو ایک جملہ میں علاج بالضد اور علاج بالمثل دونوں کو جمع کردے اور اس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کمال شان تربیت کا بھی ثبوت ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بڑے سے بڑا عاقل اگر تسہیل صوم رمضان کی کوئی صورت تجویز کرتا تو بہت سے بہت یہ کرتا کہ رمضان سے پہلے بھی ایک دو روز کا روزہ رکھا لیا جائے تاکہ طبیعت کو روزہ سے مناسبت ہو جائے تو صوم سے صوم میں استعانت کرتا۔ باقی یہ علاج کسی کی سمجھ میں نہ آسکتا تھا کہ ترک صوم کو بھی سہولت صوم میں دخل ہے۔ اس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمایا کہ نمونہ کے لئے پندرہ شعبان کا روزہ اور اُسی کی رات کا قیام مسنون فرما کر اس کے بعد روزہ سے منع فرما دیا۔

اب میں ختم کرتا ہوں اور خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ اسباب و مسببات میں جو عقلی احتمال چار نکلتے ہیں اُن میں یہ احتمال بظاہر بہت بعید تھا کہ ضد جالب ضد ہو۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وقوع بھی بکثرت ہے اور میرے قلب میں نصف آخر شعبان میں روزہ ممنوع ہونے کی حکمت یہی آئی ہے کہ اس میں استعانت بالضد علی الضد مقصود ہے جس کی مفصل تقریر اوپر ہو چکی

ہے۔ پس اب ہم کو چاہیئے کہ اس رات میں جو اسی پہر کے بعد آئے گی معمول سے کچھ زیادہ جاگیں اور عبادت میں مشغول ہوں۔ جاگنا بلا عبادت کے مفید نہیں اور قیام اللیل سے نصوص میں محض جاگنا مراد نہیں ہوتا بلکہ جاگنے کے ساتھ عبادت کرنا مراد ہے۔ اور پندرہ تاریخ کا روزہ رکھو اور ابھی سے صیام و قیام رمضان کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

اس کی ایک آمادگی یہ بھی ہے کہ گناہوں سے پاک وصاف ہو جاؤ۔ توبہ کرو اور اہل حقوق کے حقوق ادا کرو۔ کیونکہ گناہوں کو کسل فی الطاعات میں بڑا دخل ہے۔ اور ایک آمادگی یہ ہے کہ تراویح کے لئے صحیح قرآن پڑھنے والوں کو تلاش کرو۔ تیز پڑھنے والوں کو نہ ڈھونڈو۔ کیونکہ ایسا تیز قرآن پڑھنا جس سے حروف بگڑ جائیں اور مقتدیوں کی سمجھ میں بھی نہ آئے مفید نہیں بلکہ الٹا گناہ کا سبب ہے۔ اگر صحیح پڑھنے والا نہ ملے تو الم ترکیف ہی سے تراویح پڑھ لی جائے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائیں آمین!
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

تکمیل الاسلام

تکمیل اسلام کے متعلق یہ وعظ ۲۵؍ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ کی رات کو مدرسہ حسن علی کراچی بندر میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جو دو گھنٹے میں ختم ہوا۔ حاضرین ۳۵۰ کے قریب تھے جس میں دیگر معززین کے علاوہ ایک انگریز پرنسپل بھی موجود تھا ـــــــ

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ونبینا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی الہ واصحابہ وازواجہ وسلم (اما بعد) فقد قال اللہ تبارک وتعالی یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون ○ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منہا کذلک یبین اللہ لکم ایتہ لعلکم تہتدون ○ ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینہون عن المنکر واولئک ہم المفلحون ○ ولا

تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْبَیِّنٰتُ ط وَاُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۙ یَّوْمَ
تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ط فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ
وُجُوْهُهُمْ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ہ وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ
فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ط هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ہ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰهِ
نَتْلُوْهَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ ط وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ہ
وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ہ

اے ایمان والو! اللہ تعالے سے ڈرا کرو ڈرنے کا حق۔ اور بجز
اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا اور مضبوط پکڑے رہو
اللہ تعالے کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور
باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ تعالی کا انعام ہے اُس
کو یاد کرو۔ جب کہ تم دشمن تھے۔ پس اللہ تعالے نے تمہارے
قلوب میں الفت ڈال دی۔ سو تم خدا تعالے کے انعام سے
آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے
کنارے پر تھے۔ سو اُس سے خدا تعالی نے تمہاری جان بچائی۔ اسی
طرح اللہ تعالی تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے

رہتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ پر رہو۔ اور تم میں ایک جماعت ایسی
ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے
کرنے کا کہا کریں۔ اور بُرے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ
پورے کامیاب ہوں گے۔ اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت
ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا ان کے
پاس احکام واضح پہنچنے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے
عظیم ہوگی۔ اس روز کہ بعضے چہرے سفید ہو جاویں گے اور بعضے
چہرے سیاہ ہوں گے۔ اُن سے کہا جاوے گا کہ تم لوگ کافر
ہوئے تھے اپنے ایمان لانے کے بعد، تو سزا چکھو بسبب اپنے
کفر کے اور جن کے چہرے سفید ہو گئے ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت
میں ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ تعالےٰ
کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ کر سناتے ہیں اور اللہ
تعالےٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتے اور اللہ ہی کی ملک ہیں
جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف سب
مقدمات رجوع کئے جاویں گے

تمہید صاحبو! قبل اس کے کہ میں ان آیات کے متعلق کچھ بیان کروں دو باتیں عرض کرنا ضروری ہیں ایک تو یہ کہ میرے بیان کے متعلق ابھی[1] جو کچھ کہا گیا ہے، یہ محض ان حضرات کا حسن ظن ہے۔ نیز اشتہار میں میرے متعلق جو[2] الفاظ لکھ دیئے ہیں، یہ بھی ان حضرات کے حسن ظن کا ثمرہ ہے۔ ورنہ میں اپنے کو ان الفاظ کا مستحق نہیں سمجھتا۔ البتہ اس کے ساتھ ہی جب یہ سوچتا ہوں کہ حدیث میں

أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ۔ — تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہ ہو زمین میں۔

---

[1] قبل شروع وعظ ایک صاحب نے اس کی اطلاع مجمع کو دی تھی کہ ایک ایسا ایسا وعظ ہونے کو ہے۔ [2] دن میں اس وعظ کا ایک اشتہار بھی دیا گیا تھا۔

فرمایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مسلمان اگر کسی کے متعلق حسنِ ظن سے کچھ کہہ دے تو حق جل و علا شانہٗ اس کی برکت سے تصدیق شہادت کے لئے اس کو کسی اچھے درجے پر پہنچا دیتے ہیں۔ تو میں اس نعمت پر خدا تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں۔

دوسرا امر یہ ہے کہ اگرچہ میں نے پورا رکوع تلاوت کیا ہے مگر میں مختصر ہی بیان کروں گا کیونکہ زیادہ بیان کرنے میں لوگوں کا حرج ہوگا۔ خاص کر ایسے لوگوں کا جو اپنے اوقات کے پابند ہیں۔ دوسری بات اس کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ وعظ درحقیقت امراض روحانی کا علاج ہوتا ہے یعنی اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ امراض روحانی کی تشخیص کی جائے اور پھر ان کا علاج بتلا دیا جائے۔ میں نے اس لئے عرض کر دیا تاکہ سامعین کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ وعظ سننے کے وقت کیا نیت رکھیں اور وجہ اس کے عرض کرنے کی یہ ہوئی کہ تتبع احوال سے یہ معلوم ہوا کہ سامعین کی اغراض وعظ سننے سے مختلف ہوتی ہیں اور اسی طرح واعظ کی بھی مختلف نیتیں ہوتی ہیں۔ میں اپنا تبریہ اغراض فاسدہ سے نہیں کرتا۔ لیکن بحمد اللہ مجھے اس پر تنبیہ ہو جاتا ہے اور لغزش ہو جانے سے میں استغفار کر لیتا ہوں۔ واعظین کے متعلق کہنا تو اس وقت فضول ہے کیونکہ یہ مجمع واعظین کا نہیں ہے۔

سامعین کی اغراض

ہاں سامعین کی اغراض کے متعلق دو چار جملے کہہ دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی غرض تو وعظ کے سننے سے یہ ہوتی ہے کہ وہ واعظ کے بیان سے قابل اعتراض اجزاء کو انتخاب کریں مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ بعضوں کی یہ نیت ہوتی ہے کہ تقریر

سے لذت حاصل کریں گے۔ صاحبو! اس میں شک نہیں کہ اللہ جل شانہٗ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں اور اس کی شرح میں لذت ضرور ہے لیکن ہر ایک چیز کا اصلی موضوع لہ علیحدہ ہوتا ہے۔ سو یہ دیکھو کہ اُس کلام کی اصلی غرض کیا ہے۔ لذت یا اور کچھ سو اُس کی نسبت ارشاد ہے۔

کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ط

یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

اس میں خدا تعالیٰ نے تصریحاً فرمادیا کہ یہ کتاب اس لیے نازل کی گئی ہے کہ اس سے علم اور عمل کا فائدہ حاصل کریں۔ لِیَدَّبَّرُوْا میں علم کی طرف اشارہ ہے اور لِیَتَذَکَّرَ میں عمل کی طرف۔

بعضوں کی غرض یہ ہوتی ہے اور یہ بظاہر اور اغراض سے اسلم ہے کہ ہم کو اس مجلس کی شرکت سے ثواب ہوگا۔ سو خوب سمجھ لو کہ اگرچہ شرکت فی الوعظ سے ثواب لازم آجائے اور اس پر مرتب ہو جائے لیکن اصلی غرض یہ بھی نہیں ہے جیسا کہ اور آیت سے معلوم ہوا ہے۔ ثواب کے لیے دوسرے کام بہت ہیں۔ نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن اگرچہ بے سمجھے ہی تلاوت ہو۔ تو نفس ثواب کے لیے اس کی کچھ ضرورت نہیں کہ قطع مسافت کر کے گھر سے مجلس وعظ تک آئے وقت صرف کرے۔

وعظ کی غرض

پس معلوم ہوا کہ وعظ کی غرض اصلی یہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ مجھ میں کیا کیا مرض ہیں ۔ جتنے امراض وعظ میں بیان کئے گئے ہیں ، ان میں سے میرے اندر کتنی باتیں پائی جاتی ہیں اور جو پائی جاتی ہیں اُن کا علاج کیا ہے ۔ اس مقصود کے سوا باقی سب خیالات غیر اصلی ہیں اور جب یہ ہے تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اگر کسی وعظ میں ذرا بھی لذت نہ آئے تو اس کی پروا نہ کرنی چاہیئے ۔

دیکھئے آپ نے کبھی طبیب سے نسخہ لکھوا کر یہ انتظار نہ کیا ہو گا کہ آپ کو اس میں لذت بھی آئی یا نہیں ۔ البتہ اگر کوئی صاحب فن خود نسخے کو دیکھ کر اس طرح لذت یاب ہو کہ کیسی دقائق کی رعایت اس میں رکھی گئی ہے تو دوسری بات ہے ۔ باقی اصلی غرض نسخے سے یہی ہوتی ہے کہ مرض و علاج متعین ہو جائے اور علاج کرنے سے مرض کا قلع قمع ہو جائے ۔ پس یہی غرض وعظ میں بھی ہونی چاہیئے کہ ہم میں کیا کیا امراض ہیں ۔ اس کے سوا ساری اغراض کو فراموش کر دینا چاہیئے ۔ بالکل یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیثِ یار کہ تکرار مے کنیم

ہم نے جو پڑھا سب بھلا دیا مگر دوست کی بات ہی کا تکرار کرتے ہیں ۔

حقیقت میں بڑی بات یہی ہے اور قرآن مجید میں جو قصص مذکور ہیں اُن سے بھی یہی غرض ہے کہ لوگ سابقین کی حالت پر اپنی حالت کو قیاس کریں اور دیکھیں

کہ اُنہوں نے کیا کیا اور اس کا کیا ثمرہ اُن کو ملا۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم کو بھی وہی ثمرہ حاصل ہوگا۔ تو اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ وعظ کی اصلی غرض کیا ہے۔ یعنے جو کچھ بیان ہو اُس کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھنا۔ اور میں درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے لئے اس بیان کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھئے اس وقت جو کچھ خرابیاں ہو رہی ہیں وہ سب اسی سبب سے ہیں کہ ہم اپنی حالت کو نہیں دیکھتے۔ جو کچھ سنتے ہیں اس کا مصداق دوسروں کو سمجھتے ہیں۔ یہ کبھی احتمال بھی نہیں ہوتا کہ ہم میں بھی یہ امراض ہوں گے۔

ہمارا دعویٰ اسلام

بس اب اپنا بیان شروع کرتا ہوں اور اوّل اجمالاً یہ بتلائے دیتا ہوں کہ اس وقت جو مضمون میں بیان کروں گا وہ کیا ہے۔ سو وہ یہ ہے کہ اسلام حقیقی کیا ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ہم جو کہتے ہیں اَنَا مُسْلِمٌ یہ سچ ہے یا نہیں کیونکہ محض زبان سے کہہ دینے سے اسلام نہیں حاصل ہو سکتا ؎

وَجَائِزَۃٌ دَعْوَی الْمَحَبَّۃِ فِی الْھَوٰی
وَلٰکِنْ لَا یَخْفٰی کَلَامُ الْمُنَافِقِ

اس میں شک نہیں کہ آج کل مسلمان بیدار ہیں۔ اکثر کو اپنے اسلام کی طرف توجہ ہے۔ غفلت کی شکایت اب بہت کچھ دور ہو گئی ہے۔ لیکن نرا تنبہ مفید نہیں جب تک کہ اس کی حقیقت معلوم نہ ہو۔ دیکھو اگر ایک شخص کو یہ معلوم ہو کہ مال کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے لیکن نہ اُس کی حقیقت معلوم ہو اور نہ ذریعہ تحصیل۔ تو کیا نرا احساس ضرورت مال حاصل کرنے کے لئے

کافی ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ مال کی حقیقت بتلا دی جائے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص ایک پیسے کو بھی مال سمجھتا ہو اور ایک پیسہ کما کر اپنے کو مالداروں کی فہرست میں شمار کرنے لگے۔ کیا کوئی شخص اس کو مالدار سمجھے گا یا یوں کہا جائے گا کہ اس کو جنون ہو گیا ہے۔ پیسہ بھی کوئی مال ہے۔ حالانکہ

اَدْنٰی مَا یُطْلَقُ عَلَیْہِ اِسْمُ الْمَالِ۔ — ادنیٰ جس پر مال کا نام اطلاق کیا جاتا ہے۔

پیسہ بھی ہے لیکن یہاں دقائق فلسفیہ کا لحاظ نہیں ہوتا۔ یوں تو ہر شخص اپنے کو مالدار سمجھ سکتا ہے لیکن مال کی حقیقت معتبرہ معلوم کرنے کے بعد وہی مالدار سمجھا جائے گا جس کے پاس معتد بہ مقدار مال کی موجود ہو ورنہ وہی حال ہوگا کہ

؎ خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے — حاصل خواجہ بجز پندار نیست

پس اسی طرح حالت موجودہ میں کہ بہت سے اعمالِ دین سے ہم متروک ہیں ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم مسلمان ہیں ایسا ہی دعوےٰ ہے جیسا کہ اس شخص کا ایک پیسہ کما کر صاحب مال ہونے کا دعویٰ تھا۔ پس جس طرح اس کو مجنوں کہا گیا ہم کو بھی مجنون کہا جائے گا۔ البتہ ہمارا دعویٰ اس وقت قابلِ التفات ہوگا کہ جب ہمارے پاس اس حد تک ایمان ہو کہ اس کی غرض علیٰ وجہ الکمال حاصل ہو سکے۔

دیکھئے میں خدا تعالیٰ کی ایک بڑی رحمت پر متنبہ کرتا ہوں۔ یعنی اس تقریر کا مقتضا تو یہ تھا کہ ناقص الایمان کو مومن ہی نہ کہا جاتا۔ جیسے کہ ایک پیسے کے مالک کو مالدار نہیں کہا جاتا تھا۔ چنانچہ خوارج اور معتزلہ نے ایسے شخص کو مسلمان

نہیں کہا۔ پھر معتزلہ تو اس کو ایمان سے خارج کرتے ہیں لیکن کافر نہیں کہتے اور خوارج تو بالکل کافر ہی کہتے ہیں۔ اب دیکھئے اہل سنت والجماعت نصرھم اللہ کو کہ انہوں نے شارع کی نصوص رحمت کو سمجھ کر ایسا حکم نہیں کیا۔

اس پر مجھے بطور جملہ معترضہ کے ایک ضروری بات یاد آئی یعنی ہم میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ نصوص کو عقل پر منطبق کرتی ہے اور اصل رہبر عقل کو قرار دیتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ رائے بڑی مصیبت کی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ عقل آپ کی اتنی خیرخواہ نہیں ہے جیسی وحی ہے۔ دیکھئے عقل آپ کی ایسی دشمن نکلی کہ ایک نافرمانی میں کافر بنا دیا جس کی اوپر تقریر ہوئی۔ اب وحی کے خواص کو دیکھئے کہ باوجود آپ کی نافرمانی کے ارشاد ہے

لَا تُكَفِّرُوْهُ بِذَنْبٍ وَلَا تُخْرِجُوْهُ عَنِ الْاِيْمَانِ۔	کسی کو گناہ کی وجہ سے کافر مت کہو اور ایمان سے خارج نہ کرو۔

اور دو جملے ارشاد فرمانے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جملہ اول سے خوارج کا رد فرمانا منظور ہے اور جملہ ثانیہ سے معتزلہ اور خوارج دونوں کا۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے کتنے خیرخواہ ہیں اور آپ کی عقل کس قدر دشمن ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔	نبی مومنین کے ساتھ اُن کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں

کیا معنے کہ ہمارے نفس نے تو عقل کے مشورے سے ایک نافرمانی سے کفر کا

فتوےٰ دے دیا تھا۔ اس قاعدے سے کہ ناتمام ذخیرے پر نموں کا حکم نہیں کیا جاتا جیساکہ اُوپر کی مثال سے معلوم ہوا۔ اس طرح ایمان ناقص پر بھی ایمان کا حکم نہ کیا جائے گا۔ یہ تو عقل کا فتوےٰ تھا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے باوجود گناہ میں مبتلا دیکھنے کے بھی مسلمان ہی فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ شریعت ہم سے زیادہ ہماری خیر خواہ ہے۔ لہذا اب یوں کہنا چاہیئے اور یہی مذہب رکھنا چاہیئے ؎

آزمودم عقلِ دور اندیش را — بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

میں نے عقلِ دُور اندیش کو آزمایا اس کے بعد اپنے آپ کو دیوانہ بنا لیا۔

یعنی عقل کا تو امتحان کر لیا وہ تو مخالف ثابت ہوئی۔ اب دیوانہ ہی رہنا چاہیئے اور اس دیوانگی کے واسطے یہ کہنا چاہیئے ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم — مستِ آں ساقی وآں پیمانہ ایم

ہم اگر مفلس اور دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے۔ محبوبِ حقیقی اور اس کی محبّت کے متوالے ہیں۔

اور ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد — اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

وہ خود ہی دیوانہ ہے جو آپ کا دیوانہ نہیں ہوا۔

یہ وہ دیوانگی ہے کہ اس پر ہزار فرزانگی قربان ہے۔ یہ جملہ معترضہ تھا اصل مقصود یہ تھا کہ جیسے مالدار وہ ہے کہ اس کے پاس اصلی ذخیرہ ہو ایسے ہی اسلام کا دعوےٰ اسی کو زیبا ہے کہ اس کے پاس کامل ایمان ہو ورنہ ہمارا دعوےٰ ایسا

(براہ کرم ورق نہ موڑیں)

ہے جیسا اُس ایک پیسے والے کا۔ اور مثال لیجئے۔ حسین اُس کو کہیں گے جس کی آنکھ ناک سب درست ہو اور جس کی یہ حالت ہو کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

ورنہ اگر کسی کی ناک کاٹ لی جائے اور وہ ناک پر ہاتھ رکھ کر آئے تو کتنا حسین معلوم ہوگا لیکن کوئی ہاتھ اٹھا دے تو پھر دیکھئے کتنا پژمردہ ہوتا ہے۔ تو جیسا ایک حسنِ ظاہری ہے ویسا ہی ایک حسنِ باطنی بھی ہے۔ جب ہر صفت کمال کے ساتھ ہو گی اُس وقت حسین اور مسلم کہیں گے۔

ورنہ اس کا حسنِ باطنی اور اسلام ایسا ہے جیسے آپ کسی دوست سے کہیں کہ ہم کو ایک آدمی کی ضرورت ہے اور وہ ایک مدت کے بعد آپ کے پاس ایک آدمی کو ایک چارپائی پر لاد کر لایا۔ جتنے امراض ہیں قریب قریب سب میں مبتلا ہے۔ آنکھیں بھی نہیں، کان بھی نہیں، ہاتھ پیر بھی بیکار ہیں، فاتر العقل بھی ہے البتہ جاندار ہے کہ اگر اُس کو کوئی قتل کر دے تو قانوناً اُس کو پھانسی ہو جائے۔ مگر کیا اُس آدمی سے آپ کی غرض پوری ہو سکتی ہے۔ ہرگز نہیں! کیا آپ تعجب سے نہ پوچھیں گے کہ اس کو کیوں لائے ہو۔ اب اگر وہ دوست یہ کہے کہ آپ کے واسطے لایا ہوں۔ آپ نے فرمائش کی تھی کہ ایک آدمی لادو۔ تو آپ ہنسیں گے اور کہیں گے کہ اگرچہ یہ لغۃً اور قانوناً آدمی ہے لیکن جب اس سے میری غرض حاصل نہیں ہوتی تو میرے لئے تو یہ آدمی نہیں ہے۔

مقصودِ اسلام جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب دیکھئے کہ اسلام سے کیا غرض ہے۔ آیا نجاتِ کاملہ یا محض ایک قومی شعار بنانا

جیسا کہ آج کل کے عقلا نے سمجھ رکھا ہے کہ غرض مذہب سے صرف یہ ہے کہ اس سے ہماری ایک قوم بن جائے اور ہمارے اندر ایک اجتماع کی شان پیدا ہو جائے جیسا کہ اس وقت اکثر لوگوں نے یہی غرض سمجھی ہے۔ مذہب کی حیثیت سے بہت کم لوگ اس پر متوجہ ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں مذہبی رنگ نہیں ورنہ اگر مذہب کے لحاظ سے متوجہ ہوتے، تو مذہبی رنگ بھی ان میں ضرور پیدا ہوتا۔

میں ایک انجمن میں بلایا گیا۔ اُس کی حالت جو تحقیق کی، تو معلوم ہوا کہ نہ اُس کے ممبروں کی آمدنی شریعت کے موافق ہے نہ اعمال اُن کے درست ہیں۔ ترک صلوٰۃ و شرب خمر تک میں بعضے مبتلا ہیں۔ میں نے داعی سے کہا کہ غرض اہل انجمن کی خیرخواہی قوم بیان کی جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ خیرخواہ قوم ہیں، تو اپنے خیرخواہ کیوں نہیں اور جب اُنہوں نے اپنی اصلاح نہیں کی تو کیسے مان لیا جائے کہ ان کو قوم پر توجہ ہے۔

صاحبو! میں لیڈران قوم کو متوجہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ اپنی اصلاح نہ کریں گے اس وقت تک ان کی خیرخواہی کسی درجے میں مؤثر نہ ہوگی نہ اُن کی خیرخواہی کو کوئی تسلیم کرے گا اسی کو تو فرماتے ہیں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ۔	کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے۔ حالانکہ تم تلاوت کرتے ہو کتاب کی۔

تو ان حالات کو دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام من حیث الاسلام بہت کم لوگوں میں ہے، صرف اسلام من حیث القوم رہ گیا ہے جیسے اپنے ہمعصروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ مذہب کے ذریعے سے ایک اجتماعی شان پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح خود بھی اُن کے قدم بقدم چلتے ہیں اور بڑی علامت اس کی یہی ہے کہ یہ لوگ اپنی اصلاح کچھ بھی نہیں کرتے اور میں کچھ ان ہی کی شکایت نہیں کرتا بلکہ اپنی بھی شکایت کرتا ہوں کہ ہم بھی فکر اصلاح سے خالی ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ گو شراب نہیں پیتے زنا نہیں کرتے لیکن غیبت میں ہی مبتلا ہیں۔ اگر ہم نے زنا کو خدا کا گناہ سمجھ کر چھوڑا ہے تو دوسرے گناہوں کو کیوں نہیں چھوڑتے معلوم ہوا کہ شراب وغیرہ کو چھوڑنے کی اصل وجہ یہ نہیں بلکہ خاندان و وضع کے خلاف ہونے سے چھوڑا ہے کہ کبھی باپ نے نہیں پی تھی، دادا نے نہیں پی تھی، تو اگر ہم پئیں گے تو سخت رسوائی ہوگی۔ تو اپنی وضع کی حفاظت کے لیے اس سے اجتناب کیا نہ کہ شریعت کے زجر سے۔ بخلاف غیبت کے کہ باپ دادا سب کرتے چلے آئے ہیں اس لئے اس کو عیب نہیں سمجھا گیا لہٰذا اس کے ترک پر کبھی توجہ نہیں ہوئی۔ ورنہ گناہ ہونے کی رُو سے شرب خمر اور ارتکاب غیبت دونوں مساوی ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

ریا حلال شمارند جامِ بادہ حرام
زہے طریقت و ملت زہے شریعت و کیش

کہ عجیب بات ہے ریا کو تو عملاً حلال سمجھ رکھا ہے اور جامِ بادہ کو حرام سمجھ رکھا ہے حالانکہ دونوں برابر ہیں دونوں کو چھوڑنا چاہیئے اور یہ

مطلب نہیں کہ دونوں میں مبتلا ہو جائیں۔ افسوس ہے کہ ہمارا ماٹ کا ماٹ ہی بگڑ گیا ہے۔ خوب کہا ہے۔ اور یہ بزبان حال استغاثہ ہے۔ نہ اس اعتقاد سے کہ حضورؐ سنتے ہیں بلکہ محض جوش میں کہا ہے کہ ؎

اے بہ سرا پردہ یثرب بخواب　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

جدھر جا کر دیکھتے ہیں خرابی ہی خرابی ہے۔ بہر حال گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑنا چاہیئے۔ اور چونکہ اس امر میں سب گناہ مشترک ہیں اس لیے سب کو چھوڑنا چاہیئے۔ ایسا نہ کرنا چاہیے جیسے بعض لوگ اپنے تقدس میں بٹہ لگنے کے خیال سے شراب تو چھوڑ دیتے ہیں مگر غیبت نہیں چھوڑتے۔ کیونکہ عرفاً اس سے تقدس میں بٹہ نہیں لگتا۔ اس تقدس پر کہ معصیت سے بھی زائل نہ ہو مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ حکایت تو بے تمیزی کی ہے لیکن آج کل کے تقدس کا پورا فوٹو ہے۔

مشہور ہے کہ ایک آوارہ عورت تھی بی بی تمیزہ۔ اس کو کسی بزرگ نے نماز کا پابند کر دیا اور وضو بھی سکھلا دیا۔ وہ سمجھے تھے کہ اس کی بدولت فحش گناہ بھی چھوڑ دے گی۔ پانچ چھ مہینے کے بعد جو آنے کا اتفاق ہوا تو پوچھا کہ بی بی نماز پڑھا کرتی ہو۔ کہنے لگی کہ جی ہاں۔ اُنہوں نے کہا کہ وضو بھی کیا کرتی ہو کہنے لگی کہ آپ کرا تو گئے تھے بس اُسی سے پڑھ لیتی ہوں۔

تو جیسے اس بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ وہ نہ سونے سے ٹوٹتا تھا نہ بدکاری سے ٹوٹتا تھا، ایسا ہی آج کل کا تقدس بھی ہے کہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں بس عوام میں تقوے اس کو سمجھا جاتا ہے کہ وضع ظاہر کو درست کر لیں۔ رہا باطن اس

کی جو حالت بھی ہو۔ خوب کہا ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل
واندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید
وز درونت ننگ میدارد یزید

یعنے ظاہری حالت اُن کی ایسی ہے جیسے کافر کی قبر مزین ہوتی ہے اور اُس کے اندر خدا تعالےٰ کا قہر و غضب نازل ہوتا ہے

اور جیسے یہ پُرانے لوگوں کی شکایت تھی ایسے ہی نئی وضع کے لوگوں کی یہ شکایت ہے کہ انہوں نے اسلام کو بالکل ہی نہیں سمجھا۔ غرض جب اسلام سے مراد نجات کاملہ ہے اور وہ حاصل ہوتی ہے اسلام کامل سے۔ جس طرح مقصود تموّل سے انتفاع کامل تھا اور وہ حاصل ہوتا تھا تموّل کامل سے۔ پس اب اسلام کامل کو تحقیق کرنا چاہیے۔ بس میں چند جملوں میں اس کے متعلق بیان کرتا ہوں۔

اسلام کی حقیقت

فرماتے ہیں اے مسلمانو! ڈرو خدا سے جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم کو بجز اسلام کے کسی حالت پر موت نہ آنا چاہیے۔

یہ ایک آیت کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس میں خدا تعالےٰ نے ایمان والوں کو خطاب کیا ہے دو چیزوں کا۔ جن میں ایک امر ہے اور ایک نہی ہے۔ امر یہ ہے کہ خدا تعالےٰ سے ڈرو اور نہی یہ ہے کہ بجز اسلام کے کسی حالت پر مت مرو۔

یہاں چند امور قابل غور ہیں انہی سے میرا مضمون نکل آئے گا۔ ایک یہ کہ

یہ خطاب جو ایمان والوں کو ہے تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ دوسرے لوگ نہ ڈریں بلکہ اوروں کو خطاب اس لئے نہیں کیا کہ یہ خطاب اُن کے لئے قبل از وقت تھا اور اسی سے فیصلہ ہو جائے گا کہ کفار جزئیات کے مخاطب ہیں یا نہیں۔ سو قبل از وقت وہ مخاطب جزئیات کے نہیں ہیں البتہ جب وہ اس زمرے میں داخل ہو جائیں اُس وقت وہ بھی مخاطب ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی کالج میں ایک کورس بنایا گیا اور یہ خطاب کر کے اس کو پیش کیا گیا کہ اے طالب علمو! اس کو سیکھو۔ تو یہاں جو خاص طالب علموں کو خطاب ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اوروں سے سیکھنے کا مطالبہ نہیں۔ کیونکہ یہ پرنسپل اوروں کو بھی کالج میں داخل ہو کر طالب علمی کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ تو مطلوب ہر ایک سے ہوا۔ لیکن جو شخص ہنوز کالج کا طالب علم نہیں بنا اُس کو یہ خطاب قبل از وقت ہے۔ اس کو اوّل یہ کہیں گے کہ تم اس کالج کے طالب علم ہو جاؤ۔ اس کے بعد جب وہ نام لکھا لے گا تو اُس کو یہ خطاب کیا جائے گا کہ تم فلاں کورس سیکھو۔

اسی طرح کلام مجید کے اس خاص خطاب کا یہ مطلب نہیں کہ غیر اہل اسلام سے تقویٰ مطلوب نہیں۔ لیکن ان کو یہ خطاب کرنا قبل از وقت ہے۔ ان سے اوّل یہ کہا جائے گا کہ تم ایمان لے آؤ۔ اس کے بعد تقوے کا حکم کیا جائے گا اور اگر کہیں قرآن میں خطاب عام سے اِتَّقُوْا فرمایا ہے تو وہاں اتقوا سے آمنوا مراد ہے کیونکہ ایمان بھی تقوے کا ادنیٰ درجہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں ایک بات کا تو امر فرمایا ہے

اور ایک سے نہی۔ چنانچہ ترجمے سے ظاہر ہے۔ اس کا قائل ہونا ممکن نہیں کہ مضامین میں ارتباط نہیں۔ اور یہ تو ایک ہی آیت کے دو جملے ہیں۔ خود آیتوں میں بھی اس کا قائل ہونا صحیح نہیں کیونکہ اگر آیتوں میں ترتیب نہ ہوتی تو ترتیب تلاوت کو ترتیب نزول کے خلاف کہنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ نازل تو کہیں ہوئی اور رکھی گئی کسی دوسری جگہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مناسبت مضامین کے لحاظ سے ترتیب مقرر ہوئی ہے اور جب آیتوں میں ارتباط ہے تو اجزائے آیات میں علے سبیل الاولویت ارتباط ہوگا۔ اور جب یہ ہے تو بظاہر امر و نہی دونوں میں عنوان ایک ہونا چاہیئے تھا۔ یہ کیا بات ہے کہ امر میں تو تقوے کا لفظ اختیار کیا گیا اور نہی میں ہے،

اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ مگر دراں حالیکہ تم مسلمان ہو۔

فرمایا گیا ہے کہ مرتے وقت تک مسلمان رہنا۔ اور ربط کا ہونا ضروری ہے۔ پس یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ اتقوا اللّٰہ اور مسلمون دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مسلم وہ ہے کہ حق تقوٰی کو حاصل کر چکا ہو اور اسی پر قائم رہے ورنہ وہ مسلم کامل نہیں۔ علیٰ ہذا اسلام کامل حق تقوے ہے اور جب اسلام کامل یہ ہے تو اب دیکھئے کہ آپ میں یہ اسلام ہے یا نہیں۔ سو اس کے لئے حق تقوے کی تفسیر کو دیکھ لیجئے۔ اگر وہ حاصل ہے تو اسلام کامل حاصل ہے ورنہ نہیں۔ تو مفسرین میں سے بعض نے تو اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے۔

اَنْ یُّطَاعَ وَلَا یُعْصٰی ۔ یہ کہ اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے۔

اور بعض نے یہ لکھا ہے۔

اَنْ یُّشْکَرَ وَلَا یُکْفَرَ۔ شکر کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔

اسی طرح اور بھی تفسیریں ہیں مگر ان میں کچھ تعارض نہیں۔ سب کا اجتماع مقصود ہے۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اعمال اسلام کو کامل کر لیا جائے۔ سو اُس کا ایک جزو اطاعت و ترکِ معصیت بھی ہے۔ ایک جزو شکر و ترک کفر بھی ہے۔ اور ان کی تخصیص بطور تمثیل کے ہے۔ مقصود یہ ہے کہ سب اعمال کو جمع کرنا چاہیے پس اسلام کامل تو یہ ہے۔

عوام کی غلطی مگر اس وقت لوگوں نے اسلام کی حقیقت کو دوسرے طور پر سمجھ رکھا ہے۔ اہل سائنس نے دواؤں کا ست نکالا تھا مگر اس وقت کے عقلاء نے اسلام کا ست نکالا ہے کہ اپنے خیال کے موافق کچھ چیزیں اسلام میں داخل کر لیں کچھ چیزوں کو خارج کر دیا۔ مگر صاحبو! ست اس چیز کا نکالا کرتا ہے جس میں کوئی فضول جزو بھی ہو۔ تو کیا آپ کے نزدیک اسلام میں کوئی فضول جزو بھی موجود ہے۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے تو اس سے تو خدا تعالیٰ پر اعتراض لازم آتا ہے۔

صاحبو! اسلام کا کوئی جزو بھی قابل ترک کے نہیں۔ حتیٰ کہ حضرت عبداللہ ابن سلامؓ کو ایک مرتبہ یہ خیال ہوا کہ اگر میں اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں تو اسلام کے خلاف نہ ہوگا کیونکہ کچھ فرض نہیں اور توریت پر بھی عمل ہو جائے گا۔ اس پر یہ آیت نہایت شد و مد کے ساتھ نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ط وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ط ــــ الخ

اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو۔

خیال کیجیے کہ گوشت کھانا بھی کیا کوئی رکن اعظم تھا مگر اس کے ترک کو قربت سمجھنے پر کس قدر تشدد وارد ہوا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا اتنا جزو بھی ترک کے قابل نہیں۔ پھر ست کیسے نکل سکتا ہے اور ست اسلام کا اس طرح نکالا ہے کہ بعض نے تو صرف عقیدوں کو کافی سمجھا ہے اور اعمال وغیرہ کی کچھ بھی ضرورت نہ سمجھی۔ اگرچہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے عقیدوں میں بھی انتخاب کیا ہے لیکن وہ بہت اقل و نادر ہیں مگر ہیں ضرور۔

چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز کی ضرورت اب نہیں رہی۔ یہ عرب کے واسطے مقرر ہوئی تھی کہ وہ نامہذب تھے۔ اب ہم متمدن ہیں۔ ہم میں کوئی توحش کی شان باقی نہیں رہی۔ لہذا نعوذ باللہ اس کو اسلام سے حذف کر دیا جائے۔ انا للہ! اس مشورے کا صحیح اور سیدھا جواب یہ ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے افسوس ہے کہ لوگ آج کل اس جواب کی قدر نہیں کرتے اور اس کو عجز اور دفع الوقتی پر محمول کرتے ہیں۔ اور علماء سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ قطع نظر حوالہ قرآن و حدیث سے ہر قانون کی لم بیان کرو۔ صاحبو! قوانین ظاہری جن میں بہت سے خلاف عقل عوام بھی ہیں ان کی لم کیوں نہیں تلاش کی جاتی۔ صرف وجہ یہ ہے کہ اس قانون کی وقعت دلوں میں ہے اور قانون اسلام کی وقعت نہیں۔ ورنہ اگر اس

کی بھی وقعت ہوتی تو ہرگز اس میں چون وچرا نہ کی جاتی بلکہ یہ کہا جاتا کہ ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو　　نینگیختن علّت از کار تو

اور یہ شان ہوتی ہے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو

جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

یعنی زندگی عطا فرمائیں تو آپ کی مہربانی ہے اور اگر آپ قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں۔ دل آپ پر آگیا ہے جو کچھ تصرف کریں میں آپ پر راضی ہوں۔

دیکھئے انسان کو اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے سامنے کیسا سرافگندہ ہو جاتا ہے۔ مجنوں کی لیلیٰ کے عشق میں کیا حالت ہو گئی تھی تو ؎

عشقِ مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　گوئی گشتن بہر او اولےٰ بود

کیا خدا کی محبت لیلیٰ کی محبت سے بھی کم ہو گئی ہے۔ اور دیکھئے اگر محبوب دس روپے مانگے تو محب کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ دس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے بلکہ غنیمت سمجھتا ہے اور مسرور ہوتا ہے۔ افسوس کہ ایک مردار کی فرمائش پر تو مسرت ہو اور خدا تعالیٰ کے ارشاد کی لِم تلاش کی جائے۔

میں ایک موٹی بات بتلاتا ہوں کہ قانون کی حکمت واضع قانون سے دریافت کرنی چاہیے نہ کہ حاکم قانون سے۔ مثلاً اگر کوئی حاکم قانونِ مروّج کی رُو سے فیصلہ کر دے اور آپ اس سے پوچھیں کہ اس قانون کے مقرر کرنے میں کیا مصلحت ہے تو وہ کیا جواب دے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا کہ ہم قانون کے حافظ ہیں واضع

نہیں۔ مصالح واضعانِ قانون سے دریافت کرو۔

صاحبو! جب حاکم کو یہ جواب دینے کا اختیار ہے تو گیا علماء یہ جواب نہیں دے سکتے۔ اور جب حاکم کا یہ جواب زبردستی اور عجز پر محمول نہیں کیا جائیگا تو علماء کے اس جواب کو عجز پر کیوں محمول کیا جاتا ہے۔ اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ سائلین پر اتنی شفقت نہ کیا کریں۔ اور خواہ مخواہ عوام کو دلیر نہ بناویں اور اپنے درپے نہ کریں۔ رہا یہ ڈر کہ بعض لوگ مصالح نہ معلوم ہونے سے اسلام سے نکل جائیں گے تو میں کہتا ہوں کہ بلا سے نکل جائیں ؎

زعشقِ ناتمام ما جمالِ یار مستغنی ست
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

اسلام کو ایسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے بس قانون کے موافق جواب دو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس لئے پوچھتے ہیں کہ دوسروں کو بتلائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ؎

آرزو مے خواہ لیک اندازہ خواہ	بر نتابد کوہ را یک برگِ کاہ

تمنا کرو لیکن اپنے تحمل سے نہ بڑھو۔ اسلام کی خدمت کرو لیکن اپنے اندازہ کے موافق۔ اگر تم نے دو چار باتیں معلوم کر کے ایک دو سوال کا جواب دے دیا تو اُن کے علاوہ دوسرے سوالات میں کیا کرو گے ؎

چار پا را قدرِ طاقت بار نہ	بر ضعیفاں قدرِ قوت کار نہ
طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر	طفلِ مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

یعنی بچے کو اگر روٹیاں دینے لگو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مرے گا۔ تو عوام کو چاہیے کہ

اپنے درجے پر رہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کی خدمت نہ کرو۔ مگر جو خدمت تحقیق علمیات کی تم نے شروع کی ہے اُس کو محدود کرو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت ہر شخص اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے۔

اعمال کی تلخیص

غرض بعض نے عقائد میں بھی تلخیص کی ہے لیکن ایسے بہت کم ہیں۔ باقی اعمال کی تلخیص و حذف کرنے والے تو بہت ہی ہیں اور بعض نے عقائد کے ساتھ اعمال کو بھی ضروری سمجھا۔ مگر کسی نے تو صرف نماز کو اختیار کیا اور زکوٰۃ کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس نے دیکھا کہ اگر چار ہزار روپیہ ہوگا تو اس میں سے ایک سو روپیہ دینا پڑے گا۔ اس لیئے اُس کو بالکل ہی ترک کر دیا۔ ان لوگوں کی وہ حالت ہے کہ ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست　　　ور زر طلبی سخن دریں ست

اگر جان مانگو تو مضائقہ نہیں۔ اگر مال مانگو اس میں کلام ہے۔

کوئی صاحب، اندیشہ نہ کریں کہ شاید اب چندے کی فرمائش کی جائے گی میں چندہ نہیں مانگوں گا۔ مقصود زکوٰۃ دینے والوں کی حالت کا بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا صرف زبانی دعوے رکھتے ہیں۔ باقی امتحان کیوقت، جی چراتے ہیں۔

مشہور ہے کہ کسی بخیل سے اُس کے دوست نے انگوٹھی مانگی تھی کہ وہ یادگار کے طور پر رہے۔ اُس نے کہا کہ جب اپنا ہاتھ خالی دیکھا کرو گے تو مجھے یاد کر لیا کیجو کہ ہم نے ایک دوست سے انگوٹھی مانگی تھی مگر اُس نے نہیں دی تو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بھی ایسی ہی محبت رکھیں کہ صرف نماز

تو پڑھ لیا کریں تاکہ اُس کے ذریعے سے بزرگوں میں داخل سمجھے جائیں۔ باقی اور اعمال کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بعض نے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو بھی لیا لیکن حج کو چھوڑ دیا کہ اتنے دنوں تک دکان بند کرنی پڑے گی نقصان ہو گا سفر میں تکالیف ہوں گی بعض نے اس کو بھی لیا لیکن ابواب آمدنی کو نہیں روکا۔ پھر ان میں بعض نے تو رشوت لینی شروع کر دی۔ بعض نے سود خوری اختیار کر لی۔ اور کہا جاتا ہے کہ اگر رشوت یا سود لینا چھوڑ دیں تو آمدنی کے وسائل بند ہو جائیں گے۔ یہ تو وہ کوتاہیاں تھیں جن میں اکثر اہل دنیا مبتلا ہیں۔

خواص کی کوتاہیاں

بعض وہ کوتاہیاں ہیں کہ اُن میں دیندار بھی مبتلا ہیں، مثلاً اکثر لوگ جن میں دیندار بھی ہیں ریل کے سفر میں اسباب زیادہ لے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل ناجائز ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ قیامت میں یہ سب دینا پڑے گا۔ علیٰ ہذا ڈاکخانے کے بعض قواعد مثلاً اگر کسی ٹکٹ پر بالکل مہر نہ لگی ہو اور وہ ایک مرتبہ کام میں آچکا ہو تو اس کو دوسری دفعہ کام میں لانا جائز نہیں ہے۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ میرے ایک عزیز سے کسی نے پوچھا کہ دیانت کیا ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ دیانت یہ ہے کہ ڈاکیا ایک لفافہ دے کر جائے اور اس کا ٹکٹ مہر سے محفوظ نظر آئے اور اس وقت کوئی شخص اس مکتوب الیہ کے پاس نہ ہو نہ کسی کو خبر ہونے کا اندیشہ ہو اور یہ ٹکٹ کو سالم اتار کر کام میں لا سکتا ہو اور وہ ایسے وقت میں محض خدا کا خوف کر کے لفافہ کھولنے سے پہلے اس ٹکٹ کو اتار کر پھاڑ ڈالے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو سمجھا جائے گا

کہ یہ پورا دیانت دار ہے۔

مقصود اس سے دیانت داری کی ایک مثال دینا ہے نہ کہ اس میں منحصر کرنا۔ اور اس سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ اسلام کی کیا خوبیاں ہیں۔ واللہ اسلام ہرگز چالاکیوں اور مکاریوں کی اجازت نہیں دیتا کہ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِی الْاِسْلَامِ۔ یعنے کسی کو ذراسی تکلیف پہنچانا بھی اسلام کے خلاف ہے یہاں تک حکم ہے کہ جانور کو ذبح کرو تو اُس کو راحت دو۔ یعنی چھری کو خوب تیز کر لیا کرو۔ کیا انتہا ہے رحمت کی کہ ذبح کہ بظاہر تکلیف ہے لیکن شرافت انسانی کی وجہ سے اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اس میں بھی راحت رسانی کا کتنا بڑا خیال ہے۔

رہا یہ شبہ کہ تکلیف تو اب بھی ہوگی۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو کیا خبر ہے کہ خود مرنے میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے یا ذبح میں زیادہ ہوتی ہے اگر شبہ ہے تو مرنے پر بھی ہونا چاہیئے کیونکہ ذبح کا شارع اور موت کا خالق ایک ہی ہے۔ اگر اس کی تشریع پر شبہ ہے خلاف رحمت ہونے کا تو موت کی تکوین پر بھی ہونا چاہیئے۔ تو جس نے جانور پر رحمت کا حکم کیا ہے وہ انسان کے لیئے رحم کو کیوں نہ واجب کرے گا۔ پھر دھوکا، دغا بازی، خیانت کو کیسے جائز رکھے گا۔ مگر افسوس کہ ہم نے اس کی ذرا بھی رعایت نہ کی۔ اپنے بھائیوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ خصوص جو لوگ آج بڑے کہلاتے ہیں، اُن کے معاملات کی تو بُری حالت ہے۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ریل میں سوار ہوئے۔ ایک قلی کے

سر پر اُن کا اسباب تھا۔ اسباب کو رکھوا کر اُنہوں نے قلی کو ایک گھسی ہوئی دوّنی دی۔ اُس نے کہا کہ حضور یہ تو خراب ہے۔ کہنے لگے کہ ہم کیا کریں۔ اُس نے کہا کہ بدل دیجئے۔ کہنے لگے ہم نہیں بدلتے۔ اُس نے کہا کہ صاحب میں کیا کروں گا۔ کہنے لگے کہ چلا دینا۔ اُس نے کہا کہ میں کیسے چلا دوں گا۔ تو کہتے ہیں کہ جیسے ہم نے چلا دی۔ بھائی تم نے تو اس لیے چلا دی کہ تم بڑے شخص ہو۔ اگر اس قلی کو بھی کوئی ایسا فیل مل جائے جس کی ذلّت کی نسبت اس کی عزّت کے ساتھ ایسی ہو جیسے اُس کی ذلّت کی نسبت تمہاری عزّت کے ساتھ، تو وہ بھی چلا سکے گا۔ مگر ایسا شخص اُس کو کہاں ملے گا۔ آخر وہ روتا ہوا واپس چلا گیا اور گاڑی چھوٹ گئی۔

ایسا افسوس ہوا کہ جب یہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر ہمدردی کے لیکچر دیتے ہیں اُس وقت اُن کی زبان کیسی چلتی ہے اور کس قدر زور ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہو کہ ان کے برابر دنیا بھر میں کوئی ہمدرد نہیں اور اعمال کی یہ حالت ہے ــــــ!

اسلام اور امن صاحبو! میں بہ قسم کہتا ہوں کہ مذہب کا پابند ہو کر تو ہمدردی کرنا ممکن ہے ورنہ ہرگز ممکن نہیں۔ نرے تمدّن سے کبھی کوئی ہمدرد نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بالکل واقعات سے ظاہر ہے۔ اس وقت لوگوں نے مذہب کو بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اگر مذہب کی پابندی ہو جائے تو ہرگز کبھی کسی سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچ سکتی اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے امنِ عام کی کتنی حفاظت کی ہے۔

میں ایک دوسری بڑی مثال تعلیم حفظ امن کی اسلام میں دکھلاتا ہوں۔
ابن ابی الدنیا نے روایت کیا ہے۔

لَا تَسُبُّوا الْمُلُوكَ فَاِنَّمَا قُلُوبُهُمْ بِيَدِي الْحَدِيث۔

یعنی اگر احکام سے تم کو تکلیف پہنچے تو اُن کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ اُن کے قلوب تو میرے اختیار میں ہیں۔

بلکہ مجھ سے اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرو۔ میں اُن کے قلوب کو نرم کردونگا اللہ اکبر! کس قدر امن پسندی ہے کہ حکام کو زبان سے بھی کچھ کہنے کی اجازت نہیں اگرچہ اُن سے بظاہر کچھ تکلیف ہی پہنچی ہو بلکہ یہ حکم ہے کہ میری اطاعت کرو۔ غرض معاملات کے متعلق یہاں تک تعلیم ہے مگر لوگوں کی معاملات میں دیکھ لیجیے کیا حالت ہے۔

اسلام میں معاملات و معاشرت

بعض نے معاملات کو بھی لیا لیکن معاشرت کو بگاڑ دیا حالانکہ شریعت نے معاشرت کا بھی اسی قدر انتظام کیا ہے جس قدر معاملات وغیرہ کا۔ وضاحت کے لئے میں معاشرت کی ایک جزئی بیان کرتا ہوں۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو اور اُن کے رہنے والوں

کو سلام نہ کرو۔ یہ بھی تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تم خیال رکھو۔

یہ مسئلہ استیذان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بغیر استیذان کے کسی کے گھر میں داخل نہ ہو۔ اور یہ آیت مجمل ہے۔ اس میں استیذان کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی کہ کب تک اجازت مانگا کریں۔ حدیث میں اس آیت کی شرح ہے کہ تین مرتبہ اجازت چاہو۔ اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ۔ چوتھی بار مت پوچھو کہ مخاطب تنگ ہوگا۔ اور یہ مردانہ اور زنانہ دونوں کے لئے ہے۔ لیکن مردانہ قطعات مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ان میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہاں آنے کی ہر شخص کو اجازت ہوتی ہے۔ جیسے حکام کی عدالتیں یا مجلس عام۔ وہاں استیذان کی ضرورت نہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں استیذان کی ضرورت ہے۔ بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ وہاں بیٹھنے کی غرض قرائن سے بھی معلوم ہوجاتی ہے کہ خلوت ہے اور علی العموم سب کو آنے کی اجازت نہیں۔ تو شریعت کا حکم ہے کہ اگر قرائن سے معلوم ہوجائے کہ اس وقت اس شخص کو خلوت مقصود ہے تو بغیر استیذان وہاں ہرگز نہ جاؤ پھر کیا کوئی صاحب اس پر عمل کرتے ہیں اور اگر کوئی کرتا ہے تو اس کو طعن کیا جاتا ہے نیز حکم ہے کہ اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ۔ آج یہ حالت ہے کہ ایک مرتبہ کوئی اجازت نہ دے پھر دیکھئے جو عمر بھر اس طرف رخ بھی کریں کیونکہ صاحب اگر وہ آزاد نہ ہوا تو طلب اجازت کیا ہوئی۔ یہ تو محض اطلاع ہوئی کہ ہم آگئے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ لیجئے۔ حکم ہے کہ جب نماز جمعہ سے فارغ ہوجاؤ اور کوئی دوسرا بھی جلسہ مثل وعظ وغیرہ کے نہ ہو تو منتشر ہوجاؤ اور کماؤ کھاؤ لیکن

دل بیار، دست بکار۔ خدا کو نہ بھولو۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جس کام کے لیئے جمع ہوئے تھے جب یہ کام ہو چکے تو منتفرق ہو جاؤ۔ کیونکہ بیکار اژدہام میں ممکن ہے کہ کوئی فساد کھڑا ہو جائے۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ اگر تین آدمیوں کا مجمع ہو تو ان میں سے دو کو یہ جائز نہیں کہ ایک کو تنہا چھوڑ کر کسی خفیہ مشورے میں لگ جائیں جب تک کہ تیسرا چلا نہ جائے یا کہ کوئی چوتھا نہ آ جائے کیونکہ اس کو ناگوار ہوگا۔ اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ مجھ کو غیر سمجھا اور مجھ سے پردہ رکھا۔ اور جب چوتھا آ جائیگا تو اس تیسرے کو اس لیئے رنج نہ ہوگا کہ اس کو احتمال ہوگا کہ شاید چوتھے سے مخفی کرنا راز کا مقصود ہے۔ اور چوتھے کو اس تیسرے پر یہی احتمال ہوگا۔ غرض حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر ہر چیز کے متعلق ایک نہایت مناسب قانون مقرر فرما دیا ہے۔ مگر افسوس ہے ہمارے بھائیوں نے ان قانونوں کو کبھی دیکھا بھی تو نہیں۔

بعض لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے معاشرت کو بھی کچھ کچھ لیا ہے، مگر اخلاق کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور ایسے لوگ بکثرت ہیں کہ جن کو اخلاق کے صحیح معنے بھی معلوم نہیں۔ تو سمجھ لیجئے کہ تہذیب اخلاق وہی چیز ہے جس کو تصوّف کہتے ہیں اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ ہم جس طرح اعمال ظاہرہ کے مکلّف ہیں اسی طرح اعمال باطنہ کے بھی مکلّف ہیں۔ ہم کو حکم ہے کہ تکبّر نہ کریں۔ ہم کو حکم ہے کہ خدا کی محبت پر کسی کی محبت غالب نہ کریں۔ ہم کو حکم ہے کہ دل میں بغض و کینہ نہ رکھیں۔ پھر بتلایئے کہ ہم نے اس کی کیا فکر کی ہے اور جو لوگ کچھ کر بھی رہے ہیں وہ حقیقت کو

چھوڑ کر رسم پرستی کر رہے ہیں۔ اصل حقیقت کی طرف کسی کو بھی توجہ نہیں ——— اِلّا ماشاء اللہ!

تو اسلام کامل یہ ہوا کہ عقائد بھی درست اور کتاب و سنت کے موافق ہوں اور اعمال یعنی دیانات و معاملات، گواہی، وکالت، تجارت، زراعت وغیرہ اور معاشرت مثلاً کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا اور اخلاق باطنہ صبر و شکر و اخلاص یہ سب کے سب موافق شریعت کے ہوں۔ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام اسلام کامل ہے۔ اگر ان میں سے ایک جزو بھی کم ہو، تو وہ اسلام ایسا ہے جیسا کوئی شخص حسین ہو لیکن اس کے ناک نہ ہو۔ اس تقریر سے آپ کو اسلام کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی۔

ہمارے امراض اور اُن کا علاج

اب غور کیجئے کہ ہم نے مسلم کہلانے کا استحقاق کس درجہ تک حاصل کیا ہے

واقعی ہماری وہ حالت ہے کہ ؎

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق
تحسیں کنند او خجل از زشت پائے خویش

مور کے نقش و نگار (یعنی خوبصورتی کی) مخلوق تحسین کرتی ہے اور وہ اپنے پاؤں کی خرابی سے شرمندہ ہے۔

اے مسلمانو! اگر تمہیں کسی نے مولوی کہہ دیا یا شاہ صاحب کہہ دیا یا ریفارمر کہہ دیا تو مغرور نہ ہو جانا کہ ہم بھی کچھ ہوں گے۔ صاحبو! خود بھی تو اپنی حالت کو دیکھو کہ ہم واقع میں کیا ہیں!

ہماری وہ حالت ہے جیسا ایک قصہ ہے کہ کسی شخص کے پاس ایک عیبی گھوڑا تھا۔ اُس نے ایک چابک سوار سے کہا کہ میرا گھوڑا بیچ دو۔ اُس نے بازار میں کھڑا کر کے بیچنے کے لیے خلاف واقع اس کی بہت کچھ تعریف کرنی شروع کی۔ مالک نے جو سُنا تو کہنے لگا کہ جب یہ ایسا ہے تو لاؤ مجھی کو دے دو۔ احمق نے چابک سوار کی حکایت کو تو سُنا اور اُس سے دھوکا ہوا۔ مگر یہ خبر نہ ہوئی کہ گھوڑا تو میرا ہی ہے۔ میں نے ہی پانچ برس تک خود اس کو رکھا ہے اور بیچ رہا ہوں۔

اسی طرح ہم کو اگر کوئی مولوی یا لیڈر کہتا ہے تو ہماری ہی تلبیس سے تو پھر اپنے مشاہدے کو غلط سمجھنا اور خوشامدیوں کی روایت کو صحیح سمجھنا عجیب بات ہے۔ ان خوشامدیوں کے باب میں اور ہمارے دھوکا کھانے کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکل ست آں خار جاں ‏ ‏ ‏ از فریب داخلاں و خارجاں
اینش گوید نے منم ہمراز تو ‏ ‏ ‏ آنش گوید نے منم انباز تو
او چو بیند خلق را سرمست خویش ‏ ‏ ‏ از تکبر مے رود از دست خویش

حالانکہ آدمی سے اپنی حالت مخفی نہیں رہ سکتی۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ ‏ ‏ ‏ بلکہ انسان خود اپنی حالت پر
بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ‏ ‏ ‏ خوب مطلع ہو گا گو اپنے حیلے
پیش لا دے۔

میری تقریر گو مختصر ہے مگر یہ ایک کافی میزان ہے ہم لوگوں کی حالت کی۔
اب میں مختصراً ان امراض کا علاج بیان کرتا ہوں۔ ہمارے ان امراض کے

دو سبب ہیں۔

ایک قلتِ علم ——————— دوسرے ضعفِ ہمت

یعنے بعض خرابیاں تو قلتِ علم سے پیدا ہوئی ہیں اور بعض خرابیاں باوجود جاننے کے قلتِ ہمت سے اور قلتِ ہمت قلتِ خشیت سے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً سردی کے وقت نماز کا قضا کر دینا اس کا سبب قلتِ خشیت اور قلتِ ہمت ہے۔ نفس کہتا ہے کہ اس وقت سردی میں تکلیف ہوگی۔ صبح کو قضا پڑھ لینا بھی تو ممکن ہے۔ تو ان اسباب کو دور کرنا چاہیئے۔ یعنی اوّل تو بقدرِ ضرورت علمِ دین پڑھنا چاہیئے۔ اگر اصطلاحی عالم بنے تو بہت ہی اچھا ہے۔

رہا دنیا داروں کا اس پر یہ شبہ کہ اصطلاحی عالم بن کر پھر یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟ یہ واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے۔ کیونکہ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ جو شخص کسی جماعت کی خدمت میں محبوس ہو اُس کا نفقہ اُس شخص کے ذمہ ہے۔ اور جب یہ بات ہے تو یہ کہنا کہ کہاں سے کھاؤ گے واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے۔ یہ سوال تو علماء کر سکتے تھے کہ یہ کہاں سے کھائیں گے مگر وہ تو خدا پر نظر کرکے بیٹھ رہے ہیں۔ اب یہ خود یاد دلاتے ہیں کہ ہم میں ایک عیب ہے کہ باوجود ہمارے ذمہ ہونے کے ہم خیال نہیں کرتے۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ قوم کے ذمہ ہے کہ ان لوگوں کے اخراجات کی متکفل ہو۔ مگر علماء کو یہ چاہیئے کہ وہ قوم پر ہرگز نظر نہ کریں بلکہ ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند | دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور ہر وقت اس کو پیشِ نظر رکھیں۔

وَلِلّٰہِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہیں خزانے آسمانوں اور زمین کے

اکبر بادشاہ کی حکایت مشہور ہے کہ یہ ایک مرتبہ شکار میں گئے اور ساتھیوں سے بچھڑ کر کہیں دُور نکل گئے۔ ایک دیہاتی نے اُن کو مہمان رکھا۔ اکبر اُس سے بہت خوش ہوئے اور کہا کہ دارالسلطنت میں آنا۔ چنانچہ وہ دہلی آیا۔ اکبر اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر دُعا مانگی۔ دیہاتی نے یہ حالت دیکھی جب دُعا سے فارغ ہوئے تو پوچھا کہ تم کیا کر رہے تھے؟ اکبر نے کہا کہ خدا تعالیٰ سے دُعا کر رہا تھا اور مراد مانگ رہا تھا۔ کہنے لگا کیا تم کو بھی مانگنے کی ضرورت ہوتی ہے؟ اکبر نے کہا کہ بے شک! کہنے لگا کہ پھر میں اسی سے کیوں نہ مانگوں جس سے تم کو بھی ضرورت مانگنے کی ہوتی ہے۔

اہل علم کو چاہیئے کہ اگر خدمت دین کریں تو نہ اس لئے کہ ہم کو نذرانہ ملیگا خدا کی قسم خدا کا نام دونوں عالم سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے خوب کہا ہے ؎

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

اپنی قیمت دو جہان بتلائی ہے نرخ بڑھایئے کیونکہ ابھی ارزاں ہے۔

غرض مولویت کے درجے تک اگر پہنچیں تو بہت ہی اچھا ہے لیکن اگر کوئی مولوی نہ بنے تو بقدر ضرورت علمِ دین ضرور حاصل کر لینا چاہیئے اور ضروریات یہ ہیں۔ عقائد ــــ دیانات ــــ معاملات ــــ معاشرت ــــ اخلاق ــــ اس کے بعد خواہ انگریزی پڑھو یا صنعت سیکھو جو چاہو کرو

نیز اگر کوئی ذی استعداد ہو، تو اُس کو علاوہ اجزائے مذکورہ کے وہ کتابیں بھی پڑھا دی جائیں جن میں ملحدین کے اعتراضات علی الاسلام والمسلمین کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ تو خواندہ لوگوں کی تحصیل علم کا طریقہ ہے۔

رہے بے پڑھے لوگ، اُن کی تعلیم کی یہ تدبیر ہے کہ کوئی عالم ہفتے میں ایک دو بار عام لوگوں کو کسی مسجد وغیرہ میں جمع کر کے احکام سنا دیا کرے اور سمجھا دیا کرے۔ اور عورتوں کی تعلیم یوں ہو سکتی ہے کہ اُن کے گھروں کے مرد روزانہ دینی رسائل اُن کو پڑھ پڑھ کر سُنا دیا کریں اور جو علماء سے سنیں وہ اُن کے کان میں ڈالتے رہیں۔ اور اگر کوئی محلے میں خواندہ عورت ہو کبھی کبھی اُس سے کتاب پڑھوا کر سُن لیا کریں۔ یہ وہ طریقہ ہے کہ اس سے عام اُمتِ محمدیہؐ عالم ہو سکتی ہے۔

رہا ضعفِ ہمت وقلتِ خشیت، اُس کا علاج یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے اس میں یہ سوچا کرو کہ ہم کو خدا تعالےٰ نے کیا کیا نعمتیں دی ہیں اور ہم نے کیا معاملہ خدا کے ساتھ کیا ہے۔ کچھ سوچو کہ حشر کا میدان ہوگا اور ہم خدا تعالےٰ کے سامنے ہوں گے اور ہم سے ان سب نعمتوں اور ہمارے معاصی کی نسبت سوال کیا جائے گا۔ پھر خدا تعالےٰ کے عذابوں کو یاد کرو اور اس وقت خدا تعالیٰ کے سامنے سجدے میں گر کر خوب گڑگڑا کر دعا کرو اور استغفار کرو۔ اگر اس کو نباہ کرو گے تو ایک ہفتے میں انشاء اللہ تعالیٰ عظیم الشان تغیر حالت میں ہوگا۔ اور اس سے ہر وقت جائز و ناجائز کی فکر ہوگی۔

ایک کام یہ کرو کہ اہل اللہ کی خدمت میں جایا کرو۔ لیکن کسی ایسے کے

پاس جاؤ جو کہ بقدر ضرورت عالم ہوں اور اگر ایسا میسر نہ ہو تو بزرگوں کی حکایات ونصائح دیکھا کرو۔ یہ علاج ہے قلتِ علم وضعفِ ہمت کا اور پھر اس حالت پر دوام رکھو جب۔ تم اس حالت پر دائم رہو گے تو

لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ — بجز اسلام کے کسی حالت پر جان مت دینا۔

پر پورا عمل ہو جائے گا۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ توفیق عمل دیں آمین یا رب العالمین۔

(ناظرین وعظ سے التماس ہے کہ جامع وعظ کے لئے بھی عین خاتمہ وحصول رضائے باری کی دعا فرمائیں اور تا قید حیات حصولِ استقامت کی۔)

تجارتِ آخرت

(از اشرف المواعظ حصہ سوم)

طاعاتِ بدنیہ و مالیہ کے متعلق یہ وعظ ۱۷ ربیع الاوّل ۱۳۳۰ھ کو جامع مسجد سہارنپور میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جس میں ۲۰۰ کے قریب طلباء اور قدیم وضع کے لوگ موجود تھے۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل
علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا
من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ
ونشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشہد
اَن سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ
وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم ۔ اما بعد فقد قال اللہ تعالیٰ
اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ
بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ ۔

ترقی کی حقیقت

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں خداوند تعالےٰ نے مجملاً اُن تمام وظائف ضروریہ کو جو بندے کے ذمہ ضروری ہیں بہت مختصر لفظوں میں ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہم لوگوں میں منجملہ بہت سی کوتاہیوں کے ایک کوتاہی وہ بھی ہے جس کی اصلاح کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگوں میں بہت سی کوتاہیاں ہیں۔ بہت سی باتوں میں اہل اسلام مرکز سے ہٹے ہوئے اور اپنی مخترعہ من سمجھوتیوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور اہل اسلام کی تخصیص قید احترازی نہیں یعنے یہ مطلب نہیں ہے کہ کوتاہیاں صرف اہل اسلام ہی میں ہیں دوسری قوموں میں نہیں۔ جیسا کہ بعض اہل مذاق جدید کا خیال ہے۔ اسی لئے وہ جس وقت اہل اسلام کی مذمت کرتے ہیں تو دوسری قوموں کی مدح کرتے ہیں کہ فلاں قوم میں فلاں صفت نہایت اچھی ہے مگر مسلمانوں میں نہیں اور اس میں بھی بعض تو وہ مدائح ہیں کہ وہ فی نفسہ مدح کے قابل ہیں۔ نیز اُن کے ذکر کرنے

سے مسلمانوں کو غیرت دلانا مقصود ہوتی ہے کہ جن لوگوں سے دین کا تعلق بھی نہیں اُن میں تو یہ مدائح موجود ہیں اور جن لوگوں میں بوجہ دین کے ہونا چاہیے، وہ بالکل معرّا ہیں۔ اس کا تو مضائقہ نہیں۔ قابلِ افسوس تو یہ امر ہے کہ یا تو غیر قوموں کی وہ صفات بیان کی جاتی ہیں جو واقعہ میں قابلِ مدح ہی نہیں ہیں۔ یا اگر قابلِ مدح ہیں تو اُن سے مقصود صرف مسلمانوں پر طعن اور اُن کا دل توڑنا اور عیب کھولنا ہوتا ہے۔ یہ امر مسلمانوں کے لئے سخت محلِ شکایت ہے۔

اگر واقعات کا مشاہدہ کیا جاوے تو اس کا ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ واقعی اکثر اہلِ اسلام کا یہ شیوہ ہو گیا ہے۔ ہر عاقل آدمی کو قرائن سے اُن کے لب و لہجہ سے اس نفرت سے جو کہ ایسے لوگوں کو مسلمانوں سے ہے ان سب کے مجموعہ سے اس کا اخذ کر لینا بعید نہیں کہ ان لوگوں کا مقصود محض اہانت ہوتی ہے مسلمانوں کی پھر لطف یہ کہ جن مدائح کی مسلمانوں سے نفی کی جاتی ہے، وہ واقع میں مدائح بھی نہیں یعنی شریعتِ مطہرہ کے نزدیک مطلوب نہیں ہیں اگرچہ دنیا میں کسی درجہ میں مطلوب ہوں۔ لیکن مسلمان من حیث المسلمان کے منہ سے اُن مدائح کا نکلنا بالکل ایسا ہے کہ جیسے کوئی شخص ہاتھی کی یہ تعریف کرنے لگے کہ وہ اس قدر قوی ہوتا ہے کہ اگر اس کو وزن کیا جاوے تو وہ پچاس من کا اُترے کہ یہ صفت اگرچہ واقعی صفت ہے لیکن اس کو تہذیبِ نفس اور قابلِ مدح ہونے میں کچھ دخل نہیں۔

بس اسی قسم کے وہ مدائح ہیں کہ جن کو آج کل مدائح سمجھا جاتا ہے اگرچہ اُن میں کسی درجہ میں منفعت ضرور ہے جیسے ہاتھی کے اس قدر وزنی ہونے میں

کیونکہ حکیم مطلق نے ہاتھی کو اتنا بڑا جثہ بلا وجہ نہیں عطا فرمایا۔ لیکن حکیم مطلق نے اس کو کمال قابل مدح نہیں ٹھہرایا۔

چنانچہ ان ہی مخترعہ مدائح میں ایک مدح ترقی کرنا بھی ہے کہ اس کو بہت بڑی مدح سمجھا جاتا ہے علیٰ ہذا خودداری وغیرہ۔ سو غور کرکے دیکھ لیجئے کہ شریعت نے اُن کو مدح کے قابل سمجھا ہے یا نہیں۔ ترقی نہایت خوبصورت لفظ ہے لیکن اس وقت اس کا ماحصل محض طول امل و حرص ہے جس کی شریعتِ مطہرہ نے جڑ کاٹ دی ہے۔ صحابہ کرام جو کہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے نمونے تھے۔ انہوں نے اس کو اپنے خیال میں کبھی جگہ نہیں دی۔ جناب رسول مقبولؐ نے کبھی اس کی تعلیم نہیں فرمائی۔ حضورؐ کی سیرت جس کا ایک ایک واقعہ احادیث میں مدوّن ہے اُس کو دیکھ جائیے، ابتداء سے انتہا تک کہیں بھی آپ کو یہ تعلیم نہ ملے گی۔ رہے تاریخی واقعات سو اُن کا یہ حکم ہے کہ اگر وہ حدیث سے مطابق ہوں تو قابل اخذ ہیں ورنہ ہیچ محض۔

حدیث و تاریخ میں تفاوت

کیونکہ مورخین میں یہ بڑا مرض ہے کہ وہ واقعات میں اپنی رائے کو دخل دیتے ہیں۔ پھر اس رائے کو بصورت واقعہ بیان کرتے ہیں۔ زمانہ حال کے بعض خود رو مصنفین پر افسوس ہے کہ وہ محدثین پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے واقعات میں اپنی رائے کو شامل کیا ہے۔ لیکن جو شخص محدثین کے حالات سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ محدثین علیہم الرحمۃ نے کس تدین سے کام لیا ہے البتہ یہ اعتراض مطابق واقع کے مورخین پر ضرور ہو سکتا ہے۔ صاحبو! محدثین کا تدین اس

سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ اگر ایک باب میں حدیث سے ایک بات کو ثابت کرتے ہیں تو اس کے بعد ہی دوسرا باب اس کا معارض صوری بیان کرتے ہیں اور اس میں بھی حدیث پیش کر دیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ان حضرات کا مقصود محض نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات کا جمع کرنا ہے نہ کہ اپنی رائے کو ثابت کرنا یا اس پر زور دینا۔ کیونکہ جب ایک حدیث کے ساتھ دوسری حدیث جو اس پہلی سے صورۃً معارض ہے موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اس محدث کی رائے کسی ایک جانب ہوگی۔ تو بصورت ایراد معارض کوئی خاص رائے کیونکر مقصود ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اپنی اغراض کی تائید مقصود نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود تمام احادیث کا لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے کہ دیکھیں اور خوب سمجھ لیں۔

ہاں تاریخ میں اس قسم کے واقعات پائے جاتے ہیں کہ ایک مؤرخ نے اپنے خیال کے مؤید واقعات کو لیا اور دوسرے نے اپنے خیال کے مؤیدات کو۔ پس جب حدیث و تاریخ میں یہ تفاوت ہے تو حدیث قابل وثوق ہوئی اور اس کے مقابل تاریخ قابل وثوق نہ ہوئی۔ تو جو واقعات تاریخ میں حدیث کے خلاف ہوں گے اور حدیث ان کو باطل کرتی ہوگی وہ محض ہیچ ہیں۔ ہرگز قابل قبول نہیں۔

اتحاد و انطباق

غرض حدیث کو دیکھئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ آپ کا طرزِ زندگی کیا تھا اور وہی طرزِ بیان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا۔ تو صحابہ کے ہاں طول امل اور طول حرص کا نشان نہیں تھا

اُن کی ترقی ترقیٔ دین تھی۔ اگرچہ اُس کے تابع ہو کر اُن حضرات کو دنیا کی بھی وہ ترقی حاصل ہوئی کہ آج لوگوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں لیکن مطمح نظر صرف ترقیٔ دین تھا۔ چنانچہ اُن حضرات کی اسی شان کو خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔

یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دے دیں تو یہ لوگ اُس وقت بھی نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اچھی باتوں کی ترغیب دیں اور بُری باتوں سے روکیں۔

یہ ہے اُن کے خیالات کا نقشہ جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اب ان کو یاد رکھئے اور پھر ان کے ساتھ اپنے خیالات کو دیکھئے اور انطباق کیجئے واللہ ایسا دشوار انطباق ہے جیسے خط مستقیم پر خط منحنی کو منطبق کرنے لگیں کہ جب تک اُس میں استقامت اور اس میں انحنا باقی رہے گا کبھی انطباق ممکن ہی نہیں تو ہمارے خیالات خط منحنی کی طرح ہیں اور ان حضرات کے خیالات کی مثال خط مستقیم ہے۔

بحمد اللہ! یہ مثال ایک خاص اعتبار سے بھی بہت ہی اچھی خیال میں آئی۔ کیونکہ خط منحنی کے انطباق علی المستقیم کی شان یہ ہوتی ہے کہ اُس کے بعض اجزا تو خط مستقیم پر سے گزرے ہوتے ہیں اور بعض اجزا اُس سے ہٹے ہوئے۔ یہی حالت اُن خیالات مخترعہ کی ہے کہ اُن میں اگر ایک قدم شریعت پر ہے، تو دوسرا اس سے بالکل الگ جس کا کسی تاویل سے بھی جادۂ شریعت پر انطباق نہیں

ہو سکتا پس ایسے حالات و خیالات کس طرح قابل مدح ہو سکتے ہیں۔

ہمدردانِ قوم کی حالت

غرض جن مدائح کی آج کل لوگ علی العموم مسلمانوں سے نفی کرتے ہیں وہ مدائح واقع میں اس مسلک میں داخل ہونے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے۔ اور اگر بعض باتیں واقع میں قابل مدح ہوں بھی جیسے ہمدردی و ایثار وغیرہ تب بھی اُن کے نفی کرنے سے مقصود محض مسلمانوں کی تذلیل ہوتی ہے دلسوزی یا ہمدردی ہرگز مقصود نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر ہمدردی ہوتی تو دوسری باتوں میں بھی تو اُن کے ساتھ ہمدردی ہوتی۔ حالانکہ میں اس وقت ان ہی طاعنین میں بہت سے لوگ دیکھتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اختلاط کو بھی گوارا نہیں کرتے۔ مسلمانوں کا سلام بھی اُن کو پسند نہیں۔ اور جب یہ حالت ہے تو کسی طرح بھی کہا نہیں جا سکتا کہ اُن کو مسلمانوں سے ہمدردی ہے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو مان بھی لیا جاوے تب بھی اس خاص سبب سے جو مذکور ہوا ہرگز ممکن نہیں کہ ان کی ذات سے عام مسلمانوں کو کسی قسم کی بہبودی یا نفع پہنچ سکے۔

بدیہی بات ہے کہ طبیب اس وقت مریض کو نفع پہنچا سکتا ہے کہ جب مریض کے پاس آوے نبض دیکھے، قارورہ دیکھے، تسلی دلجوئی کرے اور اگر ایسا نہ کرے بلکہ دُور ہی سے محض صورت دیکھ کر اُلٹا سیدھا نسخہ تجویز کر دے تو کوئی عقلمند باور نہ کرے گا کہ یہ طبیب اس مریض کو اُس کے مرض سے نجات پانے کا سبب بن سکتا ہے اور وہ مریض اس کے علاج سے تندرست ہو سکتا ہے۔

دیکھ لیجئے طاعون کے زمانہ میں جو طبیب مریضوں سے دُور رہتے ہیں، اُن

کی ذات سے کیا کسی مریض کو فائدہ پہنچتا ہے؟ کسی ایک کو بھی نہیں! ہاں اس طبیب سے ضرور فائدہ پہنچتا ہے جو مریض کے مرض کو اپنا مرض سمجھ کر اُس کے ساتھ بالکل گھل مل جاوے۔

مجھ سے ایک طبیب نے بیان کیا کہ ایک زمانہ میں جب اُن کے قصبہ میں مرض طاعون پھیلا تو ۷۳ مریض اُن کے زیرِ علاج رہے جن میں سے ۶۳ تندرست ہوگئے اور دس مریض انتقال کر گئے۔ کہتے تھے کہ ان ۶۳ میں ایک مریض ایسا بھی تھا کہ جب اُس کی نبض کو میں نے دیکھا ہے تو شدتِ حرارت کی وجہ سے میری انگلی پر چھالا پڑ گیا لیکن پھر بھی اس کی تدابیر میں مصروف رہے۔

غرض جو طبیب مریض سے نفرت کرے گا وہ مریض کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا آج دیکھ لیجیے کہ اُن مدعیانِ طبابتِ اخلاق کا کیا برتاؤ قوم اور اُس کے ساتھ ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اپنے ساتھ بھی اُن کو ہمدردی نہیں اور اپنے امراض کے علاج پر بھی توجہ نہیں اور یہی سبب ہے قوم سے ہمدردی نہ کرنے کا۔ کیونکہ طبعاً اپنا خیرخواہ انسان زیادہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کی جو خیرخواہی کرتا ہے اس میں اپنی خیرخواہی مضمر ہوتی ہے۔ پس جو شخص اپنا ہمدرد نہ ہوگا وہ دوسروں کا کیسے ہمدرد ہوگا۔ یہ لوگ اوّل اپنی تو اصلاح کریں پھر دوسروں کی اصلاح حقیقی کی فکر کریں۔ آج یہ حالت ہے کہ اظہارِ ہمدردیٔ اسلام میں بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں، انجمنیں قائم ہوتی ہیں مگر نہ نماز کی فکر ہے نہ روزے کا خیال ہے۔ مال کی اتنی افراط ہے کہ دس آدمیوں کو اور بھی ساتھ لے جا سکیں لیکن محبتِ اسلام کا یہ عالم ہے کہ خود بھی حج کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ وضع کو دیکھئے تو سر سے پاؤں

تک بالکل اسلام کے خلاف گفتگو دیکھئے تو وہ مذہب سے بالکل جدا۔ تو جب ان کو اپنے امراض کے ازالہ کی فکر نہیں تو پھر دوسروں کے امراض کے ساتھ اُن کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

بات یہ ہے کہ ہر زمانہ کی ایک رسم ہوتی ہے اہل زمانہ اُسی پر چلنے لگتے ہیں۔ آج کل یہ رسم ہے کہ ہر مشہور یا غیر مشہور تحصیل شہرت یا تکمیل شہرت کی کوشش کرتا ہے۔ اور اُس کے ذرائع بہم پہنچاتا ہے۔ منجملہ ان ذرائع کے ایک یہ بھی ہے کہ انجمنیں قائم کی جائیں۔ اور جلسے کئے جائیں۔ کوئی ان انجمنوں کا گورنر ہو جائے کوئی سیکریٹری، کوئی کچھ اور کوئی کچھ اور اس سے عام و خاص کا اُن کو ایک امتیاز ہو جائے۔ پھر رسم بھی اگر شریعت پر منطبق ہوتی تو بھی نفع سے خالی نہ ہوتی کیونکہ وہ اس انطباق کی برکت سے ایک دن مبدل بہ حقیقت ہو سکتی تھی اور جب ظاہری انطباق علی الشریعۃ بھی نہ ہو تو سراسر مضر اور سم قاتل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حکماء اُمت نے عوام الناس سے صرف اسی قدر تعلق کو کافی سمجھا ہے کہ وہ اپنی صورت ظاہری کو شریعت کے موافق بنالیں اور صورت عبادت کے پابند ہو جاویں۔ کیونکہ وہ حضرات جانتے ہیں کہ یہ صورت ہی انشاءاللہ ایک دن مبدل بحقیقت ہو جائے گی۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ اگر عبادت میں ریا بھی ہو تو اُس کو کئے جاؤ کیونکہ ریا ہمیشہ ریا نہیں رہتا۔ چندروز میں عادت ہو جاتی ہے پھر عادت سے عبادت ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ذریعہ تقرب بن جاتی ہے۔ اس کو مولانا روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

از صفت وز نام چہ زاید خیال　　　واں خیالت ہست دلالِ وصال

یعنی اسم سے خیال پیدا ہوتا ہے پھر وہ خیال ہی رہبر ہو جاتا ہے وصال کی طرف۔ مگر یہ اسی وقت ہے جب کہ صورت شریعت پر منطبق ہوتی۔ تو اس کے مبدل بحقیقت ہو جانے کی امید تھی مگر انطباق ہوتا کیوں کر۔ اس لئے کہ انطباق کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ شریعت کی وقعت دل میں ہو اور یہاں وہی نادارد ہے۔

آج کل کے عقلاء شریعت مطہرہ کو مولویوں کے خیالات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور اُن پر اعتراض کرتے ہیں لیکن ہم کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو ان لوگوں نے اعتراض سے بچا لیا اگرچہ واقع میں اثر اس قول کا آپ ہی پر ہوگا لیکن تاہم مورد عتاب تو صرف مولویوں کو بنایا۔ ہم اس کے بھی شکر گزار ہیں۔ مگر اُن معترضین کو یہ ضرور سمجھ لینا چاہیئے کہ درحقیقت ان کے اعتراضات کا اثر حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی پر پڑتا ہے کیونکہ ضرب الغلام اہانۃ المولیٰ یعنی اگر کوئی شخص کسی کے غلام کو مارے۔ اگرچہ اُس نے بظاہر آقا کو کچھ نہیں کہا مگر واقع میں یہ آقا کی بھی اہانت ہو گئی۔ کیونکہ آقا اور غلام میں اس قدر تغائر نہیں ہے جس قدر یہ شخص سمجھ رہا ہے بلکہ اس میں ایسا تغائر ہے جیسا کہ احول کے مرئیات میں ہوتا ہے۔

مشہور ہے کہ کسی اُستاد نے اپنے شاگرد کو کہا کہ فلاں طاق میں ایک بوتل رکھی ہے وہ اٹھا کر لے آؤ۔ شاگرد چونکہ احول تھا وہاں جو پہنچا تو ایک بوتل کی دو نظر آئیں۔ اُستاد سے کہنے لگا کہ یہاں دو بوتلیں رکھی ہیں اُن میں سے کون

سی لاؤں؟ اُستاد نے کہا کہ دو نہیں بلکہ ایک ہی ہے۔ کہنے لگا کہ میں خود مشاہدہ کر رہا ہوں آپ میرے اس مشاہدہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اُس پر اُستاد نے غضب ناک ہو کر کہا کہ ایک بوتل توڑ دو اور دوسری میرے پاس لاؤ۔ شاگرد نے ایک بوتل کو توڑا تو وہ دونوں ٹوٹ گئیں۔ کہنے لگا کہ اب تو یہاں ایک بھی نہیں رہی۔ مولانا نے اس قصہ کو کلام مجید کی اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ — ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

تو ایک کی تکذیب کرنے سے سب رسولوں کی تکذیب ہوتی ہے اور اس سے خدا تعالےٰ کی تکذیب بھی ہو جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نائب کی تکذیب منیب کی تکذیب ہو جاتی ہے۔ لہذا علماء کی تکذیب سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب ہو گی اور اس سے خدائے تعالےٰ کی تکذیب ہو گی مگر لوگ اس پر بالکل نظر نہیں کرتے بلکہ بے دھڑک علماء پر اعتراض کر دیتے ہیں۔

ایثار اور فرعون

خلاصہ یہ ہے کہ آج کل کے جلسے اور انجمنیں بالکل رسم بلا معنی ہیں اور صورت بھی ٹھیک نہیں اور لوگوں نے اُن کو محض رسم سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ نفع پہنچانا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ جب اپنا ہی دین برباد کر رہے ہیں تو دوسروں کو دینی نفع پہنچانے کا کب قصد کر سکتے ہیں اور اگر کہئے کہ یہ ایثار ہے کہ اپنے دین سے دوسروں کے دین کو مقدم کر رکھا ہے اس لئے باوجود اپنے دین کے قائم نہ کرنے کے دوسروں کے دین کی درستی کرتے ہیں تو سمجھو کہ ایثار کی اجازت دنیاوی منافع میں ہے دینی منافع میں نہیں یعنی

اگر ہمارا کوئی دنیاوی نفع فوت ہو کر دوسرے کا نفع ہو جاوے تو اُس کو ایثار کہیں گے اور اگر ہمارا دین تباہ ہو کر دوسروں کو نفع پہنچے تو یہ ایثار نہیں کہلائے گا۔ ورنہ اگر دین کو تباہ کر کے بھی ایثار ہوتا تو باغی سب سے زیادہ صاحب ایثار ہونے چاہئیں اور اُن کو سب سے زیادہ خیر خواہ سرکار کہنا چاہئے کیونکہ ان میں اتنی بڑی ہمدردی و ایثار ہے کہ انہوں نے اپنی جان بھی دے دی اور تمام منافع جو اطاعت سے اُن کو پہنچتے وہ دوسری رعایا کے لئے چھوڑ دیئے۔

صاحبو! یہ وہی ایثار ہے جو فرعون میں تھا۔ دین چھوڑ کر دنیا پر قناعت کی اس کی ایک حکایت ہے کہ مصر کی زراعت کا مدار رُودِ نیل کے جوش پر تھا۔ ایک سال اس کو جوش نہیں ہوا۔ لوگ فرعون کے پاس آئے اور کہا تو مدعی الوہیت ہے۔ ہم لوگ قحط میں مرے جاتے ہیں۔ یہ تیری الوہیت کب کام آئے گی۔ اس نے کہا کہ کل رُودِ نیل کو جوش ہو گا۔ رات کو دُعا کی کہ اے اللہ! اگرچہ میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ میری کوئی معروض قبول ہو لیکن میری ہمت تو دیکھئے کہ میں نے آپ کو چھوڑا، جنت کو چھوڑا، ابدالاباد کے عذاب کو گوارا کیا۔ ان سب کے بدلے صرف ایک التجا کرتا ہوں کہ میری ایک دُعا قبول فرما لیجئے کہ جب میں رُودِ نیل کو حکم دوں تو اس کو جوش ہو جاوے۔ چنانچہ اُس کی یہ دُعا قبول ہو گئی۔ اور ایسا ہی ہو گیا۔

اس دُعا کی قبولیت سے کوئی اپنے دل میں یہ شبہ نہ کرے کہ اس کافر ملعون کی دُعا کیوں کر قبول ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ سب کی سنتے ہیں حتیٰ کہ شیطان ہو کہ سب سے زیادہ ملعون ہے اُس کی درخواست بھی قبول ہو

گئی اور پھر درخواست بھی خاص عتاب کے وقت کی۔ علی الصوم اُس وقت کی درخواست پوری نہیں ہوتی اور درخواست بھی ایسی عجیب، جو آج تک کسی نے نہ کی تھی اور نہ ظاہراً منظوری کے قابل تھی کہ

اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ — مجھ کو مہلت دیجیے قیامت کے دن تک

گویا خداوند تعالیٰ کی طرف سے تو یہ عتاب کہ

اِنَّ عَلَیۡکَ لَعۡنَتِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ۔ — بے شک تجھ پر لعنت رہیگی قیامت کے دن تک

اور شیطان کی طرف سے یہ درخواست کہ رب انظرنی الی یوم یبعثون تو جب اُس کی ایک ایسی عجیب درخواست ایسے عجیب وقت میں قبول ہو گئی تو فرعون کی درخواست قبول ہونے میں کیا استبعاد ہو سکتا ہے۔

شیطان کے اس واقعہ سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

اوّل تو اُس کی بے حیائی کہ جوتیاں سر پر پڑ رہی ہیں اور اُس کو درخواست کرنے کی سوجھ رہی ہے۔

دوسرا اس کا وثوق کہ باوجود اس حالت کے بھی اس کو پورا یقین تھا کہ ضرور درخواست قبول ہو گی۔

تیسرے خدائے تعالیٰ کا فضل و کرم کہ درخواست کے ساتھ ہی اِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ۔ ارشاد ہوا

جب دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ ہے تو دوستوں کو کب محروم کیا جا سکتا

ہے ؂

دوستاں را کجا کنی محروم　　　تو کہ با دشمناں نظر داری

یہ قصہ مسلمانوں کے لئے بڑی خوشی کا ہے کہ جب اُس بارگاہ میں دشمن کی دُعا قبول ہوئی تو ہماری دُعا کیوں قبول نہ ہوگی۔ مگر یہ ضرور ہے کہ شیطان کے برابر اڑیل ہو جاویں۔ غرض جیسی فرعون کی ہمت تھی ویسی آج کل کے ایثار والوں کی ہمت بھی ہے اور اگر فرعون کی وہ ہمت ہمت کہنے کے قابل نہیں تو ہمارا یہ ایثار بھی ایثار نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جو اپنا خیر خواہ نہیں وہ دوسروں کا بھی خیر خواہ نہیں ہے۔ تو ہم جو کچھ کر رہے ہیں محض رسم کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ ہیں وہ صفات جن کو مدائح قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا مسلمانوں سے نفی کرنا اور دوسری قوموں میں مدائح کے شمار میں ثابت کرنا کہاں تک قابل قدر ہو سکتا ہے۔ ہم لوگوں کی زبان پر وہ الفاظ ہیں جو کہ حبد بلا درجہ ہیں کہ رات دن اُن کو دہرایا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہو کہ اُن کے برابر کوئی دلسوز ہی نہیں۔ لیکن جیسے حدیث میں آیا ہے

لَا یُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ۔　　　اُن کے گلے سے آگے نہیں گذرتی ــــــ

قلب پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ اور جب خود متکلم کے قلب پر اثر نہیں تو سامعین کے قلب پر کیا خاک اثر ہو سکتا ہے۔ غرض مسلمانوں کی کوتاہیوں کا بیان جو اس اندازِ تحقیر پر ہو وہ بے شک مذموم ہے۔ اس سے تو احتراز واجب ہے لیکن اگر براہ شفقت ہو تو ضروری ہے اور اسی شفقت کی راہ سے خاص مسلمانوں

کی شکایت ان کوتاہیوں کے متعلق بھی مضائقہ نہیں پس میرا تخصیص کے ساتھ کہنا کہ مسلمانوں میں کوتاہیاں ہیں بطور قید احترازی کے نہیں بلکہ تخصیص کی نظر سے ہے کہ ہمارا خطاب اس وقت خاص مسلمانوں سے ہے اور اس موقع پر انہی کی اصلاح مہتم بالشان ہے۔ اس مضمون کو اس قدر تفصیل سے بیان کرنے کا قصد نہ تھا اتفاقاً اس میں تفصیل ہو گئی جو انشاء اللہ مفید ہو گی۔

سامانِ تدبیر اب اس کوتاہی کو جو یہاں مقصود بالذکر ہے عرض کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ منجملہ ان موجودہ کوتاہیوں کے ایک کوتاہی یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں نے دین کے اجزا کو متفرق کر دیا یعنے دین میں انتخاب کر لیا ہے۔ جیسے کوئی چیز تقسیم ہوا کرتی ہے۔ مثلاً انعام کہ گھڑی رومال وغیرہ میں ایک نے گھڑی لے لی۔ دوسرے نے رومال، تیسرے نے کچھ اور، چوتھے نے کچھ اور اسی طرح ہمارے بھائیوں نے اس وقت مذہب میں عمل کیا ہے کہ ایک نے دین کے ایک جزو کو لے لیا۔ دوسرے نے دوسرے جزو کو۔ اسی کو قرآن میں فرمایا گیا ہے

جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ۔ جنہوں نے آسمانی کتاب کے مختلف اجزا کر رکھے تھے۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے۔

اس تفریق کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ایک منجملہ اُن کے یہ ہے کہ کچھ حصّہ پر ایمان لایا جاوے اور کچھ حصّے سے انکار کیا جاوے۔ مسلمان اس سے تو بری ہیں ایک یہ ہے کہ بعض کو چھوڑ دیا جاوے۔ اس کی بہت صورتیں ہیں۔ ایک کو اس وقت بیان کیا جاتا ہے کہ بعض نے تو صرف اعمال بدنیہ کو دین سمجھا اور اعمال مالیہ کو دین سے خارج سمجھا اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہ دیندار کہلاتے ہیں کہ اُنہوں نے دین کا مدار زیادہ تر اعمال بدنیہ کو سمجھا۔ بعض نے فقط اعمال مالیہ کو اختیار کر کے دوسرے اجزا کو خیر باد کہہ دیا۔ چنانچہ اس وقت دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں۔ بعض رؤساء کہ اُن کو مشقت اٹھانا دشوار ہے اُنہوں نے تو یہ تجویز کر لیا کہ چاہو روپیہ کسی رفاہ عام کے کام میں دے دو۔ بس کافی ہے اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ نفع متعدی نفع لازمی سے زیادہ انفع ہے۔ صاحبو! یہ بالکل وہی بات ہے کہ

كَلِمَةُ حَقٍّ اُرِيْدَ بِهِ الْبَاطِلُ	سچی بات سے باطل مفہوم سمجھ لینا۔

کیا اعمال مالیہ پر کاربند ہو کر اعمال بدنیہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ ان کا وجوب ساقط ہو جاوے گا۔ ذرا قرآن کو دیکھئے کہ جہاں اٰتُوا الزَّكٰوةَ ہے وہیں اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ بھی موجود ہے۔ قرآن میں تامل کرنے کے بعد کسی کو ذرا بھی گنجائش اس کی نہیں مل سکتی ہے۔

رہا یہ شبہ کہ اگر قرآن میں کسی کو یہ گنجائش نہیں ملتی تو یہ بہتر فرقے کیوں کر پیدا ہو گئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب گنجائش قبل غور ہے۔ جب تک غور نہ کیا جاوے اسی وقت تک قرآن کی حالت مرد سخی کی سی ہے کہ معتزلہ اس

سے اپنے توہمات کو ثابت کر رہے ہیں اور قدریہ اپنے توہمات کو، مجسمہ اپنے دعوے پر دلیل پیش کرتے ہیں، معطلہ اپنے دعوے پر۔ لیکن غور کرنے کے بعد سوائے مذہب حق کے کسی ایک کے مذہب کی بھی گنجائش کلام مجید میں نہیں رہتی ارشاد ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔

کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے۔

معلوم ہوا کہ یہ بات تدبر کے بعد نظر آتی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں۔ تو جو کچھ اختلاف ہے وہ بوجہ غور نہ کرنے کے ہے اور تدبر بھی اس شخص کا معتبر ہوگا جس کے پاس سامانِ تدبر بھی ہو ہر کس و ناکس کا تدبر معتبر نہیں۔

آج کل کے عقلا کا تدبر ایسا ہی ہوگا جیسا کہ ایک شخص نے گلستان کے اس شعر میں تدبر کیا تھا ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

کہ ایک مرتبہ ان کے ایک دوست کہیں پٹنے لگے اور خود بھی کچھ ہاتھ چلا رہے تھے۔ انہوں نے وہاں جا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پہلے سے بھی زیادہ پٹائی ہوئی۔ کسی نے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو کہا کہ میں نے شیخ سعدیؒ کے اس قول پر عمل کیا ہے ؎ دوست آں باشد

۔۔۔۔ الخ جیسا اُس نے گلستاں کو سمجھا تھا ویسا ہی ہمارے بھائی بھی قرآن میں تدبر کرنے والے موجود ہیں۔ خدا اُن کو سلامت رکھے مگر باطنی سلامتی کے سائے کے ساتھ۔

ایک صاحب پنجاب میں مجھ سے ملے۔ کہنے لگے کہ تحقیقات جدیدہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تخم میں ایک نر اور ایک مادہ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں، خیر یہی ہو لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ قرآن میں بھی یہ مسئلہ موجود ہو مگر وہ کہنے لگے کہ میں نے سوچا کہ قرآن میں بھی کہیں اس کا ذکر ہے یا نہیں۔ کئی مہینے تک سوچتا رہا، لیکن کہیں نہ ملا۔

سبحان اللہ! صاحبو قرآن میں اس مسئلہ کو ڈھونڈنا ایسا ہے، جیسا کوئی طب اکبر میں جوتا بنانے کی ترکیب ڈھونڈنے لگے۔ کیوں صاحبو! اگر کوئی ایسا کرنے لگے تو عقلاء وقت اُس کی نسبت کیا فتویٰ دیں گے۔ وہی فتویٰ اُس کی نسبت بھی دینا چاہیئے۔

غرض کہنے لگے کہ مدت کے بعد ایک روز اتفاق سے میری بیوی قرآن پڑھ رہی تھی۔ جب اُس نے یہ آیت پڑھی۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ — وہ ذات پاک ہے جس نے

كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ — تمام متقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات

کے قبیل سے بھی۔

تو بہت خوش ہوا کہ قرآن میں یہ مسئلہ صراحۃً موجود ہے۔ تو وہ بزرگ ازواج کے معنی خاص میاں بیوی اور نر و مادہ کے سمجھے۔ حالانکہ ازواج کے لغوی معنی جوڑ کے

کیے ہیں۔ خواہ کسی چیز کا جوڑا ہو۔ حتیٰ کہ زوجی الخف و النعل بھی کہتے ہیں۔ زوج کے معنی وہی ہیں جس کو فارسی میں جفت اور اردو میں جوڑا کہتے ہیں۔ بیوی کو بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی باہم جوڑا ہوتے ہیں یہ نہیں کہ ہر جگہ میاں بیوی ہی کے معنی ہوں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری جفت پاپوش اٹھا لاؤ یا یہ کہے کہ میرے جوتے کا جوڑا اٹھا لاؤ تو کیا اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ میرے جوتے کی میاں بیوی اٹھا لاؤ۔ پس معنی آیت کے تو یہ ہیں کہ ہم نے نباتات میں بھی جوڑے پیدا کیے ہیں کہ اگر ایک انار کھٹا ہے تو دوسرا میٹھا ہے علیٰ ہذا۔ لیکن اُن مجتہد صاحب نے ان ازواج کا ترجمہ زن و شوہر کیا اور قرآن میں اپنے نزدیک اس مسئلہ کو بھی داخل کر دیا۔

تو اگر ایسے لوگ قرآن میں تدبر کریں گے تو قرآن کی جو گت ہو گی ظاہر ہے اور اس قسم کے تدبر کرنے والے اس سے پہلے بھی ہوتے آئے ہیں۔ میرے ایک استاد بیان کرتے تھے کہ اُن کے پاس ایک درزی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے اوّل یہ پڑھا۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ
وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ
میں ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور اُس کے فرشتوں پر اور اُس کے
پیغمبروں پر اور قیامت کے دن پر اچھی اور بری اللہ کی طرف
سے آتی ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا۔

پھر ایک آہ سرد کھینچی اور کہنے لگا کہ مولوی صاحب بادلوں کی بھی موت ہے

یہ گت بعد الموت کی بنائی کہ عین کی جگہ الف پڑھ کر اُس کی یوں تعلیل کی کہ باول موت بہت لوگوں نے قرآن کی تفسیریں لکھنی شروع کر دیں لیکن وہ تفاسیر اسی قسم کی ہیں وجہ یہ کہ اُن کے پاس سامانِ تدبر یعنی علم و تقویٰ نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ تدبر بھی ضروری ہے جس کو اس آیت میں فرمایا۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے

اور پھر تدبر کے لئے سامانِ تدبر بھی ضروری ہے جیسا کہ ظاہر ہے

پس اس آیت سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ قرآن میں غور کرنے کے بعد اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی اور جہاں بالکل صریح دلالت ہو وہاں تو تدبر کی بھی ضرورت نہیں۔ چنانچہ عباداتِ بدنیہ و مالیہ کی تفریق کی غلطی پر اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ صاف دال ہے کہ جہاں آتوا الزکوٰۃ کا حکم ہے وہاں اقیموا الصلوٰۃ بھی ہے۔ یہ تو دنیادار افراد کی حالت کا بیان تھا۔

قابلِ اصلاح رسوم

دوسرے وہ لوگ ہیں جن پر دینداری کا بہت ہی غلبہ ہے۔ اُنہوں نے اپنے مذاق کے موافق ایک اور مسلک اختیار کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دینداری جو کچھ ہے وہ جان سے کام لینے میں ہے۔ ان لوگوں نے طاعاتِ مالیہ کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ میں اپنے ہی کو کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص میری سوانح عمری لکھنے لگے تو اس کا آسانی سے پتہ بھی نہ لگے گا کہ فلاں جگہ دس روپے دیئے۔ اس طرح ہم میں اکثر کی یہ حالت ہوتی ہے غرض اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگوں نے دین کے اجزا کو تقسیم کر رکھا ہے کہ ایک جزو کو ایک نے اختیار کر لیا اور دوسرے کو دوسروں نے

یہ ایک کلی کوتاہی ہے۔ پھر اس کے تحت میں اور بہت سی جزئیات داخل ہیں۔ یعنی پھر خود عباداتِ بدنیہ میں بھی ایک تفریق کی ہے۔ مثلاً کسی نے وظیفہ کو لے لیا۔ کسی نے صرف قرآن کو لے لیا۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں اپنے مرشد کی تعلیم پر اس شدّت سے پابند ہوں کہ نماز چاہے قضا ہو جائے لیکن مرشد کی تعلیم قضا نہیں ہوتی؛

اسی طرح اموال میں تفریق کی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ جب مرنے لگتے ہیں تو چونکہ کوئی اولاد نہیں ہوتی اس لئے وہ مسجد بنانا تجویز کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ نمازیوں کی تعداد سے مسجدوں کی تعداد زیادہ ہے۔ قصبہ آنولہ کی نسبت سُنا ہے کہ وہاں بے حد مسجدیں ہیں اور غضب یہ ہے کہ باوجود اس کثرت کے اب بھی اگر کسی کو اس طرف توجہ ہوگی تو اپنی مسجد الگ ہی بنانے کی سوجھے گی۔ اور مزہ یہ کہ نئی مسجد شروع کرکے پُرانی کے سامان لینے پر نگاہ دوڑتی ہے کیونکہ چندہ تو اس قدر ہو نہیں سکتا۔ کام ادھڑ میں رہ جاتا ہے۔ اور اس وقت مولویوں سے اجازت لینے کی فکر کرتے ہیں کہ حضرت پُرانی مسجد بالکل ویران ہے، آباد ہونے کی امید نہیں۔ کیا اس کا ملبہ نئی مسجد میں خرچ کرلیں۔

میں نے اپنے قصبے میں دیکھا ہے کہ لوگوں نے ایک پُرانی مسجد کو چھوڑ کر دس پندرہ قدم کے فاصلہ پر ایک نئی مسجد بنائی۔ اب چند روز سے لوگ اُس پُرانی کی درستی پر بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یا ایک پھر ویران ہوگی یا دونوں کی جماعتیں ٹوٹیں گی۔

کانپور میں ایک شخص نے مسجد بنائی۔ دوسرے برادری کے بھائی نے اُس کے مقابلہ پر ایک دوسری مسجد تیار کی۔ جب دونوں بن کر تیار ہوئیں تو نمازیوں کی فکر ہوئی۔ آخر یہ تجویز کیا گیا کہ نماز کے بعد شیرینی تقسیم کی جایا کرے تاکہ نمازی بڑھیں۔

وجہ اس کی یہی ہے کہ اس قسم کے لوگ مسجد بنانا زیادہ ثواب سمجھتے ہیں کہ مسجد کے کام میں روپیہ صرف ہونے میں زیادہ ثواب ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک شخص تیل لایا اور اُس سے پوچھا گیا کہ اس کو طالب علموں میں صرف کر دیا جائے یا مسجد میں؟ تو وہ مسجد ہی تجویز کرتا ہے۔ بلکہ اکثر عوام الناس کا یہ خیال ہے کہ مسجد میں تیل جلنے سے قبر میں روشنی ہوتی ہے۔ اسی بناء پر اگر کوئی مر جائے اور اُس کو ثواب پہنچانا ہو تو کھانا مسجد ہی میں بھیجتے ہیں۔ دوسری جگہ دینے کو ویسا ثواب نہیں سمجھتے۔

اُس میں ایک اور قید تراشی ہے کہ وہ کھانا بھی رات کے وقت بھیجا جاوے شاید یہ سمجھتے ہوں کہ دن کو تو آفتاب نکلا ہے اس کی کم و بیش روشنی تو ضرور قبر میں پہنچے گی۔ برخلاف رات کے کہ اُس میں بالکل تاریکی ہوتی ہے۔ اس لئے اس وقت، اس طعام اور چراغ کے ذریعہ سے روشنی پہنچے گی۔ اور دن کو بھیجنا رات کے وقت نافع ہونے کی توقع پر شاید اس لئے پسند نہیں کرتے ہوں گے کہ خدا جانے وہاں کا انتظام کافی ہوگا یا نہیں تو ایسے وقت پہنچاؤ کہ فوراً ہی پہنچے ایسا نہ ہو کہ کارکنانِ قضا و قدر کہیں رکھ کر بھول جائیں اور مردہ ساری رات تاریکی میں رہے۔

اسی کے قریب قریب گڑ دینے کی رسم ہے۔ یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ سکراتِ موت کی تلخی اس سے دُور ہو گی۔ صاحبو! اگر تو وہاں پہنچتا نہیں اور یہ کہیں ثابت نہیں کہ میٹھی چیز کا ثواب بھی میٹھا ہوتا ہے۔

غرض اس قسم کی بہت سی خرافات لوگوں میں ہیں اور اُن سب کے لئے مسجد ہی کو تجویز کیا ہے کیونکہ ان کے اعتقاد میں مسجد میں بھیجنے سے زیادہ ثواب ہوتا ہے اور مسجد میں بھی زیادہ تر ثواب خاص منبر پر رکھنے سے سمجھا جاتا ہے مگر وہ بھی اس وقت کہ جب اس پر نیاز بھی دی جائے ورنہ اُن کے خیال میں اتنا مال ضائع ہی گیا۔

کانپور میں ایک مرتبہ چند عورتیں کچھ مٹھائی لے کر عشاء کے بعد جامع مسجد میں آئیں۔ وہاں ہی مدرسہ کے طلبا رہتے تھے۔ میں اُس وقت مکان پر جا چکا تھا صرف طلبا مسجد میں موجود تھے۔ طالب علموں کا فرقہ آزاد ہوتا ہی ہے۔ وہ اُن سے مٹھائی لے کر نیاز دیئے بغیر ہی سب کھا گئے۔ اس پر اُن عورتوں نے بیحد شور و غل کیا۔ اُن کی آواز سُن کر اُن کے گھر کے مرد بھی جمع ہو گئے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر ایک طالب علم میرے پاس دوڑا آیا اور کہا کہ مسجد میں اس قسم کا ہنگامہ برپا ہے اور یہ اس کی وجہ ہے۔ میں نے مسجد میں آ کر دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ آخر میں نے اُس وقت باقتضائے مصلحت طالب علموں کو بُرا بھلا کہا ایک آدھ کو مارا بھی اور مٹھائی کی قیمت پوچھ کر طالب علموں سے سب قیمت دلوائی اور عورتوں کو سمجھا دیا کہ یہاں نہ لایا کرو

قیمت دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ صرف اڑھائی آنے کی مٹھائی تھی

حالانکہ یہ مقدار ایسی مقدار نہ تھی جس پر اس قدر ہنگامہ کی نوبت آتی نیز وہ ان ہی طالب علموں کے لیے لائی گئی تھی۔ لیکن محض نیاز نہ ہونے کی وجہ سے ان عورتوں کے خیال میں ثواب نہیں پہنچا تھا جو یہاں تک نوبت پہنچی۔ حالانکہ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر دس دفعہ بھی نیاز دے دی جاوے لیکن کسی کو کھلایا یا دیا نہ جاوے تو کچھ بھی ثواب نہیں پہنچتا اور اگر ایک دفعہ بھی نیاز نہ دی جاوے اور کسی مستحق کو دے دیا جاوے تو ثواب پہنچ جاتا ہے۔

ایک ظریف درویش نے بیان کیا کہ ایک مقام پر فاتحہ تھی ہم کو بھی بلایا گیا۔ کھانا چنا گیا تو فاتحہ شروع ہوئی۔ فاتحہ خواں نے حضرت آدم علیہ السلام سے نام گنوانے شروع کیے۔ جب بہت دیر ہوگئی تو میں نے کہا کہ صاحب ساری دنیا کے تو نام شمار کیے جاتے ہیں مگر ہمارا نام بھی تو لے لو۔ کیونکہ جب تک ہم نہ کھائیں گے ان میں سے ایک کو بھی ثواب نہ پہنچے گا۔ اس پر وہ لوگ خفا تو بہت ہوئے کہ وہابی ہیں لیکن فاتحہ کا سلسلہ جلدی ختم ہوگیا۔

غرض عام طور سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بدون نیاز کے ثواب نہیں ہوتا نیز اس میں قوانین بھی ایجاد کیے ہیں۔ چنانچہ مجھ سے ایک شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ گیارہویں اٹھارہ تاریخ تک جائز ہے اس کے بعد جائز نہیں۔ گویا یہ نماز کا وقت ہے کہ فلاں گھنٹے تک رہے گا اس کے بعد نہ رہے گا۔

صاحبو! یہ عقائد رکھنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے تو سمجھو کہ لوگ تم کو دیکھ کر یہ عقیدہ پیدا کرلیں گے۔ صاحبو! عوام الناس اس قدر حد سے نکل گئے ہیں کہ شریعت سے بہت دور نکل گئے ہیں کہ شریعت

سے بہت دُور جا پڑے

غضب ہے کہ بعض مقامات میں خدائی رات منائی جاتی ہے اور صبح کو اللہ تعالیٰ کی سلامتی کے گیت گاتی ہوئی مسجد میں آتی ہیں اور آکر جھک کے سلام کرتی ہیں۔ غرض مسجدوں کی بابت یوں سمجھتی ہیں کہ گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔

فریب آمیز صورتیں سو بعض نے اموال کا مصرف مسجد ہی کو قرار دیا ہے بعض لوگوں نے انجمنوں یا مدارس کو لیا۔ خواہ وہ مدارس دینی ہوں یا دنیوی لیکن اُن میں جنہوں نے مدارس دنیوی کو لیا وہ تو کبھی الکھر کبھی مسجد کی طرف نہیں گرتے۔ پس اُنہوں نے مدرسہ سنبھال کر مسجد کو چھوڑ دیا۔ اُن کا کام صرف یہ ہے کہ قوم سے جس طرح ہو چندہ جمع کیا جاوے خواہ وہ شریعت کے موافق ہو یا شریعت کے مخالف ہو۔ یعنی یہ لوگ دباؤ ڈال کر چندہ وصول کرتے ہیں جو کہ شریعت سے بالکل ہی حرام ہے۔ اور یہ غضب کرتے ہیں کہ اگر کوئی غریب آدمی چار آنے دے دے تو اُن کی نمائشی قدر اس طرح کی جاتی ہے کہ اُس کو نیلام کیا جاتا ہے اور ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ اُس کی قدر کی گئی کہ یہ غریب کا عطیہ ہے۔ حالانکہ مقصود محض اس بہانے سے بڑی رقم وصول کرنا ہوتا ہے صاحبو! ان لوگوں سے غریبوں کی کیا قدر ہو گی۔ غریبوں کی قدر وہ کرے گا جو کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کرے۔

حضرت مولانا گنگوہی رح ایک مرتبہ بیمار ہو گئے۔ جب تندرست ہوئے تو صاحب زادے نے تنگریہ میں بہت لوگوں کی دعوت کی۔ مولانا نے اپنے ایک

خاص خادم سے فرمایا کہ جب غریب لوگ کھانا کھا چکیں تو اُن کے سامنے کا بچا ہوا کھانا جو کہ سقوں کو دیا جاتا ہے، وہ سب میرے پاس لے آنا کہ وہ تبرک کھاؤں گا اور خیال نہ کرنا کہ اُن کا بدن صاف نہیں، اُن کے کپڑے صاف نہیں اور اُس کو تبرک اس لئے قرار دیا کہ اوّل تو وہ لوگ مومن ہیں۔ دوسرے اُن کی یہ شان ہے کہ حدیث قدسی میں خدائے تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَنَا عِنْدَ الْمُنْکَسِرَۃِ قُلُوْبُہُمْ — میں شکستہ دل والوں کے ساتھ ہوں۔

حدیث میں آیا ہے۔

یَا عَائِشَۃُ قَرِّبِی الْمَسَاکِیْنَ — اے عائشہ مسکینوں کی اعانت کر

چنانچہ وہ کھانا حضرت کے پاس لایا گیا اور حضرت نے اُس کو نہایت رغبت سے کھایا۔ تو کیا کسی نے اس قسم کی قدر غریبوں کی کر کے دکھائی ہے۔ مگر اس وقت قدردانی کی بھی نئی نئی فریب آمیز صورتیں ایجاد ہو رہی ہیں حتیٰ کہ اُس ایک چونی کو سینکڑوں روپوں سے فروخت کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں علاوہ تلبیس کے ربوا بھی لازم آ جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں تفاضل ہو جاتا ہے اور تفاضل ایک جنس میں ربوا ہے اور اگر ربوا کا کوئی علاج بھی کر لیں تو تلبیس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

ایک مقام پر ایسا ہوا کہ ایک چونی فروخت ہونے لگی۔ ایک غریب آدمی نے جو سبق پڑھایا ہوا تھا اس پر ایک ہزار روپیہ لگا دیا اور بیچنے والوں نے اُسی کے نام پر نیلام کو ختم کر دیا۔ جب اُس کو یہ معلوم ہوا کہ چونی میرے

نام پر ختم ہو گئی ہے تو رونے لگا۔ لوگوں نے رونے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے تو صرف اس لئے ایک ہزار کہہ دیا تھا کہ لوگ سُن کر اس سے آگے بڑھیں گے انجمن والوں کا فائدہ ہو جاوے گا۔ آخر ایک صاحب اُٹھے اور فرمایا کہ قوم میں کوئی ایسا نہیں کہ اس عالی ہمت کا قرضہ اپنے ذمہ لے لے۔ غرض اُس غریب کے واسطے پھر چندہ کیا گیا! اور اس طرح پر ایک ہزار کی تعداد پوری کی گئی۔

جائے غور ہے کہ یہ کارروائی صدق سے کس درجہ بعید ہے اور صاحبو یہ صدق ہی وہ چیز ہے جو کہ آج مسلمانوں سے بالکل مفقود ہے کہ اب اُن کی ہر بات میں ایک پہلو ہوتا ہے۔ ہاں مخلصین میں اب بھی بحمد اللہ یہ صدق باقی ہے غرض یہ حالت چندے کی ہوتی ہے۔

مساجد کی حالت

اس مذاق والوں کی یہ حالت ہے کہ گویا یہ کام کر لیا تو دین پر پورا عمل کر لیا۔ نہ اُن کو پھر نماز کی ضرورت ہے نہ روزے کی اور اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو گھروں میں۔ گویا مسجد میں آنے کی اُن کے لئے بالکل معافی ہے۔

ایک رئیس صاحب کہنے لگے کہ مسجد میں کس طرح جاویں۔ وہاں نہ چٹائی ٹھیک ہے نہ وہاں فرش پنکھے کا انتظام ہے، جگہ جگہ کائی جم رہی ہے۔ گھر پر ہر طرح کی آسائش ہے۔ میں نے کہا ذرا سنبھل کر شکایت کرو۔ یہ تم کس کی شکایت کرتے ہو۔ غریبوں کی یا خدا تعالیٰ کی۔ سو غریبوں کی شکایت تو اس لئے نہیں ہو سکتی کہ اُن کے پاس اتنی وسعت ہی نہیں کہ وہ سب سامان کر سکیں۔ خدا تعالیٰ

کی شکایت اس لئے نہیں ہو سکتی کہ یہ خدائے تعالیٰ کا اوّل تو کام نہیں تمہارا کام ہے۔ دوسرے خدائے تعالیٰ کیا فرشتوں سے یہ کام لیں۔ یہ بھی خدا کا کرنا ہے کہ تم کو حکم کیا خدمتِ مساجد کا اور اُس کے لئے وسعتِ مالی دی پس یہ معلوم ہوا کہ تمہاری ہی کوتاہی ہے اس لئے تم اپنی ہی شکایت کر رہے ہو۔ اگر تم مسجد میں جاتے تو تم کو اس کی حس ہوتی اور خیال پیدا ہوتا۔

لطف یہ کہ بعضے لوگ مسجد کی تو مدد کیا کرتے، اُلٹا مسجد کی چیزیں اپنی ملک کے طور پر سمجھتے ہیں اور منگا کر اپنے کاموں میں لاتے ہیں اور اگر کوئی روکے تو اس غریب پر خفگی ہوتی ہے کہ مسجد کیا تمہاری ملک ہے۔ نہیں صاحب تمہاری ملک ہے۔ کہ اس کی چیزیں تم خوب استعمال کرو۔ کبھی مسجد میں کچھ دینے کی بھی تم کو توفیق ہوتی ہے۔

ایسے لوگوں کی حالت بعینہٖ اُس قصائی کی سی ہے کہ اُس کا ایک رشتہ دار قصائی مر گیا تھا۔ اُس کی بیوی یہ کہہ کر روتی تھی کہ ہائے تیری چھریاں کون لے گا تیرے مویشی کون لے گا۔ ایک شخص ہر بات کے جواب میں بول رہا تھا کہ میں لوں گا میں۔ اس میں وہ عورت نوحہ میں بولی کہ تیرا قرضہ کون دے گا وہ صاحب فرماتے ہیں بولو بھائی کس کی باری ہے۔

تو یہی حالت ہماری مساجد کے ساتھ ہے کہ خدمت کا بار تو دوسروں پر اور چیزیں برتنے والے یہ۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو تختے بھی لے جاتے ہیں اور یہ تو دینداروں میں بھی مرض ہے کہ مسجد کا گرم پانی گھر منگا لیتے ہیں۔ غرض میں نے اُن سے کہا کہ مسجد کی یہ حالت تو تمہاری ہی بدولت ہے۔ کہنے لگے کہ مولوی

تو مسجد میں فرشی پنکھا لگانے سے منع کرتے ہیں۔ میں نے کہا میں اجازت دیتا ہوں تم لگالو۔ کہنے لگے کہ لوگ شور و غل کریں گے اور مجھ پر اعتراض کریں گے۔ میں نے کہا کہ انشاءاللہ چار دن میں جب نماز کی برکت سے قلب پر عبدیت کا اثر ہوگا تم خود ہی اس مخدومیت کو چھوڑ دو گے۔ کسی مولوی کو منع کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ حاصل یہ کہ اسی قسم کے لوگ دین صرف اُس کو ہی کہتے ہیں کہ کچھ روپیہ خیرات کر دیا جاوے۔

سرمایہ کاری

بعضے تو ان سب سے نرالے وہ لوگ ہیں کہ وہ نہ اعمالِ بدنیہ کریں نہ مالیہ۔ اگر اُن کے پاس سرمایہ ہو تو اُس کو بنک میں جمع کر دیا۔ ان لوگوں کو منع کیا جاتا ہے تو منع کرنے والوں کو یہ لوگ تاریک خیال بتلاتے ہیں۔

ایک شخص نے اسی قسم کے ایک صاحب سے کہا کہ ہم نے سُنا ہے کہ تم سود لیتے ہو۔ تو وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ تم میری ذاتیات پر حملہ کرتے ہو سبحان اللہ امر بالمعروف ذات پر حملہ کرنا ہو گیا۔ آخر جب اُنہوں نے سمجھایا تو کہنے لگے کہ بھائی یہ وقت جائز ناجائز کی تحقیق کا نہیں ہے۔ اس وقت تو جس طرح ہو سکے روپیہ کمانا چاہیئے۔

یہ مذکورہ بالا تو اُن لوگوں کی حالت تھی جو کہ دنیا کے مدارس قائم کرتے ہیں اور جو دین کے مدارس کے حامی ہیں اُنہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب ہم نے وعظ، خطاب یا خامہ سے دوسروں کو ترغیب دی تو ہم کو سو دو سو روپیہ دینے کی کیا ضرورت ہے اَلدَّالُّ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ کا ہی ثواب بہت ہے الحاصل

ہر ایک فرقہ نے اپنے خیال کے موافق دین کا ایک خلاصہ نکال رکھا ہے۔ تو صاحبو یہ کتنی بڑی کوتاہی ہے مگر میں اس وقت ان مذکورہ اقسام میں سے بضرورت مقام اس کوتاہی کو بالخصوص بیان کرتا ہوں جو کہ غالب ہے۔ وہ یہ کہ مال کے خرچ کرنے کو مشکل سمجھتے ہیں۔ جہاں معلوم ہوا کہ اب چار پیسے خرچ کرنے پڑیں گے انہوں نے فوراً اپنی جان بچا کر اس موقع سے بھاگنے کی کوشش کی۔

ممکن ہے کہ اس خاص کوتاہی کے بیان کرنے سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ کیا محض چندہ مانگنے کے واسطے یہ وعظ کہا جاتا ہے۔ تم تو تحریک چندہ کو پسند نہیں کرتے تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ بے شک اس وقت ترغیب چندہ ہی کے لئے وعظ کہنا زیادہ مقصود ہے اور میں مطلق ترغیب کو ناپسند نہیں کرتا۔ ترغیب تو خدائے تعالیٰ کے کلام مجید میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ البتہ اس کو ایک خاص حد تک کلام مجید میں رکھا گیا ہے۔ یعنی اعمال کی دو قسمیں ہیں۔

ایک بذل نفس　　　　دوسری بذل مال

تو جو نسبت اس کو کلام مجید میں ہے۔ اگر وہی نسبت کسی شخص کے وعظ میں بھی ہو تو اس کا کیا مضائقہ ہے۔ اور اس نسبت کے محفوظ رہنے کا یہ طریقہ ہے کہ یا تو ایک ہی وعظ میں دونوں مضمونوں کو بیان کر دیا جاوے اور یا کسی ایک وعظ میں بذل النفس کے متعلق بیان کر دیا جاوے۔ چنانچہ اس وعظ سے زیادہ مقصود ترغیب ہے انفاق فی سبیل اللہ کی۔ اور اگرچہ اکثر واعظین کی یہ عادت ہے کہ جب چندہ کی ترغیب دیتے ہیں تو شروع سے ترغیب کا مضمون بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو موجب وحشت عامہ سمجھ کر یوں کرتے ہیں کہ بیان شروع دوسرے مضمون

سے کرتے ہیں اور اس کو کسی جگہ جوڑ لگا کر اسی وعظ میں شامل کر دیتے ہیں اور میں اس طرز کا مخالف، تو نہیں ہوں کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہے مگر اس میں اتنا ضرور ہے کہ ایسے شخص کے ہر وعظ میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید اب چندے کا ذکر چھیڑا جاوے۔ اس لیے میں نے شروع ہی سے اس مضمون کو لیا اور پہلے کہے دیتا ہوں کہ اس وقت محض چندے کا بیان ہوگا۔ جس کا جی چاہے سنے اور جس کا جی چاہے نہ سنے اور جس کا جی چاہے چلا جاوے۔ جو سنے گا اپنے نفع کے لیے سنے گا۔ ہمارا اس میں کوئی نفع نہیں اور نفع کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس وقت سننے والوں کو کوئی گھڑی انعام میں مل جاوے گی۔ مگر قرآن میں صاف ارشاد ہے۔

مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔

جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو اور تم کسی اور غرض سے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی پاک، خدا کے کرتے ہو۔ یہ سب پورا پورا تم کو مل جائے گا۔ اس میں ذرا کمی نہ کی جاوے گی

ان آیتوں میں غور کیجیے کہ کیا ارشاد ہوتا ہے۔ پس یہ شبہ کہ ہم نے تمہاری ہی زبان سے متعدد مرتبہ چندہ مانگنے کی ممانعت سنی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مطلقاً ممانعت نہیں سمجھ جانا یہ تمام مضمون نہ سننے سے ناشی ہوا ہے۔ آیات بالا سے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ مضمون بھی دین کا جزو ہے۔

چندہ اور ہدیہ کی بے احتیاطیاں

البتہ چندہ مانگنے کی متعدد صورتیں ہیں اُن میں سے جو صورت شریعت پر منطبق ہو گی وہ بے شک مذموم ہو گی باقی مذموم نہ ہو گی۔ اور یہ قاعدہ کچھ چندے کے ساتھ خاص نہیں بلکہ نماز روزہ میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ مثلاً جو نماز شریعت پر منطبق ہو گی وہ محمود ہو گی ورنہ مذموم۔ مثلاً اگر کوئی شخص بے وضو نماز پڑھنے لگے یا قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھنے لگے تو وہ نماز ناجائز اور مذموم نماز ہو گی۔ اسی طرح یہی قاعدہ طاعات مالیہ میں بھی ہے کہ چندہ دینے کے جواز کے لئے کچھ شرائط ہیں۔ اگر وہ پائی جائیں گی تو جائز ہو گا ورنہ ناجائز۔ پھر وہ کچھ چندہ ہی کے ساتھ نہیں بلکہ ہدیہ وغیرہ میں بھی وہی شرائط ہیں۔ اس وقت اکثر کمی یہ ہے کہ اُن شرائط کا لحاظ نہیں کرتے اور یہ کمی زیادہ تر لینے والوں میں ہے۔ دینے والے تو چونکہ حتی الامکان دیتے ہی کم ہیں۔ اس لئے وہ اکثر اُن خرابیوں سے بھی بچے ہوئے ہیں۔ البتہ لینے والے بہت زیادہ مبتلا ہیں اور یہ کوتاہی دو جگہ ظاہر ہوتی ہے کیونکہ معاملہ دو قسم کا ہوتا ہے۔

ایک تو وہ جو کہ بالعوض ہو۔

دوسرے وہ جو کہ بلا عوض ہو۔

پہلی قسم میں بھی اگرچہ خرابیاں آج کل بہت ہیں۔ مگر پھر بھی اُس میں ایک حد تک جواز کی صورتیں بھی بکثرت معمول بہا ہیں لیکن بلا عوض میں تو بہت ہی بے احتیاطی کی جاتی ہے اور بلا عوض کی صورتیں دو ہیں۔ ہدیہ یا چندہ۔ ان دونوں میں بے احتیاطیاں سراسر ہو رہی ہیں۔ چنانچہ ہدیہ میں ایک تو یہ بے احتیاطی کر رکھی

ہے کہ کبھی کسی کا ہدیہ واپس ہی نہیں کیا جاتا۔ جو شخص بھی ہدیہ پیش کرے اُس کو فوراً قبول کر لیا جاتا ہے بلکہ اگر کوئی شخص واپس کر دیتا ہو تو اُس کو بُرا کہتے ہیں اور اُس پر اعتراض کرتے ہیں۔

صاحبو! رسول مقبول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال میں غور کیجئے، تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک ہدیہ لینا بھی ناپسندیدہ ہے۔

مَا اَتَاكَ مِنْ غَيْرِ اِشْرَافِ نَفْسٍ فَخُذْهُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ۔

کہ جو بلا انتظار نفس آوے اُس کو لے لو اور جو نہ آوے اُس کی فکر میں نہ پڑو۔

اسی حدیث میں حضورؐ نے ہدیہ قبول کرنے کے متعلق ایک قید بتلائی ہے اس کو ادب سے تعبیر کیا جاوے یا شرط واجب سے۔ میں اس وقت اس سے خالی الذہن ہوں۔ جو کچھ بھی حضورؐ نے یہ بتلا دیا کہ اشراف نفس سے بچنا چاہیئے میں نے اس سے ایک امر مستنبط کیا ہے۔ اگر استنباط غلط ہو تو اس کی اصلاح کر دی جائے۔

سو میں نے اس سے یہ فائدہ سمجھا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس آمد و رفت رکھو تو ہمیشہ ہدیہ لے جانے کے پابند نہ ہو بلکہ کبھی ہدیہ لے کر چلے جاؤ اور کبھی خالی چلے جاؤ۔ کیونکہ تجربہ بتلا رہا ہے کہ پابندی کی صورت میں جب اس شخص کی صورت نظر پڑے گی تو طبعاً ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوگا کہ خدا جانے کچھ لایا ہے یا نہیں۔ یہی اشراف ہے تو اس کا علاج یا تو یہ ہے کہ نفس ایسا ہو جائے کہ اس میں اشراف ہی نہ ہو یا یہ ہے کہ پابندی سے منع کر دیا جاوے

چنانچہ میں نے اپنے لئے یہی تجویز کیا ہے بلکہ نہ لانا اکثر ہو تو زیادہ بہتر ہے۔

ہدیہ کے آداب

دوسری حدیث میں ہے تَہَادُوْا تَحَابُّوْا۔ (ہدیہ دو اور آپس میں محبت بڑھاؤ) تو ہدیہ دینے کی مصلحت حضورؐ نے ازدیادِ محبت کو قرار دیا ہے اور ازدیادِ محبت اسی وقت ہوتا ہے کہ جب ہدیہ لے کر جی خوش ہو اور جی اسی وقت خوش ہوتا ہے کہ جب اشرافِ نفس نہ ہو ورنہ مسرت نہیں ہوتی۔ بلکہ انتظار کی جو کلفت تھی وہ رفع ہو گئی۔ تو اس حدیث سے بھی یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہدیہ میں اشراف کی نوبت نہ آنی چاہیئے۔ دوسرے اسی حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ بیعت کے وقت ہدیہ نہ لینا چاہیئے کیونکہ اس کی بھی وہی حالت ہوتی ہے جیسا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ بھائی آج کل کے پیروں کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی دیہاتی اُن کے سامنے سر کھجلانے لگے تو پیر صاحب کو خیال ہوتا ہے کہ شاید پگڑی میں سے روپیہ نکال کر دیگا۔ واقعی بالکل سچ ہے۔

حرص و طمع نے ہماری وہ حالت بنادی کہ جیسے ایک مرید نے اپنے مرشد سے اپنا ایک خواب بیان کیا کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے کہ میری انگلیاں نجاست میں بھر رہی ہیں اور آپ کی انگلیوں پر شہد لگا ہے پیر صاحب سُن کر کہنے لگے کہ اس کی تعبیر تو ظاہر ہے کہ تو دنیا کا کتا ہے ہم لوگ اللہ والے ہیں۔ مُرید نے کہا کہ حضور ابھی خواب پورا نہیں ہوا۔ میں نے اسی میں دیکھا کہ آپ کی انگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں۔ اس

پر پیر صاحب بہت خفا ہوئے۔

غرض یہ خواب صحیح ہو یا غلط لیکن اس خواب سے مرید نے جس حالت کا فوٹو کھینچا ہے وہ بالکل مطابقِ واقع کے ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ مرید تو پیر سے دین حاصل کرنے کے لئے تعلق رکھتا ہے اور پیر مرید سے دنیا کے مردار سمیٹنے کی فکر میں ہے۔

اسی قسم کے ایک پیر کے کوئی مرید تھے۔ اُن سے کسی نے پوچھا کہ میاں تم کو پیر سے کچھ فائدہ بھی ہوا یا نہیں۔ مرید نے کہا کہ میاں جب ستفادہ ہی میں کچھ نہ ہو تو لوٹے میں کہاں سے آوے۔

مجھے اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی۔ بلگرام میں ایک بزرگ تھے اُن کے پاس ایک شخص پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ حسبِ معمول ایک روز وہ پڑھنے کے لئے آئے تو دیکھا کہ اُستاد صاحب کے چہرے پر ضعف کے آثار نمودار ہیں۔ دیکھ کر سمجھ گئے کہ آج شیخ کے ہاں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔

یہ دیکھ کر پڑھنے ——————

سے عذر کر دیا اور گھر واپس گئے اور وہاں سے کھانا پکوا کر لائے۔ جب کھانا پیش کیا، تو شیخ نے کہا کہ کھانا تو عین حاجت کے وقت آیا ہے لیکن اس کے لینے میں ایک عذر شرعی مانع ہے۔ وہ یہ کہ جب تم واپس گئے۔ تو مجھے اسی وقت خیال آیا کہ تم میرے لئے کھانا لینے کو جاتے ہو۔ تو یہ کھانا اشرافِ نفس کے بعد آیا ہے اور اس کا لینا حدیث کے خلاف ہے۔ وہ شاگرد بھی کیسے مؤدب تھے کہ اصرار نہیں کیا اور سینی لے کر فوراً اٹھ کر چل دیئے اور تھوڑی دور پہنچ کر

پھر لوٹے اور آ کر عرض کیا کہ حضرت اب تو اشراف نفس نہیں رہا ہوگا کیوں کہ میرے واپس لے جانے کے بعد آپ کو یقین ہو گیا ہوگا کہ اب وہ کھانا گیا۔ لہٰذا اب تو اس کو قبول فرمائیے۔ چنانچہ آپ نے قبول فرما لیا۔

سبحان اللہ! جب دل میں محبت ہوتی ہے خدمت کا طریقہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے بقول شخصے ؏

شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے در کار نیست

بر خلاف آج کل کے کہ اگر کوئی شیخ انکار کر دے تو مرید یا شاگرد پھر بھی اُس کو پریشان کرتا ہے۔

ایک ادب ہدیہ کا یہ ہے کہ دنیاوی حاجت کی آمیزش اُس میں نہ ہو۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ آکر ہدیہ دیتے ہیں اور پھر تعویذ لکھ دینے کی فرمائش کرتے ہیں ایسے ہدیہ کو فوراً واپس کر دینا چاہیئے۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آپ کو ایک اونٹ دیا۔ آپؐ نے اُس کے عوض میں کئی اونٹ اُس کو دیئے مگر وہ شخص راضی نہ ہوا۔ اس پر حضورؐ کو سخت رنج ہوا اور آپؐ نے خطبہ فرمایا کہ فلاں فلاں خاندان کے سوا کسی سے ہدیہ نہ لوں گا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ اُس شخص نے دنیوی غرض سے ہدیہ دیا تھا اور اسی حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ اکثر لوگوں سے اوّل ملاقات میں ہدیہ نہ لینا چاہیئے کیونکہ اوّل ملاقات میں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ ہدیہ دینے والے کی کیا نیت ہے۔ اسی لیئے میں نے اپنا یہ معمول مقرر کر دیا ہے کہ جو نیا شخص آتا ہے اُس سے میں ہدیہ نہیں لیتا۔ البتہ اگر قرائن قویہ سے خلوص ثابت ہو جاوے، تو

مضائقہ نہیں۔

رسم پرست لوگوں نے اس ہدیہ لے جانے کی وجہ یہ نکالی ہے کہ اگر پیر کے پاس خالی ہاتھ جاوے گا تو وہاں سے بھی خالی ہاتھ آوے گا۔ چنانچہ اس کی نسبت مثل بھی مشہور ہے کہ خالی جاوے خالی آوے۔ اس لیئے ضروری ہے کہ جاتے ہی پیر جی کی مٹھی گرم کر دو اور اس مٹھی گرم کرنے کے ایک محاورہ کی ایک اصل ہے۔ وہ یہ کہ پیرزادوں نے اپنا راز چھپانے کے لیئے لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ مصافحہ میں ہدیہ دیا کریں تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے۔

صاحبو! اوّل تو مصافحہ ایک مستقل عبادت ہے اس میں دنیا کے انضمام کے کیا معنی دوسرے اس کی کیا خبر ہے کہ اس شخص کے بعد کوئی دوسرا شخص مصافحہ نہ کرے گا۔ تو اگر کسی دوسرے نے بھی مصافحہ کر لیا تو اس کو معلوم ہو گا کہ پیر صاحب کو یہ ہدیہ دیا گیا۔ پھر اخفا کہاں رہا اور اگر دوسروں کو مصافحہ سے روکا جائے، پھر تو خواہی نخواہی دال میں کالے کا شبہ ہو گا۔ کیونکہ بعضی احتیاط سبب بے احتیاطی کا بن جاتی ہے۔

چنانچہ مشہور ہے کہ ایک شخص کا نکاح ہونے والا تھا تو اس نے کسی دوسرے سے ایک دوشالہ مستعار لے لیا۔ جب بارات گئی تو لوگ دولہا کو دیکھنے کے لیئے آئے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ دولہا کون ہے تو صاحب دوشالہ دولہا کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ دولہا تو یہ ہیں لیکن دوشالہ میرا ہے۔ دولہا نے کہا، یار تم بھی عجیب آدمی ہو اسے ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہنے لگے کہ اب ایسا نہ کروں گا۔ تھوڑی دیر میں اور کسی نے آکر پوچھا تو آپ فرماتے ہیں

کہ دولہا تو یہ ہیں، مگر دوشالہ میرا نہیں۔ اس پر دولہا اور بھی جھلایا کہ بندۂ خدا تم کو اس کے ذکر ہی کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ کہنے لگے کہ اب ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا نہ ہوگا کچھ دیر میں ایک اور صاحب نے آکر پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ دولہا تو یہ ہیں مگر دوشالہ کا کوئی ذکر نہیں اس پر دولہا نے وہ دوشالہ ان کے اوپر پھینک دیا۔

تو جیسے اس شخص کا یہ کہنا کہ دوشالہ میرا نہیں یا دوشالہ کا ذکر ہی نہیں بظاہر احتیاط تھی مگر باعتبار اثر کے پوری بے احتیاطی تھی، اسی طرح دوسرے سے مصافحہ نہ کرنا بھی اظہار ہوگا ہدیہ کا۔ جب اظہار ہو گیا تو پھر اخفا کہاں رہا۔ نیز جب دوسروں کے بھی مصافحہ کا احتمال ہے تو مرید صاحب کو یہ ڈر بھی تو ہونا چاہئے کہ اگر کوئی شخص پیر کے ہاتھ سے لے کر بھاگ جائے تو کیا کر لیں گے۔ کیونکہ جب اخفا کر کے لیا دیا گیا ہے تو ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ ہمارے ہاتھ میں کچھ تھا۔

اگر کہئے کہ ہم دوسرے کے مصافحہ کرنے سے پہلے جیب میں رکھ لیں گے، تو میں کہوں گا کہ مصافحہ میں لینے کی مصلحت تو فوت ہو گئی۔ کیونکہ جب جیب میں رکھا گیا تو بھانڈا تو پھوٹ گیا۔ اور اگر میری یہ رائے غلط ہے تو اس کی غلطی ظاہر کر دی جائے۔

غرض بعض لوگ یہ تعلیم کرتے ہیں کہ جب پیر کے پاس جاؤ تو کچھ لے کر ضرور جاؤ ورنہ جو خالی جاوے وہ خالی آوے۔ یہ کلمہ تو ٹھیک ہے مگر اس کا مطلب لوگوں نے غلط سمجھا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جو خلوص سے خالی جاویگا وہ خالی آوے گا۔ اگرچہ پیر کو روپیہ بھی کیوں نہ دیا ہو۔ غرض خلوص نہ ہونے

سے تو نیض سے بھی خالی رہا اور روپیہ دے کر اُس سے بھی خالی ہو گیا۔

ایک اور بات بھی ہدیہ کے متعلق کہنی ضروری ہے، کہ بعض اوقات جو چیز ہدیہ میں دی جاتی ہے وہ مقدار میں اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اُس کا لینا گراں معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے دس روپیہ لا کر پیش کئے۔ تو بعض دفعہ کسی وجہ سے اُن کے لینے سے طبیعت پر گرانی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق میں مدّت سے سوچا کرتا تھا کہ اگر ہم واپس کرنا چاہیں تو کسی شرعی قاعدے کے تحت اس واپسی کو داخل کریں مگر الحمد للہ یہ بھی حدیث سے سمجھ میں آگیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

لَا یُرَدُّ طِیبٌ فَاِنَّہٗ خَفِیفُ الْمَحْمِلِ۔	اچھے ہدیہ کو واپس نہ کیا جائے کیونکہ وہ ہلکا بوجھ ہے۔

اس حدیث میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے رد کرنے کی علّت طیب کے خفیف المحمل ہونے کو قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ علّت نہ پائی جاوے بلکہ اس کے برخلاف طبیعت پر گرانی اور بار گزرے تو ایسی چیز کا واپس کر دینا جائز ہو گا۔

میں نے اس کا ایک تخمینی معیار مقرر کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ کسی شخص سے اُس کی ایک دن کی آمدنی سے زیادہ ہدیہ نہ لیا جاوے اور جب ایک دن کی آمدنی کے برابر ایک مرتبہ لے لیا تو پھر دوسرا ہدیہ ایک مہینہ گزرنے سے پہلے نہ لیا جاوے۔ گویا اگر کسی شخص کی تنخواہ تیس روپے ماہوار ہے تو اُس سے مہینہ بھر میں صرف ایک روپیہ ہدیہ میں لینا مضائقہ نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ

جب ایک شخص جوش طبیعت سے اس سے زیادہ دینا چاہتا ہے تو انکار کی کیا ضرورت۔ تو سمجھو کہ جس جوش میں مصالح کی رعایت نہ ہو وہ جوش نہیں بلکہ جنون ہے جس کی اصلاح کرنی واجب ہے۔

اسی موقع پر اور ایک امر کو بھی جو کہ ہدیہ صدقہ وغیرہ سب میں مشترک ہے سمجھ لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ ہدیہ، صدقہ، چندہ، قرض، غرض جو طریقہ داد دہش کا ہو حرام مال میں نہ ہونا چاہیے۔ اگر کوئی حرام سے دینا چاہے تو صاف انکار کردے۔ یہ تو ضروری امور ہدیہ کے متعلق تھے۔

آداب چندہ

دوسرا امر جس میں بے احتیاطی کی جاتی ہے وہ چندہ ہے اس میں ایک تو یہ ضروری ہے کہ وسعت سے زیادہ نہ لے۔ چنانچہ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی سے وسعت سے زیادہ نہیں لیا۔ اُن لوگوں سے جن پر حضورؐ کو پورا اطمینان تھا کہ اُن کی قوت توکل کی کامل ہے جیسے حضرت صدیق اکبرؓ۔ حضورؐ نے ان سے کل سرمایہ قبول فرما لیا ہے ایک شرط یہ ہے کہ چندہ دینے والے کی طبیعت پر گرانی نہ ہو یعنے ان طرق سے بچے جن میں دینے والے کی طبیعت پر بار پڑنے کا احتمال ہو کیونکہ حدیث میں ہے۔

لا یحل مال امرء الا بطیب نفسہ — آدمی کا مال بغیر اس کی رضامندی کے جائز نہیں۔

ایک شرط یہ ہے کہ اپنی مذلت نہ ہو کیونکہ بعض طریقے ایسے بھی چندہ لینے کے ہیں کہ اُن میں دینے والے پر بار تو نہیں ہوتا مگر لینے والا نظروں سے

گر جاتا ہے۔ حدیث شریف میں جو سوال کی ممانعت آئی ہے وہ اسی بنا پر ہے اور اسی وجہ سے جہاں نہ گرانی ہو نہ ذلت، وہاں حاجت کے وقت طلب کرنا درست ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ اگر مانگو تو صلحاء سے مانگو (ہم لوگ جو مدعی اصلاح ہیں اس حدیث کو سن کر بہت متفکر ہوں گے کہ خدا خیر کرے اب سائلین کا ہجوم ہوگا) اور فرمایا کہ یا بادشاہ سے مانگو۔

خلاصہ یہ ہے کہ یا تو اہل اللہ سے مانگو یا بہت بڑے امیر سے۔ اس کا راز یہ ہے کہ سوال کی حرمت کی وجہ دو ہیں۔ ایک، ذلت، دوسرے مخاطب کی گرانی طبع کا احتمال۔ لیکن یہ علیٰ سبیلِ منعُ الخلوّ ہیں علیٰ سبیلِ منعُ الجمع نہیں۔ اور جب علت مرتفع ہوگی معلول بھی مرتفع ہوگا۔ جب بادشاہ سے مانگا تو نہ ذلت ہوئی نہ گرانی۔ گرانی تو اس لئے نہ ہوگی کہ جس کے پاس کروڑوں موجود ہیں وہ اگر دس پانچ دے دے تو اس کے خزانہ میں کیا کمی آتی ہے اور ذلت اس لئے نہیں کہ بادشاہ خود اتنا بڑا رتبہ رکھتا ہے کہ یہ اس کی نظر میں چڑھا ہی کب تھا کہ آج نظروں سے گر گیا۔

بزرگوں سے مانگنے کی اجازت بھی اسی لئے ہے کہ ان سے مانگنے میں ذلت تو اس لئے نہیں ہو سکتی کہ وہ سب سے کم اپنے کو سمجھتے ہیں دوسرے ترحم ان میں بہت ہوتا ہے۔ ہر ایک پر ان کو رحم آتا ہے۔ وہ کسی کو کیوں ذلیل سمجھنے لگے۔ اور گرانی اس لئے نہیں ہوگی کہ وہ ہر چیز سے بالکل آزاد ہیں اگر ان کو نہ کرنا ہوگا وہ آزادی سے جواب دے دیں گے۔ کسی سے وہ کیوں دبیں گے۔ اس لئے گرانی ان کے پاس بھی نہیں آتی۔ ان کی سادگی و آزادی

کی وہ حالت ہے کہ ؎

دل فریبانِ نباتی ہمہ زیور بستند ۔۔۔ دلبرِ ماست کہ با حسنِ خداداد آمد
زیرِ بارند درختاں کہ ثمرہا دارند ۔۔۔ اے خوشا سرو کہ از بندِ غم آزاد آمد

حسینانِ جہاں کو بناؤ سنگھار کی ضرورت ہے اور ہمارے محبوب کو حسنِ خداداد حاصل ہے۔ پھل دار درخت، زیر بار رہتے ہیں مبارک ہو سرو کو کہ وہ تمام غموں سے آزاد ہے۔

اور اُن کی یہ حالت ہے کہ ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم ۔۔۔ غیرِ زلفِ آں نگارِ دلبرم

یعنی بجز احکامِ خداوندی کی قید کے اور کوئی قید بھی اُن کو مقید نہیں کر سکتی بڑی قید ننگ و ناموس کی ہوتی ہے اُس کو وہ مٹا ہی چکے۔ جس کا طریقہ وہ ہے جو اس شعر میں مذکور ہے ؎

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما ۔۔۔ اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما ۔۔۔ اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیال درست ہو جاتے ہیں تجھ سے تمام بیماریوں کا علاج ہو جاتا ہے۔ تجھ سے نخوت اور ناموس کا دفیعہ ہو جاتا ہے، تو ہمارے لئے افلاطون اور جالینوس ہے ؎

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد ۔۔۔ او ز حرص و عیب کلی پاک شد

جس کا جامہ عشق سے چاک ہو گیا۔ وہ حرص اور تمام نقائص سے بالکل

پاک ہو گیا۔

اس سے بڑھ کر اُن کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

ساقیا برخیز در دہ جام را　　خاک بر سر کن غم ایام را

گر بدنامی ست نزد عاقلاں　　ما نمی خواہیم ننگ و نام را

غرض وہ بالکل آزاد ہیں۔ اُن پر کسی قسم کا دباؤ نہیں پڑ سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ جس کے سبب، ان دونوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا لیکن جب یہ معلوم ہو گئی اور یہ اجازت اسی بنا پر ہے۔ تو اگر کہیں ان دونوں میں بھی اس کا احتمال ہو تو اُن سے مانگنا جائز نہ ہوگا اور یہی وجہ تھی میری ممانعت کی چندہ سے ورنہ مطلق ممانعت ہرگز مقصود نہ تھی۔ اور یہ سمجھ لیجئے کہ دین تو ہر وقت باعزت ہے لیکن ظاہر نظر میں اس کی عزت علما کی عزت سے سمجھی جاتی ہے۔ اگر یہ لوگ نظروں سے گر گئے تو سمجھئے کہ دین نظروں سے گر گیا۔ اور اس وقت جو دین نظروں سے گر گیا ہے۔ یہ ہماری ہی بدولت اور محض ہماری صورتِ احتیاج بنانے کی وجہ سے ہے کہ لوگ ہماری اس حالت کو دیکھ کر خود دین کی تعلیم کو موجب ذلت سمجھنے لگے اور ہم کو بھی اس احتیاج نے اس نوبت تک پہنچایا۔ بقول شخصے ؎

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج　　احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

مگر بعض ایسے صاحب ہمت بھی ہیں کہ وہ باوجود احتیاج کے بھی ذلت گوارا نہیں کرتے۔ ایک شاہزادہ ایرانی کسی حادثہ سے آوارہ ہو کر لکھنؤ آیا وہاں ایک رئیس مسافر نواز تھے۔ شاہزادہ نے اُن کی دعوت کی۔ دوسرے کسی موقعہ پر وہ حالتِ سفر میں پریشان ہو کر اتفاقاً ان رئیس کے گھر پہنچے۔ ایک مریل ٹٹو

پر خستہ و زار سواد تھے۔ رئیس صاحب نے اُن کی صورت دیکھ کر براہ تاسف کہا ؎

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج — احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

شہزادہ بگڑ گیا اور فی البدیہہ جواب دیا کہ ؎

شیر نرکے می شود روباہ مزاج — میزند بر کفش خود صد احتیاج

اور کہا کہ تم ہم کو غربت کی وجہ سے ذلیل سمجھتے ہو اور یہ کہہ کر چل دیا۔

تو جو لوگ مقتدا کہلاویں اُن کے لیے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ وہ نظروں سے نہ گریں اور یہ امر حاصل ہوتا ہے استغنا سے۔ البتہ جب کبھی چندے کی ضرورت ہو تو تحریک، عام کا مضائقہ نہیں کیونکہ اس میں کوئی ذلت نہیں ہے۔ رہی تحریک خاص، اس میں اگر یہ یقین نہ ہو کہ نہ میں ذلیل ہوں گا اور نہ مخاطب پر گرانی ہو گی تب تو جائز ہے اور اگر ان میں سے ایک کا بھی احتمال ہو تو ناجائز۔ اور میں جو ہمیشہ ممانعت کیا کرتا ہوں وہ اسی تحریک خاص کی بعض صورتوں میں۔ یہ تحقیق ہے اس کی جو میں سمجھا ہوں۔

دعوت الی الدین

رہا عمل سو عمل کرنے میں اپنی اپنی رائے ہے۔ میں نے اپنے لیے یہ تجویز کر لیا ہے کہ تحریک عام میں تو کبھی نہ روکا جائے اور تحریک خاص کو مع دونوں قسموں کے ترک کر دیا جاوے۔ اس وقت میں تحریک، عام کر رہا ہوں۔ اس میں بحمد اللہ کوئی مضائقہ نہیں ہے اور نہ یہ سوال ہے بلکہ دعوت الی الدین ہے۔ اس کے متعلق اس آیت میں کافی فیصلہ موجود ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان یسألکموھا فیحفکم تبخلوا — اگر تم سے تمہارے مال طلب

ویخرج اضغانکم ‏ کریں، پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اور اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری ظاہر کر دے۔

یہ سوال کرنے کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر خدا تعالیٰ تم سے مانگنے لگے اور مبالغہ سے مانگے تو تم بخل کرنے لگو اور وہ تمہارے کینے کو ظاہر کر دے۔ آگے فرماتے ہیں ــــــ،

هَا اَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ۔

دیکھیے سوال کی تو نفی کرتے ہیں اور دعوت الی الانفاق کا اثبات فرماتے ہیں اور سوال کرنے پر بخل کرنے پر زیادہ مذمت نہیں فرماتے ہیں بلکہ ایک گونہ اس میں معذور رکھتے ہیں۔ چنانچہ فیحفکم تبخلوا میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور دعوت الی الانفاق میں بخل کرنے کی مذمت فرماتے ہیں کہ

من یبخل فانما یبخل عن نفسہ ‏ جو شخص بخل کرتا ہے وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے۔

کہ خدا تعالےٰ کو کوئی پروا نہیں ہے کیونکہ

اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ ‏ اگر تم روگردانی کروگے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم

پیدا کر دے گا۔ پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

کہ اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری بجائے دوسری کسی قوم کو پیدا کر دیگا جو کہ تمہاری طرح بخیل اور جان چرانے والے نہ ہوں گے اور تم سے ہر طرح افضل ہوں گے۔ دیکھئے ترغیب پر عمل کرنے سے کس قدر دھمکایا ہے کہ تمہارے تان گاڑی نہیں چلتی دوسرے بھی ہزاروں خدمت گزار موجود ہیں ؎

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

بادشاہ کی خدمت کر کے احسان نہ جتلاؤ کہ ہم نے خدمت کر دی
اُس کے احسان مند ہو کہ اُس نے تم سے خدمت لے لی۔

خدا تعالیٰ ہی کا ہم پر احسان ہے کہ ہم سے یہ کام لے لیا۔ تو اس آیت میں خدا تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ سوال اور چیز ہے اور وہ وہ ہے کہ جس میں اخفا ہو اور اخفا دو قسم کا ہے۔ ایک صوری دوسرا معنوی جیسے وجاہت سے وصول کرنا کہ یہ بھی اخفاء کی ایک فرد ہے۔ غرض جس میں ایلام قلب ہو وہ اخفا ہے اور اس پر تبخلوا کا ترتب کچھ بعید نہیں۔ اور ایک ہے ترغیب کہ اس میں بخل کرنا مذموم ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو صورتیں غیر مشروع ہیں وہ تو سوال میں داخل ہیں اور جو مشروع ہیں وہ ترغیب میں۔ غرض میں آپ لوگوں کو ترغیب دیتا ہوں اور مجھے اس ترغیب کے متعلق بہت سے مضامین محرکہ یاد نہیں ہیں۔ ہاں صرف یہ یاد ہے کہ

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔

جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اُن کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے سات بالیں جمیں ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں اور اللہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت وسعت والا ہے اور جاننے والا ہے۔

اور اس مقام پر خدائے تعالیٰ نے بہت دور تک انفاق فی سبیل اللہ کا حکم فرمایا ہے۔ یعنی یہ ربع سپارہ اس انفاق کی فضیلت میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ بھی بہت بڑی ضروری چیز ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہماری حالت یہ ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست　　　　　ور زر طلبی سخن دریں است

اگر جان مانگو تو مضائقہ نہیں اگر مال مانگو اس میں کلام ہے۔

ہم لوگوں کو دین سے جو کچھ محبت ہے اس کا خلاصہ وہی ہے جو کہ مولانا نے مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک شخص سفر میں چلا جا رہا تھا۔ رستہ میں دیکھا کہ ایک کتا پڑا ہوا سسک رہا ہے اور ایک آدمی اس کے پاس بیٹھا ہوا رو رہا ہے مسافر نے اُس شخص سے رونے کا سبب پوچھا۔ اُس نے کہا، یہ کتا میرا بہت بڑا رفیق تھا۔ آج یہ مر رہا ہے۔ اس کے غم میں روتا ہوں۔ پوچھا کہ اس کو کیا بیماری

ہے۔ کہا کہ صرف فاقہ۔ یہ ماجرا سُن کر مسافر کو اُس کی اور کتے کی حالت پر رحم آیا قریب ہی ایک بورا بھرا ہوا رکھا تھا۔ مسافر نے پوچھا کہ میاں اس میں کیا چیز ہے اُس شخص نے کہا کہ اس میں روٹیاں بھری رکھی ہیں۔ مسافر نے کہا کہ ظالم کتے کے مرنے پر بیٹھا رو رہا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ اس بورے میں سے ایک روٹی نکال کر اس کو دے دے۔ کہنے لگا کہ جناب مجھے اس قدر محبت نہیں ہے کہ اس کے لئے روٹیاں بھی خرچ کرنے لگوں۔ روٹیوں کے دام لگتے ہیں اور آنسو تو مُفت کے ہیں۔

اسی طرح ایک شخص کی حکایت ہے کہ اُس کا لڑکا بیمار ہوا۔ کسی نے ختم قرآن کی رائے دی اور کسی نے خیرات کا مشورہ دیا۔ تو اُس نے قرآن تو پڑھوایا لیکن خیرات ایک پیسہ نہیں دیا۔ اسی طرح ہم لوگ محبتِ دین کے مدعی تو ہیں مگر پیسہ خرچ کرنے میں محبت سب ختم ہو جاتی ہے۔

میں جو اس وقت ترغیب دے رہا ہوں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم ضرور ہی دو۔ کیونکہ دین کا کام تو انشاء اللہ تمہارے نہ دینے کی صورت میں بھی ضرور ہی چلے گا۔ میں صرف اس لئے ترغیب دے رہا ہوں کہ یہ بھی ایک شریعت کا مسئلہ ہے جس کا پہنچانا ضروری ہے لیکن اس ترغیب کے ساتھ ہی محلِ صَرف کا بتلانا بھی ضروری ہے۔ مگر اس کے بتلانے سے پہلے میں یہ ظاہر کئے دیتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے کسی کے کہنے سے نہیں کہا نہ آگے کسی کا کہا ہوا کہوں گا ہاں اس کی مجھے خبر نہیں کہ کسی نے تصرفِ باطنی سے میرے دل میں ڈالا ہو۔ مگر میں یقین کے ساتھ اس کی بھی نفی کرتا ہوں کیونکہ بحمد اللہ ہمارے بزرگ ایسے

نہیں ہیں کہ وہ اس قسم کے تصرفات سے کام لیں۔ بالخصوص ایسے مواقع پر کہ جہاں ان حضرات کو خلافِ مرضی ہونے کا احتمال ہو۔ ہاں خدائے تعالیٰ نے دل میں ڈالا اور میں نے بیان کیا۔

واسطۂ قرب

تو انفاق مالی کے مصارف کا فیصلہ یہ ہے کہ مفید انجمنیں، مدرسے، مسجدیں وغیرہ ہیں تو سب ضروری مگر جس وقت جو مصرف زیادہ ضروری ہو وہ زیادہ قابل توجہ ہے۔ میرے خیال میں اس مقام پر اس وقت میں مدرسہ مظاہر العلوم کے متعلق دار الطلبہ میں بڑی ضرورت ہے کماً بھی کیفاً بھی۔ بلکہ مناسب ہو کہ لوگ اس کو دیکھ بھی لیں۔ لوگوں کے دیکھ لینے میں انشاء اللہ برکت بھی ہو گی۔

اس دار الطلبہ کے باب میں حدیث ہے او بیتاً لابن السبیل بناہ یعنی اگرچہ وہ ابن السبیل فاسق ہو لیکن پھر بھی اس کے لئے گھر بنانے میں ثواب ہو گا چہ جائیکہ وہ طلبۂ علم ہوں جو کہ اضیاف ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پھر یہ بھی نہیں کہ یوں ہی سکونت رکھیں بلکہ قال اللہ قال الرسول کا شغل رکھیں کہ اس کے برابر کوئی شغل نہیں۔ حدیث میں ہے۔

اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَّمَا فِیْھَا مَلْعُوْنٌ اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ اَوْ عَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ۔

دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ ملعون ہے مگر اللہ کا ذکر اور جو اس کے نزدیک ہے اور عالم اور طالب علم۔

تو علم دین ذکر اللہ بھی ہے اور اس میں عالم اور متعلم بھی جمع ہیں اور دوسرے متعلقین

ما والاہ بھی ۔ غرض ذکر اللہ ، اور ما والاہ اور عالم اور متعلم تو لعنت سے مستثنیٰ ہوئے باقی سب موجب بعد من الرحمۃ ہیں ۔

اس سے بعض مخلصین کو اسباب دنیا کی نسبت سخت تشویش ہونا ممکن تھی حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی کیسی تدبیر فرمائی ۔ گویا ایک پاکیزہ کیمیا سکھلائی کہ اس دنیائے ملعون کو اگر ما والاہ میں داخل کردو تو پھر سبب قرب ہو جاوے گی ۔ تو اس سے زیادہ کیا کیمیا ہو گی کہ واسطہ لعنت کو واسطہ قرب بنا دیا جاوے ۔ اور یہی ایک فرد ہی آپ نے میں مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں ۔

چون آں تخییل را حکمت کند ۔۔۔ چون آں زہر ابے را شربت کند

آں گماں انگیز را سازد یقین ۔۔۔ مہرہا رویاند از اسباب کین

اور لوگ مغرور نہ ہوں کہ ہم تو ان کاموں میں دیتے ہیں ۔ چنانچہ اس وقت بھی مدرسہ میں دیا ہے لہٰذا ہم پہلے ہی سے داخل ہیں ۔ سو جتنا دیا ہے وہ تو اس ترغیب سے نہیں دیا ۔ اس پر دیتا تو جب سمجھا جائے کہ جنہوں نے مدرسہ میں کچھ دیا ہے ۔ وہ اسی قدر دار الطلبہ میں اور دیں اور جنہوں نے اب تک کچھ نہیں دیا وہ بھی حسب ہمت دیں اور جو نہیں لا سکے وہ وعدہ کرلیں ۔ مگر اس کا خیال رہے کہ نری زبان ہی نہ ہو بلکہ پورا کریں ۔ اور کوئی صاحب قلیل کثیر کا خیال نہ کریں ۔ یہ صدقہ جاریہ ہے ۔ جتنا ہو سکے اس کی شرکت کو غنیمت سمجھیں ۔

صدقہ جاریہ وہ چیز ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے اور ذرہ ذرہ نیکی کو ترستا ہے اور سوچتا ہے کہ کاش اس وقت کوئی ایسی سبیل ہو کہ کوئی شخص ایک مرتبہ سبحان اللہ ہی کہہ کر بخش دے ۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے اولیاء اللہ بھی احتیاج

ظاہر کرنے میں کہتے ہیں ؎

اے کہ برما میروی دامن کشاں　　از سرِ اخلاص الحمدے بخواں

کہ اگر اور کچھ نہیں تو ایک دفعہ الحمد ہی پڑھتے جاؤ۔ آج جس الحمد کو ہم ہزار بار خود پڑھ سکتے ہیں بعد مرگ، اُس کو ایک دفعہ دوسرے کی زبان سے پڑھنے کے لئے ترسیں گے۔ تو یہ صدقۂ جاریہ اس وقت کام آوے گا۔

نیز جس وقت قیامت کے روز اعمال پیش کئے جاویں گے اور دیکھے گا کہ میرے پاس کافی نیکیاں نہیں اس وقت جب ورق الٹا جاوے گا تو اس کو معلوم ہوگا کہ کسی جگہ بخاری کا ثواب لکھا ہوا ہے کسی جگہ مسلم شریف کا ثواب لکھا ہوا ہے کہیں قرآن شریف پڑھنے کا ثواب لکھا ہے علیٰ ہذا۔ صاحبو! اگر آج سے ہزار سال کے بعد قیامت آوے تو اُس وقت تک اس مکان میں یا اس مکان میں تعلیم پانے والوں کے سلسلہ میں جتنی مرتبہ بخاری کا ختم ہوگا اور جتنی دفعہ مسلم شریف پڑھائی جاوے گی برابر اُس کی روح کو ثواب ملتا رہے گا اور قیامت کے روز اُس کی نجات پریشانی کے وقت انشاء اللہ تعالیٰ کہا جاوے گا کہ تم نے جو دارالطلبہ میں مثلاً دو روپے دیئے تھے آج یہ لوٹ کی لوٹ ثواب کی اس کی بدولت تم کو مل رہی ہے۔ اس وقت خوش ہوگا اور زبانِ حال سے کہے گا ؎

بحمد اللہ زہے ارزاں خریدم　　جاں دادم جواں خریدم

اور اس وقت معلوم ہوگا کہ ایک روپیہ یا دو روپے دینے سے کیا نفع عظیم حاصل ہوا۔ صاحبو! خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے کہ اتنی بڑی دولت مفت میں ہاتھ آتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض وہمی مزاجوں کو شبہ ہو کہ جب اس

مکان میں یہ کام یا خود یہ مکان نہ رہے گا تو کیسے ثواب ملے گا۔ اول تو اس کا گمان کرنا ہی برا ہے۔ یاد رکھو کہ نیک کام کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا کرتا ہے

اگر گیتی سراسر باد گیرد چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

غرض اس میں کبھی انقطاع نہیں ہوتا اور بالفرض ہو بھی تو یہ قاعدہ مقرر ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (عملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے) تو نیت تو دینے والے کی ہمیشہ ہی کے لئے اس کی اعانت کرنے کی ہے۔ اور اگر اسی پر پڑ رہو کہ جتنے دن قیام ہوا اتنے ہی دن کا ثواب ملے تو جنت دائمی کا استحقاق بھی نہ رہے گا۔ کیونکہ جب سو برس تک بھی نیکیاں نہیں کیں تو سو برس سے زیادہ جنت میں کیوں رہیں۔ حالانکہ جنت میں ابدالآباد رہنا ثابت ہے تو اس نیت کی بدولت ہے کہ ہر مسلمان کی نیت یہ ہے کہ اگر قیامت تک زندہ رہیں گے تو اس دین پر رہیں گے۔ اسی لیے جزائے مؤبد ملتی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی نیت تابید کی ہے پس یہ وسوسہ غلط ٹھہرا۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے تقسیم اور تجزیہ کا غلط ہونا ثابت فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے تمہارے نفسوں اور جانوں کو خرید لیا ہے۔ تو دونوں کو جمع فرمانے سے یہ بتلا دیا کہ نہ صرف بذل مال کرنے والے مغرور ہوں اور نہ صرف بذل جان کرنے والے بلکہ جب دونوں کا بذل ہوگا تو جنت کا استحقاق ہوگا۔ تو صاحبو! جنت ایسی سستی نہیں ہے خوب سمجھ لو کہ

اَلَا اِنَّ سِلْعَۃَ اللّٰہِ غَالِیَۃٌ خبردار اللہ کا سامان مہنگا ہے

أَلَآ اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ هِيَ الْجَنَّةُ — خبردار اللہ کا سامان جنت ہے

اب میں طالب علموں کے کام کی ایک بات تبلاتا ہوں کہ اس مقام پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بذل نفس تو خاص خاص کاموں میں ہوتا ہے یعنے قتال میں جس کا آگے ذکر بھی ہے یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ تو بذل نفس عام کیسے ہوا۔ تو سمجھو کہ خدا تعالیٰ نے خود آگے چل کر فرما دیا ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ ۔ الخ — وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے۔

یہ آیت اس شبہ کو بالکل زائل کر کے بتلا رہی ہے کہ یہ سب کام بذلِ نفس ہی میں داخل ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ دلیل ہے کہ آگے ارشاد ہوتا ہے۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ — مسلمانوں کو بشارت دیجئے۔

یہ المومنین اُسی عن المومنین سابق کا اعادہ ہے۔ پس ان اعمال کے بعد یہ حکم دینا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ان مومنین مذکورین کو بشارت دے دیجئے صریح طور سے دال ہے کہ جس اشتراء انفس واموال کا اوپر ذکر تھا وہ یہ اعمال ہیں۔ پس یہ سب بذلِ نفس ہو گیا۔ اس تقریر سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ تمام شریعت مطہرہ بذل نفس و بذل مال کی تفصیل ہے۔ یہ تھا میرا مقصود اس وقت کے بیان سے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور یہ درخواست کرتا ہوں کہ یہ میری طرف سے مدرسہ میں قبول ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ برکت دے۔ آمین یا ربّ العالمین۔

تا

تقویم الزیغ

انسداد بدعت والحاد کے متعلق یہ وعظ ۲۹ رشوال سنہ ۱۳۲۹ھ بعد نماز عشاء ۳ گھنٹے کھڑے رہ کر انجمن ضلع ہردوئی میں بیان فرمایا۔ نو سو کے قریب حاضری تھی جس میں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ حضرات تھے۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا ــــــــ!

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ۔ اما بعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ

یہ دین میرا سیدھا راستہ ہے سو اس پر چلو جو کہ مستقیم ہے۔ دوسری راہوں پر مت چلو۔ وہ تم کو اللہ کی راہوں سے جُدا کر دیں گی۔

ضرورتِ تدبیر

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس سے اوپر خدا تعالیٰ نے بعض احکام اعتقادیہ اور بعض احکام عملیہ بیان فرمائے ہیں اُن کے بعد یہ جملہ ارشاد ہوا ہے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے۔

خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے اس کا اتباع کرو۔ دوسرے طریقوں کا اتباع نہ کرو کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے دُور کر دیں گے۔

اس ترجمہ سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اس وقت کس مضمون کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اور یہ کہ یہ کوئی نیا مضمون نہیں بارہا کان اس سے آشنا ہوئے ہوں گے۔ اس پر ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ جب یہ مضمون بارہا سنا ہوا ہے تو اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سننا دوسری چیز ہے اور سمجھنا دوسری چیز ہے۔ ہم نے سُنا تو ہے مگر سمجھا نہیں۔ خدا تعالیٰ نے کہیں کہیں

اس کی شکایت بھی کی ہے۔ اس کو تفکر اور تدبر بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے۔

وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ — عقلمندوں کو اس پر غور کرنا چاہیئے

مسلمان تحصیل علوم وغیرہ کو ضروری سمجھتے ہیں اور وہ ہیں بھی ضروری۔ لیکن ان کی جو اصل ہے جس کی یہ سب فرع ہیں۔ اس کی ضرورت کا تصور بھی نہیں ہوا بلکہ اس حالت کا بھی تصور نہیں۔ اور ترقی کرکے کہتا ہوں کہ ذرا التفات بھی نہیں ہوا الا ماشاء اللہ کہ بعض کو تو اس کا خیال ہے ورنہ علی العموم اس طرف سے بالکل بے پروائی ہے۔ اور وہ بات کچھ بہت لمبی چوڑی نہیں، بہت چھوٹی سی بات ہے۔ لیکن چھوٹی ظاہر ہی میں ہے ورنہ مثل قول نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم

خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ — زبان میں ہلکے ہیں میزان میں بھاری ہیں۔

حقیقت میں وہ بات بہت بڑی ہے اور اسی کی بدولت کچھ حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم تدبر اور تفکر کیا کریں۔ مسلمان اس سے کچھ ایسے غافل اور بے خبر ہیں کہ گویا انہوں نے اس کا سبق ہی نہیں پڑھا اور دوسروں کی کیا شکایت کروں۔ خود اپنی ہی یہ حالت ہے کہ زبان پر لمبے چوڑے مضامین ہیں لیکن اپنی حالت میں تدبر اور تفکر نہیں اور جب میں اپنے کو مریض سمجھتا ہوں اپنی شکایت کرتا ہوں۔ تو اگر سننے والوں کی بھی شکایت کروں تو کچھ بے موقع نہیں ہے۔ ہاں اگر اپنا شکوہ کرتا تو سامعین کی تکدر خاطر کا ضرور خیال تھا۔

غرض ہم مسلمانوں میں اس کی بہت کمی ہے۔ ہم نے تدبر سے کام لینا بالکل

چھوڑ دیا۔ ہر شخص اپنے یوم و لیلہ کو دیکھ لے جن لوگوں کے اوقات کا کوئی انضباط ہی نہیں۔ وہ تو شمار ہی سے خارج ہیں اور اکثر لوگ ہم میں ایسے ہی ہیں کہ صبح کا کام شام پر اور شام کا کام صبح پر ملتوی رکھنا معمولی بات ہے۔ میں نے ایسے افراد بھی دیکھے ہیں کہ انہوں نے ایک ایک خط کو صبح شام میں ہفتہ بھر تک ڈالے رکھا۔ جیسے بعض حفاظ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے جب سے قرآن پڑھا ہے، ایک ختم کی بھی نوبت نہیں آئی۔ ایسے لوگ تو شمار ہی سے خارج ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے اوقات منضبط ہیں وہ اپنے نظام الاوقات میں دیکھیں کہ پانچ منٹ بھی تدبر کے لئے انہوں نے رکھے ہیں۔ کہیں نام و نشان بھی نہ ہو گا۔ اکثر مسلمانوں کو اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں۔ خدا تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں۔

کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ	یہ ایک بابرکت کتاب ہے
مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوْا اٰيَاتِهٖ	جس کو ہم نے آپ کے اوپر نازل
وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ	کیا تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر

غور کریں تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

دوسری جگہ شکایت فرماتے ہیں۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ	تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور ہی
اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔	نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ

گیا ہے۔

کہ یہ لوگ قرآن میں غور ہی نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ گئے ہیں کہ تدبر کی قدرت ہی نہیں رہی کیونکہ اگر تدبر کرتے تو یہ حالت ہرگز نہ رہتی۔ تدبر کا خاصہ

ہے کہ اُس سے رحمت کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور بغیر اس کے کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ۔ یعنی کیا ہم اُن کو زبردستی اپنی رحمت چمٹا دیں گے اگرچہ وہ کراہت کرتے ہوں۔

سو اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے۔ کیا ہمارے یہاں اُن کے رکھنے کی جگہ نہیں۔ اگر ہزار بار چاہیں تو ہم بھی متوجہ ہوں گے اور تمہاری توجہ سے زیادہ متوجہ ہوں گے اور کام بھی ہماری ہی توجہ سے چلتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بچے کو آپ لینا چاہیں اور لینے کو ہاتھ بڑھائیں تو اگر وہ بچہ اپنی بساط کے بموجب دوڑے اور کوشش کرے اگرچہ گر ہی جاوے تو آپ خود دوڑ کر اٹھا لیتے ہیں اور یہ مسافت آپ ہی کے بڑھ کر اٹھا لینے سے طے ہوتی ہے ورنہ اُس بچے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ خود اُس مسافت کو طے کر سکے۔

اسی طرح خدا تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ اگر یہ بھی کچھ ہاتھ پیر ہلائے اور کوشش کرے تو اُس جانب سے جذب ہوتا ہے اور اس جذب کی بدولت یہ وہاں تک پہنچتا ہے۔ اور یہ فرلانگ دو فرلانگ کی مسافت تو ممکن ہے کہ بچہ قطع کر لے برخلاف اس بُعد کے جو ممکن اور واجب میں ہے کہ اگر ادھر سے جذب نہ ہو تو کبھی یہ مسافت طے ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ادھر سے جذب ہونا آپ کی طلب پر موقوف ہے جس کو افسوس ہے کہ آپ نے بالکل

چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہر وقت ہدایت دینے کو تیار ہیں مگر افسوس کہ ہم ہی قاصر ہیں۔ اور وہ طلب یہی ہے کہ ہم تدبر کریں اور سوچ لیا کریں۔ اس سے خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہوتا ہے۔

وعظ سننے کا مقصد صاحبو! میں پھر کہتا ہوں کہ تدبر اور سوچ اگرچہ بظاہر بہت چھوٹی سی بات ہے۔ لیکن ثمرہ کے اعتبار سے یہ بہت بڑی بات ہے اور اس کے ترک کر دینے سے ہم بہت خرابیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اسی طرح یہ مضمون جو آج بیان کرنا مقصود ہے اس کو بھی آپ نے بہت دفعہ سنا ہوگا مگر کبھی اس میں غور کرنے اور سمجھنے کی نوبت نہیں آئی اس لئے آج سمجھانے کے لئے اس کو اختیار کیا گیا۔

میں مضمون آیت کو پھر دہرائے دیتا ہوں تاکہ وہ تازہ ہو جائے اور وعظ سے یہی مقصود بھی ہوتا ہے کہ جو مضامین کانوں میں پڑے ہیں لیکن ان سے غفلت ہو گئی ہے وہ پھر تازہ ہو جائیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر وعظ میں کوئی نئی بات ہی بیان کی جاوے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ وعظ سننے سے اصل مقصود کیا ہونا چاہئے کیونکہ آج کل وعظ سننے والوں کے مختلف مقاصد ہوا کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو اس لئے وعظ سننے آتے ہیں کہ واعظ کی تقریر کا اندازہ کریں کہ وہ کس قبیل کی ہے بیان مسلسل ہوتا ہے یا اکھڑا اکھڑا ہوتا ہے۔ مضامین کی آمد کا کیا حال ہے بعض لوگ اس لئے سنتے ہیں کہ مضامین سن کر واعظ کے خیالات کا اندازہ کریں گے کہ یہ کس خیال کا آدمی ہے۔ بعض لوگ اس لئے آتے ہیں کہ اس کے بیان اور مضامین میں

عیب نکالیں گے۔ بعض کی اچھی نیت ہوتی ہے لیکن صرف یہ کہ مجلس وعظ میں شریک ہونے سے اتنا وقت ثواب کے کام میں گزرے گا۔ یہ نیت اگرچہ مستحسن ہے، لیکن کافی نہیں کیونکہ وعظ سننے سے یہ مقصود نہیں ہوتا۔ ثواب تو نفلوں میں تلاوت قرآن میں بھی بہت کچھ ملتا ہے۔ وعظ سننے کی اصلی غرض یہ ہے کہ وہ امراض باطنی جن پر کبھی ہماری نظر بھی نہیں جاتی اُن کو سنیں اور اُن پر ہم کو توجہ ہو۔ بس اس غرض کو پیش نظر رکھ کر وعظ سننا چاہیئے۔

ایک مشترک مرض

غرض خدا تعالیٰ اس مقام پر فرماتے ہیں۔ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ـــــ هذا مستقیما میں عامل اشیر ہے جو کہ هذا سے مفہوم ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ

میرے اس سیدھے رستہ کا اتباع کرو اور دوسرے رستوں پر نہ ہو لو کہ وہ تم کو خدا کے رستہ سے جدا کر دیں گے۔

ترجمہ سے معلوم ہوا ہو گا کہ رستے بہت سے ہیں جن میں ایک خدا کا بتلایا ہوا رستہ ہے۔ اور دوسرے خود بندوں کے تراشے ہوئے ہیں۔ پس ان سب رستوں میں ایک تو اتباع کے قابل ہو گا باقی سب ترک کے قابل۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ طریق الٰہی کو دوسرے طرق سے ممتاز اور جدا کرنے کے لئے کوئی معیار ہو جس سے ہم کو یہ بات معلوم ہو سکے کہ فلاں رستہ خدا کا بتلایا ہوا اور قابل اتباع ہے اور اس کے سوا دوسرے قابل ترک۔ اگر غور کیا جائے تو اسی آیت کے پورے مضمون سے اس معیار کا پتہ چل جائے گا اور معلوم ہو جاوے گا

کہ اس معیار کو چھوڑ دینے ہی سے یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں جن کی وجہ سے یہ حالت ہوگئی کہ بعض لوگوں کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ہم نے طریق الہٰی کو چھوڑ دیا یا لئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس جزو آیت سے اوپر کا جزو اس کے ساتھ ملایا جائے تو اس سے معیار معلوم ہو جاوے گا۔ فرماتے ہیں۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ عَلَیْکُمْ رَبُّکُمْ اَنْ لَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ فرما دیجئے کہ آؤ میں تم کو احکام خداوندی بتلاؤں اور وہ فلاں اور فلاں ہیں۔ اس ارتباط باہمی سے یہ اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ معیار طریق خداوندی کے دوسرے طرق سے ممتاز ہو جانے کا یہ ہے کہ جس بات کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرما دیں اور پڑھ کر سنا دیں وہ طریق خداوندی ہو گا۔ اور حضور جو کچھ فرما دیں وہ وحی ہوتا ہے۔ تو تما حصہ یہ نکلا کہ وحی سے جو ثابت ہو وہ طریق الہٰی ہے۔ تو وحی معیار ہوئی مختلف طرق کے ممتاز کرنے کی۔ اور اسی پر دار و مدار ہوا۔

اس مضمون کو بھی مسلمانوں نے بہت دفعہ سنا ہو گا لیکن برتاؤ اور مسلمانوں کے حالات میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے قلب میں تو وحی کی مطلق عظمت ہی نہیں اور بعض کے دل میں وحی کی وقعت تو ہے لیکن اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

اس وقت مسلمانوں میں مختلف فرقے ہیں مگر سب میں مرض مشترک یہ ہے کہ وحی کو معیار نہیں سمجھتے اور اس وجہ سے مناسب تھا کہ سب کو ایک ہی فرقہ کہا جاتا

لیکن چونکہ انداز الگ الگ ہیں اس لیے سب کو ایک نہیں کہا جا سکتا۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بادشاہ کی عملداری میں مختلف طرح کے آدمی رہتے ہوں۔ بعض تو ایسے ہوں کہ وہ قوانین کو تسلیم ہی نہ کرتے ہوں۔ بعض ایسے ہوں کہ قوانین کو تو تسلیم کریں لیکن ان قوانین کے صحیح فرض کو نہ سمجھتے ہوں۔ تو یہ سب لوگ اس قدر مشترک میں تو شریک ہیں کہ معیاری قانون پر نہیں چلتے لیکن چونکہ تسلیم اور عدم تسلیم کا فرق بھی ہے اس لیے دونوں کو الگ الگ شمار کیا جاوے گا اور برتاؤ بھی دونوں کے ساتھ مختلف ہوگا۔

قانون کے غلط سمجھنے کے متعلق مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ اس سے انشاءاللہ یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاوے گی کہ قانون کو تسلیم کرنے کے بعد بھی کیوں کر اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے۔

احکام خداوندی کی عظمت کا فقدان

ایک غیر ملک کے دیہاتی نے ریل کا سفر کیا اور قریب ایک من کا بورا اپنے ساتھ لیا۔ جب اسٹیشن پر پہنچا تو ملازمین ریلوے نے ٹکٹ کیساتھ اسباب کی بلٹی بھی طلب کی۔ اس نے بجائے بلٹی کے بھی اپنے ٹکٹ ہی کی طرف اشارہ کیا۔ ملازم ریلوے نے اس کو سمجھانے کے طور پر کہا کہ تمہارا اسباب چونکہ پندرہ سیر سے زیادہ ہے اور پندرہ سیر سے زیادہ اسباب محصول ادا کیے بغیر لے جانے کی اجازت قانون ریلوے میں نہیں ہے اس لیے ایک بلٹی اس اسباب کی بھی ہونی چاہیے۔ یہ سن کر وہ دیہاتی کہتا ہے کہ پندرہ سیر سے یہ خاص وزن مراد نہیں بلکہ وہ مقدار جس کو ایک آدمی اٹھا سکے اور چونکہ ہندوستانی لوگ پندرہ

سیر ہی اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے یہ خاص وزن لکھ دیا گیا ہے اور ہم ایک من اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے ہمارے ایک من کے لیے وہی قانون ہوگا جو تمہارے پندرہ سیر کے لیے ہے۔

خیر یہ حکایت تو ایک لطیفہ ہے۔ لیکن ہم کو اس سے سبق لینا چاہئے اور دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ ڈپٹی کلکٹر اس دیہاتی کے جواب کو سن کر اس کو معذور سمجھے گا یا اُس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کتاب قانون لاکر اُس دیہاتی کے سامنے رکھ دے اور اُس کو قانون سمجھانے کی اور اُس کے اشتباہ رفع کرنے کی کوشش کرے۔ اور اگر وہ ہر شخص کے ساتھ ایسا کیا کرے تو کیا اپنے منصبی کام کو پورے طور پر انجام دے سکے گا۔ کبھی نہیں! بلکہ یہ مشغلہ اُس کو معطل کر دے گا۔ پس ان ساری دقتوں کو پیش نظر رکھ کر آپ بتلائیے کہ ڈپٹی کلکٹر کیا کرے گا۔ صرف یہی کہ ہاتھ پکڑ کر اُس کو پولیس کے حوالہ کر دے گا۔

تو جیسا اس دیہاتی نے قانون کی غلط تفسیر کی تھی اسی طرح آج کل قرآن کی غلط تفسیر کی جاتی ہے اور زور دے کر کہا جاتا ہے کہ اس قانون قرآنی کا یہی مطلب ہے۔ حالانکہ نہ وہ مطلب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے سمجھا نہ صحابہ کرام نے سمجھا نہ خدا تعالیٰ نے بتایا۔ صاحبو! قرآن فہم لوگوں کی نظروں میں اس قسم کی تفاسیر کی وقعت اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی وقعت اس دیہاتی کی تفسیر قانون کی تھی حالانکہ بظاہر اُس کی یہ تفسیر اور تاویل جی کو لگتی ہے کہ اگر کوئی شخص قانون پر نظر نہ رکھتا ہو تو وہ اس کو سن کر یقین کر لے کہ یہی معنی قانون کے ہیں۔ اور آپ کو جو یہ تفسیر منکر معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون مدت سے سنا ہوا ہے اور نہ جس نے

کبھی اس قانون کو نہ سنا ہو اور وہ اس گفتگو کو سنے کہ ٹکٹ کلکٹر تو کہتا ہے قانون یوں ہے اور دیہاتی کہتا ہے کہ قانون کی لم کیا ہے۔ کیوں یہ خاص وزن قانون میں رکھا گیا۔ ٹکٹ کلکٹر جواب دیتا ہے کہ ہم عامل قانون ہیں، مجوز قانون نہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ کیا لم ہے۔ اس پر دیہاتی کہتا ہے کہ تم اگرچہ نہیں جانتے لیکن میں جانتا ہوں۔ لم اس کی یہ ہے کہ پندرہ سیر سے زیادہ اکثر ہندوستانی اٹھا نہیں سکتے اور جب یہ لم ہے۔ تو جہاں یہ منتفی ہو گی قانون بھی منتفی ہو گا۔ تو اس دیہاتی کی آب و تاب کی تقریر اور ٹکٹ کلکٹر کا بظاہر عاجزانہ جواب۔ اس کا یہ خیال یہ بات قائم کرادیگا کہ قانون کی اصل حقیقت دیہاتی نے سمجھی اور ٹکٹ کلکٹر محض زبردستی کر رہا ہے حالانکہ قانون داں آدمی جانتا ہے کہ قانون وہی ہے جو ٹکٹ کلکٹر کہہ رہا ہے اور اس لیے وہ ٹکٹ کلکٹر کی جملہ تجاویز کو جو اس دیہاتی کے متعلق ہوں بجا اور مناسب سمجھے گا یہی حالت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے بچپن سے شریعت کے احکام نہیں سنے اور ہوش سنبھال کر انہوں نے ایک عالم اور ایک جاہل کی گفتگو سنی کہ عالم کہتا ہے، شریعت کا یہ قانون ہے اور جاہل اس کی لم دریافت کر رہا ہے جس کے جواب میں عالم یہ کہہ کر ختم کر دیتا ہے کہ ہم عامل قانون ہیں واضع قانون نہیں۔ لم اور مصلحت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے جو کہ واضع قانون ہے۔ ہم اس کے ذمہ دار نہیں اور وہ جاہل مدعی عقل کہتا ہے کہ میں اس کی لم جانتا ہوں اور یہ کہہ کر احکام میں تحریف شروع کر دیتا ہے جس طرح اس دیہاتی نے قانون ریلوے میں تحریف کی تھی۔

تو صاحبو! کیا وجہ ہے کہ اس گنوار کے قصہ میں تو اس کو ناحق پر اور ٹکٹ کلکٹر کو حق پر کہا گیا اور اس جاہل کی گفتگو میں علماء کے جواب کو زبردستی پر محمول کیا گیا اگر

ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو بتلایئے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ احکام خداوندی کی عظمت دل میں نہیں اور گورنمنٹ کے احکام کی عظمت دل میں ہے۔

تلاشِ حجت کے اسباب

کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کی عظمت دل میں ہوتی ہے اُس کے احکام میں علتیں نہیں تلاش کی جاتیں بے چون وچرا تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اور جس کی عظمت دل میں نہیں رہتی اُس کی ہر بات میں لم اور کیف کیا جاتا ہے۔

چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض مرتبہ کوئی ایسا حکم سرکار کی طرف سے آتا ہے کہ جس سے طبیعت منقبض ہوتی ہے عقل بھی ابا کرتی ہے لیکن اس کو بلا تامل تسلیم کر لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب گورنمنٹ نے حکم دیا تو اس میں کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔ اس طرح کے بہت سے احکام ہیں جن کی علت عوام کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن ان کو مانا اور اُن پر عمل کیا جاتا ہے۔

مثلاً اگر ایک روپیہ کا عدالتی ٹکٹ لفافہ پر لگا کر ڈاک میں بھیج دیا جائے تو لفافہ بیرنگ ہو جائے اور ڈاک خانہ کا دو پیسے کا ٹکٹ لگا دیں تو بیرنگ نہ ہوگا۔ ہزاروں آدمی ہوں گے جو اس قانون کی لم نہیں جانتے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی عدالتی ٹکٹ لگا کر بھیجے اور لفافہ بیرنگ ہو جائے تو گورنمنٹ سے یہ نہیں پوچھا جاتا نہ اس کی لم دریافت کی جاتی ہے کہ ایک روپیہ میں لفافہ کیوں بیرنگ ہوا۔ اور دو پیسے میں کیوں بیرنگ نہیں ہوتا۔ غرض کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا کہ اس کی مخالفت کی جائے یا علت تلاش کی جائے۔ برخلاف اس کے اگر ایک شخص کوئی حکم کرے یا کسی امر میں رائے دے تو اس میں صدہا عیب نکال دیتے ہیں

وجہ اس کی یہی ہے کہ گورنمنٹ کی وقعت دل میں ہے اور دوست کی نہیں کیونکہ وہ آپ کے برابر کا ہے اور گورنمنٹ بالادست ہے۔

صاحبو — ذرا غور کرو کہ خدا تعالیٰ کے احکام میں علت ڈھونڈ کر آپ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عظمت آپ کے دلوں میں نہیں رہی۔ اور اگر اس کے سوا کوئی دوسری وجہ ہے تو مجھے بتلا دیجئے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے حکم یا رائے کو باوجود اس کے بالادست نہ ہونے اور ہمارے دل میں اس کی عظمت نہ ہونے کے بھی اس وجہ سے کہ ہم اس رائے کو اپنے لئے مفید سمجھتے ہیں تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص کسی طبیب کے پاس گیا اور جا کر مرض کی تشخیص کرائی اور نسخہ لکھوایا تو اس موقع پر آپ نے کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ اگر اجزاء نسخہ کی حکمت اور علت اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس نے طبیب سے دریافت کیا ہو یا اس کے ساتھ الجھنے لگا ہو کہ یہ اوزان خاص کیوں رکھے گئے۔ واللہ کبھی اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو زبان سے کبھی نہیں کہتے کیونکہ جانتے ہیں کہ ہمارے ہی فائدہ کے لئے اس نے نسخہ تجویز کیا ہے۔ ایسا نہ ہو چوں وچرا کرنے سے کبیدہ خاطر ہو کر ہم کو نکال دے اور پھر کبھی نہ گھسنے دے۔

تو صاحبو! اگر احکام خداوندی کی قدر بھی دلوں میں نہ ہو تب بھی اس لئے ان کو تسلیم کر لو کہ وہ صرف تمہارے ہی فائدہ کے لئے تجویز کئے ہیں۔ ایسا نہ ہو تمہارے اعتراض سے خدا تعالیٰ خفا ہو جائیں اور تم پر کوئی مصیبت آپڑے

من نہ کردم خلق تا سودے کنم   بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

میں نے مخلوق کو نفع حاصل کرنے کے لیے نہیں پیدا کیا بلکہ سخاوت کے لیے پیدا کیا ہے۔

تو اگر احکام خداوندی کی وقعت، گورنمنٹ کے احکام کے برابر نہیں ہے تو حکیم ہی کا سا برتاؤ کیا ہوتا۔ اور جب، یہ بھی نہیں، تو معلوم ہوا کہ احکام خداوندی کی اتنی بھی قدر نہیں۔ البتہ حکیم کی تجاویز میں ایسے لوگ ضرور چھیڑ چھاڑ نکالا کرتے ہیں جن کو نسخہ پینا منظور نہ ہو بلکہ محض مشغلہ کے طور پر گئے ہوں۔ تو میں لوگوں کے حالات دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر وہی لوگ، احکام خداوندی میں لم کیف کرتے ہیں جن کو کچھ کرنا نہیں ہوتا۔ اور جن کو عمل کرنا ہوتا ہے وہ اگر سوال کرتے ہیں تو یہ کہ نمازیں فرض کس قدر ہیں واجب کتنے۔ کیونکہ اُن کو یہ فکر ہے کہ لاعلمی میں ہم سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے جس سے نماز ہی جاتی رہے۔ اُن کو لم وکیف سے بالکل تعلق نہیں ہوتا۔

پس حجت تلاش کرنے کے دو سبب ہوئے۔ ایک تو احکام کی وقعت نہ ہونا۔ دوسرے عمل کی نیت نہ ہونا۔ اور علل تلاش کرنے والوں کے دلوں میں نہ وقعت ہے نہ عمل کی نیت ہے۔ بہر حال مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت ہے جو وحی کی عظمت اور قدر نہیں کرتے اور ایک ایسی جماعت ہے جو وحی پر نہیں چلتے۔ ان دونوں کے لیے معیار وحی کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔

صراطِ مستقیم | بالجملہ جس طرح معاملات، حکام و رعایا میں معیار تعیین و تصحیح کا قانون ہے اسی طرح طریق نجات کے لیے بھی معیار صحیح قانون الٰہی ہے جس کو وحی کہا جاتا ہے اور جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ط | جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے اس کو پڑھئے اور نماز کی پابندی کیجئے۔

کہ جو آپ پر وحی ہوا ہے اُس کو پڑھئے۔ تو خلاصہ دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نکلا کہ جو وحی سے ثابت ہو وہ خدا تعالیٰ کا رستہ ہے۔ اور ھٰذا صِرَاطِی مستقیما میں صراط کو جو اپنی طرف منسوب و مضاف فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ تک پہنچانے والا میرا تبلایا ہوا رستہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو رستہ خدا تک پہنچانے والا ہوگا وہ مستقیم ہی ہوگا اس لئے مستقیما فرمایا اور مستقیم کے یہ معنی نہیں کہ کوئی خط مستقیم ہے۔ نیز یہ بھی مقصود نہیں کہ خدا تعالیٰ کا تبلایا ہوا کوئی دوسرا غیر مستقیم رستہ بھی ہے جس سے احتراز کرنے کو اس کی صفت مستقیم لائے ہوں بلکہ خدا تعالیٰ کا ایک ہی رستہ تبلایا ہوا ہے جو کہ مستقیم ہی ہے تو آج کل چونکہ لوگوں نے اس طریق کو معیار نہیں بنایا اس لئے بہت سے فرقے ہو گئے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ فرقوں سے مراد مسلمانوں کے فرقے ہیں کافروں کے نہیں۔ تو بعض تو وہ ہوئے جنہوں نے وحی الٰہی کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو اس دیہاتی نے کیا تھا کہ وحی کو وحی تو مانا مگر اس میں تغیر و تبدل کرنے لگے۔

آسمان اور سائنس

چنانچہ مسلمانوں کے ایک بڑے فرقہ کی یہ کوشش ہے کہ قرآن کی آیتوں کو جس طرح بن سکے سائنس پر منطبق کیا جائے اور ایسے لوگ علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ لکیر کے فقیر ہیں۔ صاحبو! میں دعویٰ کرتا ہوں کہ سائنس کا کوئی تحقیقی مسئلہ قرآن کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا اور

تحقیقی کی قید اس لیئے لگائی ہے کہ سائنس کے مسائل دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ محض تخمین سے اُن میں کام لیا گیا ہے اور اکثر اسی قسم کے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں کہ جو تحقیق سے ثابت ہوئے ہیں۔ تو جو مسائل تحقیقی ہوں گے وہ کبھی قرآن کے کسی دعویٰ کے معارض نہیں ہوں گے۔ کیونکہ قطعی عقلی قطعی نقلی کے معارض نہیں ہو سکتا۔

صاحبو۔۔۔ آج کل تو تحقیق کا زمانہ ہے اور مسائل میں غور و فکر سے کام لیا جاتا ہے تو ذرا اس میں بھی تو غور کرو کہ اہل سائنس کے جتنے دعاوی ہیں سب صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ مثلاً اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں۔ ستارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں۔ تو دیکھو، یہ مسئلہ ظنی ہے یا یقینی۔ تو سائنس کی رُو سے آسمان کا عدم قطعی طور سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ آج تک جتنی دلیلیں نفی آسمان پر قائم کی گیئں، اُن سب کا خلاصہ عدم العلم ہے جو کہ عدم الوجود کو مستلزم نہیں۔

وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے کیونکہ وجود آسمان فی نفسہ ممکن ہے یعنی آسمان کا وجود و عدم دونوں عقلاً برابر ہیں۔ اور یہ عقلی مقدمہ ہے کہ جس ممکن کے وجود کی خبر کوئی مخبر جو قطعاً صادق ہو دیتا ہے تو اُس ممکن کا وجود ثابت قطعی ہوتا ہے اور اس کے وجود کی خبر ایک مخبر صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے۔ پس ان تینوں مقدموں میں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ آسمان موجود ہے۔ اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بناء پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممتنع پس نہ ضروری الوجود ہوا نہ ضروری العدم۔ تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہا جا سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت العدم میں

زمین آسمان کا فرق ہے۔

امریکہ کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ تھا اُس وقت تک بھی ہم یوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں ہے البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہم کو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا او یہ ہم کو مضر نہیں کیونکہ ہم تقریر سابق سے اُن کو وجود آسمان تسلیم کرا دیں گے البتہ اس کے ضروری الوجود نہ ہونے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اہل یونان نے وجودِ آسمان پر عقلی دلائل قائم کیے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفۂ یونان کے دلائل قریب قریب سب مخدوش ہیں جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں۔ واقعیت یہی ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم۔

رہی یہ بات کہ علی العموم اس نیلگوں رنگ کو جو کہ جانب فوق میں نظر آتا ہے آسمان سمجھا جاتا تھا۔ اور آج یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ نیلگوں رنگ، آسمان نہیں ہے۔ اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اوّل تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے وہ خود ابھی مخدوش ہیں اور بنا، الفاسد علی الفاسد ہے۔ دوسرے اگر ثابت ہو بھی جائے کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے تب بھی اس سے عدم وجود آسمان جب ہی ثابت ہوتا ممکن ہے کہ آسمان اس سے آگے ہو۔

پس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت ہے دلائل سائنس سے متصادم ہے سخت غلطی ہے کیونکہ سائنس اس میں بالکل ساکت ہے اور قرآن ناطق اور تصادم و تعارض ناطقین میں ہوتا ہے ساکت و ناطق میں نہیں ہو سکتا اور جب

تعارض نہیں ہے تو سمار کی تفسیر کو اکب یا ما فوقنا وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہو گی اور ایسے محرفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ انہوں نے وحی کو معیار نہیں بنایا۔ کیونکہ باوجود وحی کو ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی۔ جس طرح اس دیہاتی کو کہا گیا تھا کہ اس نے قانون پر عمل نہیں کیا۔ ایک صورت تو وحی کو معیار نہ بنانے کی یہ تھی۔

وحی اور حدیث

ایک اور یہ صورت ہے کہ بعض لوگ وحی کو مانتے بھی ہیں اور اس کی حقیقت کو بھی کچھ سمجھتے ہیں لیکن اس کو قرآن میں منحصر سمجھتے ہیں اور فقہ وحدیث کو وحی سے خارج کر دیتے ہیں تو غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ لوگ بھی وحی کو نہیں مانتے اور اس کو معیار نہیں سمجھتے۔ وجہ یہ ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ قانون کی شرح اگر مقنن کر دے تو وہ شرح بھی قانون ہی ہے۔ یا اگر اصول اقلیدس سے اشکال جدیدہ بنائی جائیں تو ان اشکال کو بھی اقلیدس ہی کی اشکال کہا جائے گا۔

پس حدیث تو چونکہ وحی ہے اگرچہ غیر متلو ہے۔ اس لئے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی شرح ہے اور اس لئے اس کا حکم بھی قرآن شریف کا سا ہے اور مسائل فقہ چونکہ انہی اصول پر مبنی ہیں جو قرآن وحدیث میں ہیں اس لئے وہ بھی حکم میں وحی کے ہوں گے۔ تو وحی کبھی جلی ہوتی ہے کبھی خفی۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ۔ چنانچہ جب حضورؐ پر آیت

اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ

نازل ہوئی تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ شاید وساوس پر بھی گرفت ہو۔ اس لئے بہت گھبرائے

اُن کی گھبراہٹ پر دوسری آیت نازل ہوئی جس نے اُس کی تفسیر کر دی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔ اس آیت نے بتلا دیا کہ وساوس پر جب تک کہ وہ وسوسے کے درجے میں رہیں مواخذہ نہ ہوگا۔ نیز حدیث کے ذریعے سے حضورؐ نے اس کی تفسیر فرمائی۔

اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ عَمَّا وَسْوَسَتْ صُدُوْرُھَا مَا لَمْ تَعْمَلْ اَوْ تَتَکَلَّمْ اَوْ کَمَا قَالَ۔

پس حدیث قرآن کی تفسیر ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور بعض چیزیں چونکہ حدیث میں بھی مجمل رہ گئی تھیں مثلاً مسائل ربوا میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مِثْلًا بِمِثْلٍ یَدًا بِیَدٍ وَالْفَضْلُ رِبٰوا۔ اور دوسری جگہ یہ فرمایا کہ دَعُوا الرِّبٰوا وَالرِّیْبَۃَ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ربوا حرام ہے۔ مگر اس کی جزئیات کا پتہ اس سے نہیں چلتا تھا۔ ہمارے فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بمثل اور ید ابید سے سب جزئیات کو نکال دیا جن کو عوام الناس نہ سمجھ سکتے تھے اور اسی لیے علم اصول مدوّن کیا۔ نیز یہ بھی کہہ دیا کہ اَلْقِیَاسُ مُظْہِرٌ لَا مُثْبِتٌ۔ جس میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ جو کچھ کہا ہے حدیث و قرآن ہی کی تفسیر ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جا بجا یہ ارشاد فرمایا کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وحی سے فرماتے ہیں۔ کوئی بات وحی کے خلاف نہیں، تو اس سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو حدیث یا فقہ کو نہیں مانتے اور محدثین اور فقہا پر اعتراض کرتے ہیں۔

اہمیتِ حدیث

صاحبو! حدیث سے کیونکر استغناء ہو سکتا ہے فرمایئے کہ اگر حدیث کو نہ مانا جائے تو رکعات کی تعداد یا اوقاتِ نماز کی تعیین کس طرح معلوم ہو گی۔ اگرچہ اوقات خمسہ کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے، لیکن وہ اس طرح ہے کہ جس کو پیشتر سے معلوم ہو وہ اُن پر منطبق کر سکتا ہے ورنہ خود قرآن سے بلا مدد حدیث تعیین نہیں ہو سکتی کیونکہ قرآن میں صراحۃً نہیں ہے۔ اشارات ہیں اور تعداد رکعات کا اشارہ بھی نہیں اور یوں زمین کا آسمان مان لیا جائے تو اس کو ثبوت بالقرآن نہ کہا جائے گا۔ مثلاً ایک صاحب نے تعداد رکعات کو قرآن کی اس آیت سے ثابت کیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔

سب تعریفیں اُس خدا کے لئے ہیں جو آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پردار بازو ہیں۔

اور کہا ہے کہ اس آیت سے نماز کا دو رکعت اور تین رکعت اور چار رکعت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ صاحبو! کہاں فرشتوں کا ذکر، کہاں رکعات کی تعداد۔ یہ سب نفس کا زیغ اور کید ہے۔ میں بالقسم کہتا ہوں کہ نفس کا کید ایسی بلا ہے کہ بہت سی اصلاح کرنے سے بھی دفع نہیں ہوتا اور جس نے اصلاح ہی نہ کی ہو اُس کے کید کے دُور ہونے یا سرے سے کید نہ ہونے کی تو کیا امید ہو سکتی ہے اور وہ کید یہ ہے کہ نفس نے دیکھا کہ حدیث و فقہ میں احکام بکثرت ہیں اور ان سب پر عمل ہونا دشوار ہے۔ اس لئے اُس نے

یہ ترکیب نکالی کہ ان سب کو چھوڑو صرف قرآن شریف کو لو۔ اور اپنی مرضی کے موافق تفسیر کر دو کہ جس سے کچھ کرنا ہی نہ پڑے ۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس زمانے میں احمال کیمیاوی کی بہت ترقی ہوئی کہ دین کا بھی ست نکل آیا۔ صاحبو! جس کو طلب شریعت ہو گی وہ کبھی ایسی ترکیبیں نہیں نکال سکتا۔ دیکھئے جس کو بھوک کی شدت ہوتی ہے، وہ زیادہ کا طالب ہوا کرتا ہے نہ یہ کہ موجود کو بھی اڑانے کی فکر کرے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

نہ حُسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

نہ اُس کے حُسن کی کوئی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی مستسقی پیاسا مرجاتا ہے اور دریا اسی طرح باقی رہتا ہے۔

حقیقت میں جب طلب ہوتی ہے تو موجودہ ذخیرے کو پُن کر بھی تمنا ہوتی ہے کہ کچھ اور ہوتا اور جب طلب نہیں ہوتی تو سب میں اختصار کیا جاتا ہے یہاں تک تفسیر والرائے کی سماتی ہے کہ ایک صاحب نے حرمت ربوا ہی کا انکار کر دیا اور کہا کہ کلام مجید میں جو ربوا آیا ہے وہ بضم الرائے ہے جس کے معنی اُچکا پنے کے ہیں۔ چونکہ اعراب حضورؐ کے زمانے میں نہ تھے بعد کو لگائے گئے۔ اس لئے غلطی ہو گئی اور بکسر الرائے لکھ دیا گیا۔

صاحبو! ربا بضم الرائے عربی کا لغت تو ہے نہیں جس کے معنی اُچکا پن لئے گئے ہیں پس کیا یہ لفظ فارسی کا قرآن میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اور محرفین پر تو زیادہ افسوس نہیں کہ وہ تو اپنے مطلب کے لئے کرتے ہیں۔ مگر افسوس ان پر ہے جو قرآن

شریف کو مانتے ہیں اور پھر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سب احکام قرآن سے ثابت ہو جائیں۔ یہ سچ ہے ؎

دوستی بے خرد چو دشمنی ست　　حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

واللہ اس وقت وہ حالت ہے کہ دین دار اور بے دین سب کی حالت خراب ہے۔ وہ شعر یاد آتا ہے جو کسی نے حضورؐ میں عرض کیا ہے کہ ؎

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

موضوع قرآن

ایک صاحب مجھ سے ملے۔ کہنے لگے کہ ڈاکٹری تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ منی میں کچھ کیڑے ہوتے ہیں۔ مجھے مدت سے خیال تھا کہ قرآن کی کسی آیت سے بھی یہ بات ثابت ہو تو اچھا ہے۔ چنانچہ ایک روز میں قرآن شریف پڑھ رہا تھا۔ اس میں یہ آیت نکلی۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ط اور علق جونک کو کہتے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔

بھلا خیال تو فرمایئے کہ آیت کے یہ معنی ہیں؟ کہاں جونک کہاں کیڑے، کہاں ڈاکٹری کے مسائل کہاں قرآن شریف۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص فن طب کی کتابوں میں کپڑا بننے کی ترکیب تلاش کرنے لگے یا فن طب میں حدیث ڈھونڈنے لگے۔ چنانچہ ایک صاحب نے ایسا کیا بھی کہ میرے پاس طب اکبر یا میزان الطب لے کر آئے اور کہنے لگے کہ آپ رسم بسم اللہ کو منع لکھتے ہیں حالانکہ اس کتاب میں موجود ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسینؓ یا حسنؓ کا چارسال چار ماہ چار دن کی عمر میں مکتب کرایا اور لوگوں کو جمع کیا۔

صاحبو — جس فن کی کتاب ہو اُس فن کے مسائل اُس میں تلاش کرنے چاہئیں

تو اب یہ دیکھ لیا جائے کہ قرآن شریف کس فن کی کتاب ہے۔ قرآن جغرافیہ نہیں کہ اس میں جغرافیہ کے مسائل ڈھونڈھیے۔ طب ابدان نہیں کہ بخار کھانسی کی ادویہ اس میں ملیں۔ قرآن شریف طب روحانی ہے اور تہذیب نفس کی کتاب ہے۔ تو جیسے طب ابدان میں زراعت، اور صناعی کے مسائل نہ ملیں گے قرآن سے بھی بجز طب روحانی کے دوسرے مسائل کی تلاش سعی بے حاصل ہے۔ اور اگر کسی دوسری چیز کا ذکر آیا بھی ہے تو وہ بھی کسی روحانی مرض کے دفع کے لئے۔

مثلاً امراض روحانی کے ایک مرض جہل باللہ و بصفاتہ بھی تھا۔ قرآن نے اس کو دفع کیا اور اس ضرورت کے لئے یہ فرمایا کہ

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ — تحقیق زمینوں اور آسمان کو پیدا
وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ — کرنے میں اور دن اور رات کے
بدلنے میں اللہ کی توحید کی نشانیاں ہیں۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کو معلوم کرنے کے لئے مصنوعات میں غور کرو۔ مثلاً آسمان کے وجود میں، زمین کے وجود میں، رات اور دن کے وجود میں مگر نہ اس حیثیت سے کہ آسمان سیال ہے یا نہیں زمین کروی الشکل ہے یا مسطح بلکہ مطلق وجود اور مصنوع ہونے کے اعتبار سے۔ پس قرآن میں ایک مسئلہ بھی سائنس کا بحیثیت سائنس کے مذکور نہیں۔ اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں کیونکہ کسی طب کی کتاب میں جوتے بنانے کی ترکیب نہ ہونا اُس کتاب کا کمال ہے۔ مسلمانو! خدا کی قسم یہ قرآن کا غایت درجہ کمال ہے کہ اُس میں یہ خرافات نہیں ہیں۔ نہ قرآن کو اس کی ضرورت کہ زبردستی اُس میں ان مسائل کو داخل کیا جائے۔ ع

بر نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

اگر قرآن میں یہ خرافات ہوتے تو قرآن شریف کتاب الطبیعات ہوتی نہ کہ طب روحانی۔ لہذا قرآن سے کیڑوں وغیرہ کا وجود ثابت کرنے کی کوشش۔ ع

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست

ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر علق کے یہی معنی ہیں جو کہ ان ڈاکٹر صاحب نے فرمائے تو کیا وجہ ہے کہ اس کو نہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھا نہ ابوبکرؓ سمجھے نہ دوسرے صحابہ اور تابعین نے سمجھا۔ چنانچہ کسی نے یہ تفسیر نہیں کی۔ اگر کہا جائے کہ آج مسئلے کی تحقیق ہوئی ہے اس سے پیشتر یہ محقق نہ تھا تو اس میں اول تو اپنے اسلاف کے کتنے بڑے جہل کا اقرار ہے۔ دوسرے اگر کوئی ملحد تم سے کہے کہ تمہارا قرآن نازل ہوا محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور پڑھا تمام صحابہ وتابعین نے لیکن سمجھا ہم نے تو تم کیا جواب دوگے اور اگر قرآن ایسا ہی وسیع ہے کہ اس میں ہر چیز کو داخل کیا جا سکتا ہے تو پھر اپنے کو اور اپنے متعلقین کو بھی داخل کر دو۔

جیسے مشہور ہے کہ کسی گاؤں میں تین چودھری تھے۔ ایک کا نام ابراہیم تھا دوسرے کا موسےٰ، تیسرے کا عیسیٰ۔ امام نے نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ سورت پڑھی جس کے اخیر میں ہے صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى۔ تو عیسےٰ چودھری خفا ہو گیا امام نے پھر وہی سورت پڑھی اور موسیٰ کے بعد عیسیٰ بھی بڑھا دیا۔

اسی طرح مجھ سے ایک مقام پر ایک ڈاکٹر ملے۔ کہنے لگے کہ جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جس طرح حیوانات میں مذکر ومونث کا جوڑا ہوتا ہے اسی طرح نباتات کے تخم میں بھی ہوتا ہے کہ تخم کا ایک حصّہ نر ہوتا ہے دوسرا مادہ

مجھے خیال ہوا کہ قرآن سے بھی یہ بات ثابت ہو تو بہت خوب ہو۔ ڈپٹی صاحب کا ترجمہ دیکھا اس میں بھی نہ ملا۔ آخر ایک روز بیوی سورۂ یٰسین پڑھ رہی تھی۔ اُس میں جو یہ آیت پڑھی۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ — الآیۃ	وہ پاک ذات ہے جس نے تمام متقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات زمین کے قبیل میں سے۔

تو فوراً سمجھ میں آگیا کہ اس آیت میں وہ مسئلہ مذکور ہے۔

صاحبو—— یہ خبط نہیں تو کیا ہے۔ اس آیت کو اس مسئلے سے کیا تعلق۔ زوج کے معنی خاص میاں بی بی کے نہیں ہیں بلکہ مطلق جوڑے کے معنی ہیں خواہ وہ مذکر و مؤنث کے طور پر ہو یا دوسرے طور پر۔ چنانچہ زوجی الخف بولتے ہیں۔ بس حق تعالیٰ نے اس میں یہ فرمایا ہے کہ نباتات میں بھی اقسام مختلفہ ہیں نہ یہ کہ اُن میں میاں بی بی ہے۔ غرض بطور مثال کے یہ ایک مسئلہ پیش کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ بہت سے مسائل ہیں جو کہ بالکل تخمینی ہیں اور وہ قرآن سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ان مسائل سائنس پر قرآن شریف کی تفسیر کی بنا رکھی جائے اور چند روز کے بعد یہ دعاوی سائنس کے کاذب ثابت ہوں تو اس کی کیا تدبیر کی جائے گی کہ ملحدین اُس وقت آپ کو کہیں کہ دیکھئے تمہارے محققین اس مسئلے کو قرآن کا مدلول بتلا گئے ہیں اور یہ مسئلہ غلط ثابت ہوا۔ تو قرآن کا غلط ہونا ثابت ہو گیا اس کا کیا جواب دو گے۔

براہ کرم ورق نہ موڑیں

اساس احکام شرعیہ

افسوس ہمارے بھائی مسلمان ذرا غور نہیں کرتے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور بالکل نہیں سمجھتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ سمجھنے کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو تحقیق ہو اُس کا تو اُن کے پاس سامان نہیں۔ یا علماء کی تقلید ہو، اس سے عار آتی ہے اور بڑا لطف یہ ہے کہ قرآن شریف سے ثابت کرنے کی کوشش ہے مگر ثابت کرنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔

چنانچہ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ داڑھی رکھانے کا وجوب قرآن سے ثابت نہیں تو دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ میں قرآن سے ثابت کرتا ہوں۔ دیکھئے قرآن میں ہے۔

قَالَ یَابْنَ اُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ — اے میرے حقیقی بھائی! میرے سر اور داڑھی کو مت پکڑ۔

تو اگر حضرت ہارون علیہ السلام کے داڑھی نہ تھی تو حضرت موسےٰ علیہ السلام نے کیسے اس کو پکڑ لیا اور اُن کو لاحجن کہنے کی ضرورت پڑی۔ اس جواب کو سُن کر معترض صاحب بھی خاموش ہوگئے۔ حالانکہ اس جواب سے صرف داڑھی کا وجود معلوم ہوتا ہے۔ وجوب سے اس میں تعرض نہیں اور جب دوسرے وقت اُن مستدل صاحب سے اُن کے جواب کی حقیقت ظاہر کی گئی تو فرماتے ہیں کہ خیر اُس وقت تو معترض کو خاموش کر دیا۔

صاحبو۔۔۔ اہل علم کو تو اس قسم کے جوابوں سے عار آتی چاہیے اور یہ خرابی اس کی ہے کہ اگرچہ نیت خراب نہیں لیکن چونکہ مجیب نے دیکھا کہ ہمارے

زمانے کے لوگ بغیر آیت قرآن پیش کئے مانتے نہیں اس لئے سائل کے تابع ہوکر ہر جواب کو قرآن سے ثابت کرنے لگے۔ حالانکہ اس کا کھلا نتیجہ تحریف ہے پس آج ہی سے کیوں تحقیقی جواب نہ دیا جائے اور سائل کی تبعیت چھوڑ دی جائے مثلاً داڑھی رکھانے کے متعلق میں تحقیقی جواب عرض کرتا ہوں لیکن اول یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ جواب بالکل پھیکا اور سیدھا سادہ ہوگا کیونکہ تحقیقی بات ہمیشہ بے مزہ ہوتی ہے۔

دیکھئے غالب اور مومن خاں کے اشعار میں کیا کچھ لطف آتا ہے اور حکیم محمود خاں کے نسخے پر کسی کو وجد نہیں ہوتا۔ غرض وہ تحقیقی جواب یہ ہے کہ داڑھی رکھنے کے وجوب کا ثبوت قرآن سے دینا ہمارے ذمہ نہیں ہے اور درحقیقت یہ سوال کہ قرآن سے ثابت کرو متضمن ایک دعوے کو ہے کہ احکام شرعیہ کا ثابت ہونا قرآن ہی میں منحصر ہے۔ تو اول سائل سے اس دعوے کی دلیل دریافت کی جاوے گی۔ جب وہ اس دعویٰ پر دلیل قائم کردے گا اس وقت ہمارے ذمہ جواب ہوگا۔ اور جب وہ جواب نہ دے سکے گا تو ہم ثابت کریں گے کہ اصول شریعت کے چار ہیں۔

۱۔ قرآن شریف ۲۔ حدیث شریف

۳۔ اجماع ۴۔ قیاس

پس جب کسی حکم کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں حکم شریعت سے ثابت ہے اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ یہ حکم ان چاروں میں سے کسی ایک سے ثابت ہے ہاں اگر کسی ایک سے بھی ثابت نہ کر سکے تو حکم شرعی کہنا غلط ہوگا۔

اس کی تائید کے لیے میں ایک قانونی نظیر بیان کرتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص نے عدالت میں جاکر کسی دوسرے شخص پر ایک دعویٰ کیا۔ عدالت نے اُس سے دعویٰ کے گواہ طلب کیے اور اُس نے قانون کے موافق گواہ پیش کر دیئے جن پر کسی قسم کی جرح نہیں ہوسکی۔ کیا اس کے بعد مدعا علیہ کو یہ حق ہے کہ وہ یوں کہہ سکے کہ میں ان گواہوں کی گواہی تسلیم نہیں کرتا۔ البتہ اگر صاحب جج خود آکر گواہی دیں تو میں تسلیم کروں گا۔ اور اگر کوئی مدعا علیہ ایسا کہے تو عدالت اس کو کیا جواب دے گی یہی کہ یا ان گواہوں میں جرح کرو یا دعویٰ تسلیم کرو۔ وجہ اس جواب کی یہ ہے کہ اثبات دعویٰ کے لیے مطلق حجت کی ضرورت ہے، حجت خاص کی ضرورت نہیں ہے۔

پس کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ میں فلاں حکم کو قرآن ہی سے مانوں گا حدیث یا اجماع وغیرہ سے تسلیم نہ کروں گا۔ البتہ اگر کسی حدیث یا اجماع میں جرح کرے تو اُس کا حق ہے اور علماء اس جرح کا جواب دینے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ہے تحقیقی جواب لیکن ہمارے بھائیوں نے اس طرز کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور بالکل معترضین کے تابع ہو گئے ہیں لیکن کہاں تک اُن کے ٹکڑوں کے پیچھے ہاتھ دیں گے کبھی تو عاجز ہونا پڑے گا۔ بہتر یہ ہے کہ

بردئے خود درِ طماع باز نتواں کرد

ایسے ہوس ناک لوگوں کا اوّل ہی علاج کرنا چاہیئے۔ خوب سمجھ لو کہ قرآن شریف ہی سے ہر بات کے ثابت کرنے کی کوشش کرنا سخت مشکل میں پڑنا ہے حدیث فقہ سب قرآن ہی کے حکم میں ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ حکیم علوی خاں کے مطب کو لے کر ایک شخص نے
جمع کیا اور ہر نسخے کے متعلق ضروری ہدایات لکھ دیں کہ فلاں نسخہ غلبۂ صفرا کے لیے
ہے اور فلاں نسخہ غلبۂ بلغم کے لیے۔ اور دوسرے شخص نے اُن سب نسخوں کی تبویب
کر دی کہ امراض راس کے نسخے الگ کر دیئے اور امراض چشم کے الگ۔ تو اس مفسر
اور مبوب کو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ حکیم علوی خاں کا مطب نہیں ہے بلکہ یہی کہیں گے
کہ عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ اور یہ کہا جائے گا ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش — من انداز قدت را می شناسم

کہ جو لباس چاہے پہن لے میں تو تیرے قد سے تجھے پہچان لیتا ہوں

ہاں اس پہچان کے لیے طلب شرط ہے۔ اگر طلب نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ورنہ
طالب کو حدیث فقہ سب میں قرآن ہی نظر آئے گا۔ صاحبو! یہ تفریق طلب نہ ہونے
کا نتیجہ ہے۔ طالب کی تو یہ شان ہوتی ہے ؎

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی
ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

یعنی میری جان فگار اور چشم بیدار میں تو ہی سمایا ہوا ہے جو کچھ دُور
سے ظاہر ہوتا ہے تجھی کو گمان کرتا ہوں۔

ایسا شخص حدیث و اجماع کو ہرگز الگ نہ سمجھے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ
بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ جس طرح محبوب کبھی غیر محبوب کے لباس میں بھی جلوہ گر ہوتا
ہے اسی طرح کبھی غیر مطلوب بھی مطلوب کے لباس میں آجاتا ہے تو ان میں تمیز
کرنی بھی نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ آج کل یہ مرض عام ہے کہ غیر محبوب کو محبوب

سمجھ کر اس پر عاشق ہو گئے ہیں۔

ابتلاء الحاد و بدعات یہ وہ لوگ ہیں جو اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اس میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ تو گویا ایک جماعت نے اتباع کو ایسا چھوڑا کہ وہ الحاد تک پہنچ گئے۔ دوسرے فرقے نے اس شدت سے اتباع کا دعوےٰ کیا کہ بدعات میں مبتلا ہو گئے۔ یعنی اُن کو اپنی رسوم بھی عبادات نظر آنے لگیں اور وہ رسوم اگرچہ جائز بھی ہوں لیکن اُن کو عبادت سمجھنا سخت غلطی ہے۔ کیونکہ عبادت وہ ہے جس پر ثواب کا وعدہ ہو اور ان رسوم میں ثواب کا وعدہ کسی حدیث یا آیت میں نہیں ہے۔

غرض اس وقت یہ دو مرض کہ دلائل کو غیر دلائل سمجھنا جو کہ الحاد ہے اور غیر دلائل کو دلائل سمجھنا جو کہ بدعت ہے ہندوستان میں بکثرت ہے۔ اُمت محمدیہ میں ذی اثر دو فرقے ہیں۔ ایک امرا کا اور ایک عام فقراد کا۔ ان دونوں فرقوں کی حالت نہایت درجہ خراب ہے اور ان دونوں فرقوں کی بدولت بہت زیادہ الحاد اور بدعت دنیا میں پھیلا۔ اُمرا میں الحاد زیادہ پایا جاتا ہے اور فقرا میں بدعت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور اگرچہ ایک تیسرا فرقہ علماء کا بھی ہے لیکن میں نے ان کو اس لئے[1] اضلال سے خارج کیا ہے کہ جہاں تک دیکھا جاتا ہے علماء کا دوسروں پر اثر کم ہے۔ پس ان کی وجہ سے چنداں خرابی نہیں پڑ سکتی۔

---

[1] اس سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ علماء جو کبھی چندہ وغیرہ کی ترغیب دیتے ہیں اُن کے ترغیب دینے میں اس قدر خرابیاں نہ ہوں گی جتنی اہل

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۶۴۸)

اور جن علماء کا کم و بیش اثر ہے تو وہ اُن کی بزرگی اور درویشی کے خیال کی وجہ سے ہے۔ صرف عالم ہونے کی وجہ سے کسی عالم کا کچھ اثر نہیں۔ بلکہ جو صرف عالم سمجھے جاتے ہیں اُن کی تو یہ حالت ہے کہ اگر عوام اہل دنیا اُن کی توہین نہ کریں تو غنیمت ہے۔ یا اگر کسی عالم کے باوجود بزرگ نہ سمجھے جانے کے عزت اور اثر ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے اعتبار سے ذی جاہ ہوتا ہے اور علی العموم اہل جاہ کی طرف لوگ اپنے کو منسوب کرتے ہیں۔ کیونکہ کسی بڑے کی عظمت کرنا خود اپنی عظمت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اُن کے ساتھ منتسب ہونے سے اپنی بڑائی ہوتی ہے۔ غرض صرف عالم ہونے کی وجہ سے کسی عالم کا کچھ اثر نہیں۔ یا فقیری کی وجہ سے ہے یا جاہ کی وجہ سے اور بلفظ دیگر امیری کی وجہ سے۔ ورنہ اگر صرف عالم ہونے کی وجہ سے کسی عالم کا اثر ہوتا تو طلباء کا بھی بہت اثر ہونا چاہیئے تھا کہ وہ بھی تو عالم ہیں۔ اور میں دوسروں کو کیا کہوں خود اپنے اندر بھی یہی حالت دیکھتا ہوں کہ طلباء کی زیادہ وقعت نظر میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علماء کی من حیث العلم کچھ وقعت نہیں ہے۔

ایک رئیس صاحب کے ہاں ایک طالب علم کا کھانا مقرر تھا۔ چونکہ اکثر اس کو وہاں انتظار کرنا پڑتا تھا، اس لئے اُن کو خیال ہوا کہ اتنا وقت بیکار جاتا ہے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۶۴۷) دنیا کے طلب چندہ میں خرابیاں واقع ہوتی ہیں کیونکہ اہل دنیا کا ایک دوسرے پر اثر ہوتا ہے اور وہ دباؤ سے کام لے سکتے ہیں اور کام لیتے ہیں بخلاف علماء کے کہ وہ دباؤ ڈال ہی نہیں سکتے۔

اس میں اگر کچھ دین ہی کی خدمت ہو تو اچھا ہے۔ رئیس سے کہنے لگا کہ میں یہاں دیر تک بیٹھا رہتا ہوں۔ اگر آپ کا لڑکا کچھ پڑھ ہی لیا کرے تو اچھا ہے۔ رئیس صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب آپ نے عربی پڑھی تو یہ نتیجہ ہوا کہ میرے دروازہ پر کھانا لینے کے لئے آتے ہیں۔ میرا لڑکا پڑھے گا تو کسی دوسرے کے دروازہ پر جائے گا۔

اس حکایت سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ علماء کے ساتھ لوگوں کا کیا برتاؤ ہے اور علماء کا کتنا اثر ہے۔ اور جب علماء کا کچھ اثر نہیں تو ان کو ذی اثر لوگوں میں کیوں شمار کروں۔ اور اپنی اس حالت کو سن کر علماء کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اب وہ کیا کریں۔ اگر اب بھی ان کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو سخت افسوس ہے۔

مقامِ علماء خیر میں بتلاتا ہوں کہ ان کو بالکل استغناء چاہیئے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے ؎

اَرَی الْمُلُوْکَ بِاَدْنَی الدِّیْنِ قَدْ قَنَعُوْا
وَمَا اَرٰهُمْ رَضُوْا فِی الْعَیْشِ بِالدُّوْنِ
فَاسْتَغْنِ بِالدِّیْنِ عَنْ دُنْیَا الْمُلُوْکِ کَمَا
اِسْتَغْنَی الْمُلُوْکُ بِدُنْیَاهُمْ عَنِ الدِّیْنِ

وہ دنیا کو لے کر تم سے مستغنی ہو گئے۔ تم دین لے کر ان کی دنیا سے مستغنی ہو جاؤ۔ میں خدا کے بھروسے پر کہتا ہوں کہ اگر اہل علم اہل دنیا سے مستغنی ہو جائیں تو خدا تعالیٰ ان کی غیب سے مدد کریں۔ بلکہ خود یہی اہل دنیا جو آج ان کو ذلیل سمجھتے ہیں، اس وقت ان کو معزز سمجھنے لگیں گے اور ان کے محتاج ہوں گے۔ کیونکہ ہر مسلمان کو

بحیثیت مسلمان ہونے کے جس طرح اپنی ضروریات کے لیے کم و بیش دنیا کی ضرورت ہے دین کی اُس سے زیادہ ضرورت ہے خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، رئیس ہو یا غریب۔ اور یہ ظاہر ہے کہ علماء کے پاس بقدر ضرورت دنیا موجود ہے اور اہل دنیا کے پاس دین کچھ بھی نہیں۔ تو اُن کو ہر ہر امر میں موت میں حیات میں، نماز میں، روزے میں، سب میں علماء کی احتیاج ہو گی۔ اور اگر کوئی کہے کہ مجھے دین کی ضرورت ہی نہیں تو وہ مسلمان ہی نہیں۔ غرض ایک وقت ایسا آئے گا کہ اہل دنیا خود علماء کے پاس آئیں گے۔ پس علماء کو بالکل استغناء چاہیئے اور خدا تعالیٰ کے دین میں مشغول ہونا چاہیئے۔

ہم لوگوں میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں کرتے۔ اگر خدا تعالیٰ سے ہم کو تعلق ہو تو کسی کی بھی پروا نہ رہے۔ البتہ میں علماء کو بد اخلاقی کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ بعضے استغناء بد اخلاقی کو سمجھتے ہیں۔

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نور اللہ مرقدہم امراء کی بہت خاطر داری کرتے تھے اور وجہ اس کی یہ فرماتے تھے کہ نِعْمَ الْاَمِیْرُ عَلٰی بَابِ الْفَقِیْرِ۔ یعنی جو امیر فقیر کے دروازے پر جائے وہ بہت اچھا ہے۔ پس جب کوئی امیر آپ کے دروازے پر آیا تو اس میں امارت کے ساتھ ایک دوسری صفت بھی پیدا ہو گئی یعنی نعم کی۔ پس اس صفت کی عظمت کرنی چاہیئے۔ لہذا بد اخلاقی کی اجازت نہیں۔ ہاں استغناء ضروری ہے۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔

اصل مقصود اس مقام پر یہ تھا کہ علماء کی وقعت اور اُن کا اثر کچھ نہیں کیونکہ جس کو دیکھئے علماء پر اعتراض کرنے اور اُن کو مشورہ دینے پر آمادہ ہے۔ ایک

صاحب ایک مرتبہ علماء پر نہایت برہم اور علماء کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ کچھ دیر تک تو بوجہ اس کے کہ وہ مہمان تھے میں نے صبر کیا۔ آخر جب وہ حد سے بہت ہی آگے نکل گئے تو میں نے پوچھا کہ علماء نے کیا قصور کیا۔ کون سی ایسی خطا اُن سے ہوئی۔ کہنے لگے کہ علماء انگریزی پڑھنے کو منع کرتے ہیں اور قوم کے تنزل کے سبب یہ ہیں۔ حالانکہ انگریزی کی بہت ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ اوّل تو یہ افتراء محض ہے۔ علماء ہرگز انگریزی پڑھنے کو منع نہیں کرتے۔ دوسرے قطع نظر انگریزی کے جواز اور عدم جواز کے آپ یہ تبلائیے کہ علماء کی ممانعت کا کچھ اثر ہے یا نہیں۔ اگر کہیئے کہ اثر ہے تو میں کہوں گا کہ کیا وجہ علماء کے اثر نے قوم کے بچوں کو عربی پڑھنے پر کیوں نہ لگا دیا۔ جب علماء ایسا نہیں کر سکے تو معلوم ہوا کہ علماء کا کچھ اثر قوم پر نہیں اور جب اثر نہیں تو علماء سے کچھ نقصان قوم کو نہیں پہنچا۔

اسبابِ تنزل اصل سبب قوم کے تنزل کا کوئی دوسرا امر ہے اور وہ یہ ہے کہ قوم علی العموم سُست، کام چور، آرام طلب ہے جفاکشی تو ہو نہیں سکتی اپنے چھٹکارے کے لئے مولویوں کے فتوی کو آڑ بنایا۔ صاحبو! کیا وجہ کہ تمام فتاوی میں سے علماء کا صرف یہی ایک فتوےٰ پسند ہوا کبھی دوسرے فتووں پر کیوں عمل نہ کیا گیا۔ وجہ یہی ہے کہ یہ اپنی مرضی اور نفس کے موافق تھا۔

ایک شخص سے کسی نے پوچھا تھا کہ قرآن کا کون سا حکم تم کو زیادہ پسند ہے کہنے لگا کہ كُلُوا وَاشْرَبُوا اور دعا کو پوچھا تو یہ تبلائی۔

رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ   اے پروردگار! ہم پر آسمان سے

دستر خوان پُر از نان نازل فرما۔

کیا کوئی شخص اس کو عامل بالقرآن سمجھے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ تابع نفس وہوا کہیں گے بس یہی حال آج کل علمار کی پیروی اور اُن کے اتباع کا ہے کہ جس بات کو اپنی مرضی کے موافق دیکھتے ہیں اُس میں علمار کو آڑ بنا لیتے ہیں۔

اس جملہ تقریر سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اثر جو کچھ ہے امرار اور فقرار کا ہے اور جو کچھ خرابیاں پھیلیں انہی دو فرقوں کی وجہ سے پھیلیں۔ پہلا فرقہ الحاد میں مبتلا ہے دوسرا فرقہ بدعات میں غرق ہے۔ پس اُس اُمت کے مریضوں کا کیا مآل ہو گا جس کے اطبار خود مریض ہیں۔

نیز علمار کے اس زمرہ سے خارج ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اگر خود بگڑیں بھی اور اعمال کو ترک بھی کر دیں تو اپنے کو گنہگار سمجھتے ہیں اور اپنے بُرے اعمال کی طرف کسی کو دعوت نہیں کرتے اور لوگوں کو اپنے اُس طرز پر چلانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو نیک ہی رستہ بتلادیں گے برخلاف امرار اور فقرار کے کہ اُن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جس رستہ پر ہم ہیں دوسرے بھی اسی پر ہولیں اگرچہ ہم اور وہ دونوں جہنم کے غار میں جا گریں۔

چنانچہ چند روز ہوئے کہ ایک روشن خیال نے یہ مضمون شائع کیا تھا کہ اسلام کی ترقی کو سب سے بڑی مانع نماز ہے۔ اگر علمار مل کر نماز کو اسلام سے خارج کر دیں تو اسلام کو بہت ترقی ہو۔ ہاں

ہاں اتنا ضرور ہوا کہ بعض عالموں نے اپنا طرز عمل ایسا کر دیا کہ اہل دنیا کو اُن کی بدولت خود علم سے نفرت ہو گئی۔ یعنی بعض علمار نے امرار سے ملنا اور اختلاط

کرنا اس قدر بڑھا دیا اور اس اختلاط کی وجہ سے اُن اُمراء کی ہاں میں ہاں ملانے لگے کہ اُن کو دیکھ کر اہلِ دنیا نے یہ سمجھا کہ سب عالم ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

ٹونک کا واقعہ ہے کہ ایک رئیس نے داڑھی منڈا رکھی تھی۔ ایک عالم نے اُن پر اعتراض کیا اور وہ رئیس متاثر بھی ہوئے۔ اتفاق سے مجمع میں ایک دوسرے صاحب بھی بیٹھے تھے اور یہ مولوی کہلاتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ داڑھی ہرگز نہ رکھنی چاہیئے کیونکہ اس میں جوئیں پڑ جاتی ہیں اور وہ زنا کرتی ہیں۔ فرمایئے اس رئیس کی نظر میں کیا وقعت اس عالم کی رہی ہوگی۔ اور زیادہ سبب ان صفات کا کمیٔ خاندان ہوتا ہے۔

ایک شخص نے ڈھاکہ میں مجھ سے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ انگریزی خوان طالب علم نہایت باہمت، عالی حوصلہ، جری، جفاکش ہوتے ہیں اور عربی خواں طالب علم نہایت پست ہمت، تنگ خیال، سست، کم حوصلہ ہوتے ہیں۔ مقصود اُن کا یہ تھا کہ یہ فرق عربی اور انگریزی کے اثر سے ہے۔ یعنی پست ہمتی وغیرہ عربی کے آثار ہیں اور علو حوصلگی وغیرہ انگریزی کے آثار ہیں۔ میں نے کہا جناب علو حوصلگی وغیرہ صفات جس قدر ہیں علو خاندان پر موقوف ہیں یعنی جو عالی خاندان ہوگا اُس میں یہ صفات ہوں گے۔ وہ خواہ عربی پڑھے یا انگریزی اور جو عالی خاندان نہ ہوگا اس میں یہ صفات نہ ہوں گی اگرچہ وہ انگریزی کے اعلیٰ پایہ کی ڈگری حاصل کر لے بلکہ اکثر واقعات اور مشاہدات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پست خاندان آدمی اگر عربی پڑھ لیں تو کم و بیش اُن کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں اور اگر انگریزی پڑھیں تو بالکل ہی برباد ہو جائیں۔ عربی و انگریزی کے آثار کا پورا مقابلہ اُس وقت ہو سکتا ہے

کہ ایک خاندان کے ایک طبیعت کے دو بچے لئے جائیں۔ ایک کو انگریزی شروع کرائی جائے اور دوسرے کو عربی اور دس برس کے بعد دونوں کا موازنہ کیا جائے اور جب کہ خوش قسمتی سے انتخاب ہی ایسا پاکیزہ ہو کہ عربی کے لئے جولاہے تیلی اور انگریزی کے لئے شرفا تو عربی کہاں تک اپنا اثر کرے اور کس حد تک اُن کی پستی کو مٹائے۔ اور اگر شرفار میں سے کوئی بچہ عربی کے لئے دیا بھی جاتا ہے تو ایسا کہ جو بالکل ہی کودن ہو۔ تو جب عربی میں سارے کودن ہی کودن منتخب ہوں گے تو پھر ان سے علو حوصلگی کی کیا امید ہوگی اور میں نے اُن سے کہا کہ آپ میرے ہمراہ چلئے تو میں آپ کو دکھلاؤں کہ علمار ایسے ہوتے ہیں۔

غرض ایسے علمار سے ایک ضرر پہنچ سکتا ہے اور میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس پر بھی کسی کو کمال حاصل ہو تو وہ اس دنادت وخست سے ضرور دُور ہوگا۔ سو ایسے لوگوں کو جب غور سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ عالم ہی نہیں ہیں کیونکہ علم کمال ہے اور کمال کا خاصہ ہے استغنار۔ دیکھئے بڑھئی راج لوہار جب اپنے فن میں کامل ہو جاتے ہیں تو کیسے مستغنی ہو جاتے ہیں۔ تو کیا علم ان ذلیل کاموں کے برابر بھی اثر نہیں رکھتا۔ ضرور رکھتا ہے اور بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ جس میں استغنا نہیں، اُس کے کمال ہی میں کمی ہے۔

علامہ تفتازانی کا واقعہ لکھا ہے کہ جب امیر تیمور کے دربار میں آئے تو امیر تیمور بوجہ لنگ ہونے کے پیر پھیلائے بیٹھا تھا۔ آپ نے بھی بیٹھ کر پیر پھیلا دیا۔ امیر تیمور کو ناگوار ہوا اور کہا کہ "معذورم دار کہ مرا لنگ است"۔ علامہ فرماتے ہیں کہ "معذورم دار کہ مرا لنگ است"۔

صاحبو! یہ ہے علم کا خاصہ۔ جن لوگوں کو آپ عالم کہتے ہیں یہ واعظ ہیں۔ جنہوں نے چند اردو و فارسی کے رسالے یاد کر لیے ہیں۔ اُن کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ لوگ اپنے کو علماء کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں۔ اور جہل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک واعظ صاحب نے سورۂ کوثر کا وعظ کہا اور ترجمہ پہلی آیت کا یہ کیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھ کو کوثر کے مثل دیا۔ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ کاف تو اعطینا کا مفعول ہے۔ پھر مثل کس لفظ کا ترجمہ ہے۔

اسی طرح ایک واعظ گنگوہ میں آیا اور وعظ کہا۔ جب جنت دوزخ کا تذکرہ آتا تو بجائے جہنم کے جہندم کہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ظالم نے کہیں لکھا بھی نہیں دیکھا صرف کسی کی زبان سے سن لیا ہوگا۔

اس سے بھی زیادہ پُر لطف یہ واقعہ ہے کہ سہارنپور میں ایک واعظ آیا۔ جمعہ کی نمازنہ کے بعد آپ نے پوچھا کہ ساہبو (صاحبو) یہاں اواج (وعظ) بھی ہوا کرے ہے۔ معلوم ہوا نہیں ہوتا۔ آپ نے پکار دیا بھائیو اواج (وعظ) ہوگی۔ لوگ ٹھہر گئے منبر پر پہنچ کر یٰسین شریف کی غلط سلط آیتیں پڑھیں اور غلط سلط ترجمہ کر کے دُعا مانگ کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی عالم نابینا موجود تھے۔ اُنہوں نے اُس کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری تحصیل کہاں تک ہے۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں ہماری تسیل ہے ہاپوڑ پھر اُنہوں نے صاف کر کے پوچھا کہ تم نے پڑھا کیا کیا۔ تو آپ فرماتے ہیں ہم نے سب کچھ پڑھا۔ نور نامہ، سانپ نامہ، دائی حلیمہ کا قصہ، معجزہ آل نبیؐ اور تو کیا جانے اللہ جھے۔

یہ نمونہ ہے واعظ صاحب کی لیاقت کا لیکن پھر بھی ان لوگوں سے اتنا

ضرر نہیں ہوتا کیونکہ دیکھنے والے اور سننے والے اُن کے اس ظاہر جہل کے سبب پہلے ہی معتقد نہیں ہوتے۔ البتہ ان لوگوں سے گہرا ضرر پہنچتا ہے جن کی زرق برق تقریریں، مہذب الفاظ، شستہ بندشیں مسلسل بیان معلوم ہوتا ہے کہ غزالی وقت خطبہ دے رہے ہیں یا رازیٔ زماں بول رہے ہیں مگر علم دیکھئے تو ہدایت النحو بھی شاید نہ پڑھی ہو۔ یہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو تباہ کیا۔ خود ڈوبے اور دوسروں کو بھی لے ڈوبے۔ غرض تحقیقی علماء پر کسی قسم کا الزام اس بارے میں نہیں آسکتا۔

رفع اختلاف کی صورت

ایک شبہ شاید کسی کو پیدا ہو کہ علماء میں چونکہ آپس میں اختلاف ہے اس اختلاف کی وجہ سے لوگ گمراہی میں مبتلا ہوتے۔ میں کہوں گا اگر اختلاف کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوئے تو اس میں بھی انہیں کا قصور ہے۔ اس لئے کہ اختلافات صرف طبقہ علماء میں منحصر نہیں۔ دنیا میں شاید کوئی جماعت، کوئی طبقہ ایسا ہو جس کے افراد متفق اللسان ہوں مثلاً فنِ طب، ڈاکٹری، صناعی، تجارت، غرض جس قدر بھی دنیا میں فنون ہیں سب میں اختلاف ہے۔ پس اگر کسی طبقے کا اختلاف عوام کے لئے ضرر رساں ہو سکتا ہے، تو اطباء اور ڈاکٹروں کا اختلاف کیوں ان کے لئے مہلک نہیں ہوا۔ وہاں کون سی تدبیر انہوں نے کی جس کی بدولت حکیم عبد المجید اور حکیم عبد العزیز کے اختلافات کے ضرر سے محفوظ رہے۔

تدبیر یہ کی کہ دونوں کو کسی معیار پر جانچ کر جس کو زیادہ کامل سمجھا اس کا دامن پکڑ لیا دوسرے کو چھوڑ دیا۔ صاحبو! کیا مستعار زندگی اور چند روزہ آرام کے لئے تو اس تدبیر کی ضرورت ہے اور حیات دائمی کے لئے اس تدبیر کی ضرورت نہیں

اگر نہیں معلوم ہوتی تو حیف ہے اس اسلام پر اور اگر ضرورت ہے تو کیوں اس تدبیر پر عمل نہیں کیا جاتا اور اختلاف کے ضرر سے کیوں نہیں بچا جاتا۔ اور جس طرح انتخاب اطباء کے لیئے مثلاً یہ معیار ہو گا کہ اُس نے کسی بڑی جگہ پڑھا ہو، سند حاصل کی ہو اُس کے ہاتھ سے اکثر مریض اچھے ہوتے ہوں، اُس میں حرص وطمع نہ ہو، بندۂ دنیا نہ ہو، مریضوں پر شفقت ہو، تشخیص مرض میں پوری مہارت ہو۔ اسی طرح علماء دین بھی انتخاب اسی معیار سے ہوگا کہ جس کے ہاتھ سے اکثر لوگوں کو ہدایت ہوتی ہو، طالبین پر شفقت کرتا ہو، خود دنیا سے نفور ہو، گناہوں سے بچتا ہو، کسی بزرگ کی صحبت میں رہا ہو، اُس پر خشیت الٰہی غالب ہو پس اُس کے کہنے پر عمل کرو۔ کیونکہ یہ تم کو جو کچھ بھی بتلائے گا اُس میں خدا کا خوف کرے گا۔ اور گڑبڑ کچھ کا کچھ نہ بتلائیگا لیکن دوسروں کو بھی بُرا نہ کہو ——— بہر حال یہ خدشہ بھی جاتا رہا کہ علماء کے اختلاف سے لوگ گمراہ ہوئے۔

اب صرف دو فرقے ایسے رہ گئے کہ جن کی وجہ سے زیادہ تر گمراہی پھیلی ایک امراء دوسرے فقراء، کہ ان میں اکثر گمراہ کُن اور گمراہ ہیں۔ (الا ماشاء اللہ) بعض ایسے بھی ہیں کہ اُن کو ابراہیم ادھم رح کہنا چاہیئے اور جنید بغدادی رح۔

حضرت جنید رح کی یہ حالت تھی کہ ایک شخص آپ کا امتحان کرنے آیا اور دس برس تک آپ کے پاس رہا مگر معتقد نہ ہوا۔ ایک روز کہنے لگا کہ میں نے آپ کی بزرگی کی شہرت سنی تھی۔ لیکن میں دس برس سے آپ کے پاس ہوں اس مدت میں میں نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے اس مدت میں جنید کو کسی گناہ صغیرہ یا کبیرہ میں مبتلا دیکھا؟ اُس نے جواب دیا کہ گناہ تو کوئی

نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ جنید کی یہ کچھ چھوٹی کرامت ہے کہ دس برس تک اُس سے خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

علیٰ ہذا ایک دوسرا واقعہ اُن کا مشہور ہے کہ اُن کے زمانے میں چند مدعیان تصوف کا یہ قول آپ کے پاس پہنچا کہ وہ کہتے ہیں۔ نَحْنُ وَصَلْنَا وَلَا حَاجَةَ لَنَا اِلَی الصِّیَامِ وَالصَّلٰوۃِ۔ آپ نے سُن کر فرمایا۔ صَلُوا اِلَی الْوُصُوْلِ وَلٰکِنْ اِلٰی سَقَرٍ۔ اور پھر فرمایا کہ اگر میں ہزار برس زندہ رہوں تو نفل عبادت بھی بدون عذر شرعی ترک نہ کروں۔

تو فقرا میں بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ جنید بغدادی کے مثل ہیں اور امرا میں بھی بعض حضرات ابراہیم بن ادھم رح کی طرح ہیں۔ لیکن کثرت سے ایسے ہی ہیں جن میں الحاد اور بدعت کا زور ہے۔ ایک جماعت کو تو مثالوں میں میں بیان کر چکا ہوں۔

دوسری اہل بدعت کی وہ جماعت ہے جو ہم لوگوں کو وہابی کہتی ہے لیکن ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ ہم کو کس مناسبت سے وہابی کہا گیا کیونکہ وہابی وہ لوگ ہیں جو کہ ابن عبدالوہاب کی اولاد میں ہیں۔ یا اُس کے متبع ہیں۔ ابن عبدالوہاب کے حالات مدوّن ہیں۔ ہر شخص اُن کو دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ نہ اتباع کی رُو سے ہمارے بزرگوں میں ہیں نہ نسب کی رُو سے۔ البتہ آج کل جن لوگوں نے تقلید کو ترک کر دیا ہے اُن کو ایک اعتبار سے وہابی کہنا درست ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے اکثر خیالات ابن عبدالوہاب سے ملتے جلتے ہیں۔ البتہ ہم لوگوں کو حنفی کہنا چاہیے۔ کیونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے اصول چار ہیں۔ کتاب اللہ، حدیث الرسول، اجماع امت، قیاس مجتہد۔ ان چار کے سوا اور کوئی اصل نہیں اور مجتہد

اگرچہ متعدد ہیں لیکن اجماع اُمّت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ائمہ اربعہ (یعنی امام ابو حنیفہؒ۔ امام شافعیؒ۔ امام احمد بن حنبلؒ۔ امام مالک بن انسؒ) کے مذہب کے باہر ہونا جائز نہیں۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ ان چاروں میں سے جس ملک میں جس کا مذہب رائج ہو اُس کا اتباع کرنا چاہیئے۔ تو چونکہ ہندوستان میں امام ابو حنیفہ کا مذہب، رائج ہے اس لیئے ہم انہیں کا اتباع کرتے ہیں۔ ہم لوگ وہابی کے لقب سے بُرا نہیں مانتے لیکن اتنا ضرور کہے دیتے ہیں کہ قیامت میں اس بہتان کی بازپرس ضرور ہوگی۔

میں بدعت کی جزئیات بھی بتلاتا لیکن اوّل تو اُن کو علماء نے پوری طرح رسائل کے ذریعے سے بتلا دیا ہے۔ دوسرے وقت میں بھی گنجائش نہیں۔ البتہ ایک پہچان بدعت کی بتلائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جو بات قرآن حدیث اجماع، قیاس، چاروں میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو اور اس کو دین سمجھ کر کیا جائے۔ وہ بدعت ہے۔ اس پہچان کے بعد دیکھ لیجئے کہ ہمارے بھائیوں کے جو اعمال ہیں مثلاً عرس کرنا، فاتحہ دلانا، تخصیص اور تعیین کو ضروری سمجھ کر ایصال ثواب کرنا وغیرہ وغیرہ جتنے اعمال ہیں کسی اصل سے ثابت نہیں اور ان کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے یا نہیں اور اگرچہ خواص کا عقیدہ ان مسائل میں خراب نہیں لیکن یہ فقہ حنفیہ کا مسئلہ ہے کہ خواص کے جس مستحسن امر سے جب کہ وہ مطلوب عندالشرع نہ ہو عوام میں خرابی پھیلے خواص کو چاہیئے کہ اس امر کو ترک کر دیں۔ ہاں اگر وہ امر مطلوب عندالشرع ہو اور اس میں کچھ منکرات مل گئے ہوں تو منکرات کے مٹانے کی کوشش کریں گے اور اس امر کو نہ چھوڑیں گے۔ مثلاً اگر جنازے کے ساتھ منکرات

بھی ہوں تو مشایعت جنازہ کو ترک نہ کریں گے۔ کیونکہ مشایعت جنازہ کی مطلوب عند الشرع ہے۔

پس ایصال ثواب میں دو امر ہیں۔ ایک تعیین وقت دوسرا ایصال ثواب اور ان میں سے تعیین مطلوب عند الشرع نہیں اگرچہ مباح ہے اور چونکہ تعیین سے عوام میں خرابی پھیلتی ہے اس لئے ہم تعیین کو ترک کر دیں گے۔ البتہ اگر ساری اُمت کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ وہ تعیین کو ضروری نہ سمجھے تو ہم خواص کو بلکہ سب کو تعیین کی اجازت دے دیں گے۔ لیکن حالت موجودہ میں رجب کہ اکثروں کا یہ خیال ہے کہ خاص تاریخوں میں ثواب پہنچانے سے زیادہ قبولیت ہوتی ہے اور یہ خلاف شریعت ہے) کیسے اجازت دے دی جائے۔

ایک شخص نے مجھ سے کہا۔ گیارہویں اٹھارہ تاریخ تک ہو سکتی ہے پھر نہیں ہو سکتی ——— ایک وعظ میں میں نے ان رسوم کا بیان کیا۔ بعد وعظ کے ایک صاحب کہنے لگے کہ علماء کو ایسے مضامین بیان نہ کرنا چاہئیں کہ تفریق اُمت ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا بیان کرنا تو آپ کے عمل کرنے پر موقوف ہے جیسے لوگوں کے اعمال اور حالات ہوں گے ویسا ہم بیان کریں گے۔ اگر لوگ ان اعمال کو چھوڑ دیں تو ہم بھی اس قسم کے بیان کو چھوڑ دیں گے۔ تو تفریق کا الزام ان اعمال کے ارتکاب کرنے والوں پر ہے نہ کہ ہم پر۔ غرض یہ امور مطلوب عند الشرع نہیں اور ان سے خرابیاں بہت کچھ پھیل رہی ہیں۔ اس لئے اُن کو ترک کر دینا چاہئے۔

ایصال ثواب کی صورت | ایک تو تخصیص اور تعیین قابل ترک ہے دوسرے جو ہیئت ایصال ثواب کی اختراع کر رکھی ہے

وہ قابل ترک ہے۔ مجھ سے ایک دیہاتی کہنے لگا کہ اگر ایصال ثواب کے وقت کھانے پر چند سورتیں پڑھ لی جائیں تو حرج ہی کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جس مصلحت سے کھانے پر سورتیں پڑھی جاتی ہیں کبھی روپے پر یا کپڑے پر کیوں نہیں پڑھی جاتیں اور ایک نیت میں اصلاح کرنی ضروری ہے کیونکہ اکثر نیت یہ ہوتی ہے کہ ہم اُن کو ثواب پہنچائیں گے تو اُن سے ہمارے دنیا کے کام نکلیں گے۔

توصاحبو! قطع نظر فساد اعتقاد کے اس کی ایسی مثال ہے کہ آپ کسی شخص کے پاس ہدیۃً مٹھائی لے جائیں اور پیش کرنے کے بعد اُس شخص سے کہیں کہ آپ میرے مقدمے میں گواہی دے دیں۔ اندازہ کیجیے کہ یہ شخص کس قدر کبیدہ ہوگا اور اس سے اُس کو کیسی اذیت ہوگی۔ پس جب اہل دنیا کو اذیت ہوتی ہے تو اہل اللہ کو تو اس سے زیادہ اذیت ہوگی۔ پھر خصوصاً وفات کے بعد کیونکہ وفات کے بعد لطافت زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ قفس عنصری ٹوٹ جاتا ہے اور صرف روح ہی روح رہ جاتی ہے اور اُس کا ادراک کامل ہو جاتا ہے۔ پس جس وقت اُن کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ یہ ہدیہ اس غرض سے پیش کیا گیا ہے کس قدر ناگواری ہوتی ہوگی۔ اس کے ماسوا کس قدر شرم کی بات ہے کہ اہل اللہ سے دنیا کے لیے تعلق اور محبت ہو۔

صاحبو! ان کے پاس دنیا کہاں ہے ان سے دنیا کی امید رکھنا بالکل ایسی بات ہے جیسے کسی سُنار سے کھرپا بنانے کی امید رکھنا یا کسی حکیم سے یہ فرمائش کرنا کہ تم چل کر ہمارے گھر کی گھاس کھود دو۔

صاحبو! ہم کو حضرت سید غوث الاعظمؒ سے جو محبت ہے تو اس لیے کہ انہوں نے ہم کو راہ ہدایت دکھلائی۔ اُس کے مکافات میں ہم اُن کو کچھ ثواب بخش دیں کہ

اُن کی روح خوش ہو۔ اور اُس کے خوش ہونے سے خدا تعالیٰ خوش ہوں۔ اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم لوگ ایصال ثواب سے منع نہیں کرتے۔ بلکہ اُس کی اصلاح کرتے ہیں اور جس دن اصلاح عام ہو جائے گی اُس دن ہم یہ بھی نہ کہیں گے۔ مگر جب تک اصلاح نہ ہو اُس وقت تک ہم ضرور لایجوز کہتے رہیں گے۔ رہی بدنامی سو بحمد اللہ اشاعت دین میں ہم کو اس کی مطلق پروا نہیں ہمارا وہ مذہب ہے ؎

ساقیا برخیز و دردہ جام را — خاک بر سر کُن غم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں — ما نمی خواہیم ننگ و نام را

اگرچہ عقلاء ظاہر کے نزدیک ہماری حالت بظاہر ایسی ہے جس سے بدنامی ہوتی ہے مگر ہم ایسی نیک نامی نہیں چاہتے جس میں محبوب سے تعلق نہ ہو۔

غرض مقصود اس بیان سے حق کو ظاہر کرنا ہے اعتدال کے ساتھ اور اس کلیہ کو اگر آپ یاد رکھیں گے تو بہت سے اعمال میں آپ کو حد جواز و عدم جواز معلوم ہو جائے گی۔ یہ تو اعتقاد کے متعلق تھا۔

اکرامِ مسلم | ایک فرقہ مسلمانوں میں ایسا بھی ہے کہ اُس کے عقائد و اعمال سب درست ہیں مگر یہ فرقہ اپنے تقدس پر مغرور اور نہایت متکبر ہے اور دوسرے مسلمانوں کو ذلیل و حقیر سمجھتا ہے۔ صاحبو! خوب سمجھ لو ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را — در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش — ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

اور ع

تا یار کرا خواہد میلش بکہ باشد

اور صاحبو! تکبر کس پر کیجئے۔ جو لوگ گنہ گار ہیں اُن کو بھی برا اور ذلیل نہیں سمجھ سکتے۔ کسی کا قول ہے ؎

گناہ آئینہ عفو و رحمت ست اے شیخ مبیں بچشم حقارت گناہگاراں را

اے شیخ! گناہ (جس کے بعد توبہ نصیب ہو جاوے) عفو و رحمت کا آئینہ ہے کیونکہ اگر گناہ نہ ہوتے تو توبہ کس چیز سے ہوتی۔ لہذا گناہگاروں کو چشم حقارت سے مت دیکھو۔

جن کو تم گناہ گار سمجھتے ہو اُن میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ اعتقادی گمراہی میں مبتلا ہیں مگر اُن کو کچھ بھی گناہ نہیں۔ کیونکہ

مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَاِنَّمَا جس نے بغیر علم کے فتویٰ دیا
اِثْمُہٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاہُ اُس کا گناہ مفتی پر ہوگا۔

تو بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ اُن کو کچھ خبر بھی نہیں۔ اس کے ماسوا وہ شخص کس منہ سے دعویٰ کر سکتا ہے جو دوسرے مسلمانوں کو ذلیل سمجھے اور اُن پر طعن کرے۔ حدیث کا مضمون ہے جس کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے ترجمہ کیا ہے۔ ع

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

تو گویا تمام مسلمان مثل ایک تن کے ہیں اور جب یہ حالت ہے تو آپ کو مسلمانوں کے جہنم میں جانے سے صدمہ اور رنج ہونا چاہیئے اور اُن کے بچانے کی تدابیر میں لگنا چاہیئے۔ ہم کو گنہگار مسلمانوں کے ساتھ وہی دل سوزی ہونی چاہیئے

جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو تھی۔

ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور زنا کرنے کی اجازت چاہی۔ صحابہ کرام رضؓ نے سُن کر اُس کو ڈانٹنا چاہا۔ حضورؐ نے منع فرمایا اور نہایت اطمینان سے فرمایا کہ کیا تو اپنی ماں کے ساتھ ایسا کیا جانا پسند کرتا ہے۔ اُس نے کہا نہیں۔ فرمایا بہن کے ساتھ۔ کہا نہیں۔ فرمایا بس جس سے تم ایسا فعل کرو گے وہ بھی کسی کی ماں کسی کی بہن ہو گی۔ آنچہ برخود نپسندی بر دیگراں مپسند بس وہ سمجھ گیا۔

سبحان اللہ! حضورؐ کے پاکیزہ اخلاق اور تربیت کی یہ حالت تھی اور کیوں نہ ہوتی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو مخالفین اور کفار تک کی خاطرداری فرماتے تھے کفار آپ کو ستاتے اور فرشتہ جبال آکر عرض کرتا کہ اگر اجازت ہو تو میں ان سب کو پہاڑوں سے ہلاک کر دوں۔ آپؐ فرماتے کہ دَعُوْنِی وَقَوْمِی۔ تو جب حضورؐ کو کفار تک کی خاطر منظور تھی تو ہم میں آج کونسی بڑائی پیدا ہو گئی ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو ذلیل سمجھیں اور اُن سے تکبر سے پیش آئیں۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا — دل دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

اور جب تم دوستوں سے لڑتے اور اُن کو حقیر سمجھتے ہو تو کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے ہو۔ نیز یہ امور خداشناسی کے بھی مخالف ہیں۔ حضرت بہلول رحؒ کی حکایت ہے ؎

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوئے — چو بگذشت بر علاف جنگ جوئے

گر ایں مدعی دوست بشناختے بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

حضرت بہلول مبارک قدم نے کیا خوب فرمایا۔ جب کہ اُن کا گذر ایک (ظاہری) عارف پر ہوا جو جھگڑا کر رہا تھا۔ آپ نے فرمایا اگر اس کو دوست کی معرفت حاصل ہوتی تو اس کو دشمن کی طرف توجہ کی فرصت ہی کب ہوتی۔

نجات کی صورت

صاحبو! کیا بھروسہ ہے کہ شام تک ہماری کیا حالت ہوگی اور چار دن کے بعد ہم کیا ہوں گے۔ اگر قبر میں ایمان ساتھ گیا تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ تو جب ہم کو اپنی حالت پر اطمینان نہیں، موجودہ حالت کے اعتبار سے بھی کہ اس میں صدہا نقص ہیں اور آئندہ کے اعتبار سے بھی کہ زیادہ بگڑ جانے کا اندیشہ ہے تو سخت جہل کی بات ہے کہ ہم دوسروں پر ہنسیں اور اُن کو ذلت کی نظر سے دیکھیں۔ بڑا پاگل ہے وہ شخص کہ اُس پر بیسیوں فوجداری کے مقدمات قائم ہیں اور وہ دوسرے دیوانی کے مقدمات والوں کو ذلیل سمجھتا اور بُرا بھلا کہتا پھرتا ہے۔

تو اس وجہ سے اس فرقے کو خصوصاً میں کہتا ہوں کہ اگرچہ تمہارے اعتقادات درست ہیں اور بظاہر اعمال بھی خراب نہیں معلوم ہوتے لیکن تم اپنی اندرونی حالت میں غور کرو اور اندرونی حالت کو اچھا نہ سمجھو۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مدار صرف عقائد پر ہے۔ اگر عقائد درست کر لیے تو پھر نجات ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عقائد درست ہونے سے کبھی نہ کبھی نجات ہو جائے گی۔ لیکن محض عقائد پر نجات تام کا مدار سمجھنا غلط ہے۔ بعضے لوگوں کا خیال ہے کہ صرف

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرنا کافی ہے۔ اگر حضورؐ سے محبت ہو نہ سوال جواب ہوگا نہ حساب کتاب ہوگا۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ اُن کا ظاہر درست ہے مگر دل مثل بھیڑیئے کے نہایت سخت ہے۔ ایک بزرگ ایسے لوگوں کی شان میں کہتے ہیں ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل — واندروں قہر خدائے عزّ و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ می دارد یزید

یعنی ظاہری حالت اُن کی ایسی ہے جیسی کافر کی قبر مزین ہوتی ہے اور اُس کے اندر خدا تعالیٰ کا قہر وغضب نازل ہوتا ہے۔ ظاہری حالت بایزید جیسی ہے اور باطن یزید کو بھی شرماتا ہے۔

اس لئے ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ باطن کی بھی فکر کریں جس کا طریق یہ ہے کہ ؎

قال را بگذار مرد حال شو — پیش مردے کاملے پامال شو

زبانی جمع خرچ چھوڑ صاحب حال ہو۔ کسی کامل مرد کے سامنے زانوادب رکھ۔

اصل علاج یہی ہے کہ اپنے کو بالکل مٹا دے اور تواضع پوری طرح اختیار کرے اور یہی تواضع جڑ ہے اتفاق کی بھی۔ آج کل لوگ اتفاق کی کوشش کرتے ہیں مگر اتفاق کی جو جڑ ہے اُس کو بالکل چھوڑ رکھا ہے کیونکہ اتفاق ہمیشہ اس سے پیدا ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے کم سمجھے۔ اس سے کبھی اختلاف کی نوبت آ ہی نہیں سکتی۔ افسوس آج اس پاکیزہ خصلت کو بالکل چھوڑ دیا گیا بلکہ اُس کے برخلاف خودداری اور تکبر کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لباس میں ہمیشہ ایسی وضع اختیار کی جائے

کہ مجمع بھر میں ہمیں کو ممتاز اور بڑا سمجھا جائے اور غضب یہ ہے کہ اپنی اولاد کو بھی ابتدا ہی سے اس وضع کا عادی بناتے ہیں۔ غرض ہر فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کو فرعون کا ہمسر سمجھتے ہیں۔ پھر فرمائیے اتفاق کیونکر ممکن ہے۔ صاحبو! اگر اتفاق کی واقعی تمنا ہے تو حضرات صوفیہ کے طرز پر چلنے کی کوشش کرو اور ان حضرات کے قدموں پر جا گرو۔ پھر دیکھو کیسا اتفاق ہوتا ہے۔

ایک رئیس سے میری گفتگو ہوئی کہ اگر لڑکے سے کسی نوکر پر کوئی زیادتی ہو جائے تو اس کو سزا دینی چاہیے یا نہیں۔ اُن رئیس صاحب کی یہ رائے تھی کہ سزا نہ دینی چاہیے۔ کیونکہ سزا دینے سے بچے کی طبیعت پست ہو جاتی ہے اور دماغ میں علو حوصلگی نہیں رہتی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ علو کے کیا معنی ان لوگوں کے نزدیک ہیں۔ ایسے علو کو غلو کہا جائے تو بہتر ہے اور نہ کہیے تب بھی ہمارا مقصود حاصل ہے کیونکہ یہ وہی علو ہے جس کو فرماتے ہیں لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ دیکھ لیجیے کہ قرآن نے اس علو کو محمود بتلایا ہے یا مذموم۔ اور اگر قرآن نے مذموم بتلایا ہے تو کیونکر یہ علو مطلوب ہو سکتا ہے۔ صاحبو! قرآن شریف کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن آج کل کے مخترع تمدن کی بالکل جڑ کاٹ رہا ہے۔

غرض یہ ہے کہ اتفاق پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ اپنے اعمال درست کرو اور جو لوگ اپنے اعمال درست کر چکے ہیں اُن کے پاس آمد و رفت رکھو۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ بزرگوں کی خدمت میں اگر جاؤ تو نیت محض اپنی اصلاح کی کر کے جاؤ۔ بعض لوگ بزرگوں کی خدمت میں جاتے ہیں لیکن نیت ان

کی محض وقت پورا کرنا اور دل بہلانا ہوتی ہے۔ اور علت اس کی یہ ہے کہ بزرگوں کے پاس جا کر دنیا بھر کے قصے جھگڑے اخبار شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور اُن بزرگ کا بھی وقت ضائع کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ اصلاح ہی کی نیت سے جاتے ہیں لیکن عجلت پسند ہونے کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ دو ہی دن میں ہماری اصلاح ہو جائے۔ ان لوگوں کی بالکل وہ مثال ہے کہ

الحَائِکُ اِذَا صَلّٰی یَومَینِ اِنتَظَرَ الوَحیَ۔ — جولاہا جب دو دن نماز پڑھ لیتا ہے تو وحی کا منتظر ہو جاتا ہے

ایسے لوگوں کے جواب میں ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ کیا کم فائدہ ہے کہ تم کو خدا کا نام لینے کی توفیق ہو گئی اور فرمایا کرتے تھے کہ بھائی اگر واقعی کچھ بھی حاصل نہ ہو تب بھی طلب نہ چھوڑنی چاہیے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم — حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

کچھ ملے یا نہ ملے جستجو میں لگا رہوں گا۔ اور کچھ حاصل ہو یا نہ ہو میں آرزو کرتا رہوں گا۔

طالب خدا کی یہ نشان ہے کہ اگر سو دفعہ اُس کو یہ آواز آئے کہ تو دوزخی ہے تب بھی اُس کو مایوسی نہ ہو۔ ایک بزرگ کے پاس شیطان آیا اور کہا کہ تم کو عبادت کرتے اتنے دن ہو گئے نہ پیام ہے نہ سلام، پھر اس سے کیا نفع۔ وہ معمول چھوڑ کر سو رہا۔ خواب میں حضرت حق جل مجدہ آئے اور وجہ پوچھی۔ اُس نے کہا کہ نہ لبیک ہے نہ پیک ہے پھر کیسے دل بڑھے۔ جواب ارشاد ہوا کہ ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ویں نیاز و سوز و درد ت پیک ماست

ایک بزرگ کی حکایت شیخ علیہ الرحمۃ نے لکھی ہے کہ وہ ذکر کرنے بیٹھے تو یہ آواز آئی کہ تم کچھ بھی کرو یہاں کچھ قبول نہیں مگر وہ پھر کام میں لگ گئے۔ اُن کے ایک مرید نے کہا کہ جب کچھ نفع ہی مرتب نہیں ہوتا تو محنت سے کیا فائدہ۔؟ بزرگ نے جواب دیا کہ بھائی اگر کوئی دوسرا ایسا ہوتا کہ میں خدا کو چھوڑ کر اُس کی طرف متوجہ ہو جاتا تو اعراض ممکن بھی تھا۔ اب تو یہی ایک در ہے قبول ہو یا نہ ہو

؎ توانی ازاں دل بپرداختن کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

اس جواب پر رحمت باری کو جوش ہوا اور ارشاد ہوا کہ ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہے دگر نیستت

قبول ہے اگرچہ اس قابل نہیں ہے کیونکہ ہمارے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے۔

غرض طالب کو ہر حال میں طلب میں مشغول رہنا چاہیئے اور یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎ اندریں رہ می تراش و می خراش تا دم آخر دمے فارغ مباش

تا دم آخر دمِ آخر بود کہ عنایت با تو صاحب سر بود

راہ سلوک میں بہت تراش خراش ہیں۔ لہذا آخر دم تک ایک دم کے لئے فارغ نہ ہو بلکہ کام میں لگے رہو۔ آخر ایک وقت تجھ پر عنایت ہو جائے گی۔

کامل کی پہچان

البتہ اس موقع پر اس کی ضرورت ہے کہ کامل کی کوئی پہچان بتلائی جائے۔ کیونکہ آج کل بہت سے شیطان بھی لباس انسان

میں ہیں ۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نباید داد دست

تو پہچان اس کی یہ ہے کہ وہ شریعت کا ضروری علم رکھتا ہو۔ کسی کامل شیخ کی زیر تربیت میں رہا ہو۔ اور اس سے اجازت تربیت حاصل ہو۔ خود شریعت پر عامل ہو۔ شریعت کے خلاف پر اصرار نہ کرتا ہو۔ سنت کا پورا پابند ہو۔ اپنے متعلقین پر شفقت کرتا ہو۔ احتساب میں کمی نہ کرتا ہو۔ جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں، وہ کامل ہے اور ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا ہے ؎

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یعنی اللہ والوں کی تھوڑی دیر کی صحبت بھی سو سال کی بے ریا عبادت وطاعت سے بہتر ہے۔

بحمد اللہ سب طبقات کا بیان بقدر ضرورت ہو گیا۔ اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ سبیل نجات صرف ایک ہے اور اس پر چلنے کا طریقہ یہ ہے جو مذکور ہوا۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ بہت کارآمد ہے اگرچہ لذیذ نہیں۔ اب دعا کیجئے کہ خدا عمل کی توفیق دے۔ آمین یا رب العالمین۔

العید و الوعید

عید و وعید کے متعلق یہ وعظ ۳۰ رمضان المبارک سنہ ۱۳۴۲ھ بروز جمعۃ الآخرہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو ۲ گھنٹے ۱۵ منٹ میں ختم ہوا۔ حاضری ۵۰۰ کے قریب تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئاتِ اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ وَلِتُکۡمِلُوا الۡعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمۡ وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ۔

اللہ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے دشواری کرنا منظور نہیں ہے

احکام کی حکمتیں

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس سے پہلے حق تعالیٰ نے کچھ احکام صوم کے متعلق بیان فرمائے ہیں۔ پھر ان کو ختم کیا ہے ایسے احکام پر جن میں کچھ حکمتیں بھی ان احکام کی مذکور ہیں۔ چونکہ ان میں ایک مضمون ختم رمضان کے متعلق بھی ہے اس لئے بمقتضائے وقت اس کا اختیار مناسب ہوا۔

اس سے قبل جو احکام مذکور ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ دو حکموں کی مشروعیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک ادائے صیام کا ایک قضائے صیام کا۔ چنانچہ اوپر اول یہ فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ط فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ط وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ط وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ۔

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ۔ تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو۔ جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار کرنا ہے۔ جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے اُن کے ذمہ فدیہ ہے وہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ جو شخص خوشی سے خیر کرے وہ اس کے لئے بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا زیادہ بہتر ہے اگر تم خبر رکھتے ہو۔

اس میں قضا، ادا دونوں کے احکام مذکور ہیں اور ابتداء میں طاقت رکھنے والوں کو بھی افطار صوم کی اجازت تھی۔ اور اس صورت میں فدیہ دینے کا حکم تھا پھر یہ حکم منسوخ کیا گیا۔ چنانچہ اگلی آیت میں فرماتے ہیں۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْنَ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ
بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ط فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ
فَلْيَصُمْهُ ط وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ
اَيَّامٍ اُخَرَ ۔

ماہ رمضان ہے جس میں قرآن پاک بھیجا گیا ہے۔ جس کا وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور واضح الدلالت ہے منجملہ ان کتب کے جو کہ ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں۔ جو شخص اس ماہ میں

موجود ہو اُس کو ضرور روزہ رکھنا چاہیئے۔ جو بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو دوسرے ایام کا شمار رکھنا ہے۔

اس میں بھی ادا و قضا، دونوں کا حکم مذکور ہے جس میں بتلا دیا گیا کہ مریض و مسافر کے لیے حکم اوّل منسوخ نہیں ہوا۔ اس کے بعد یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ط الآیہ۔ میں ان احکام کی حکمتوں کا ذکر ہے۔ احکام تو ظاہر ہیں اور لوگ بارہا سُن چکے ہیں۔ اس لیے ان کو میں اس وقت بیان نہ کروں گا۔ اس وقت میں اخیر کا مضمون بیان کروں گا جس میں احکام مذکورہ کی حکمتوں کا ذکر ہے کیونکہ اس کو لوگوں نے بہت کم سنا ہوگا اور اکثر اس سے ناواقف ہیں۔ اس لیے اس کا سمجھنا ضروری ہے۔

ہر چند کہ حق تعالیٰ کے احکام میں حکمتوں کا انتظار نہ کرنا چاہیئے لیکن اگر کہیں وہ از خود بیان فرما دیں تو ان کو سمجھنا چاہیئے۔ اور حق تعالیٰ نے کہیں کہیں احکام کی حکمتیں اس لیے بیان فرما دیں کہ بعض دفعہ حکمت کا معلوم ہو جانا مفید ہوتا ہے گو کبھی مضر بھی ہوتا ہے۔ پس اب فیصلہ یہ ٹھہرا کہ از خود تو درپے حکمت نہ ہو اور اگر کہیں حق تعالیٰ ہی بیان کر دیں تو سمجھنا چاہیئے کہ یہاں علم حکمت مضر نہیں۔ اور جہاں وہ بیان نہ کریں وہاں عمل کے لیے حکمت کا انتظار نہ کرے اور غیر مذکور کو مذکور کے ساتھ ملحق کر کے اس پر قیاس نہ کرے کہ ایک جگہ علم حکمت ہم کو مضر نہ ہوا تھا، تو یہاں بھی مضر نہ ہوگا کیونکہ یہ قیاس صحیح نہیں۔ ممکن ہے کہ ہر حکم کی نوعیت جدا ہو، جس سے خواص بھی بدل جاویں۔

میں جو احکام کی حکمتیں تحقیق کرنے سے منع کر رہا ہوں، احکام کی علتیں جو مجتہدین

تحقیق کرتے ہیں ان علتوں کو ان حکمتوں پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ وجہ فرق کی دو امر ہیں ایک تو یہ کہ وہ علتیں مجتہدین کی سمجھی ہوئی ہیں اور یہ حکمتیں غیر مجتہدین کی سمجھی ہوئی۔ دوسرے وہ علتیں بضرورت نکالی جاتی ہیں کہ مسکوت عنہ میں حکم کا تعدیہ کریں اور یہ حکمتیں بلا ضرورت نکالی جاتی ہیں کیونکہ احکام ان حکمتوں پر موقوف نہیں اور گو وہ علل بھی ظنی ہوں گے قطعی نہ ہوں گے اور اسی لیے وہ احکام ان علتوں پر مبنی ہیں ظنی ہوں گے مگر علوم ظنیہ بھی اثبات حکم کے لیے کافی ہیں اور حکمت نکالنے سے اثبات حکم مقصود نہیں۔ اس لیے وہاں ظنیت کو خطرناک کہا جاوے گا اور یہاں ایک استطرادی تحقیق ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگوں کو بعض نصوص سے علوم ظنیہ کے مطلقاً مفید نہ ہونے کا شبہ ہو گیا ہے۔ جن سے

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا — یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

اس میں شیئًا نکرہ ہے تحت نفی کے جس سے معلوم ہوا کہ ظن کسی درجہ میں بھی مفید نہیں تو سمجھنا چاہیے کہ یہ دھوکا اصطلاح اور محاورہ کے خلط سے پیدا ہوا ہے۔ قرآن کو محاورات پر سمجھنا چاہیے کیونکہ اس کا نزول محاورات عرب ہی پر ہوا ہے نزول قرآن کے وقت اہل عرب ان معقولی اصطلاحات کو جانتے بھی نہ تھے۔ یہ تو بعد میں مقرر ہوئی ہیں۔

پس اب سمجھو کہ محاورات میں ظن کے معنی مطلق خیال کے ہیں خواہ صحیح ہو یا غلط، مدلل ہو یا غیر مدلل، مطابق واقع ہو یا خلاف واقع۔ تو ظن اصطلاحی بھی اس کی ایک فرد ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ظن کا استعمال بمعنی اعتقاد جازم ہوا ہے۔

يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلَاقُوْا رَبِّهِمْ — وہ اللہ کی ملاقات کا یقین رکھتے ہیں۔

یہاں اعتقاد جازم مراد ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ اعتقاد آخرت میں ذرا سا شک بھی کفر ہے اور ایک جگہ آخرت کے متعلق کفار کا قول نقل کیا گیا ہے۔

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ۔ — محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو یقین نہیں۔

یہاں وہم و خیال مراد ہے کیونکہ ان کو آخرت کے متعلق ظن اصطلاحی بھی نہ تھا بلکہ وہ تو منکر و مکذب تھے۔ اسی طرح

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ — یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا مفید نہیں ہوتے۔

میں ظن اصطلاحی مراد نہیں بلکہ خیال بلا دلیل مراد ہے کیونکہ یہاں کفار کے بارہ میں گفتگو ہے اور اُن کا ظن (ملائکہ کے بنات اللہ ہونے کے بارہ میں) کسی دلیل سے نہ تھا بلکہ خلاف دلیل تھا۔ چنانچہ اوپر کی آیت سے اس کا کفار کے متعلق ہونا ظاہر ہے فرماتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ۔

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لائے وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں شمار کرتے ہیں۔ اُن کے پاس کوئی علم نہیں ہے محض بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں۔

اسی کے متعلق آگے ارشاد ہے۔ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا کہ ایسا ظن جو بلا دلیل ہو جیسا کفار کو تھا۔ مُغْنِی عَنِ الْحَقِّ نہیں ہے۔

غلبۂ حال کا اثر اب تو مشکل یہ ہے کہ طلباء قرآن کو ملا حسن و حمداللہ کے بعد پڑھتے ہیں جب کہ ان کے ذہن میں یہ اصطلاحات رچ جاتی ہیں۔ پھر وہی تمام قرآن میں سوجھتی ہیں۔

جیسا کہ میں ایک دفعہ دیوبند میں طالب علمی کے وقت تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا تھا جو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے نقل کے لیے دیا تھا۔ اس وقت ایک معقولی طالب علم آئے اور پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہو۔ میں نے کہا تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں۔ کہنے لگے شیخ بو علی سینا کا؟ اُن کے نزدیک بس وہی تو ایک شیخ تھا اور سارے جولاہے ہی تھے۔

ہم لوگ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں کہ حدیث و فقہ کی اصطلاحات کو ہر جگہ جاری کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے جو معقول نہ جانتے تھے کسی کتاب میں تصدیق کے متعلق امام رازی کے نقل مذہب کے موقع پر لکھا ہوا دیکھا قال الامام تو کہتے ہیں کیا امام ابوحنیفہؒ کا یہ مذہب تھا۔ اُن کے ذہن میں امام بس وہی تھے۔ غرض یہ کچھ قاعدہ ہے کہ جو چیز ذہن میں رچی ہوتی ہے ہر جگہ وہی سوجھتی ہے۔ ع

جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی

یہیں سے معلوم ہو گیا کہ اگر کسی مغلوب صوفی پر وحدۃ الوجود کا حال طاری ہو جائے تو اُس پر کیا اعتراض ہے۔ اُس غریب کے ذہن میں بھی ایک ذات

رچی ہوئی ہے۔ وہی ہر جگہ اس کو سوجھتی ہے۔ جیسے کسی نے ایک طالب علم سے کہا تھا کہ دو اور دو کے ہوتے ہیں تو وہ بے ساختہ کہتا ہے کہ چار روٹیاں۔ اس غریب کے ذہن میں روٹیاں ہی رچی ہوئی تھیں۔ تو اگر کسی کے ذہن میں خدا تعالیٰ کی ہستی رچ جائے اور ہر چیز میں وہی نظر آنے لگے تو اُس پر فتوے کیوں لگائے جاتے ہیں۔

ایک دفعہ مولانا جامیؒ پر بھی وحدۃ الوجود کا حال طاری تھا۔ اس وقت غلبۂ حال میں وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

بسکہ در جانِ فگار و چشم بیدارم توئی
ہر چہ پیدا مے شود از دُور پندارم توئی

پیدا می شود یہاں پر بمعنی ظاہر می شود ہے۔ اس وقت کوئی منکر سامنے سے آگیا اُس نے تمسخر کے طور پر کہا، مولانا اگر خر پیدا شود؟ آپ نے فوراً جواب دیا پندارم توئی۔ یعنی اگر گدھا سامنے آئے گا تو میں سمجھوں گا کہ تُو ہے۔

کیسا پُر مغز جواب ہے کہ اپنا دعویٰ بھی صورۃً محفوظ رہا اور اُس کے تمسخر کا بھی جواب ہو گیا۔ ان کاملین کو غلبۂ حال ایسا نہیں ہوتا کہ مسلوب الحواس ہو جائیں بلکہ اُن کے حواس غلبۂ حال میں بھی درست رہتے ہیں اور ذرا سے محرک سے حالتِ سکر مبدل بصحو ہو جاتی ہے۔ اسی لئے مولانا جامی کو سوال منکر کے بعد فوراً ہی ظرافت کی سوجھی۔

بہر حال وحدۃ الوجود کی حقیقت بھی یہی ہے کہ سالک کے دل پر ہستی حق کا خیال رَچ جاتا ہے اور اُس کا تصوّر غالب ہو جاتا ہے تو اب ہر چیز میں اُس کو وہی نظر آنے لگتا ہے اور اس وقت وہ ہمہ اوست یا ہر چہ پیدا می شود از دُور

پندارم تو ئی کہنے لگتا ہے۔ تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ مگر اس حالت کے اقوال میں ان کی تقلید نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ باتیں وہ غلبۂ حال اور درجہ معذوری میں کرتے ہیں اور معذوری کی حالت کا اتباع نہیں ہو سکتا۔ صاحب حال صادق پر جب تک عذر غالب نہیں ہوتا بہت ضبط سے کام لیتا ہے۔ جب ضبط کی طاقت نہیں رہتی اور اختیار سلب ہو جاتا ہے، اُس وقت اُس سے ایسے حرکات وجدیہ اور ایسے اقوال شطحیہ صادر ہونے لگتے ہیں۔ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

بہ تسلیم سر در گریباں بُرند چو طاقت نماند گریباں درند

تو ایسی حالت میں بے اختیاری کی باتیں قابل تقلید کیوں کر ہو سکتی ہیں مگر ان پر انکار بھی نہ کرنا چاہیئے۔

قرآن بین النظر ین یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ طلبا معقول کے بعد قرآن کو پڑھتے ہیں جب کہ وہ اصطلاحات ان کے ذہن میں رچی ہوئی ہوتی ہیں تو قرآن میں بھی ان کو وہی سوجھتی ہے۔ اسی کی مناسبت سے وحدۃ الوجود کا ذکر آ گیا کہ اس کی حقیقت بھی ایک چیز کا ذہن میں رچ جانا ہے۔ بہر حال اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا میں ظن اصطلاحی مراد نہیں بلکہ ظن بلا دلیل مراد ہے۔ پس ظن اصطلاحی کا غیر کافی ہونا یا حجت نہ ہونا قرآن سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ دلائل شرعیہ سے اس کا معتبر و حجت ہونا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قرآن میں بعض آیات مجملہ و مشکلہ بھی ہیں۔ سب کی سب مفسر و محکم ہی نہیں ہیں اور جب بعض آیات مجمل و مشکل بھی ہیں تو ان کی کوئی تفسیر قطعی نہیں ہو سکتی ورنہ پھر اجمال و اشکال ہی کہاں رہا۔ اور جب کوئی تفسیر قطعی نہیں، تو

ظنی ہوگی۔ اب اگر ظن مطلقاً غیر معتبر ہے تو آیات مجملہ و مشکلہ بالکل متروک العمل ہو جائیں گی۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔ مثلاً لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ میں ابہام ہے۔ جس کی وجہ سے تفسیر میں اختلاف ہو رہا ہے کہ اس سے مراد مس بالید ہے یا ملامسۃ بالجماع ہر فریق اپنی تفسیر کو دلائل سے ثابت کرتا ہے اور جس کے نزدیک جو معنی راجح ہیں ان پر عمل کرتا ہے حالانکہ ہر تفسیر ظنی ہے قطعی کوئی بھی نہیں۔ مگر کسی نے اس آیت کو یہ کہہ کر ترک نہیں کیا کہ اس کی قطعی مراد تو معلوم نہیں اور ظن معتبر نہیں لہذا اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اور جب ظن معتبر ہے تو یقیناً جو معنی جس شخص کے نزدیک راجح ہیں وہ اس کو مدلول کلام ہی سمجھ رہا ہے گو قطعاً نہ سہی ظناً ہی سہی (جس کا قرینہ یہ ہے کہ اس ظن کی بنا پر وجوب و حرمت و کراہت و مندوبیت وغیرہ احکام شرعیہ ثابت کیے جاتے ہیں اور یہ احکام بدون نسبت الی الشارع کے ثابت نہیں کیے جا سکتے پس ثابت ہو گیا کہ مدلول ظنی بھی مدلول نص ہی ہے) تو جس طرح قطعیات کو قطعاً مدلول نص کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ظنیات بھی ظناً مدلول نص ہیں خواہ بلا واسطہ قیاس کے خواہ بواسطہ قیاس کے۔ غرض حکم اور علل کا جدا جدا حکم ہے۔

ایک تفصیل استطراداً ہی علل شرعیہ کے متعلق بیان کرتا ہوں کیونکہ علل کے بارہ میں بھی دو فرقے ہیں۔ ایک وہ جو یوں کہتے ہیں کہ جو صاف صاف بتلا دی گئی ہے۔ اس کو بھی علت سمجھو اور جو صاف صاف نہیں بتلائی گئی اس کو بھی تعدیہ کی ضرورت سے تلاش کرو اور اس کو معلوم کر کے حکم کی بنا اس پر سمجھو اور جزئی مسکوت عنہ میں اس کے واسطے سے حکم کو متعدی کرو۔ اور یہ طبقہ فقہا کا ہے۔

ایک فرقہ وہ ہے جو یوں کہتا ہے کہ جو علت نصاً بتلا دی گئی ہے اس پر تو

عمل کرو اور جو نہیں بتلائی گئی اس کو تلاش نہ کرو۔ یہ اہل ظاہر ہیں جو قیاس کو حجت شرعیہ نہیں کہتے۔ نیت ان کی بھی اچھی ہے کیونکہ منشا اس مسلک کا یہ ہے ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو ۔۔۔ نینگیختن علت از کار تو

ہمارے نزدیک امام داؤد ظاہری پر مذاق عشق غالب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس حکم کی علت بتلائی گئی ہو۔بس وہی معلل ہے اور جس کی علت مذکور نہیں اس کو معلل بعلۃ کرنے کی ضرورت نہیں ہم کو بدون کسی علت کے تلاش کئے اس پر اطلاق کے ساتھ عمل کرنا چاہیے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے۔

نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْقِرَانِ بَيْنَ الْبُسْرِ وَالرُّطَبِ۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھواروں کی دو قسموں رطب اور بسر کے ملانے سے منع فرمایا ہے۔ عرب میں عادت تھی کہ پانی میں چھوارے ڈال کر بھگوتے اور اس کا زلال پیا کرتے تھے جس کو نبیذ کہتے ہیں۔ یہ مقوی ہوتا ہے جیسا کہ یہاں بھی اطبا مریض کو بعض ادویہ کا خیسا ندہ بتلایا کرتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ دو قسم کے چھوارے ملا کر نہ بھگوے جائیں۔ اس حکم کو عام فقہائے تو معلل بالعلۃ مانا ہے کہ قران بین التمرین مطلقاً ممنوع نہیں بلکہ خاص علت کی وجہ سے ممنوع ہے۔ پھر اس علت کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض نے تو کہا کہ رطب اور بسر کے ملانے سے نبیذ میں تیزی بہت جلد آجاتی ہے اس لئے آپ نے منع فرمایا تو مدار حکم اشتداد پر ہے۔ اس صورت میں یہ حکم ان موسموں کے ساتھ خاص ہوگا جن میں اس قران سے اشتداد کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً گرمی یا برسات

میں اور جاڑے کے موسم میں ممنوع نہ ہوگا۔ کیونکہ اس موسم میں تیزی جلدی پیدا نہیں ہوتی۔ نیز گرمی اور برسات میں بھی مطلق قران سے ممانعت نہ ہوگی بلکہ اتنی دیر تک ملا کر بھگونے سے ممانعت ہوگی جس میں اشتداد کا اندیشہ ہو۔ پس اگر کوئی ایک دو گھنٹہ تک ملا کر بھگو دے تو ممنوع نہ ہوگی۔

بعض نے یہ کہا کہ قران بین التمرتین میں ایک قسم کا تنعم ہے اور وہ زمانہ قحط کا تھا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تنعم سے منع فرمادیا کہ زمانہ قحط میں ایک شخص تو دو دو قسم کے چھوارے بھگوئے اور ایک کو ایک قسم بھی میسر نہ ہو اس صورت میں یہ حکم زمانہ قحط کے ساتھ مخصوص ہوگا۔

اہل ظاہر کہتے ہیں کہ ہم کو اس حکم کی علت نکالنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے علت نہیں بتلائی تو قران بین التمرتین مطلق ممنوع ہے بعض اہل ظاہر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ دو قسم کے چھوارے ساتھ بھگونا ایسا ہے جیسا جمع بین الاختین۔ گو یہ غلو ہے مگر ہم اس کی بھی قدر کرتے ہیں کیونکہ اُن کے اس قول کا منشا غلبۂ عشق اور غلو فی المحبت ہے۔

مگر سب کو معلوم ہے کہ عاشق مغلوب کا اتباع نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ اُس کا جوش جنوں اعتدال پر لایا جائے نہ یہ کہ ہم بھی اُن جیسے مجنون ہو جائیں۔ پس اہل ظاہر کی تقلید تو ہم کرتے نہیں بلکہ تغلیط کرتے ہیں لیکن ان کو برا بھلا بھی نہیں کہتے بلکہ ایک درجہ میں اُن کی ان باتوں کی قدر کرتے ہیں کیونکہ منشاد ان اقوال کا غلبۂ عشق ہے اور یہ حالت محمود ہے گو مقصود نہ ہو۔ اور یہ ممکن ہے کہ ایک حالت محمود ہو اور مقصود نہ ہو جیسے غلبۂ خشیت سے کثرت بکا، حالتِ

محمود ہے گو مقصود نہیں) تو عشق کا ایسا غلبہ گو مقصود نہیں مگر فی نفسہٖ محمود ضرور ہے کیونکہ اس شخص میں عشق تو ہے۔

فرعون اور ایمان

کسی درجہ میں عشق کا ہونا ضروری بھی ہے۔ اس کے بالکل نہ ہونے سے ایمان پر خطرہ ہے۔ بقول محققین کے شیطان اسی لئے گمراہ ہوا کہ اس کو حق تعالیٰ سے محض ضابطہ کا تعلق تھا محبت نہ تھی اور ملائکہ میں عشق و محبت کا اثر موجود تھا۔ اس لئے حکم کے ساتھ ہی سب فوراً سجدہ میں گر پڑے۔ بلکہ ملائکہ میں بعض پر استغراقی کیفیت طاری ہے کہ ہر وقت غلبۂ محبت کی وجہ سے مستغرق رہتے ہیں۔

نیز احادیث سے بھی ملائکہ میں عشق و محبت کے وجود کا پتہ چلتا ہے چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا فرعون کے منہ میں کیچڑ ٹھونسنا غلبۂ محبت حق ہی کی وجہ سے تھا جس سے فرعون کے ساتھ بغض فی اللہ بدرجۂ غلبہ پیدا ہو گیا کیونکہ جب وہ ڈوبنے لگا تو کہنے لگا۔

آمَنْتُ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔	میں ایمان لایا ہوں کہ بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کوئی معبود نہیں۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام کو غصہ آیا کہ کم بخت نے ساری عمر تو خدائی کا دعویٰ کیا۔ اب مرتے ہوئے ایمان لاتا ہے۔ وہ اس کم بخت کے لئے رحمت کو گوارا نہ کرتے تھے۔ اس لئے منہ میں کیچڑ ٹھونس دیا تاکہ زبان سے پوری طرح بات نہ نکل سکے مبادا کہیں رحمت متوجہ ہو جائے۔ چنانچہ ترمذی کی روایت میں خود حضرت

جبرئیل علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے۔

فَأَدُسُّهٗ فِیْ فِیْهِ مَخَافَةَ اَنْ تُدْرِکَهُ الرَّحْمَةُ. (کذا فی جمع الفوائد)	حضرت جبرائیلؑ نے اُس کے منہ میں کیچڑ ٹھونس دیا۔ مبادا رحمۃ خدا اس کی طرف متوجہ ہو جاوے

اور اگر اس پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت جبرائیلؑ نے ایک شخص کو اسلام سے روکا۔ حالانکہ اسلام سے روکنا جائز نہیں۔ سو اس کا علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو معلوم تھا کہ عذاب دیکھنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَلَمْ یَکُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا.	سو اُن کو اُن کا یہ ایمان لانا نافع نہ ہوا جب اُنہوں نے ہمارا عذاب دیکھا۔

تو وہ اسلام سے نہ روکتے تھے صورتِ اسلام سے روکتے تھے جس پر گو رحمت فی الآخرۃ مرتب نہیں ہوتی مگر رحمت فی الدنیا متوجہ ہو سکتی ہے۔ جیسے منافقین صورتِ اسلام کے سبب قتل و اسر سے محفوظ رہے۔ اسی طرح احتمال تھا کہ وہ بھی غرق و اہلاک سے بچ جاتا۔

پھر اس پر اگر کوئی سوال کرے کہ اس آیت میں باْسنا سے مراد عذاب دنیا تو ہے نہیں کیونکہ عذاب دنیا کی رویت قبل انکشاف آخرت قبول ایمان سے مانع نہیں۔ اور ظاہراً یہاں عذاب آخرت کا انکشاف نہ ہوا تھا ورنہ دنیا کی طرف کا احساس بالکل باطل ہو جاتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم نہیں بلکہ انکشاف آخرت کے

بعد بھی ادھر کا احساس باقی رہنا ممکن ہے۔ چنانچہ بعض محتضرین کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو بھی دیکھا اور اس کے ساتھ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی پہچانا۔ چنانچہ گھر والوں سے کہا کہ فرشتے بیٹھے ہیں تم ان سے پردہ کرو۔ تو ابتدائی انکشاف کے ساتھ ادھر کا ہوش رہ سکتا ہے۔ اور فرعون کے واقعہ سے ظاہراً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس وقت ایمان ظاہر کیا ہے۔ اس وقت اس کو انکشاف آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی ہوش تھے۔ چنانچہ اس کا قول آمَنْتُ بِالَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ بتلا رہا ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل کا حق پر ہونا اور ان کا مومن ہونا اس کے خیال میں تھا اور یہ دنیا کا واقعہ ہے۔ تو اس کو ادھر کا ہوش ضرور تھا لیکن اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ انکشاف عذاب آخرت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ پس نا اس دلیل سے انکشاف آخرت کی نفی نہیں ہو سکتی اور یہ انکشاف مانع ہے قبول ایمان سے۔ پس اشکال رفع ہو گیا۔

اب ایک سوال رہ گیا کہ جب یہ حالت مانع ہے قبول ایمان سے اور ایمان نام ہے تصدیق کا اور وہ بعد انکشاف آخرت کے معتبر نہ تھی اگرچہ زبان سے تلفظ کیا جاوے پھر تلفظ سے روکنے سے کیا فائدہ ہوا۔ اور اگر زبان سے اقرار کو نا کسی درجہ میں مفید بھی مان لیا جائے تو اقرار کا قصد بھی کافی ہونا چاہئے۔ اگرچہ کسی عذر سے عجز ہو گیا ہو اور یہاں عجز ہو گیا کیچڑ کی وجہ سے۔ تو وہ اقرار مفید متحقق ہو گیا پھر کیچڑ ٹھونسنے سے کیا فائدہ ہوا؟

سو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گزرا کہ جبرئیل علیہ السلام نے ظاہری رحمت کو بھی اس لئے گوارا نہیں کیا اگرچہ رحمت ظاہری کا ایک گونہ ظہور تھا کہ ختم رکھنے

سے ہو گیا۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ الآیہ آج ہم تیرا بدن مثال کے لئے قائم رکھتے ہیں۔

مگر اس پر بھی ایک سوال ہے کہ اسی ظاہری رحمت میں اُن کا کیا حرج تھا؟ اس کا جواب وہی ہے جس کو میں ذکر کر رہا ہوں کہ اس فعل کا منشا غلبۂ بغض فی اللہ تھا اس میں یہ بھی گوارا نہ ہوا اور مبغوض حق سے ایسا بغض بدون غلبۂ عشق حق کے ہو نہیں سکتا۔ اسی طور پر حدیث سے معلوم ہو گیا کہ ملائکہ میں محبت عشقیہ ہے اور شیطان میں یہ محبت نہ تھی اس لئے وہ کمبخت سجدہ نہ کر سکا۔ پس محبت کا ہونا ضروری ہوا۔ بغیر محبت کے نری طاعات و عبادات و علوم کافی نہیں کیونکہ ان کا بھروسہ کچھ نہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ محبت طبعی ہی کا غلبہ ہو بلکہ محبتِ عقلی کا غلبہ بھی کافی ہے۔

طبعی اور عقلی محبت کا فرق

باقی محققین کا اس میں اختلاف ہے کہ کون سی محبت افضل ہے۔ سو یہ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ محبت عقلی راجح ہے کیونکہ محبت طبعی اختیاری نہیں۔ اس کا حدوث و بقاء بالکل غیر اختیاری ہے اور امر غیر اختیاری پر بعض اوقات دوام نہیں ہوتا بخلاف محبت عقلی کے کہ اس کا حدوث و بقاء اختیاری ہے تو اس پر دوام بھی ہوتا ہے۔

اس پر میں ایک واقعہ سناتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ محبت عقلی طبعی سے راجح ہے۔ ایک واقعہ میں پہلے بھی کسی بیان میں بتلا چکا ہوں۔ وہ یہ کہ میرے پاس ایک دن میں چند خطوط آئے تھے جن کی شانِ خط ایک تھی اور مضمون بھی قریب قریب

تھا اور سب میں ہدیہ دینے کے متعلق اطلاع تھی کہ ہم کچھ ہدیہ پیش کرنا چاہتے ہیں اگر اجازت ہو۔ مگر ہر خط میں رقم کی مقدار مختلف تھی۔ اس اختلاف کے سوا اور سب باتیں یکساں تھیں۔ اگر میں نے ہدیہ کے متعلق کچھ معمولات مقرر نہ کئے ہوتے تو خوش اخلاقی سے لکھ دیتا کہ ہاں بھیج دو مگر میں بدون انشراح واطمینان کے ہدیہ قبول نہیں کرتا۔ اس لیئے میں نے لکھا کہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میرے پاس ایک ہی دن کی ڈاک میں اس مضمون کے چند خط آئے ہیں جو سب ایک ہی جگہ سے روانہ ہوئے اور یکساں نشان خط ہے اور مضمون بھی قریب قریب ہے۔ تو کیا مشورہ اور کمیٹی کر کے یہ خطوط لکھے گئے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہوا ہے تو اس صورت میں یہ ہدیہ میں قبول نہیں کر سکتا۔ اس جواب کے بعد اور تو سب ندارد ہو گئے۔ کسی نے بھی کچھ جواب نہ دیا مگر ایک شخص کا خط آیا اس نے لکھا کہ یکساں خط اور یکساں مضمون ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہ گاؤں ہے۔ ہم لوگوں کو لکھنا آتا نہیں اور لکھنے والا گاہے گاہے ملتا ہے۔ جب کوئی لکھنے والا دستیاب ہوتا ہے تو سب آدمی اسی سے خطوط لکھوا لیتے ہیں۔ یہ بات تو معقول تھی جو میرے معمول کے خلاف نہ تھی مگر اخیر میں ایک مضمون ایسا لکھا جو میرے معمول کا مؤید تھا۔ وہ یہ کہ اس نے یہ بھی لکھا کہ لیکن اور سب کا یا تو جوش ختم ہو گیا یا رقم باقی نہیں رہی۔ اس لیئے سب خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ اور میرا جوش بھی باقی ہے اور رقم بھی محفوظ ہے۔ میں پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔" اب میرا ارادہ ہے کہ اس کا ہدیہ قبول کر لوں گا۔ مگر اس وقت اتنا اور پوچھا ہے کہ تم مجھ کو ہدیہ کیوں دیتے ہو۔ تم کو مجھ سے کیا نفع ہوا اور اخیر میں یہ بھی لکھ دیا کہ دوسرے لوگوں کے جوش کی حالت دیکھ کر اب تو تم کو معلوم ہوا کہ

میرے معمولات صحیح ہیں اور یہ کہ میں نے یہ اصول کیوں مقرر کیے ہیں۔

تو اس واقعہ میں آپ نے دیکھ لیا کہ جوش، تو چند روز میں ختم ہو گیا مگر محبت عقلی باقی رہی اور یہیں سے معلوم ہو گیا کہ ذاکر ہیں جوش و خروش مطلوب نہیں ذاکرین اس کی کمی سے پریشان نہ ہوا کریں کیونکہ جوش کا اکثر قاعدہ ہے کہ جب تک مطلوب حاصل نہیں ہوتا اسی وقت تک رہا کرتا ہے۔ حصول مطلوب کے بعد جوش نہیں رہا کرتا ہاں اگر مطلوب سے تعلق رہے تو بجائے شوق کے اُنس پیدا ہو جاتا ہے۔ پس اس کا کم ہونا محرومی کی علامت نہیں بلکہ وصول کی علامت ہے۔

شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی ذاکر نے شکایت کی کہ حضرت اب وہ پہلا سا شوق نہیں رہا۔ تو فرمایا کہ تم کو خبر بھی ہے "پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔" اور ظاہر ہے کہ محبت تو ماں کے ساتھ بھی ہوتی ہے مگر اس میں جوش نہیں ہوا کرتا۔

پرانی جورو کے اماں ہونے پر ایک سرحدی نواب کی حکایت یاد آئی بڑھاپے میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ تو حاکم ضلع تعزیت کے لئے گیا اور کہا نواب صاحب ہم کو اس کا بہت افسوس ہے کہ آپ کا بیوی مر گیا۔ انگریزوں کی اردو کھڑی بولی ہوتی ہے جس میں مؤنث کو مذکر بولا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انگریزی خوانوں کے سب کام بھی کھڑے ہونے لگتے ہیں ـــــــ

کسی گنوار کا لڑکا انگریزی پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ میاں آج کل تمہارا لڑکا کونسی جماعت میں ہے کتنا پڑھ گیا ہے۔ تو گنوار کہتا ہے کہ جی وہ تو بہت پڑھ گیا صاحب تو کھڑا کھڑا موتنے بھی لگا ہے۔ بس تھوڑی ہی سی کسر ہے۔ شاید وہ کسر یہ ہو کہ کھڑا کھڑا پاخانہ بھی کرنے لگے۔ تو اس گنوار نے انگریزی کا خلاصہ خوب

نکالا کہ کھڑے کھڑے سب کام کرنے لگے۔

غرض نواب صاحب سے کلکٹر نے اُن کی بیوی کے مرنے پر جو رنج ظاہر کیا تو رونے لگے اور کہا "کلکٹر صاحب! وہ ہمارا بیوی نہ تھا اماں تھا۔ ہم کو روٹی کھلاتا تھا، پنکھا جھلتا تھا۔"

واقعی یہ کام تو پرانی ہی بیوی کر رہی ہے۔ نئی دلہن سے یہ کام کہاں ہو سکتے ہیں وہ تو اپنے نخروں اور چوچلوں ہی میں رہتی ہے۔ مگر یہ سب چار دن کی باتیں ہیں، سال دو سال کے بعد سب کا جوش ختم ہو جاتا ہے اور بقول مولانا کے پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔

سو ذکر کی یہی حالت ہے کہ اس میں اوّل ہی اوّل جوش و خروش ہوتا ہے پھر سکون ہو جاتا ہے۔ اس لئے محبت طبعی سے عقلی انفع ہے۔ کیونکہ محبت طبعی کا منشا جوشِ طبیعت ہے اور جوش ہمیشہ نہیں رہا کرتا اور محبت عقلی بناءً علی الکمالات ہوتی ہے۔ تو جب تک کمالات باقی ہیں اُس وقت تک محبت بھی رہے گی۔ اور محبوب حقیقی کے کمالات ختم نہیں ہو سکتے تو اُن کی محبت بھی ختم نہ ہو گی۔

طبعی و عقلی خوف کا فرق

اب یہاں سے واعظین کی غلطی معلوم ہو گئی کہ وہ اپنے وعظوں میں اس قسم کے مضامین بیان کیا کرتے ہیں کہ افسوس ہے مسلمانوں کو خدا پر اتنا توکل بھی نہیں جتنا ایک دوست پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اگر ایک دوست یہ کہہ دے کہ شام کو تمہاری دعوت ہے تو فوراً چولہا ٹھنڈا کر دیں گے۔ اور خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ اِلَّا اور کوئی جاندار روئے زمین پر

عَلَی اللّٰہِ رِزْقُہَا۔ چلنے والا ایسا نہیں کہ جس کی
روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔

مگر خدا کے وعدہ پر ایسا اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ اس لئے کہ دوست کی دعوت پر اس واسطے چولہا ٹھنڈا کیا ہے کہ اُس نے وقت کی تعیین کر دی تھی کہ شام کو دعوت ہے اور تعیین میں یہ خاصہ طبعی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کا وعدہ مطلق ہے۔ کسی وقت کی اس میں تعیین نہیں ہے۔ اگر یہاں بھی تعیین ہوتی، تو کوئی مسلمان ہرگز چولہا گرم نہ کرتا۔ یہاں اہل توکل کو بھی عقلی توکل ہے۔

اسی طرح یہ واعظین یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو غیر خدا سے تو خوف ہے۔ حاکم کا ڈر ہے۔ شیر کا اور سانپ بچھو کا ڈر ہے مگر خدا کا ایسا خوف نہیں ہے یہ بھی اُن کی غلطی ہے۔ کیونکہ ان اشیاء سے طبعی خوف ہے اور خدا تعالیٰ سے طبعی خوف ہونا ضروری نہیں بلکہ عقلی خوف ہونا چاہیئے اور خوف عقلی خدا تعالیٰ سے ہر مسلمان کو ہے۔ خوف عقلی کا حاصل یہ ہے کہ احتمال کے درجہ میں یہ خیال ہو کہ شاید مجھے سزا ہو۔ یہ ایسا خوف ہے کہ اس کے ساتھ رجا بھی ہے۔ کیونکہ جس کو یہ احتمال ہوگا کہ شاید مجھے سزا ہو اُس کو یہ احتمال بھی ہوگا کہ شاید بدون سزا ہی کے مغفرت ہو جائے۔ یہ رجاء ہے۔ اور ایمان اسی کا نام ہے کہ خوف بھی ہو رجاء بھی ہو۔

یہاں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے انبیاء کی نسبت فرمایا ہے یَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ کہ وہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں آیا ہے کہ وہ اژدہا سے ڈر گئے تھے۔ جواب یہ ہے کہ وہ خوف طبعی تھا اور نص میں خوف عقلی

مراد ہے۔ اور خوف عقلی انبیاء کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُن کا اعتقاد یہ ہے۔

وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ — کہ بدون خدا کے حکم کے کوئی چیز ضرر نہیں دے سکتی۔

وہ ضار و نافع حق تعالیٰ ہی کو سمجھتے ہیں۔ اسی طرح کاملین کو حب عقلی خدا کے سوا کسی سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کا مبنیٰ کمالات پر ہے اور خدا تعالیٰ کے سوا کسی میں بھی بالذات کمالات نہیں ہیں۔ ہاں حب طبعی یعنی عشق غیر خدا سے بھی ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ جس محبت کا امر ہے وہ حب عقلی ہے نہ کہ طبعی۔ اسی لئے نصوص میں حب طبعی عشق کا عنوان کہیں مذکور نہیں ہے بلکہ جا بجا حب کا ذکر ہے۔

مگر ایک غالی نے قرآن میں بھی لفظ عشق کا دعوےٰ کیا ہے۔ کہنے لگا کہ حم عسق میں عشق کا ذکر ہے۔ اصل میں یہ لفظ عشق ہی تھا مگر نعوذ باللہ! نعوذ باللہ! چونکہ حضور امی تھے۔ آپ سے شین نہیں نکل سکتا تھا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے آپ کی رعایت سے سین بولا۔ مگر اس احمق سے کوئی پوچھے کہ سارے قرآن میں جو شین کا استعمال ہوا ہے یہ کس پر اترا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم شین نہیں نکال سکتے تھے تو اور جگہ شین کا استعمال کیوں ہوا۔

ایک صاحب نے کہا کہ نہیں یہ وجہ تو نہیں بلکہ شین کے نقطے اس لئے اڑا دیئے تاکہ مولویوں کو پتہ نہ چلے کہ یہ عشق کا ذکر ہے۔ سبحان اللہ! اگر یہ وجہ تھی تو حق تعالیٰ نے تم جیسے بھانڈ بھوڑوں کو یہ راز کیسے بتلا دیا۔ اگر یہ وجہ ہوتی، تو حق تعالیٰ ایسے لوگوں کو یہ راز بتلاتے جو مولویوں پر اس کو ظاہر نہ کرتے اور جب

تم نے اس راز کو محبوبوں تک پہنچا دیا ہے تو لازم آیا کہ خدا نے ایک بات کو چھپانا چاہا تھا مگر وہ چھپ نہ سکی اور یہ محال ہے۔ اس لئے تمہارا یہ نکتہ بھی غلط ہے غرض یہ جاہلوں کے نکتے ہیں جن کے سر نہ پاؤں۔ سو اس طرح تحریف کر کے اگر عشق کا ثبوت دیا جائے تو اس کا تو علاج نہیں ورنہ نصوص میں عشق کا کہیں ذکر نہیں اس سے معلوم ہوا کہ حُبِ طبعی مطلوب نہیں بلکہ حبِ عقلی مطلوب ہے۔

غلبۂ حال

پس یہاں سے ان سالکین کی غلطی معلوم ہو گئی جو تربیت میں مختلف لوگوں کے حالات غلبہ خوف و بکاء کو دیکھ کر افسوس کیا کرتے ہیں کہ ہم کو ایسے ایسے حالات نہیں ہوتے۔ رونا نہیں آتا۔ تو وہ سُن لیں کہ یہ طبعی گریہ ہے جو بعض کو پیش آتا ہے اور یہ مطلوب نہیں۔ مطلوب عقلی گریہ ہے اور وہ تم کو بھی حاصل ہے۔ کیونکہ نہ رونے پر افسوس ہونا یہ خود گریہ ہے۔ (پس میں افسوس کو تو منع نہیں کرتا بلکہ اس افسوس سے اپنی محرومی کے اعتقاد کو منع کرتا ہوں۔ سو تم اپنے کو محروم نہ سمجھو بلکہ اس افسوس کے ہونے سے شکر کرو کہ عقلی گریہ تم کو حاصل ہے)

بہر حال میرے نزدیک حُبِ طبعی سے حُبِ عقلی راجح ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ حُبِ عقلی والوں میں حُبِ طبعی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلبہ حُبِ عقلی کو ہوتا ہے۔ باقی جن پر حُبِ عقلی کا غلبہ ہوتا ہے بعض اوقات ان میں محبتِ طبعیہ بھی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن پر محبتِ طبعیہ کا غلبہ ہے۔ مگر وہاں محبتِ طبعیہ پر حُبِ عقلی غالب ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر جوش دبا رہتا ہے۔ لیکن گاہے گاہے کاملین پر بھی حُبِ طبعی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور یہی اس کی دلیل ہے کہ ان میں بھی طبعی محبت ہے مگر حُبِ عقلی کے غلبہ نے اس کو دبا رکھا تھا۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی غلبۂ حال ہوا ہے۔ واقعۂ بدر کے متعلق آیا ہے کہ اُس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم عریش میں مسلمانوں کی فتح کے لئے دُعا فرما رہے تھے کہ اے اللہ! ان مسلمانوں کو کافروں پر غلبہ دے۔ پھر فرمایا۔

اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ	الٰہی! اگر یہ مختصر جماعت ہلاک
الْعِصَابَةَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ	ہوگئی تو آج کے بعد سے دنیا
الْيَوْمِ۔	میں آپ کا نام کوئی نہ لے گا۔

بتلایئے یہ کیا تھا غلبۂ حال و دلال نہ تھا تو اور کیا تھا۔ بہرحال کاملین تو حب عقلی و طبعی دونوں کے جامع ہوتے ہیں مگر ان میں غلبہ حب عقلی کو ہوتا ہے اور ناقصین میں حُبِ طبعی کو غلبہ ہوتا ہے اور یہ گو کمال مطلوب نہیں مگر محمود ضرور ہے۔

انسان اور عشق جو دونوں سے کورا ہو وہ خطرہ میں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ع
تا فرشتہ لانشد اہر یمنے ست۔

لانشد کے معنی ہیں فانی نشد۔ اور فانی سے مراد صاحب محبت ہے۔ کیونکہ فنا محبت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ بدون محبت کے طاعات وعبادات کی صورت تو متحقق ہو سکتی ہے مگر فنا نفس حاصل نہیں ہو سکتا اور بدون فنا نفس کے طاعات کی حقیقت نہیں متحقق ہوتی۔ جس پر وصول موقوف ہے۔ حافظ فرماتے ہیں سے

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجابِ خودی حافظؔ از میاں برخیز

عاشق و معشوق میں کوئی پردہ نہیں تو خود ہی حجاب ہے اے حافظ

درمیان سے علیحدہ ہو۔

انسان خود ہی حجاب ہو رہا ہے ورنہ حق تعالیٰ تو اتنے قریب ہیں کہ بس تمہیں حاجب ہو اور کوئی مسافت حاجب نہیں۔ اپنے اوپر نظر کرنا چھوڑ دو۔ اپنے کو نیست و نابود سمجھو۔ تکبر کو دماغ سے نکال دو۔ حق تعالیٰ کے احکام میں نازعت نہ کرو۔ بس واصل ہو گئے۔

اسی لئے حضرت بایزید نے جب خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا اور عرض کیا

دُلَّنِی عَلٰی اَقْرَبِ الطُّرُقِ اِلَیْکَ۔	مجھے آپ اپنے نزدیک آنے کا راہ بتائیے۔

تو جواب ارشاد ہوا۔

یَا اَبَا یَزِیْدُ دَعْ نَفْسَکَ وَ تَعَالَ۔	یعنی اپنے آپ کو چھوڑ کر چلے آؤ۔

یعنی خودی و خود بینی کو چھوڑ کر۔ اور تجربہ و مشاہدہ ہے کہ خودی و خود بینی محبت ہی سے نکلتی ہے۔ اس کے بغیر بہت کم نکلتی ہے۔ اسی لئے عراقی طریق محبت کی تمنا کرتے ہیں ؎

صنما رہِ قلندر سزد ار بمن نمائی

کہ دراز و دُور دیدم رہ و رسم پارسائی

رہ قلندر سے طریق عشق مراد ہے اور رسم پارسائی سے طریق عبادت رسمی مطلب یہ ہے کہ طریق عبادت رسمی بہت دُور دراز ہے۔ اس میں وصول دیر سے ہوتا ہے۔ کیونکہ خودی دیر سے نکلتی ہے۔ فنا جلدی نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے

ہر وقت خطرہ ہے اور طریق عشق سے بہت جلد فنا حاصل ہو جاتی ہے۔ شیطان اسی لئے مردود ہوا کہ اس کو فنا نفس حاصل نہ تھی۔ کیونکہ محبت سے کورا تھا۔ اور ملائکہ میں محبت تھی اس لئے وہ فوراً سجدہ میں گر پڑے کیونکہ وہاں نفس نہ تھا۔ اور ملائکہ سے زیادہ انسان میں محبت ہے۔ اسی لئے یہ امانت کا حامل ہوا۔ جس کو حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ۔	ہم نے قرآن کی امانت کو زمین آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا۔

لیکن

فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ	سو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔

ہم نے (اپنی) امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا یعنی اور انسان پر بھی پیش کیا۔ جس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے حملها الانسان آرہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بدون عرض کے وہ حامل امانت نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہ ماننا لازم ہے کہ عرض میں انسان بھی دوسروں کے ساتھ تھا۔ مگر چونکہ آگے حمل میں اس کا ذکر آرہا ہے اس لئے یہاں بیان کی ضرورت نہ تھی اور یہی جواب اس اشکال کا ہے کہ بعض لوگوں نے

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ۔	جب اللہ نے تمام ملائکہ کو سجدہ آدم کے لئے کہا تو تمام نے

فرمان بجا لایا مگر شیطان نے انکار کیا۔

پر شبہ کیا ہے کہ شیطان کے مردود ہونے کی وجہ کیا ہے۔ اس کو تو سجدہ کا حکم ہوا ہی نہیں بلکہ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف ملائکہ کو ہوا تھا۔ نہ معلوم ان صاحبوں کو شیطان کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ شاید کبھی رات کو ہم بستر ہوئے ہوں گے۔

جواب اشکال کا یہ ہے کہ عدمِ ذکر عدم کو مستلزم نہیں اور یہاں اس کے ذکر کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ آگے اِلَّآ اِبْلِيْسَ میں اس کا ذکر آرہا ہے۔ یہ اس کا قرینہ ہے کہ وہ بھی مخاطب تھا۔ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کا ذکر آگے موجود ہو تو کلام سابق میں اکتفاء بالاحق اس کا ذکر نہیں کیا کرتے جیسا کہ یہاں عرض امانت میں انسان کا ذکر اس لئے نہیں ہوا کہ آئندہ حملہا الانسان میں اس کا ذکر موجود ہے۔ یہ جواب اس اشکال کا بہت سہل ہے۔ اس میں استثناء متصل و منفصل کی بحث کی ضرورت نہ رہے گی۔ بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ابلیس کا ذکر کلام سابق میں ایجازاً محذوف ہے اور تقدیر کلام اس طرح تھی وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ وَلِاِبْلِيْسَ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور تمام مخلوقات پر پیش کی۔ امانت سے مراد احکام تکلیفیہ ہیں جن کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ اگر امتثال ہوا تو ثواب ملے گا اور نافرمانی پر عذاب ہوگا۔ عذاب کو سن کر سب ڈر گئے مگر انسان نے ہمت کی اور تحمل کے لئے آمادہ ہو گیا۔

محققین نے لکھا ہے کہ اور مخلوق میں عشق کا مادہ نہ تھا۔ انسان میں عشق کا

مادہ تھا۔ یہ خطاب الٰہی کی لذت سے مست ہوگیا اور اس لذت کے لئے اس نے احتمال عذاب کی بھی پروانہ کی اور کہہ دیا کہ حضرت یہ امانت مجھے دی جائے میں اس کا تحمل کروں گا۔ بس وہی مثل ہوئی کہ چڑھ جا سولی پر اللہ بھلی کرے گا۔ اس نے سوچا کہ جس امانت کی ابتدا یہ ہے کہ کلام وخطاب سے نوازے گئے اگر اس کو لے لیا تو پھر تو روز کلام وسلام وپیام ہوا کرے گا بس ایک سلسلہ چلتا رہیگا کہ آج کوئی حکم آرہا ہے کل کو دوسرا آرہا ہے۔ کبھی عنایت ہے کبھی عتاب ہے تو اس چھیڑ میں بھی بڑا مزہ ہے ؎

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حمل امانت کا راز یہی بتلایا ہے کہ اس کا منشا محبت کی دیوانگی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

علاج النفس

بعض لوگوں نے اس راز کو قرآن سے بھی ثابت کرنا چاہا ہے۔ انہوں نے انہ کان ظلوما جھولا (وہ ظالم ہیں جاہل ہیں) کو اسی پر محمول کیا ہے اور اس کو مدح کہا ہے۔ چنانچہ بعض صوفیا نے ظلوم کی تفسیر میں لکھا ہے اس کے معنی ظلوم لنفسہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان میں فنائے نفس کی صفت تھی۔ مگر میں اس تفسیر کو نہیں مانتا۔ کیونکہ ظلم لنفسہٖ بھی تو شریعت میں محمود نہیں بلکہ مذموم ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے کفار کے باب میں فرمایا ہے۔

کانوا انفسھم یظلمون　　وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں

تو کیا وہ بھی فانی تھے؟

مگر آج کل ایک جماعت نکلی ہے جو نفس کی دشمن ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کو خوب مارو۔ اس پر خوب ظلم کرو۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کو کافر بھی کہتے ہیں حالانکہ سارے بدن میں اگر تلاش کرو تو مومن یہی نکلے گا۔ تو حضرت آپ نفس کو کافر کہہ کر خود اپنے ہی کو کافر کہتے ہیں پھر تمہارا کیا اعتبار۔ پس نفس پر ظلم کرنا یہ کچھ تصوف نہیں ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا تصوف تو یہ ہے۔

ان لنفسك عليك حقا وان لعينيك عليك حقا وان لجسدك عليك حقا۔

تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا اور تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے۔

نفس کے بھی تمہارے ذمہ حقوق ہیں ان کو ادا کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ بس ظلم ہی پر کمر باندھ لو۔ بلکہ اس کے ساتھ بچہ کا سا معاملہ کرو کہ بچوں سے جب کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اول اس کو مٹھائی وغیرہ دے کر بہلاتے ہیں۔ اگر اس سے نہ مانے تو دھمکی سے کام لیتے ہیں۔ اگر اس سے بھی نہ مانے تو بس وہ چپت، وہ چپت۔ صاحب قصیدہ بردہ فرماتے ہیں ؎

النَّفْسُ كَالطِّفْلِ اِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلٰى

حُبِّ الرَّضَاعِ وَاِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

بس اس کے حظوظ کو تو پورا نہ کرو باقی حقوق ادا کرتے رہو۔ خوب کھلاؤ پلاؤ اور اچھی طرح کام لو۔ ؏

کہ مزد ور خوش دل کند کار بیش

ہاں جب کسی طرح باز نہ آئے تو اب سزا دو مگر خود سزا نہ دو بلکہ کسی کے حوالہ کر دو۔ وہ مناسب سزا تجویز کرے گا۔

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست
کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

ورنہ جو لڑکا اپنے ہاتھ سے اپنے چپت مارے گا وہ تو آہستہ مارے گا اور مستحق سزا کافی دے گا مگر حقوق تلف نہ کرے گا۔ بہر حال نفس کو کافر کہنا گویا اپنے کو کافر کہنا ہے۔ شاید یہ لوگ تواضعاً اپنے نفس کو برا بھلا کہتے ہیں۔ مگر ایسی بھی کیا تواضع ہے کہ مسلمان سے کافر بن گئے۔

بعض کی تواضع بھی الٹی ہوتی ہے۔ جیسے ایک شخص کا نام نتھو تھا۔ جب کوئی اس سے نام پوچھتا تو وہ تواضعاً کہا کرتا تھا کہ میرا نام ہے آخ تھو کہنے کا گو، شیخ نتھو۔

جیسے ایک دو جنٹلمین ہمیں ریل میں ملے تھے۔ بڑے ہی شریر تھے۔ انہوں نے ایک منصف صاحب کا مذاق اڑا رکھا تھا۔ جب کھانا کھانے بیٹھے تو ایک نے کہا منصف صاحب آیئے آپ بھی کچھ گوہ موت کھا لیجئے، تو دوسرا کہتا ہے توبہ کرو توبہ، تم کھانے کو گوموت کہتے ہو۔ تو وہ جواب دیتا ہے کہ اپنے کھانے کو کھانا کہنا تکبر ہے۔ اس کو اس حیثیت سے کہ ہمارا ہے گوہ موت ہی کہنا چاہئے غرض سارے غیر منصف جمع تھے سب نے مل کر منصف صاحب کا اچھا خاکہ اڑایا تو جیسے ان لوگوں کی تواضع تھی ایسی ہی ان صوفیوں کی تواضع ہے جو نفس کو کافر کہتے

ہیں اور نفس پر ظلم کرنے کو اچھا سمجھتے ہیں مگر ہمارے نزدیک یہ سب غلو ہے البتہ اگر یہ کسی مغلوب الحال سے منقول ہو تو وہ معذور ہوگا۔ مگر اس کی تقلید نہ کی جائیگی اسی طرح ان لوگوں نے جہول کی تفسیر کی ہے کہ یہ بھولا ناداں ہے۔ اپنی مصالح سے بے خبر ہے، اس لیے تحمل امانت پر آمادہ ہوگیا۔ مگر یہ تفسیر بھی غلط ہے کیوں کہ آگے حق تعالیٰ نے ظلوم وجہول کے آثار کی تفصیل فرمائی ہے۔

لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَ الْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكَاتِ۔

تاکہ اللہ تعالیٰ منافق مرد وعورتوں کو مشرک مرد وعورتوں کو عذاب دے۔

اگر حق تعالیٰ نے ظلوماً جہولاً میں انسان کی مدح کی ہے اور ایسا ہونا ممدوح ہے تو آگے تفصیل میں یہ منافقین وکفار پر عتاب ولعنت وعذاب کیوں مذکور ہے۔ اس لیے یہ تفسیر بھی صحیح نہیں۔

پس قرآن سے تو یہ مسئلہ مستنبط نہیں ہو سکتا لیکن عارفین کے قول سے یہ بات ثابت ہے کہ منشا تحمل امانت کا غلبۂ محبت وعشق تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان میں یہ صفت سب سے زیادہ ہے۔ یہ ملائکہ سے بھی اس باب میں بڑھا ہوا ہے مگر انفع یہی ہے کہ طبعی محبت عقلی سے مغلوب ہونا چاہیے۔ لیکن اگر کبھی بلا اختیار عقلی مغلوب ہو اور طبعی غالب ہو تو گو ایسا شخص مقتدا تو نہ ہوگا مگر قابل ملامت بھی نہ ہوگا بلکہ معذور ہوگا۔ اسی جماعت مغلوبین معذورین میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اہل ظاہر کہلاتے ہیں جن کے نزدیک جمع بین النوعین من التمر کا وہی حکم ہے جو جمع بین الاختین کا۔ پس وہ بھی غلبۂ محبت طبعی سے معذور ہیں۔

اسی طرح ایک غیر مقلد کی حکایت ہے کہ اُن کے نواح میں سخت قحط ہوا۔ لوگوں نے گھر باہر بیچ بیچ کر کھا لیا۔ ان غیر مقلد صاحب کے یہاں ایک گائے تھی جس کے دُودھ میں خدا تعالیٰ نے برکت دے رکھی تھی۔ زمانہ قحط میں اُن کا گھر بھر اُس کے دُودھ سے گزارا کرتا تھا۔ اس لئے زیادہ پریشانی نہ ہوئی۔ جب قحط رفع ہوا تو کسی مہمان نے ان غیر مقلد صاحب سے پوچھا کہ تم نے کیوں کر گزر کیا۔ بیوی بول پڑی ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے ایک گائے دے رکھی تھی۔ اس کے دُودھ سے سب نے گزر کیا۔ غیر مقلد صاحب سنتے ہی غصہ میں بھر گئے اور بیوی سے بولے کہ تو نے خدا کو چھوڑ کر گائے پر نظر کی اور یہ کہہ کر گائے کے گلے پر چھری پھیر دی۔

تو گو ہمارے نزدیک یہ بات تشدد اور غلو میں داخل ہے کیونکہ مسلمان کوئی بھی گائے کو رازق نہیں سمجھتا بلکہ ایک ظاہری سامان سمجھتا ہے اور رازق حقیقی خدا ہی کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس عورت نے بھی اس حقیقت کو اس طرح ظاہر کر دیا تھا کہ ہم کو تو خدائے تعالےٰ نے ایک گائے دے دی تھی۔ مگر پھر بھی ہم اُن کے اس فعل کی قدر کرتے ہیں کہ اس وقت اُن پر مذاق توحید غالب تھا۔ اس لئے اتنی بات بھی ناگوار ہوئی کہ گزارہ کا سبب گائے کو بتایا گیا۔ ایسی حالت میں وہ معذور تھے۔

گو وہ لوگ ہم کو بُرا کہیں مگر ہم تو جو بات قابل قدر ہوگی اُس کی قدر ہی کریں گے کیونکہ ہمارے یہاں تو انصاف ہے اور اُن کے یہاں اُن صاف ہے یعنی صفائی منفی ہے۔ اسی لئے ہم اہل ظاہر کی اس بات کی بھی قدر کرتے ہیں کہ جس حکم کی علت شارع نے نہیں بتلائی وہ اس کی علت تلاش نہیں کرتے بلکہ ظاہر پر

رکھتے ہیں۔ مگر فقہاء محققین نے قیاس سے ان احکام کی علل بیان کی ہیں اور چونکہ قیاس مظہر ہے نہ کہ مثبت، اس لئے احکام قیاسیہ بھی ویسے ہی ہیں جیسے احکام منصوصہ۔ پس وہ کالمذکور فی النص ہیں مگر یہ شرط ہے کہ ہر شخص کو علل بیان کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ مجتہد کو حق ہے اور مجتہد کو بھی ہمیشہ حق نہیں بلکہ وہاں تعلیل کا حق ہے۔ جہاں تعدیہ حکم کی ضرورت ہو اور جو امور تعبدی ہیں جن کا تعدیہ نہیں ہو سکتا، وہاں قیاس کا مجتہد کو بھی حق نہیں۔ اسی لیے فقہاء نے صلوٰۃ وصوم وزکوٰۃ وحج میں تعلیل نہیں کی کہ ان کی فرضیت کی بنا یہ ہے حتیٰ کہ اگر یہ بنا کسی دوسرے طریقہ سے حاصل ہو سکے تو دوسری صورت اختیار کرنا جائز ہو۔ ہرگز نہیں! بلکہ انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ یہ امور تعبدیہ ہیں ان کی علت بیان کرنا جائز نہیں۔

ایک جدید فرقہ

مگر آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جس کو علل نکالنے کا بہت شوق ہے۔ وہ تمام احکام کی علتیں نکالتے ہیں خواہ تعبدی ہوں یا غیر تعبدی۔ انہوں نے ایک چیز ایجاد کی ہے جس کا نام فلاسفی ہے۔ نہ معلوم یہ کون سا لغت ہے۔ اس کا استعمال ان کے یہاں بہت سنتا ہے۔ بس ہر چیز کی فلاسفی نکالتے ہیں کہ نماز کی یہ فلاسفی ہے، روزہ کی یہ فلاسفی ہے اور زکوٰۃ و حج کی یہ فلاسفی ہے۔

انہی میں سے ایک صاحب مجھ سے ملے۔ کہنے لگے کہ پانچ وقت نماز فرض ہونے کی کیا فلاسفی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی ناک جو آگے لگی ہوئی ہے اس کی کیا فلاسفی ہے۔ کہنے لگے کہ اچھی لگتی ہے اگر پیچھے ہوتی تو بدنما لگتی۔ میں نے کہا اگر سب کی ناک پیچھے ہی ہوتی تو یہی اچھی لگا کرتی پھر اگر محض اچھا لگنا

بھی فلاسفی ہے تو یہی جواب ہمارا ہے کہ پانچ وقت کی نماز اللہ تعالیٰ کو اچھی لگتی ہے اُن کو پسند ہے۔ اس لیئے فرض کر دی)

علی گڑھ میں ایک صاحب مجھ سے ملے جو وہاں کالج میں پروفیسر اور عربی و انگریزی کے فاضل شمار ہوتے تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ جہاں زنا کی کثرت ہوتی ہے وہاں بیماری وبا وغیرہ پھیل جاتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا کیا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا وجہ ربط درمیان جنابت و عقوبت کے سمجھ میں نہیں آئی۔ کہنے لگے مدلول تو ظاہر ہے۔ وجہ ربط سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا، پھر ضرر کیا ہوا۔ کہنے لگے ضرر کچھ نہیں ہوا لیکن معلوم ہونے سے نفع ہوتا۔ میں نے کہا، کیا نفع۔ کہنے لگے اطمینان۔ میں نے کہا، اطمینان کے نافع ہونے کی کیا دلیل۔ کہنے لگے، اگر اطمینان نافع نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی درخواست نہ کرتے۔ لیطمئن قلبی۔ میں نے کہا اس کی کیا دلیل کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیئے نافع ہو، وہ آپ کے لیئے بھی نافع ہو۔ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ ایسی طمانیت نافع ہے تو جس سے ابراہیم علیہ السلام نے طمانیت کا سوال کیا تھا، اسی سے آپ بھی کر لیجئے۔ اب آگے اُن کو اختیار ہے چاہے آپ کی تسلی کریں یا نہ کریں۔ اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ علماء کے ذمہ بھی یہ ضروری ہے کہ لوگوں کی تسلی اور اطمینان کیا کریں۔ اُن کے ذمہ تو محض تبلیغ احکام ہے اور بس)) اس جواب سے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس جواب سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ علماء کو یہ مسائل معلوم نہیں۔ علماء کو بحمد اللہ اسرار شریعت بہت کچھ معلوم ہیں مگر ہم آپ کو نہیں بتلاتے ۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

گو اس میں بظاہر ایک دعویٰ تھا مگر

اَلتَّکَبُّرُ مَعَ الْمُتَکَبِّرِیْنَ عِبَادَۃٌ۔ — متکبر لوگوں کے ساتھ تکبر سے پیش آنا عبادت ہے۔

ایسے لوگوں کے ساتھ تواضع مناسب نہیں کیونکہ اس سے وہ علماء کو عاجز دلا جواب سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لئے میں نے کہہ دیا کہ ہم کو حکمت معلوم ہے جب وہ اٹھ کر چلے گئے اور خاص احباب کا مجمع رہ گیا۔ تب میں نے اس کی حکمت جو اپنے بزرگوں سے سُنی تھی بیان کی۔ بعض کو بڑا افسوس ہوا کہ وہ صاحب اگر یہ تقریر سُن لیتے تو اُن کی تسلی ہو جاتی اور معلوم ہو جاتا کہ علماء کے پاس یہ علوم ہیں میں نے کہا ہرگز نہیں! کیا میں اپنی لیاقت جتلانے کو مریض کا مرض بڑھا دیتا۔ اُن کے مرض کا یہی علاج تھا کہ حکمت نہ بتلائی جائے کیونکہ یہ لوگ حکم یکسر حکم ہی کو مقصود اور حکم بضمم حاء کو غیر مقصود سمجھتے ہیں۔

اس کے متعلق ایک مضمون یاد آیا جس کو میں نے ایک بار بیان کیا تھا کہ جو لوگ احکام کی حکمتیں بیان کرتے ہیں وہ دین کی جڑ کھوکھلی کرتے ہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کسی وقت یہ حکم ومصالح کسی اور صورت میں زیادہ حاصل ہوں تو پھر حکم کو بیکار سمجھا جائے گا۔

مثلاً نماز باجماعت کی حکمت آج کل یہ بیان کی جاتی ہے کہ شریعت مسلمانوں میں اتحاد واتفاق پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے پانچ وقت کی جماعت

مقرر کی تاکہ ہر محلہ کے آدمی اپنی اپنی مسجدوں میں باہم مل کر ایک دوسرے کی حالت سے باخبر ہوں۔ باہم سلام و کلام کریں۔ تبادلۂ خیالات ہو۔ نہ معلوم یہ تبادلۂ خیالات کیا بلا ہے۔ پھر سارے شہر کے آدمیوں کو جمع کرنے کے لیئے ہفتہ میں ایک بار جمعہ کی نماز مقرر کی گئی کیونکہ روزانہ شہر بھر کے آدمیوں کا اجتماع دشوار تھا۔ پھر اطراف و جوانب کے دیہاتیوں کو جمع کرنے کے لیئے سال بھر میں دو دفعہ عید کی نماز شروع ہوئی تاکہ دیہاتی شہریوں سے مل کر تہذیب سیکھیں اور ضروریات سے باخبر ہوں۔ پھر تمام دنیا کے آدمیوں کو ایک جگہ میں جمع کرنے کے لیئے عمر بھر میں ایک دفعہ حج فرض ہوا تاکہ ایک دفعہ سب مسلمان تمام بلاد اسلام کے ایک جگہ میں جمع ہو کر تبادلۂ خیالات کریں۔

اوّل تو اس مدعی سے کوئی پوچھے کہ اگر نماز جمعہ کی حکمت یہ ہے کہ سارے شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوں تو چاہیئے کہ جمعہ کی نماز ایک ہی مسجد میں ضروری ہو۔ تعدادِ جمعہ جائز نہ ہو حالانکہ حنفیہ کا مفتیٰ بقول جواز تعدد ہے نیز عیدین کی نماز میں جو حکمت بتلائی گئی ہے وہ جب حاصل ہو سکتی ہے جب کہ دیہاتیوں پر بھی عیدین کی نماز واجب ہو حالانکہ دیہات والوں پر عیدین کی نماز کہاں واجب ہے اور حج کے متعلق جو حکمت بتلائی گئی ہے وہ مشاہدہ کے بالکل خلاف ہے وہاں تبادلۂ خیالات سے اتفاق تو کیا ہوتا، ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں میں سفر حج سے پہلے اتفاق تھا وہاں جا کر راستہ میں ایسے لڑتے ہیں کہ گھر پر کبھی نہ لڑے ہوں گے۔ اسی لیئے حق تعالےٰ نے حج میں خصوصیت کے ساتھ جدال کو منع فرمایا ہے ولا جدال فی الحج اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کو جدال میں کچھ دخل ضرور

ہے۔ تبھی تو خاص طور پر اس سے منع فرمایا ورنہ لا فسوق میں سب گناہوں کے ساتھ یہ بھی آگیا تھا۔ تخصیص بعد تعمیم کی کوئی تو وجہ ہے)

اگر یہ حکمت تسلیم بھی کرلی جائے تو اس پر بنا حکم کرنے میں یہ خرابی ہوگی کہ جو شخص ان اعمال کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا بلکہ ان حکمتوں کو مقصود سمجھتا ہے تو اگر کبھی کسی عارض کے سبب نماز و حج وغیرہ سے یہ حکمتیں حاصل نہ ہوں یا کم حاصل ہوں اور کسی دوسری صورت سے بسہولت حاصل ہوتی ہوں اور کامل طور پر حاصل ہوں تو یہ شخص نماز و حج کو چھوڑ کر اس دوسری صورت کے اختیار کو ترجیح دے گا۔ اور اس میں جو کچھ خرابی ہے ظاہر ہے کہ اس سے احکام اسلام ہی کا انہدام ہو جائے گا۔ پس جو لوگ یہ حکمتیں بیان کرکے اپنے کو حامیٔ اسلام اور خیر خواہ اسلام کہتے ہیں ان کی یہ خیر خواہی ایسی ہی ہے جیسے ریچھ کی دوستی۔

ایک شخص نے ریچھ کو تعلیم دے کر پنکھا جھلنا سکھایا تھا۔ جب آقا سو جاتا تو وہ اس کو پنکھا جھلا کرتا۔ لوگوں نے اس کو منع کیا کہ جانور کا کچھ اعتبار نہیں تم سوتے ہوئے اس سے خدمت نہ لیا کرو۔ کہنے لگا واہ صاحب! میرا ریچھ تعلیم یافتہ ہے کچھ خطرہ کی بات نہیں۔ ایک دن یہ قصہ ہوا کہ ریچھ نے پنکھا جھلنا شروع کیا اس شخص کی ناک پر ایک مکھی آبیٹھی۔ ریچھ نے اس کو اڑا دیا۔ وہ پھر آبیٹھی۔ بعض مکھی بہت بیچڑ ہوتی ہیں کتنا ہی اڑاؤ پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ بالآخر جب ریچھ اڑاتے اڑاتے تنگ ہو گیا تو غصہ میں ایک بڑا سا پتھر لایا کہ اب کے آوے گی تو پتھر سے ماروں گا۔ وہ پھر آبیٹھی، تو ریچھ نے تاک کر پتھر مارا۔ مکھی تو نہ معلوم مری یا نہیں مگر آقا کے دماغ کا بھرتہ ہو گیا۔

دیکھئے! اس بیچارے نے بھی اپنے نزدیک تو آقا کی خدمت ہی کی تھی مگر نادان دوست کی دوستی کا یہ نتیجہ ہوا کہ دشمن تو ہلاک نہ ہوا، دوست ہی کا بھرتہ ہو گیا۔

اسی طرح ایک بادشاہ کا باز اڑ کر کسی بڑھیا کے گھر جا پڑا تھا۔ اس کو باز پر رحم آیا کہ بے چارہ تھک کر گر پڑا ہے۔ تو اُس کو خوب کھلایا پلایا۔ پھر دیکھا کہ اُس کے ناخن بڑھے ہوئے ہیں۔ کہنے لگی افسوس بے چارہ کی کسی نے خبر نہیں لی۔ ناخن اتنے لمبے ہو گئے۔ ان سے تکلیف ہوتی ہو گی۔ اُس نے محبت میں آ کر قینچی سے ناخن تراش دیئے۔ پھر دیکھا کہ اس کی چونچ بھی ٹیڑھی ہے۔ کہنے لگی اس ٹیڑھی چونچ سے کھانے پینے میں تکلیف ہوتی ہو گی قینچی سے اسے بھی کچھ تراش دیا۔ پھر دیکھا کہ اس کے بازو بہت بڑے بڑے ہیں۔ کہنے لگی ہائے یہ اسی واسطے نہیں اڑ سکتا۔ بازوؤں کا بوجھ بہت ہے۔ قینچی سے کچھ کچھ بازو بھی کاٹ ڈالے۔ اب وہ لنڈورا باز ہو گیا۔ بڑھیا بے چاری نے تو اپنے نزدیک سب کام خیر خواہی سے کیے تھے مگر حقیقت میں یہ سب بد خواہی تھی۔

اسی طرح ہمارے بھائی اسلام کے ساتھ خیر خواہی کے گمان میں بد خواہی کر رہے ہیں۔ اپنے نزدیک، تو وہ احکام کی حکمتیں بیان کر کے اسلام کی حقانیت ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ مذہب بالکل مطابق عقل کے ہے مگر اُن کو یہ خبر نہیں کہ ان حکمتوں پر احکام کی بنا کرنے سے اسلام کی جڑ کھوکھلی ہو رہی ہے کہ اس سے ایک وقت میں یہ احکام مٹ جائیں گے محض حکمتیں رہ جائیں گی۔ اس طرح سے کہ جب لوگ یہ سمجھیں گے کہ ان احکام سے اتفاق و اتحاد مقصود ہے اور پھر یہ

دیکھیں گے کہ یہ حکمت کلب گھر میں جانے سے زیادہ حاصل ہوتی ہے جہاں ہر قسم کی آسائش و راحت بھی ہے۔ تو پھر یقیناً وہ کلب گھر میں جانے کو مسجد میں جانے پر ترجیح دیں گے۔ اور اگر خدا نخواستہ کسی وقت اسلام پر قائم رہنے سے اتفاق حاصل نہ ہو سکا اور تبدیل مذہب سے اس کا حصول متوقع ہوا تو جو لوگ ان حکمتوں پر احکام کی بنا سمجھے ہوئے ہیں عجب نہیں کہ اس وقت وہ مذہب بھی بدل دیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ ہر شخص کو احکام کی حکمتیں نکالنے کا حق نہیں اور نہ ہر حکم کی علت بیان کرنا جائز ہے۔ البتہ محقق مجتہد کو یہ حق ہے اور وہ بھی مطلقاً نہیں بلکہ تعدیہ حکم کے لئے اور وہ بھی سب علماء کے نزدیک نہیں۔ چنانچہ اوپر بیان ہوا ہے کہ اس میں بھی دو فرقے ہیں۔ ایک اہل ظاہر جو سوائے علل منصوصہ کے اور کسی علت کا تلاش کرنا جائز نہیں سمجھتے اور ایک فقہاء محققین جو تعدیہ حکم کے لئے صرف احکام غیر متعبد بہا کی علل کا تلاش کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ باقی حکمتوں کا تجسس کرنا باجماع اہل حق غیر ضروری اور بعض جگہ مضر ہے۔ اس اجماع کے مخالف صرف نیچری ہیں جو ہر حکم کی حکمت کو ہی کو تلاش کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس مسئلہ پر تنبیہ کر دی۔

قاعدہ یہ ہے کہ جہاں شارع نے خود حکمت بتلا دی ہو خواہ صراحۃً یا دلالۃً یا الہاماً وہاں تو حکمت کا دعویٰ قطعاً یا ظناً یا احتمالاً جائز ہے اور جہاں شارع نے حکمت سے بالکل سکوت کیا ہو وہاں اس کے درپے ہونا جائز نہیں۔

حکمتوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے جواہرات کا شاہی خزانہ کہ اگر بادشاہ از خود اپنے خزانہ کی سیر کرا دے تو عنایت ہے اس وقت ضرور سیر کرنا چاہئے اور

معلوم کرنا چاہیے کہ یہ یاقوت ہے یہ مرجان ہے یہ زمرد ہے۔

اس مثال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک بزرگ نے حکمتوں کے بارہ میں ایک کتاب لکھی ہے اس میں جواہرات ہی کے نام سے ان کو معنون کیا ہے۔ چنانچہ کہیں یاقوت کا عنوان ہے کہیں زمرد کا، کہیں الماس کا۔ بلکہ اس میں بجائے الماس کے صرف ماس لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں الف لام اصلی نہیں بلکہ اصل لفظ ماس ہے اس پر الف لام تعریف کا زیادہ کیا گیا ہے۔ مگر استعمال میں وہ جزو کلمہ ہی بنا لیا گیا۔ اور آج کل تو الف لام کا اتنا خروج ہے کہ بہت سے اعلام میں الف لام کو جزو علم بنا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کتب و رسائل کے نام ہو گئے ہیں الہارون، المامون وغیرہما۔

اس کے متعلق ہمارے مولانا عبدالعلی صاحب کا لطیفہ ہے کہ الف لام کی چار قسمیں تو نحاۃ نے بیان کی ہیں۔ لام استغراق و عہد خارجی و عہد ذہنی و لام جنس مگر آج کل پانچویں قسم اور بھی ہے یعنی لام نیچریت۔ پھر فرمایا کہ آج کل جو اعلام پر الف لام داخل کیا جاتا ہے یہ الف لام نیچریت کا ہے کیونکہ زیادہ عادت ان ہی کی ہے۔

غرض بادشاہ اگر خود اپنی خوشی سے خزانہ کی سیر کرا دے تو یہ اُن کی عنایت ہے مگر تمہارا درخواست کرنا جرم ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص از خود ایسی درخواست کرتا ہے تو گستاخ سمجھ کر دربار سے نکال دیا جاتا ہے یہی حال حکم کا ہے کہ خود ان کے درپے نہ ہونا چاہیے۔ ہاں حق تعالیٰ بتلا دیں تو نعمت ہے اس وقت ان کو سمجھنا چاہیے اور جن احکام کی حکمتیں معلوم ہو جائیں اُن کو مبانی و مناشی

احکام کا نہ سمجھے بلکہ خود ان کو احکام سے ناشی سمجھے۔ ان شرائط کے ساتھ حکمتوں کے سمجھنے کا مضائقہ نہیں۔ قرآن میں جہاں کہیں حکم کے بعد لام غایت آیا ہے وہ علت نہیں ہے حکمت ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حکم پر یہ اثر مرتب ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ حکم کی بنا اس پر ہے۔ مگر اب تو لوگوں نے حکمت کو علت بنا رکھا ہے۔ اس طرز سے حکمتیں بیان کی جاتی ہیں جس سے حکم کی بنا انہی پر معلوم ہوتی ہے یہ طریقہ غلط ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر بیان حکمت کا مضائقہ نہیں۔ اس صورت میں یہ مفسدہ نہ ہوگا کہ کلرب گھر کو جو بعض جگہ تو کلرب گھر بھی ہو جاتا ہے، نماز با جماعت پر ترجیح دی جائے۔

حکمتوں کی تفصیل

اب سنئے چونکہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے احکام کی حکمتیں خود بیان فرمائی ہیں اس لئے ان کے بیان میں مضائقہ نہیں بلکہ ان کو سمجھنا ضروری اور مفید ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ۔

صوم کے احکام ادا و قضا بیان کر کے فرماتے ہیں کہ ہم تم پر آسانی کرنا چاہتے ہیں دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ حکم قضا میں تو یہ آسانی ہے کہ معذور و مسافر کے ذمہ یہ لازم نہیں کہ چاہے کیسا ہی عذر ہو تب بھی ادا ہی رکھو بلکہ یہ اجازت دی گئی کہ پھر جب چاہو رکھ لو۔ رہا یہ کہ حکم ادا میں کیا سہولت ہے۔ ظاہراً تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی اگر تعمیم ہوتی کہ جب چاہو رکھ لو کسی خاص زمانہ کی قید نہ ہوتی تو اس وقت سہولت ہوتی۔ اور اگر ادا ہی واجب نہ ہوتا۔ تو اور زیادہ سہولت تھی یعنی روزہ مشروع ہی نہ ہوتا۔ چنانچہ کل ہی ایک،

سائل نے مجھ سے کہا تھا کہ بڑی آسانی تو یہ تھی کہ روزہ فرض ہی نہ ہوتا۔ میں نے کہا، اس میں کیا آسانی تھی بلکہ یہ تو محرومی تھی۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ بجا مُراد ہی نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ تو کیا جا مُراد نہ ہونا بھی کوئی لطف ہے (اس جواب کی تفصیل آگے آتی ہے)۔

تو سنیئے، ادا میں تو یہ سہولت ہے کہ ایک مہینہ معین کرنے سے سب مسلمان مل کر ساتھ ہی روزہ رکھتے ہیں اور جو کام سب مل کر کرتے ہیں، وہ آسان ہو جاتا ہے۔ تجربہ کر لیا جائے کہ تنہا روزہ رکھنا جاڑوں میں بھی گراں اور دشوار ہو جاتا ہے اور رمضان چاہے کیسے ہی گرمی کے ہوں ان میں روزہ آسان ہے کیونکہ ایک طرف سے سب کا ایک حال ہوتا ہے۔ اسی لئے اہل عرب کا مقولہ ہے۔

اَلْبَلِیَّۃُ اِذَا عَمَّتْ طَابَتْ مصیبت جو عام ہوتی ہے، خوشگوار ہو جاتی ہے۔

اور فارسی مثل ہے۔ مرگِ انبوہ جشنے دارد۔ اسی کو سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

پائے در زنجیر پیش دوستاں   بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

دوستوں کے سامنے قید میں رہنا اسی لئے تو اچھا ہے کہ وہ سب کے سب غم میں شریک ہو جاتے اور غم کو بانٹ لیتے ہیں اور بیگانوں کے ساتھ باغ کی سیر اس لئے بُری ہے کہ وہ خوشی میں ساتھ نہیں دیتے۔ غرض جس طرح خوشی بھی شرکت احباب ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح رنج بھی شرکت احباب سے کم ہو جاتا ہے۔ تو ادا کی تعیین میں یہ لطف ہے کہ دن بھر سب

ایک حال میں رہتے ہیں اور افطار میں سب کے سب کیسے خوش ہوتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ روزہ ہی نہ ہوتا تو سب سے زیادہ آسانی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سہولت اسی وقت تک سہولت ہے جب کہ اس کا ثمرہ صورت مشقت سے کم نہ ہو اور اگر مشقت مثمر ہو اور سہولت غیر مثمر تو اس صورت میں اس کو کوئی بھی سہولت نہیں کہتا۔ توضیح اس کی یہ ہے کہ فرض کرو ایک شخص کو ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ جس کے حصول کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تجارت کرے دوسرے یہ کہ ملازمت یا زراعت کرے اور ان میں سے ہر صورت ایسی ہے کہ اس میں ہزار روپے مل جانے کی توقع ہے۔ تو اس وقت مثلاً کہا جائے گا کہ زراعت و تجارت دشوار ہے اور ملازمت آسان ہے اب اگر کوئی کہنے لگے کہ سب سے آسان صورت تو یہ ہے کہ کچھ بھی نہ کرو، گھر بیٹھے رہو، تو اس کو کوئی عاقل سہولت نہیں سمجھتا کیونکہ اس طرح ہزار روپیہ نہیں مل سکتا۔ اس کو تو ہر کس محرومی اور کم ہمتی سے تعبیر کرے گا۔ اور محرومی ایسی ناگوار چیز ہے کہ اس پر انسان اس مشقت کو ترجیح دیتا ہے جس میں گو تعب، اور دشواری ہے مگر حصول ثمرہ کی توقع ہے۔

پس یہ بات محقق ہو گئی کہ یسر و عسر کے مقابلہ میں کسی صورت کو یسر جبھی کہا جاتا ہے جب کہ مثمر ہونے میں عسر کے برابر ہو اور جو صورت مثمر ہی نہ ہو وہ یسر ہرگز نہیں بلکہ عسر سے بھی اشد اور ناگوار تر ہے۔

اب سمجھئے کہ روزہ بھی ایک بڑی دولت عظمیٰ ہے۔ یہ ایسی نعمت ہے کہ اس سے بے انتہا ثواب ملتا ہے اور درجات میں ترقی ہوتی ہے۔ تو اس میں بھی

یُسر کا مصداق وہی صورت ہو سکتی ہے جس میں ثواب تو عُسر کے برابر ملے اور پھر سہولت ہو اور اگر روزہ ہی مشروع نہ ہوتا تو یہ ثواب بالکل نہ ملتا۔ تو اس میں کون سی آسانی تھی۔ دراصل آسانی کی حقیقت راحت ہے اور راحت حصول دولت ہی میں ہے نہ کہ محرومی میں۔ پس عدم مشروعیت صوم کے مقابلہ میں تو روزہ کی مشروعیت، اور اس کی دشوار صورت بھی یُسر ہی ہے کیونکہ وہ مثمر تو ہے۔ پھر مشروعیت صوم کے بعد چونکہ مثمر ہونے میں کئی صورتیں برابر ہیں تو ان میں سے جو صورت میں ادا سہل ہو وہ یسر ہو گی اور جس میں ادا دشوار ہو وہ عسر ہو گی۔

لطف و قہر یہیں سے یہ سوال بھی حل ہو گیا کہ ہم پہلے عالم ارواح میں تھے اگر وہیں رہتے تو اچھا تھا کہ وہاں قرب ہی قرب تھا، بُعد کا نام نہ تھا۔ یہاں عالم ناسوت میں آ کر کیا فائدہ ہوا گھس میں مبتلا ہو گئے، بُعد میں پڑ گئے۔ اسی لئے بعض اہل حال اس حالت کو اشتیاق سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ عارف جامی فرماتے ہیں ؎

چند روزے کہ پیش از روز و شب　　فارغ از اندوہ و آزاد از طلب
متحد بودیم با شاہ وجود　　حکم غیریت بکلی محو بود الی آخرہا

اس عالم ناسوت سے پہلے کیا اچھا زمانہ تھا کہ ہم بغیر کسی غم کے اور بغیر ضرورت طلب کے شاہ وجود کے ساتھ متحد تھے اور غیریت کا حکم بالکلیہ محو تھا۔

مگر محققین نے فرمایا ہے کہ نہیں یہاں آنا ہی اچھا ہوا۔ اور ان علائق میں مبتلا ہونا بھی قرب ہے بلکہ اس قرب سے بڑھ کر ہے کیونکہ قرب کی اقسام ہیں

بعض قرب بصورت بُعد ہوتا ہے جیسے بعض لُطف بصورت قہر ہوتا ہے۔ چنانچہ بعضے امیر ہوتے ہیں مگر طاعات سے بے فکر ہوتے ہیں تو یہ لطف بصورت قہر ہے اور بعض دفعہ قہر بصورت لطف ہوتا ہے۔

جیسے ایک بچہ کو میاں جی کئی کئی دن تک کچھ نہیں کہتے حالانکہ وہ سبق یاد نہیں کرتا نہ آموختہ سناتا ہے مگر میاں جی کسی بات پر تنبیہ نہیں کرتے۔ یہ بچہ اپنے دل میں خوش ہے کہ میاں جی مجھے بہت، چاہتے ہیں کہ باوجود کوتاہیوں کے مجھے کچھ نہیں کہتے۔ یہ قہر بصورت لطف ہے اور دوسرے بچے کو روز مارتے ہیں اس پر وہ پہلا بچہ ہنستا ہے کہ نالائق تجھے میاں جی نہیں چاہتے اسی لئے روز پیٹتے ہیں مگر ؎

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ

اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِکَ اَمْ حِمَارٌ

عنقریب دیکھے گا تو جب آنکھوں سے غبار اتر جائے گا کہ تیرے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔

ایک دن جو میاں جی نے سب کا امتحان لیا کہ سبق سناؤ۔ جو لڑکا روز پٹتا تھا وہ تو فرفر سناتا چلا گیا کہ میاں جی بھی خوش ہو گئے اور خوب شاباشی دی اور بہت تعریف کی اور دوسرا لڑکا جو کبھی نہ پٹتا تھا لفظ لفظ پر غوطے کھانے لگا۔ اس پر سر مُنڈاتے ہی اولے پڑنے لگے اور آخر میں مکتب سے نکال دیا گیا۔ اب وہ لڑکا اس سے پوچھتا ہے کہ بتلاؤ کل کس پر لُطف تھا۔ اب وہ تسلیم کرے گا کہ اس پر قہر بصورت لطف تھا اور دوسرے پر لُطف بصورت قہر تھا۔ ہمارے

حاجی صاحب نے اس نکتہ کو قبض کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ لطف بصورت قہر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آید تو درے بسط ہیں ۔ تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں!

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو ۔ آں صلاح تست آیس دل مشو

مولانا بھی اسی کی تعلیم دے رہے ہیں کہ قبض کو صلاح و لطف سمجھو اور اس میں بسط کو دیکھو۔ ایسے ہی بعض یُسر بصورت عُسر ہوتا ہے جیسا کہ روزہ میں بظاہر دشواری ہے مگر ثواب و ترقی پر نظر کرکے یہ سب مشقت عین یُسر ہے خصوص جب کہ اس کی صورت بھی آسان تجویز کی گئی۔ اسی طرح اس وقت جو ہم اس عالم میں آکر علائق میں مبتلا ہو گئے یہ بھی قرب بصورت بُعد ہے کیونکہ عالم ارواح میں ہم ناقص تھے۔ حق تعالیٰ کو زیادہ قرب عطا فرمانا منظور تھا۔ اس لئے یہاں بھیج دیا کیونکہ بہت سے اقسام قرب وہ ہیں جو بصورت صلوٰۃ اور صورت صوم پر موقوف تھے بعض قرب وہ ہیں جو صورتِ حج پر موقوف ہیں۔ یہ روح مجرد کو بدون جسم کے کیونکر حاصل ہوتے۔ وہ تو لنڈی لنڈی کھڑی رہتی۔ وہاں چہرہ ہی نہیں تو نماز میں وضع الجبہہ کیسے ہوتا۔ اس کو بھوک پیاس ہی نہیں تو روزہ کیسے ہوتا اور طواف بیت اللہ کیسے ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ تو روح ان اقسام قرب کی تحصیل سے بالکل عاجز تھی اگر عالم ارواح سے یہاں نہ آتی تو یہ قرب خاص کیسے حاصل ہوتا۔ نماز روزہ کی دولت کیونکر ملتی۔ اس لئے جن پر حُبِ عقلی کا غلبہ ہے، وہ تو اس پر نظر کرکے یہاں کی قید سے خوش ہو کر یوں کہتے ہیں ؎

اسیرت نخواہد رہائی زبند ۔ شکارت نجوید خلاص از کمند

وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ دس برس کی جگہ بیس برس اور زندہ رہیں تاکہ بہت سے اعمال طاعات کا ذخیرہ ساتھ لے جائیں اور کسی باپ بیٹے کی فاتحہ کے محتاج نہ ہوں بلکہ اتنا زندہ رہیں کہ خود ہی اوروں کی فاتحہ دلایا کریں۔ مگر جن پر حُبِ طبعی کا غلبہ ہے وہ اس قید سے گھبرا کر پہلی حالت کا اشتیاق ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محبوب کا قرب صورۃً حاصل ہو جائے چاہے درجے بھی نہ ملیں۔ ہم کو نہ درجات کی ضرورت ہے نہ کسی کے ایصال ثواب کی۔ چنانچہ ایک مغلوب کا قول ہے۔ ؎

طمع فاتحہ از خلق ندا ریم نیاز　　عشق می زیبد من فاتحہ خوانم باقی ست

نیاز[1] کو تو عقل کم ہوتی ہی ہے۔ اس لئے یہ تو ایسی ہی کہیں گے۔ حیرت ہے نیاز ہو کر ایسی بے نیازی۔ اور جن پر حُبِ عقلی کا غلبہ ہے وہ یوں کہتے ہیں ؎

اے کہ بر ماسے روی دامن کشاں　　از سر اخلاص الحمد سے بخواں

وہ تو ادنیٰ سے ادنیٰ عمل کے محتاج ہیں اور اس کے لیے زندگی کی درازی کے طالب ہیں۔ ہم نے دونوں قسم کے بزرگوں کو دیکھا ہے۔ اُن کو بھی جن پر حُبِ طبعی کا غلبہ تھا اور زندگی نہ چاہتے تھے اور اُن کو بھی جن پر حُبِ عقلی کا غلبہ تھا اور زندہ رہنا چاہتے تھے۔

شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ ایک دفعہ بیمار ہو گئے۔ پھر اچھے ہو گئے تو فرمایا

---

[1] یہ اپنے خادم نیاز محمد خاں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ وہ اس وقت سامنے بیٹھے تھے اور شعر میں اپنا نام سُن کر خوش ہو رہے تھے۔ بارک اللہ فیہ ۱۲ جامع۔

کہ ہم ایک بار بیمار ہو گئے۔ ہم کو مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ایک رات حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے ہم کو چھاتی سے لگا لیا۔ بس صبح ہی کو اچھے ہو گئے۔ مولانا بڑے صاف تھے تصنع بالکل نہ تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تو حدیث میں آیا ہے کہ جب ملک الموت ان کے پاس قبض روح کے واسطے آئے تو آپ نے ان کے ایک طمانچہ مارا وہ بے چارے حق تعالیٰ کے پاس واپس گئے اور عرض کیا۔

اِنَّكَ اَرْسَلْتَنِیْ اِلٰی رَجُلٍ لَا یُرِیْدُ الْمَوْتَ۔ آپ نے مجھے ایسے شخص کے پاس بھیجا جو مرنا نہیں چاہتا۔

سو طمانچہ مارنے کی خواہ کچھ ہی توجیہ ہو لیکن ملک الموت کے قول سے موسیٰ علیہ السلام کی شان لا یرید الموت کی تو معلوم ہوئی۔ جس پر کوئی نکیر نہیں کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ طول حیات کی خواہش بھی منافی کمال ولایت نہیں۔ وہ دنیا کی عمر کو موجب زیادت قرب سمجھ کر یہ چاہتے تھے کہ اور زندہ رہیں تاکہ قرب میں اور ترقی ہو۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کا دنیا میں آنا گو بصورت عتاب تھا، مگر حقیقت میں یہ عنایت تھی کہ حق تعالیٰ نے یہاں بھیج کر ہمارے لئے ترقی کی راہیں کھولدیں۔ اگر جنت ہی میں رہتے تو وہ رہنا ایسا ہوتا جیسے گھر کی زمینداری ہوتی ہے جس میں ایک ہزار کی مثلاً بچت ہے بس وہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ اسے ہی کھالو پہن لو پھر کچھ نہیں۔ اور یہاں آنا ایسا ہے جیسے کوئی زمیندار ملازمت پر چلا جائے کہ گھر کی زمینداری الگ رہی اور ماہواری تنخواہ الگ رہی۔ اب وہ بہت

زمانہ کے بعد لاکھوں روپیہ لے کر گھر جائے گا، تو اُسے معلوم ہوگا کہ گھر پر رہنے کا اب مزا ہے۔

اسلام نگر کے ایک صاحب ہیں جو حیدرآباد میں انسپکٹر ہیں۔ گو انسپکٹری کا معاف الیہ بہت بڑا ہے مگر اُن کی تنخواہ بہت ہے دو ہزار روپے ماہوار۔ اب جس وقت وہ پنشن لے کر ہزاروں لاکھوں ساتھ لائیں گے تو اُن کو اسلام نگر میں رہنے کا لطف اُن لوگوں سے زیادہ آئے گا جو محض گھر کی زمینداری پر قناعت کیے ہوئے وہاں رہتے ہیں۔

اسی طرح آدم علیہ السلام کا دنیا میں آنا گویا ملازمت پر آنا ہے کہ یہاں خوب دولت جمع کر کے پھر بے فکری کے ساتھ اصلی وطن میں جائیں گے پس آدم علیہ السلام کا زمین میں اترنا بھی صورتِ قہر میں لطف تھا اور اُن پر جو عتاب ہوا وہ بھی لطف تھا۔ باقی عصی آدم فرمانا یہ محبوبانہ انداز ہے۔ محبوب اپنے عشاق کو جو چاہے کہہ لیتے ہیں۔ کبھی عاصی، کبھی غاوی بلکہ کبھی عاشق بھی محبوب کو ظالم یا ستمگر کہہ لیتا ہے جس سے وہ بُرا نہیں مانتا مگر براہ مہربانی آپ ان سنے ہوئے الفاظ کی نسبت اپنی طرف بطور نقل بھی نہ کریں ورنہ آپ کے عصا لگے گا۔ بعض لوگوں کو سُنے ہوئے الفاظ کی نقل کا شوق ہوتا ہے مگر اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔

چنانچہ ایک صاحب نے کسی مہذب آدمی کو سُنا کہ جب وہ مجلس سے جانے لگے تو صاحب خانہ سے کہا کہ میں مرخص ہونا چاہتا ہوں۔ آپ کو اس لفظ کے استعمال کا شوق ہوا۔ دیر تک اس کو رٹتے رہے کہ ہم بھی اٹھتے ہوئے

یوں ہی کہیں گے۔ اتفاق سے کچھ دیر کے بعد مرخص کی جگہ زبان پر مخنث چڑھ گیا۔ اب جب آپ اٹھنے لگے تو فرماتے ہیں کہ میں بھی مخنث ہونا چاہتا ہوں صاحب خانہ نے کہا کہ اپنی چیز کا آپ کو اختیار ہے۔ جو چاہے کیجئے میں کیا عرض کردوں۔ اب آپ اس کا منہ تکتے ہیں کہ مجھے یہ نیا جواب کیوں دیا جا رہا ہے۔

اسی طرح ایک صاحب نے کسی کو سنا تھا کہ اس نے ایک شخص کے بیٹے کی تعزیت میں یوں کہا تھا خدا آپ کو نعم البدل عطا فرمائے۔ آپ نے اس لفظ کو یاد کر لیا۔ اتفاق سے کسی کا باپ مر گیا تھا۔ آپ اس کی تعزیت کو گئے تو اس سے بھی فرماتے ہیں کہ خدا آپ کو نعم البدل عطا فرمائے۔ تو حضرت سنے ہوئے الفاظ نقل کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ بہرحال حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے ساتھ تلطف وبشری کیا ہے گو صورۃً عسر تھا۔

مشروعیتِ احکامِ صیام

اسی طرح روزہ میں بھی یسر ہے ادا میں بھی اور قضا میں بھی۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ کا تعلق کلام سابق کے ہر ہر جزو سے الگ الگ نہ ہو بلکہ مجموعہ سے ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ مجموعۂ احکام ادا وقضا میں یسر کی رعایت ہے گو کسی ایک جزو ہی کے لحاظ سے ہو۔ اس صورت میں ادا کے لئے یسر تلاش کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ مگر ظاہر پہلا ہی احتمال ہے کہ ہر جزو سے الگ الگ اس کا علاقہ ہے۔ کیونکہ ادا میں بھی یسر کا ہونا مشاہد ہے اور یہ یسر تو دائمی ہے۔ بعض اوقات یسر خاص بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس رمضان میں درمیان کے چند روزے کیسے دشوار

معلوم ہوتے تھے۔ جس سے اندیشہ تھا کہ اخیر کے روزے بہت سخت ہوں گے مگر فوراً ہی ایسی ٹھنڈ ہوئی ہے کہ اخیر کے روزے بہت ہی آسان ہو گئے۔ اور یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں اعانت کا وعدہ ہے کہ یہ حکم دے کر ہم تمہارے لئے آسانی اور سہولت کا ارادہ کر رہے ہیں۔ تم کام شروع کرو ہم تائید و توفیق و تیسیر کریں گے۔

اب یہاں ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ کس کی علت غایہ ہے۔ اگر یہاں واؤ نہ ہوتا تو یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ کی علت غایہ ہو جاتی اور مطلب یہ ہوتا کہ ہم تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتے ہیں۔ تاکہ تم بسہولت اس شمار کو پورا کرلو۔ مگر واؤ کی وجہ سے اشکال پڑ گیا کہ یہ واؤ کیسا ہے اور عاطفہ ہے، تو اس کا معطوف علیہ کیا ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے اور معطوف علیہ کتب علیکم الصیام ہے اور لتکملوا العدۃ کا عامل مقدر ہے اور وہ معطوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں تھی۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ الخ وَشُرِعَ لَکُمْ صِیَامُ رَمَضَانَ لِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ — الخ

یعنی تم پر روزہ فرض کیا ہے اور رمضان کا روزہ تعیین کے ساتھ اس لئے مشروع ہوا تاکہ اس نعمت عظمٰی پر خوش ہو کر حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کرو کہ اُس نے تم سے کام پورا کرا دیا وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ اور تاکہ ان احکام میں تمہاری جن مصالح و منافع کی رعایت کی گئی ہے اُن کا مشاہدہ کر کے شکر کرو۔ حاصل اس تاویل کا یہ ہوا کہ کلام سابق میں احکام

کی تفصیل تھی اور حکمتوں کا اجمال تھا اور اس کلام میں حکمتوں کی تفصیل ہے اور ذکر احکام کا اجمال ہے۔ تو یہ ایک لطیف ایجاز ہے کہ صرف واؤ سے اجمالاً تمام احکام سابقہ پر اشارہ ہو گیا۔

ایک تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یرید اللہ بکم الیسر کو بھی معرض علت میں مانا جائے اور اس کو حکم ادا کی علت کہا جائے۔ اس صورت میں ولتکملوا کا عطف یعنی یرید اللہ پر ہو جائے گا اور لتکملو کو حکم قضا کی علت کہا جاوے گا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ادا کا حکم اس لئے مشروع کیا کہ ہم تم پر آسانی کرنا چاہتے ہیں اور قضا کا حکم اس لئے مشروع کیا تاکہ عذر کی حالت میں رمضان کا روزہ فوت ہو جائے تو دوسرے وقت میں تم شمار کو پورا کر سکو اور رمضان کی برکات حاصل کر سکو۔ اس صورت میں تفصیل حکم کے ساتھ تفصیل احکام بھی ہو گی کہ ہر حکمت ایک ایک حکم کی طرف الگ الگ مشیر ہے۔ آگے وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کا تعلق سب کے ساتھ مجموعۃً ہو گا۔

ایک لطیف توجیہ اس مقام پر واؤ لانے کی شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے کسی اور آیت میں بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ احکام دنیویہ جو معلل بالغایات ہوتے ہیں عموماً وہ احکام خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ وہ غایات مقصود ہوتی ہیں مگر احکام شرعیہ میں ایسا نہیں ہے وہ ہر حال میں خود بھی مقصود ہوتے ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے یہاں علت پر واؤ عاطفہ داخل فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ یہاں معطوف علیہ مقصودیت بالذات ہے اور معطوف مقصودیت للغایات یعنی کلام کے یہ ہوں گے شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الْاَحْكَامِ لِمَقْصُوْدِيَّتِهَا بِالذَّاتِ وَلِغَايَاتِ الْاِكْمَالِ وَالتَّكْبِيْرِ

ذالمشکر۔ یعنی یہ احکام صرف ان علتوں ہی کی وجہ سے مقصود نہیں بلکہ یہ احکام خود بھی مقصود ہیں اور علل کی وجہ سے بھی مقصود ہیں۔ حتیٰ کہ اگر ان میں کوئی بھی حکمت نہ ہوتی جب بھی حق تعالیٰ کا حکم دینا بجا تھا۔ اور اس میں لطیف اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ حق تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے بلکہ اغراض سے الگ ہو کر بھی مقصود ہیں پس حقیقت میں وہ حکم نتائج ہیں نہ کہ مبانی۔

یہ الفاظ شاہ صاحب کے نہیں ہیں۔ انہوں نے تو بہت سہل لفظوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے۔ میں نے اہل علم کی آسانی کے لئے اس کو اصطلاحی لفظوں سے تعبیر کر دیا۔

غرض یہاں مشروعیت احکام صیام کی متعدد حکمتیں مذکور ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یرید اللہ بکم الیسر کو بحکم علت مان کر صرف صیام ہی کے ساتھ مخصوص نہ کہا جاوے بلکہ تمام احکام شرعیہ کی طرف راجع کیا جاوے جس میں صوم بھی داخل ہو گیا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ صوم ہی کی کیا تخصیص ہے ہم کو تو تمام احکام سے یہی مقصود ہے کہ تم پر آسانی کریں۔ اور راحت دیں۔ اب بتلایئے حق تعالیٰ کے برابر کون شفیق حاکم ہو سکتا ہے کہ وہ محض ہماری راحت ہی کے لئے حکم دیتے ہیں ان کی کوئی منفعت نہیں۔

صاحبو ـــ ماں باپ بھی اگر بیٹے کو کوئی حکم دیتے ہیں تو اس میں بھی ان کی کوئی نہ کوئی ذاتی غرض ضرور ہوتی ہے اور کچھ نہ ہو تو ان کی راحت سے اپنے کو راحت دینا مقصود ہوتا ہے۔ پس سب کے سب طالب اغراض ہیں مگر حق تعالیٰ کی ان احکام میں کوئی اپنی غرض نہیں ہے بلکہ وہ تو محض ہماری آسانی اور راحت

کے لئے احکام مقرر فرماتے ہیں اور تمام احکام شرعیہ میں آسانی عام ہونے کی دلیل دوسری آیت میں صریحاً مذکور ہے۔

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۔ اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں۔

تو مطلب یہ ہوگا کہ ایک ہی حکم کیا بلکہ جملہ احکام میں مقصود یسر ہی ہے کیونکہ یسر مفعول ہے یرید کا۔ پس یسر مراد و مقصود ہوا۔ اب اس میں دو احتمال ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ خود حکم ہی یسر ہو۔ دوسرے یہ کہ حکم میں یسر ہو۔ اس کو حدیث الدین یسر نے صاف کر دیا کہ اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم دین ہی کو یسر فرما رہے ہیں۔ فی الدین یسر نہیں فرمایا۔ کیونکہ فی الدین یسر میں یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یسر دین سے کوئی الگ شے ہے جو اس میں آکر داخل ہو گئی ہے۔ چونکہ یہاں ایسا نہیں تھا بلکہ جس چیز کا نام یسر ہے وہ دین ہی ہے۔ اس لئے الدین یسر فرمایا ہے۔

دین کی حقیقت

صاحبو! لوگوں کو دین کی حقیقت معلوم نہیں۔ اس لئے وہ اس کو دشوار سمجھتے ہیں مگر بخدا دین کی حقیقت لذت و راحت ہے۔ ذرا اس پر عمل کر کے دیکھو تو ہر کام میں لذت و راحت معلوم ہوگی اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ ۔ کہ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

صاحبو! نماز اور ذکر میں وہ لذت ہے کہ اس کی مستی میں ذاکر ساری پریشانیوں

کو بھول جاتا ہے۔

ایک بزرگ چند سال ہوئے اکبر جہاز میں سوار تھے جب کہ وہ طوفان میں آرہا تھا۔ اس جہاز کے مسافر مجھ سے جس قدر ملے سب پریشان تھے اور اس مصیبت کی حالت کو بڑے ہیبت ناک لہجہ سے بیان کرتے تھے مگر ان بزرگ سے جو میں لکھنؤ میں ملا تو وہ بڑے خوش تھے۔ ہنس ہنس کر واقعہ بیان کرتے تھے کہتے تھے کہ اس وقت بڑا مزا آرہا تھا۔ جہاز میں ہر طرف نور ہی نور تھا۔ کیونکہ سب لوگ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ تھے۔ کوئی ذکر کر رہا تھا، کوئی توبہ استغفار کوئی گناہوں پر رو رہا تھا بس بڑا مزہ آرہا تھا۔ ان لوگوں سے کوئی دین کی لذت کو پوچھے کہ وہ انوار ذکر کی لذت میں جہاز کا طوفان میں آنا اور غرق ہونے کو تیار ہونا بھی بھول گئے۔

اہل اللہ کو نماز روزہ میں ایسی لذت آتی ہے جیسے عاشق کو محبوب کے پیر دبانے اور پنکھا جھلنے میں۔ انصاف سے کہئے کہ اگر کوئی محبوب عاشق سے یہ کہہ دے کہ بس اب پنکھا نہ جھلو آرام سے بیٹھو۔ تو کیا عاشق خوش ہو کر یہ کہے گا کہ اچھا ہوا، اس نے میرے ہاتھ نہیں دکھائے۔ ہرگز نہیں تو آپ ذرا احکام شرعیہ پر عمل کر کے دیکھیں۔ انشاء اللہ لذت و راحت ہی حاصل ہو گی۔

باقی کبھی جو نماز میں کچھ عارضی مشقت پیش آجاتی ہے یہ لیسر کے خلاف نہیں کیونکہ ایسے اتفاقات، تو آسان سے آسان کام میں بھی پیش آجاتے ہیں۔ کیا کھانا کھانے میں کبھی لقمہ نہیں اٹکتا یا پانی پیتے ہوئے پھندا نہیں لگتا۔ تو پھر ان کو بھی دشوار کہنا چاہئے صاحبو! جب یہ بات ہے۔ پھر چاہیے تو یہ تھا کہ حق تعالیٰ مسجد میں آنے کی آپ

سے فیس لینے کیونکہ یہاں آکر نماز پڑھ کر تم کو راحت حاصل ہوتی ہے۔ اس راحت پر فیس لگ سکتی ہے مگر وہ تو ایسے کریم ہیں کہ تم کو راحت پہنچا کر اس پر بھی خود ثواب دیتے ہیں کہ تم نے راحت حاصل کر لی اس کا انعام لو ——— کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ وہ کس کس طرح ہم کو راحت دینا چاہتے ہیں ——— چنانچہ ارشاد ہے

بَشِّرِ الْمَشَّائِیْنَ فِی الظُّلَمِ اِلَی الْمَسَاجِدِ بِالنُّوْرِ التَّامِّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔

کہ جو لوگ اندھیرے میں چل کر مسجد میں آتے ہیں اُن کو قیامت میں نور کامل حاصل ہونے کی بشارت دے دیجئے۔

بتلایئے اگر کوئی محبوب اپنے عاشق کو اجازت دے دے کہ رات کو اندھیرے میں آکر ہم سے مل لو تو فیس لینے کا محبوب کو حق ہے یا عاشق کو۔ ظاہر ہے کہ محبوب ہی کو حق ہے مگر یہاں حق تعالیٰ تو ثواب کی بشارت دے رہے ہیں۔ پھر یہاں یہ بھی اجازت ہے کہ لالٹین ساتھ لے لو حالانکہ جب عشق میں پردہ ہے، تو چاہیئے تھا کہ روشنی میں آنے کی اجازت نہ ہوتی۔ مگر نہیں یہاں اس کی بھی اجازت ہے۔ گو بعض اس کے بھی قائل ہیں کہ اگر راستہ میں خطرہ نہ ہو تو روشنی ہرگز ساتھ نہ لائی جائے۔ یہ بھی ایک مذاق ہے۔ بعضے عشاق گھونسہ بازی میں خوش ہیں کہ محبوب ذرا دو چار ڈھول بھی لگا دیا کرے کیونکہ یہ خصوصیت کی علامت ہے۔ اسی طرح یہ لوگ عشاق کے تحمل کو افضل سمجھتے ہیں تاکہ خصوصیت ظاہر ہو۔ اور دوسرے اظہار تمیز سے بچتے ہیں تاکہ عشق کا پردہ رہے۔ ہر ایک کا مذاق محمود ہے کیونکہ مقصود سب کا اچھا ہے ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

عنوانات مختلف ہیں اور حسن یعنی قرآن ایک ہی ہے۔ ہر عنوان اس ایک ہی حسن کی طرف مشیر ہے۔

بہر حال حق تعالیٰ عشاق کے سُنانے کو اس مقام پر اپنے احکام کی حکمتیں بیان فرما رہے ہیں کہ دیکھو ہم نے تم پر کیا کیا احسانات کیے ہیں اور عشاق کی تخصیص اس لئے کی کہ ان احکام میں لذت ویسر کا احساس انہی کو ہوتا ہے۔ یہ تو آیت کی تفسیر کے متعلق کلام تھا۔

انعامِ الٰہی

اب ختم رمضان کے مناسب جو مضمون اس میں ہے اُس کو خاص طور پر بیان کرتا ہوں۔ سو ختم رمضان کے مناسب اس میں دو جز ہیں ایک ولتکملوا العدۃ۔ اس میں حق تعالیٰ نے اکمال عدت کو بھی حکمت کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی مطلوب ہے۔ یعنی جس طرح رمضان کا آنا نعمت ہے اس کا خیر وخوبی سے ختم ہو جانا بھی نعمت ہے کیونکہ اس میں امتثال امر پر کامیابی ہے اور جب بندہ امتثال حکم میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس سے ایک خاص فرحت حاصل ہوتی ہے اور غلبۂ مسرت میں یوں کہتا ہے ؎

شکر للہ کہ نمردیم ورسیدیم بدوست　　　آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

نمردیم کے معنی یہ نہیں کہ رمضان میں نہ مرنے پر شکر کرتے ہیں۔ کیونکہ اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ رمضان میں مرنا تو خوش قسمتی ہے۔ پھر اس کے نہ ہونے پر خوشی کیسی۔ گو جیسے رمضان میں مرنا بھی خوش قسمتی ہے نہ مرنا بھی خوش نصیبی ہے

کیونکہ زندہ رہنے میں زیادہ عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ مثلاً جو لوگ مرگئے اُنہوں نے تو پندرہ ہی روزے رکھے، ایسے کم ہمت بنے۔ اور جو زندہ رہے اُنہوں نے پورے تیس رکھے مگر پھر بھی یہاں مزدیم سے موت حقیقی کی نفی مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ شکر للہ کہ ہم رمضان میں مریل نہ ہو گئے۔ روزہ سے عاجز نہ ہو گئے کہ اب تو روزہ نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ بعضے ایسے بھی ہیں جنہوں نے مریل ہو کر روزے نہیں رکھے۔ بلکہ بعضے تو ترک عمل سے منجاوزہ ہو کر ترک اعتقاد کو لے کر روزہ نماز کو منحوس سمجھتے ہیں۔

جیسے ایک میواتی کا قصہ ہے کہ اُس نے روزہ رکھا تھا۔ اتفاق سے اسی دن بھینس مرگئی۔ تو کم بخت نے لوٹا منہ کو لگا کر پانی پی لیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہا، لے پرکھوا لے روزہ۔ تو نے میری بھینس مار دی، میں نے تیرا روزہ توڑ دیا (کم بخت پیٹ بھر ہی کے جاہل تھا)

اسی طرح ایک دیہاتی بڈھے کی حکایت ہے کہ بڑھاپے میں اُس کے لڑکوں نے اُس کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا اور بات بات میں اُس کو برا بھلا کہنے لگے۔ بیچارے نے مجبور ہو کر ایک طرف اپنا پلنگ ڈال لیا اور نماز روزے میں مشغول ہو گیا۔ اتفاق سے لڑکوں کے بیل مرگئے۔ کچھ کھیتی میں نقصان آگیا۔ تو سب کی رائے اس پر متفق ہوئی کہ یہ سب نحوست بڈھے کے نماز روزہ کی ہے۔ بالآخر سب اُسی کے پاس گئے اور خوشامد کر کے اُس کو اپنے ساتھ شامل کیا اور کہا، تو نماز نہ پڑھا کر۔ ہم سب تیری پوری خدمت کیا کریں گے۔ اُس نے کہا بہت اچھا! میں نے تو اسی واسطے نماز شروع کی تھی کہ اکیلا پڑا ہوا کیا کروں گا۔ اگر تم

میری خدمت کرو اور ساتھ شامل رکھو تو پھر نماز کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ دنوں تو لڑکوں نے اس کی خوب خدمت کی۔ پھر گھبرانے لگے۔ تو بڈھے نے کہا، لائیو او جھوکا کلھڑا (وضو کا لوٹا) میں نماج گھال لوں (نماز پڑھ لوں)۔ لڑکوں نے پھر ہاتھ پیر جوڑے کہ : تو نماز مت پڑھ۔ ہم اب سے پوری خدمت کریں گے۔ اب بڈھے کا یہی معمول ہو گیا کہ جہاں لڑکے خدمت میں کمی کرتے اور وہ او جھو کا کلھڑا مانگتا۔ پھر سب ٹھیک ہو جاتے۔ کچھ ٹھکانا ہے اس جہالت کا کہ کم بختوں نے نماز کو ایسا منحوس سمجھ رکھا تھا۔

ہمارے اسی قصبہ میں ایک زمیندار کا لڑکا ذرا نماز روزہ کا پابند تھا تو اُس کا تایا کہا کرتا تھا کہ ارے تو نماز پڑھ پڑھ کر ہاتھ پھیلا کر کیا مانگا کرتا ہے۔ تیرے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ اُس کے نزدیک گویا نماز روزہ وہ کرے جس کے گھر کھانے کو نہ ہو۔ وہ تو خدا سے مانگے اور جس کے پاس ضرورت کے موافق سب کچھ ہو، اُسے خدا کی کچھ ضرورت ہی نہیں — استغفر اللہ!

تو صاحبو! اگر ہم بھی ایسے ہی ہو جاتے تو کیا ہوتا۔ یہ خدا کی عنایت ہے کہ وہ ہم سے کام لے لیں اور کام لینا اس لئے کہتا ہوں کہ سب باگیں اُن کے ہی قبضہ میں ہیں ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست ... مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

بس اپنا کچھ کمال نہ سمجھو نہ کسی گنہگار کو حقیر جانو۔ اس لئے کہتے ہیں ؎

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست ... آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ما

شاید دوسرے مصرع پر کسی کو شبہ ہو کہ اس میں تو اپنی تعریف ہونے لگی۔ اپنا کمال

ظاہر کر رہے ہیں۔ تو خوب سمجھ لو کہ یہ اپنی تعریف نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہے کیونکہ ہمارے اندر دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہاتھ، پاؤں، دماغ، آنکھیں وغیرہ ہمارے اعضاء ہیں۔ اس حیثیت سے اُن کی تعریف کرنا مذموم ہے دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ سب سرکاری مشینیں ہیں جو ہم کو عطا ہوئی ہیں۔ اس حیثیت سے ان کی تعریف کرنا اظہار نعمت ہے۔ یہاں اسی دوسری حیثیت سے اپنی ہمت پر آفریں ہے۔ یہاں معقول سے کام لینا چاہیے۔ اس حیثیت سے اپنے اعضاء کے ساتھ محبت کرنا بھی مذموم نہیں بلکہ محمود ہے کیونکہ اس صورت میں یہ اپنے ساتھ محبت نہیں بلکہ حق تعالیٰ کے ساتھ محبت ہے کہ اُس نے ہم کو ایسی ایسی مشینیں عطا کی ہیں۔ اسی حیثیت سے ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے محبوب کے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پڑتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ تک لے گئے ہیں۔

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را
کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اپنے ہاتھوں کو ہزار بار بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے محبوب کا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے۔

اس حیثیت سے اپنے اعضا کا علاج بھی کرنا محمود ہے۔ اگر سر میں درد ہو، تو

تیل لگانا چاہیئے۔ کوئی مقوی دوا یا غذا استعمال کرنا چاہیئے کیونکہ یہ سرکاری مشینیں ہیں۔ ان کی حفاظت ضروری ہے جیسے انجن کی مشین کو تیل دینا اور صاف کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ہاتھ پیر میں درد ہو تو اس کی مالش کرو۔ زخم ہو جائے تو مرہم پٹی کرو اور سب میں یہ نیت کرو کہ اس سے صحت ہوگی۔ تو عبادت کامل طور پر ادا ہوگی اور اگر یہ کہا جائے کہ معذور کی نماز بھی تو کامل ہی ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ گو معذور کی عبادت کا ثواب تندرست کے برابر ہو مگر تجربہ اکثر یہ ہے کہ حالت صحت میں جیسا تعلق بشاشت کا قلب کو حق تعالیٰ سے ہوتا ہے مرض میں وہ تعلق نہیں ہوتا تو اس لحاظ سے ہی دوا کرنا چاہیئے۔ جسم کو گھلاؤ نہیں، صحت کی قدر کرنا چاہیئے۔ اپنی جان کو مارنا کوئی تصوف نہیں نہ اس سے کچھ قرب ہوتا ہے۔ ہاں اگر سمن مفرط ہو تو اس کے کم کرنے کی اطباء ضرور تدبیر کرتے ہیں۔ مگر اس وقت بھی اپنی رائے سے تقلیل غذا نہ کرو بلکہ شیخ کا اتباع کرو ورنہ بجائے نفع کے ضرر کا اندیشہ ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ذاکر کو تقلیل غذا سے منع فرمایا تھا۔ انہوں نے اپنے کچھ حالات بیان کیے۔ تو مولانا نے فرمایا کہ دماغ میں یبس آگیا ہے جنون کا مقدمہ ہے۔ تم تقلیل غذا موقوف کردو اور دماغ کا علاج کرو۔ مگر وہ تو ان کشفیات کو کمال سمجھے ہوئے تھے۔ اس لیے مولانا کے قول پر اعتماد نہ کیا۔ بالآخر جنون ہوگیا اور سارے اذکار و اشغال موقوف ہو گئے۔ پھر یہ حالت تھی کہ بالکل ننگے بیٹھے رہا کرتے۔

اس لیے میں کہتا ہوں کہ اپنے اعضاء کو سرکاری مشین سمجھ کر کبھی تیل بھی دیا

کرو۔ دودھ گھی بھی کھایا کرو۔ اس حیثیت سے اُن کی محبت کرنا، حفاظت کرنا اور جب ان سے خدا تعالیٰ کے احکام کی تعمیل ہو جائے تو اس پر ان کی تعریف کرنا سب محمود ہے۔ یہی مطلب ہے اس شعر کا ؎

شکر للہ کہ نمردیم ورسیدیم بدوست　　آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

پس رمضان کا ختم ہو جانا بھی نعمت ہے کہ ہم سے حکم کی تعمیل ہو گئی اگر رمضان ختم نہ ہوتا تو اس کامیابی کی مسرت کیونکر حاصل ہوتی۔ اور کامیابی پر جو انعام کثیر ملتا ہے وہ کیسے ملتا۔ البتہ جس نے رمضان کو ضائع کیا ہو اُس کے لئے ختم رمضان موجب حسرت ہے۔

جیسے اب محکمہ بندوبست بند ہو گیا ہے تو ملازمت تلاش کرنے والے رو رہے ہیں کہ ہائے تنخواہ ملنے کا دروازہ بند ہو گیا۔ مگر ایک وہ ملازم ہیں جو زمانۂ بندوبست میں سرکاری خدمت انجام دے چکے ہیں۔ وہ اس کے بندوبست ہونے سے خوش ہیں کیونکہ اُن کو حسن کارگزاری پر اتنا انعام ملا ہے کہ گھر بھر گیا ہے۔ پھر بعض کو اس محکمہ کے بند ہو جانے پر دوسرے محکمہ کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ وہ تو اور زیادہ خوش ہیں۔ اور حق تعالیٰ کے یہاں تو ہمیشہ یہی صورت ہوتی ہے کہ ایک محکمہ بند ہو جانے پر ملازموں کو بیکار نہیں چھوڑا جاتا بلکہ دوسرے محکمہ کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔ تو یہاں جو ایک دفعہ ملازم ہو گیا اُس کے لئے گویا استمراری پٹہ لکھ دیا گیا ہے کہ عمر بھر ملازمت سے برخاست نہیں ہو سکتا۔ البتہ تبدیل محکمہ ہوتی رہتی ہے کہ اب روزہ رکھو اب حج کرو، اب قربانی کرو، اب نماز پڑھو۔ چنانچہ رمضان کے ختم ہوتے ہی کل سے اشہر حج شروع ہو جائیں گے۔

دوسرا جزو ختم رمضان کے مناسب اس آیت میں لتکبروا اللّٰہ ہے ایک تفسیر پر۔ کیونکہ بعض نے اس سے عید کی نماز مراد لی ہے جو ختم رمضان ہی پر ہوتی ہے جس میں اور نمازوں سے چند تکبیریں زیادہ ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ہم نے رمضان کا روزہ اس حکمت سے فرض کیا ہے کہ اس کو ختم کرکے تم انعام کامیابی کے مستحق ہو اور اس کامیابی پر حق تعالیٰ کی حمد وثنا خاص طریق سے کرو وہ صلوٰۃ عید ہے ظاہر کرو اور بعض نے لتکبروا اللّٰہ سے مطلق حمد وثنا مراد لی ہے۔ اس تفسیر پر اس جزو کو خاص ختم رمضان ہی سے مناسبت نہ ہوگی۔

تفسیر رحمۃ للعالمین

اب میں آیت کی تفصیل کے لئے دو حدیثیں پڑھتا ہوں جن میں سے ایک کو تو لتکملوا العدۃ سے مناسبت ہے یعنی ختم رمضان سے اور ایک کو لتکبروا اللّٰہ سے تفسیر اول پر یعنی عید کی نماز سے مناسبت ہے۔

پہلی حدیث تو یہ ہے جس کے راوی غالباً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رَغِمَ اَنْفُہٗ رَغِمَ اَنْفُہٗ رَغِمَ اَنْفُہٗ اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تین شخصوں پر بددعا کی ہے کہ اُن کی ناک رگڑی جائے۔ ذلیل وخوار ہو جائیں۔ اب سمجھ لیجئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بددعا کیسی ہوگی۔ شاید اس پر کوئی طالب علم یہ کہے کہ ہم حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے نہیں ڈرتے کیونکہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔ دوسرے آپ نے حق تعالےٰ سے یہ بھی عرض کیا ہے۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّمَا مُؤْمِنٍ آذَیْتُہٗ اَوْ شَتَمْتُہٗ اَوْ جَلَدْتُہٗ

أو لَعَنْتُهُ فَاجْعَلْهَا لَهُ صَلٰوةً وَزَكٰوةً وَقُرْبَةً تُقَرِّبُهُ إِلَيْكَ۔

اے اللہ! میں بشر ہی ہوں (اس لیے عوارض بشریہ مجھے بھی لاحق ہوتے ہیں) تو جس شخص کو میں ایذا دوں یا برا بھلا کہوں یا سزا دوں یا کسی پر لعنت (و بد دعا) کروں تو اس کو اُس کے حق میں رحمت اور (گناہوں سے) پاکیزگی اور قربت کا سبب بنا دیجئے کہ اُن (کے ذریعہ سے آپ اُس کو اپنا مقرب بنالیں۔ تو جب آپ نے اپنی بد دعا کے متعلق خود یہ دعا کی ہے کہ وہ سبب رحمت و قرب بن جایا کرے۔ تو پھر آپ کی بد دعا سے کیا ڈر؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ میں تو یہی امر محل سوال ہے کہ عالمین سے مراد کیا ہے اور عالمین کے لئے آپ کے رحمت ہونے کا کیا مطلب ہے۔ مشہور یہ ہے کہ عالمین اپنے عموم پر ہے اور اس عموم میں کفار بھی داخل ہوں گے۔ اور چونکہ آیت میں کوئی تحدید و توقیت نہیں ہے تو لازم آئے گا کہ آپ کفار کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں سبب رحمت ہیں اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ کفار پر آخرت میں آپ کی رحمت کس طرح ظاہر ہوگی۔

بعض علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ اگر ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود نہ ہوتا تو کفار کو آخرت میں اب سے زیادہ عذاب ہوتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس میں کچھ کمی تجویز کی گئی ہے۔ مگر میرے دل کو یہ جواب نہیں لگا کیونکہ اس دعوے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نہ ہوتے تو عذاب زیادہ تجویز کیا جاتا۔ دوسرے جہنم کا عذاب قلیل بھی ایسا شدید ہے کہ ہر شخص یوں سمجھے گا کہ میں سب سے زیادہ عذاب میں ہوں۔ تو اس قلت سے اُن کو نفع کیا ہوا۔

میرے ذہن میں جو اس کا جواب آیا ہے وہ یہ ہے کہ عالمین سے مراد تو معنی عام ہی ہیں۔ مگر رحمت سے مراد خاص وہ رحمت ہے جس کا تعلق ارسال سے ہے یعنی رحمت فی الدنیا۔ کیونکہ ارسال دنیا ہی کے ساتھ خاص ہے آخرت سے اس کو کوئی علاقہ نہیں اور دنیا میں جو آپ کی رحمت مومنین وکفار سب کو عام ہے وہ رحمت ہدایت وایضاح حق ہے۔ چنانچہ قرینۂ مقام اسی پر دلالت کر رہا ہے اس لئے کہ پہلے تبلیغ ہی کا ذکر ہے۔

اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ۔	اس میں کافی مضمون ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو بندگی کرتے ہیں

رہا یہ سوال کہ پھر اس میں آپ کی تخصیص کیا ہے۔ ہدایت وایضاح حق میں تو تمام انبیاء آپ کے شریک ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تخصیص محض رحمت کے اعتبار سے نہیں بلکہ مجموعہ رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کے اعتبار سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عالمین کے لئے ہادی بن کر آپ ہی مبعوث ہوئے ہیں اور عالمین سے مراد تمام مکلفین ہیں جن میں جن وانس، عرب وعجم سب داخل ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ بعثت عامہ آپ کے ساتھ مخصوص ہے۔ بخلاف اور انبیاء کے کہ اُن کی دعوت خاص خاص اقوام کے لئے تھی۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگر دیگر انبیاء کی دعوت خاص تھی تو نوح علیہ السلام

کی تکذیب سے تمام عالم کے کفار کیوں غرق کئے گئے۔ بلکہ چاہیئے تھا کہ عذاب صرف ان لوگوں پر آتا جن کی طرف وہ خاص طور پر مبعوث ہوئے تھے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو دعوت عامہ مخصوص ہے۔ اُس سے مراد دعوت عامہ فی الفروع ہے۔ باقی اصول میں تو ہر نبی کی دعوت عام ہوتی ہے کیونکہ اصول تمام انبیاء کے یکساں ہیں۔ اور نوح علیہ السلام کے زمانہ میں تمام عالم کے کفار اصول ہی میں اُن کی تکذیب کرتے تھے یعنی توحید و اعتقاد رسالت ہی میں خلاف تھے۔ اس لیئے سب پر عذاب نازل ہوا۔

بہرحال اس آیت کی تفسیر اگر وہی ہے جو میں سمجھا ہوں جب تو اس میں صرف عموم دعوت کا بیان ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ آپ کی بد دُعا بھی رحمت ہے جو اس سے بے فکری کی جائے اور اگر دوسری مشہور تفسیر ہے تو وہ منافی عذاب کے نہیں۔

رہی حدیث تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی یہ درخواست اُس بددعا کے ساتھ مخصوص ہے جو غلبۂ غضب[1] میں بلا عمد صادر ہو۔ اور یہ بد دُعا تو عمداً ہے کیونکہ اس میں تو آپ تبلیغ احکام کے ساتھ رغم انف فرما رہے ہیں۔ اور اگر یہ مضمون۔۔ فَاجْعَلْهَا لَهُ صَلٰوةً وَّزَكٰوةً وَّقُرْبَةً ۔۔۔ الخ ہر بد دُعا کے لیئے عام ہوگا۔ تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا۔ سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَكُلُّ نَبِيٍّ مُسْتَجَابٌ۔ اگر آپ

---

[1] قلت یؤید ما ورد فی الحدیث بلفظ انما انا بشر اغضب کما یغضبون۔ الحدیث ۱۲ جامع

کی بد دعا مطلقاً قبول نہیں ہوتی تو لعنتہم کے بعد عمل نبی مستجاب سے تاکید کیوں کی جا رہی ہے۔

بہرحال یہ شبہ تو رفع ہو گیا۔ اس لئے آپ کی بد دعا سے بے فکری نہیں ہو سکتی مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بد دعا ایسے لفظوں سے کی ہے جن سے دعا بھی نکل سکتی ہے۔ کیونکہ آپ رَغِمَ اَنْفُہٗ فرما رہے ہیں اور رَغِمَ اَنْفُہٗ نمازیں بھی ہوتا ہے۔ تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے اللہ! ان کو نمازی بنا دیجئے۔ گو محاورہ میں یہ معنی مراد نہیں ہوتے مگر لفظ سے بنا بر لغت نکل سکتے ہیں۔ اور کبھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا کیا ہے کہ ایک لفظ کو معنی عرفی سے صرف کر کے بنا بر لغت دوسرے معنی پر محمول کیا ہے تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس وقت حضور صلے اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کے جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو روکا کہ آپ ایسے لوگوں کی نماز کیوں پڑھاتے ہیں جن کے لئے استغفار کرنے سے حق تعالیٰ نے آپ کو منع فرمایا ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔

ان کے لئے ایمان کی دعا کریں یا نہ کریں۔ اگر ستر مرتبہ بھی کریں تب بھی ان کی بخشش نہیں ہو گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمرؓ! حق تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے اور اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستر سے زیادہ استغفار کرنے سے ان کی مغفرت

ہوجائے گی۔ تو میں اس سے زیادہ کر لوں گا۔

فلسفی مزاج مصنفین تو اگر اس حدیث کو سن لیتے تو موضوع ہی کہہ دیتے۔ کیونکہ اس پر اشکال ہوتا ہے کہ کیا نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی محاورہ کی بھی خبر نہ تھی کہ اس قسم کی تردید سے تخییر مراد نہیں ہوتی بلکہ تسویۃ فی عدم النفع مراد ہوتا ہے اور ذکر سبعین سے تحدید کا قصد نہیں ہوتا بلکہ تکثیر مراد ہوتی ہے۔ مگر حدیث صحیح ہے۔ بخاری مسلم کی روایت ہے۔ اس کو موضوع نہیں کہا جا سکتا۔ باقی علماء نے اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے ہیں مگر میں نے ان جوابوں کو یاد نہیں رکھا بلکہ اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ کا جواب مجھے بہت پسند آیا وہی یاد رکھا۔

ہمارے استاد علیہ الرحمۃ کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غایت رحمت سے محض الفاظ سے تمسک فرمایا۔ اس جواب کا حاصل وہی ہے کہ آپ نے معنی عرفی سے عدول کر کے معنی لغوی پر کلام کو محمول فرما لیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ معنی عرفی کی آپ نے نفی فرما دی بلکہ لفظی احتمال کے طور پر فرمایا کہ فی نفسہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی ہم بھی کہتے ہیں کہ گویا عرفاً رغم انفہ بددعا ہی کے لئے ہے مگر لغۃً اس سے دعا بھی نکل سکتی ہے کہ اے اللہ! ان کو نمازی بنا دے تاکہ ان کے یہ عیوب سب مٹ جائیں۔ یہ ایسی تاویل ہے جیسے مثنوی کے اس شعر کی شرح میں ؎

آتش ست ایں بانگ نای و نیست باد
ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

شراح کا اختلاف ہوا ہے۔ بعض نے مصرع ثانی میں نیست باد کو بددعا پر

براہ کرم ورق نہ موڑیں

محمول کیا ہے جس میں یہ آتش عشق نہ ہو، خدا کرے وہ ملیا میٹ ہو جائے اور بعض نے اس کو دعاء پر محمول کیا ہے کہ مولانا ان کے لئے مقام فنا کی دعا کر رہے ہیں کہ خدا ان کو بھی فنا عطا فرماوے۔ ایسے ہی رغم انفہ میں دعا اور بد دعا دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

اہمیتِ ذکرِ رسولؐ

اب سنیئے وہ تین شخص کون ہیں۔ ایک تو وہ شخص ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سنے اور صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا حق ہے۔ جب آپ کا نام مبارک لیا جائے یا سنا جائے تو صلی اللہ علیہ وسلم کہنا واجب ہے۔ اگر نہ کہے گا تو گناہ ہوگا ایسے ہی حق تعالیٰ کے نام پاک کے ساتھ جل جلالہٗ یا تعالیٰ یا اور کوئی لفظ مشعر تعظیم کہنا واجب ہے ورنہ گناہ ہوگا۔ لیکن ایک مجلس میں اگر چند بار نام لیا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر صلے اللہ علیہ وسلم کہنا (اور حق تعالیٰ کے نام پر جل جلالہٗ یا تعالیٰ کہنا) ایک بار تو واجب ہے اور ہر بار کہنا مستحب ہے

لہ یہ اولیٰ ہے باقی صرف علیہ السلام کہنا بھی کافی ہے کما فی العالمگیریہ باب الکراہیۃ ج ۷۔ اور نیز وجوب صلوٰۃ یا سلام کو شامی اور عالمگیریہ میں سماع الاسم کے ساتھ مقید کیا ہے اور حدیث من ذکرت عندہٗ سے عموم معلوم ہوتا ہے فلیحرر ۱۲ ظ۔ قلت یمکن حمل الحدیث علیہ فان الذکر لا یخلو عادۃ عن الاسم ۱۲۔ اشرف۔

وہ اس کا مصداق ہوگا ؎

اَعِدْ ذِکْرَ نُعْمَانٍ لَّنَا اِنَّ ذِکْرَہٗ
هُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَہٗ يَتَضَوَّعُ

حضرت نعمان کا تذکرہ ہمارے سامنے دہرائیے کیونکہ اُن کا تذکرہ کستوری ہے جتنا تو اُسے دہرائے گا پھیلی گی۔

جتنی دفعہ درود پڑھا جائے گا تذکرہ کا لطف ہوگا اور گو ہر بار صلی اللہ علیہ وسلم کہنا شرعاً ضروری نہیں بلکہ مستحب ہے مگر محبت وعشق کا مقتضا یہ ہے کہ ہر بار درود پڑھا جائے کیونکہ عاشق کو اس کے بغیر چین نہیں آتا۔ مجنوں کا واقعہ ہے ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد ۔۔۔ در بیابان غمش بنشستہ فرد

ایک آدمی نے مجنوں کو جنگل طے کرتے ہوئے دیکھا کہ وہ اپنے غم کے بیابان میں تنہا بیٹھا ہوا ہے۔

ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم ۔۔۔ مے نمودے بہر کس نامہ رقم

ریت کاغذ تھی اور انگلیاں قلم تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کو خط لکھ رہا ہے۔

گفت اے مجنون شیدا چیست ایں ۔۔۔ می نویسی نامہ بہر کیست ایں

اُس نے کہا، اے عاشق مجنون یہ کیا چیز ہے۔ یہ خط تو کس کے نام ہے۔

گفت مشق نامِ لیلےٰ می کنم ۔۔۔ خاطرِ خود را تسلّی مے کنم

اُس نے کہا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔

اسی طرح عشاق کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر بغیر چین نہیں ملتا۔ جتنا بھی ہو تھوڑا ہے مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا نام لینا حدود کے ساتھ ہونا چاہیے ہر طرح اور ہر طریقہ سے اجازت نہیں۔ مثلاً محمد محمد کا ورد کرنا جائز نہیں بلکہ ذکر رسول کا طریقہ یہ ہے کہ درود شریف پڑھا جائے۔

یہاں تو محمد محمد کہنے کی بھی اجازت نہیں اور آج کل غضب یہ ہے کہ بعض لوگ اپنے پیر کے نام کا وظیفہ پڑھتے ہیں اور وہ بھی حرف ندا 'یا' کے ساتھ۔ چنانچہ یا وارث کہتے ہیں اور تاویل یہ کرتے ہیں کہ وارث خدا تعالیٰ کا نام ہے کیا خوب! بھلا آپ کو خدا کے ناموں میں سے ایک یہی نام ملا۔ آخر خدا تعالےٰ کے بہت سے ناموں میں سے یہی نام کیوں چھانٹا گیا۔ کیا اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ اس نام کو پیر کے نام سے مناسبت ہے۔ یقیناً اس تخصیص کی یہی وجہ ہے تو کیا یہ شرک نہیں ہے کہ خدا کے ذکر میں پیر کا ذکر بھی شامل ہے۔

ایسے ہی آج کل ہمارے خاندان میں ایک بدعت نکلی ہے کہ خطوط وغیرہ کے شروع میں یا امداد اللہ یا ھُوَ الرَّشِیْدُ یا ھُوَ الْقَاسِمُ یا ھُوَ الْمُعِیْنُ یا بِفَضْلِ الرَّحْمٰنِ لکھتے ہیں۔ صاحبو! مجھے اس میں سے بُوئے شرک آتی ہے خدا کے واسطے اس طرز کو چھوڑ دو۔ یہ مقدمۂ شرک ہے۔ اور ایک دوسری بدعت جو اس سے کم درجہ کی ہے یہ نکلی ہے کہ اپنے نام کے ساتھ امدادی یا قاسمی و رشیدی لکھتے ہیں۔ اور بعضے اس احقر کی طرف نسبت کر کے اپنے

کو اشرفی لکھتے ہیں ۔ چاہے واقع میں کوڑی بھی نہ ہوں ۔ مگر بنتے ہیں اشرفی ۔ یہ بھی لغو حرکت ہے ۔ اس میں خواہ مخواہ گروہ بندی اور تحزب ہے ۔ کیونکہ ان سلاسل میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ جس کے اظہار کی ضرورت ہو ۔

پس اس کو حنفی و شافعی کی نسبت میں قیاس کرنا غلط ہے ۔ کیونکہ حنفیہ و شافعیہ میں خود فروعی اختلاف بہت ہے اور ائمہ اربعہ کے مقلدین کو باقی اسلامی فرقوں سے اصولی اختلاف ہے ۔ تو اس نسبت میں اس بات کا اظہار ہے کہ ہم اصولاً ائمہ اربعہ کے متبع ہیں اور فروعاً کسی خاص امام کے مقلد ہیں لیکن امدادی ورشیدی و قاسمی میں جو نسبت ہے اس سے کون سے اختلاف پر متنبہ کرنا مقصود ہے ۔ کچھ بھی نہیں ۔ اس میں سوائے گروہ بندی کے اور کچھ مقصود نہیں ۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا ۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہر طریقہ سے جائز نہیں ۔ اور حاجی صاحب کا جو شعر ہے ؎

دے مجھے عشق محمدؐ اور محمدیوں میں گن

ہو محمدؐ ہی محمدؐ ورد میرا رات دن

اس سے مراد یہ ہے کہ مجھے قاعدہ شرعیہ کے موافق ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی توفیق ہو ۔ مگر چونکہ شعر میں تنگی ہوتی ہے اس لئے شعر میں تفصیل نہ ہو سکی ۔ کیونکہ وہاں بحر و وزن کی رعایت بھی ہوتی ہے ۔ اسی لئے مولانا ایک مقام پر اس تنگی کی شکایت کرتے ہیں ؎

معنی اندر شعر جز باخبط نیست   چوں فلاسنگ آں زا ضبط نیست

اور بعض دفعہ ان رعایات سے گھبرا کر مولانا بعض تسامحات کا عذر بیان فرماتے ہیں ؎

قافیہ اندیشم و دلدار من ! گویدم مندیش جز دیدار من

ہاں اگر کوئی ایسا شعر کہے جیسا ہمارے ایک دوست نے کہا تھا۔ وہ البتہ ایسی تنگی سے خالی ہوگا۔ قصہ یہ ہوا کہ ایک بار وہ ایک نئی روشنی والے مولوی صاحب سے ملے اور دیوان قاآنی کا نسخہ اُن کو پیش کیا۔ مگر انہوں نے کتاب کو دیکھا بھی نہایت لاپروائی اور تکبر کے لہجہ میں کہا کہ کیا یہ آپ کی تصنیف ہے (یہ نیچری اکثر متکبر ہوتے ہیں)، تو اُن صاحب کو غصہ آگیا۔ انہوں نے بھی تمسخر سے کہہ دیا کہ جی ہاں! میری ہی تصنیف ہے۔ کہنے لگے کیا آپ شاعر ہیں۔ کہا، جی ہاں! کہا، کیا آپ فی البدیہہ کوئی شعر کہہ سکتے ہیں۔ کہا، ہاں! انہوں نے کہا، کوئی شعر سنایئے۔ تو آپ فرماتے ہیں ؎

گر مصور تری تصویر اکھینچے ——— !

تو اُس کے کام کے لئے سوا دو مہینے چاہئیں

کہا یہ کیا شعر ہے جس میں نہ وزن نہ بحر نہ قافیہ نہ ردیف۔ کہا جناب میں پہلے وزن و بحر کی رعایت کیا کرتا تھا۔ پھر میں نے آپ کا ایک مضمون دیکھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ پُرانی رسوم کا اتباع لغو ہے مگر علماء لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں ہمیں چاہئیے کہ ان رسوم کو ترک کر کے جس طریق میں راحت معلوم ہو اُس کو اختیار کریں میں نے آپ کی اسی رائے پر عمل کیا اور سوچا کہ شعر میں وزن و بحر و قافیہ کی رعایت بھی پرانی رسم ہے اور اس سے کلام میں تنگی بھی ہوتی ہے تو اس کو بھی ترک کر دینا چاہئیے (آپ نے تو رسوم دینیہ کے ترک کا مشورہ دیا تھا جو رسوم شعریہ سے

بدرجہا اہم ہیں جب اُن کا ترک آپ کے نزدیک مذموم نہیں تو رسوم شعر کا ترک بدرجہ اولی مذموم نہ ہونا چاہیئے) وہ صاحب کہتے تھے کہ اس جواب سے وہ مولوی صاحب بالکل لاجواب اور خاموش ہو گئے۔

تو اگر ایسا شعر ہو تو اس میں واقعی تنگی نہ ہو گی۔ ورنہ وزن و بحر کی رعایت کے ساتھ شعر میں کیا کیا مضمون آ سکتا ہے ضرور تنگی ہوتی ہے۔ اس لیئے حاجی صاحب کے شعر میں محمدؐ ہی محمدؐ سے یہ مقصود نہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر اسی طریق سے کیا جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ کا ذکر ہونا چاہیئے۔

باقی رہا طریقہ تو اس کو علماء احکام سے پوچھنا چاہیئے۔ سو ہمارے اکابر نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کا طریقہ درود شریف ہے یا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا۔ صرف محمدؐ محمدؐ کہنا کوئی ذکر نہیں۔ بلکہ بعض مشائخ نے کہا ہے کہ صرف اللہ اللہ کہنا بھی ذکر غیر ثابت ہے بلکہ خدا تعالیٰ کا ذکر احادیث سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یا سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وغیرہ کے ساتھ مقید معلوم ہوتا ہے اس کا ایک جواب ہمارے بعض اکابر نے دیا تھا کہ حدیث میں ہے۔

لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یُقَالُ فِی الْاَرْضِ اَللّٰہُ اَللّٰہُ۔	جب تک زمین پر اللہ اللہ کہنے والا کوئی باقی ہے اسوقت تک قیامت نہ آئے گی۔

تو اس سے اللہ اللہ کا ذکر ہونا ثابت ہے۔ مگر یہ جواب قواعد پر منطبق نہیں کیونکہ یقال کا مقولہ جملہ ہوتا ہے۔ سو لامحالہ یہاں ذکر بضمن جملہ ہی مراد ہے اور میں نے یہ جواب؎ دیا تھا کہ اس میں حرف ندا مقدر ہے۔ اصل میں یا اللہ ہے اور تقدیر

؎ حاشیہ بر ص ۷۴۵

حرف ندا عرب میں رائج ہے جیسے یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی یا یوسف۔ باقی ہر دفعہ نیت ندا کی ضرورت نہیں بلکہ شروع میں ایک بار نیت کر لینا کافی ہے۔ اگر ہر بار نیت کی ضرورت ہو تو کوئی فعل اختیاری بھی نہ ہو سکے گا۔ دیکھئے مسجد کی طرف نماز کی نیت سے چلنا موجب ثواب ہے۔ تو کیا ہر قدم پر نیت مشی و ارادہ رفع قدم ضروری ہے۔ ہرگز نہیں۔ ذرا ایسا کر کے تو دیکھو چلنا بھی دشوار ہو جائے گا۔

اسی لئے شمس بازغہ والے نے بھی اس سے بحث کی ہے اور مثال دی ہے کہ اگر عود بجانے میں ہر نقرہ پر قصد کرے تو بلید ہو جاوے گا۔ غرض افعال اختیاریہ کے لئے حدوث میں تو ارادہ کی ضرورت ہے مگر ان کے بقا میں ارادہ کی ضرورت نہیں۔ اگر افعال اختیاریہ کا بقا بھی ارادہ پر موقوف ہو تو ان کا صدور دشوار ہو جائے گا اسی طرح ذکر میں ایک دفعہ نیت ندا کافی ہے۔ پھر جتنی دیر تک بھی کرتے رہو گے وہی نیت مستمر رہے گی۔ اور اگر کوئی شخص ہر دفعہ میں نیت کو ضروری کہے گا، تو ہم کہیں گے پھر ذکر میں ہر ہر لفظ بلکہ ہر حرف پر ارادہ ضروری ہونا چاہیئے کہ اب

لہ (حاشیہ از صـ۷۴۴) مگر اس جواب کا مخدوش ہونا بھی ثابت ہو گیا کیونکہ لفظ اللہ سے حرف ندا کا حذف کرنا نحاۃ نے ممنوع کہا ہے اس لئے اور جواب کی ضرورت ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ یہاں خاص معنی کے راسخ کرنے کیلئے خود تکرار لفظ کا اس طرح مقصود ہے جیسے لغات کا یاد کرنے والا یا قرآن کا یاد کرنے والا ایک ایک لفظ کا تکرار کرتا ہے حالانکہ وہ جملہ مفیدہ نہیں ہوتا ۱۲ منہ

الف کہہ رہا ہوں اب لام اب ہا۔ اگر ایک لفظ بھی بلا ارادہ صادر ہوا تو چاہیے کہ ثواب نہ ملے مگر انشاء اللہ اس طرح ذکر ہی نہ ہو سکے گا۔ جب ہر حرف پر ارادہ کی ضرورت نہیں تو نیت نداہی کی کیوں ضرورت ہے۔

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ بعض لوگ جو ذکر میں اللہ کی ہاء کا خیال کرتے ہیں کہ ہاء اچھی طرح ظاہر ہوئی یا نہیں یہ غلطی ہے۔ بس اس طرح ذکر ہو چکا۔ میاں ایک دفعہ صحیح طور پر مخارج سے نکال کر ذکر شروع کرو۔ اس کے بعد مخارج کی فکر میں نہ پڑو تاکہ طبیعت مشوش نہ ہو۔ کوئی نماز تو نہیں ہے جو مخارج کے ادا نہ ہونے سے فاسد ہو جائے گی۔ شاید کوئی کہے کہ ذکر تو ناتمام رہے گا میں کہتا ہوں کہ تم بھی تو ناتمام ہی ہو۔ تم ہی کون سے ذاکر کامل ہو۔ تو جیسا ذاکر ہے، ویسا ہی ذکر بھی ناتمام ہی سہی ——!

کانپور میں مجھ سے ایک بڈھے نے پوچھا تھا کہ وتروں کے بعد سبحان الملک القدوس کہنا کیسا ہے۔ میں نے کہا، ہاں مسنون ہے حدیث سے ثابت ہے۔ کہنے لگا وہ حدیث تو ضعیف ہے۔ میں نے ظرافت سے کہا، تم بھی تو ضعیف ہو۔ تم ہی کہاں کے قوی ہو جو تمہیں حدیث قوی کی ضرورت ہے۔ اس وقت مجھے اس حدیث کی قوت وضعف کی تحقیق نہ تھی۔ ہاں اتنا معلوم تھا کہ موضوع نہیں ہے اور فضائل اعمال میں احادیث ضعیفہ پر بھی عمل جائز ہے۔ اس لئے میں نے بڈھے میاں کو بوجہ اس کے کہ وہ علمی مباحث کو سمجھ نہیں سکتا تھا اس وقت یہی جواب دے دیا کہ تم بھی تو ضعیف ہی ہو۔

اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ مخرج ہاء ادا نہ ہوا تو ذکر ناتمام ہو گا یہ میں اس

سے کہتا ہوں کہ تم بھی تو ناتمام ہو۔ ہمارا ذکر تو مخارج ادا ہونے پر بھی ناقص ہی رہیگا
بس ؎

این قبولِ ذکرِ تو از رحمت است — چون نمازِ مستحاضہ رخصت است

ذکر کا کمال ادا مخارج پر نہیں ہے بلکہ اس کا کمال تو قلب پر ہے کہ دل سے کس طرح نکلتا ہے خلوص سے یا عدمِ خلوص سے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ناظرِ قلبیم اگر خاشع بود — گرچہ گفت لفظ نا خاضع بود

تو ان قیود میں نہ پڑنا چاہیے کہ الف بھی نکلا یا نہیں ہا بھی ادا ہوئی کہ نہیں اس سے بجز تشویش کے کچھ فائدہ نہیں۔ اور یہ جواب وہمی مزاجوں کے لئے ہے ورنہ اصلی جواب یہ ہے۔ جب ہا معنوی ہے تو ضرورت کثرت سے تلفظ معاف ہے جیسے ضرورت شعر میں لفظ اللہ کا الف ساقط ہو جانا جائز ہے۔ کما قال

اَلَا لَا بَارَكَ اللّٰهُ فِي سُهَيلٍ —— (کما فی البیضاوی فی تحقیق اسم اللہ)

اور ضرورت کثرت ذکر ضرورت شعر سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے۔ نیز روزمرہ کے محاورات قسم وغیرہ میں ہا کو کوئی بھی ادا نہیں کرتا۔ مگر نہ اس کو کوئی مفتی عاصی کہتا ہے اور نہ یمین کو غیر منعقد کہتا ہے۔ اور بیضاوی میں مقام مذکور میں جو حذف الف کے ساتھ صریح یمین کو غیر منعقد کہا ہے محشی نے اس کی تفسیر کی ہے ای الیمین بلانیۃ اور یہاں ذاکر کی نیت یقینی ہے اس لئے وہ ذکر لکھا جاوے گا۔

اسی طرح ذکر نفی اثبات میں جو یہ قید ہے کہ دس مرتبہ کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم کہا کرے یہ بھی مقصود نہیں۔ بس جب یاد آئے کہہ لیا کرے خواہ سو دفعہ کے بعد ہی سہی۔ بعض لوگ اس قید کی بھی پابندی کرتے ہیں کہ

تسبیح میں دس دس دانوں کے بعد ایک موٹا سا دانہ ڈالتے ہیں تا کہ فوراً یاد آجائے اس طرح یہ شخص اسی دھندے میں رہتا ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف توجہ کامل نہیں ہوتی ایسے ہی بعض لوگ رگ کیماس کے دبانے کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔ یہ تمام قیود غیر مقصودہ ہیں۔

میں نے حضرت حاجی صاحبؒ سے ضیاء القلوب سبقاً سبقاً پڑھی ہے اس سے بہت نفع ہوا کہ مجھے طریق کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ جب میں ان قیود پر گزرا اُس وقت معلوم ہوا کہ دسویں بار پورا کلمہ کہنا مقصود نہیں مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی کہہ لے۔ یہ سب مضمون لنگی شعر پر چلا تھا جس میں یہ کہا گیا ہے۔ ع

ہو محمدؐ ہی محمدؐ ورد میرا رات دن

اصل مضمون یہ تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک سُن کر درود شریف پڑھنا ضروری ہے۔ غرض ایک تو آپؐ نے اُس شخص کو بد دُعا دی ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سُن کر درُود نہ پڑھے۔ اور اس سے خود غرضی کا شبہ نہ کیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مصلحت کے واسطے یہ حکم مقرر فرمایا۔ ہرگز نہیں! بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر درود نہ پڑھنے سے چونکہ حق تعالیٰ کا غصہ اُس شخص پر ہوتا ہے۔ اس لئے آپؐ نے اُمت کو خدا تعالیٰ کے غضب سے بچانا چاہا ہے۔

خدمتِ والدین کی اہمیت

دوسرا شخص جس پر بد دُعا فرمائی ہے، وہ ہے جس نے اپنے باپ یا ماں کو دونوں کو بڑھاپے میں پایا اور اُن کی خدمت کر کے جنت نہ پالی۔ بڑھاپے کی قید اس

لئے لگائی کہ جوانی میں تو وہ تمہاری خدمت کے محتاج نہ ہوں گے بلکہ خود تمہیں اُن کے محتاج ہو گے۔ کیونکہ ماں باپ کی جوانی میں اولاد کا بچپن ہوتا ہے۔ ہاں جب اولاد جوان ہوتی ہے تو اس وقت والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اب اولاد کو اُن کی خدمت کرنا چاہیئے۔ حق تعالیٰ نے والدین کا بڑا حق رکھا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْکِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا۔

کہ اگر والدین میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن سے اُف بھی نہ کہو۔ اور اسی میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اگر زبان سے کچھ نہ کہا، مگر صورت سے ناگواری ظاہر کی جائے کیونکہ اُف سے ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ اُن کو ایذا نہ دو۔ اور جب صورت سے ناگواری ظاہر کی جاتی ہے تو اس سے بھی مخاطب کو ایذا ہوتی ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ اُن کو (کسی بات پر) دھمکاؤ بھی نہیں بلکہ تہذیب سے گفتگو کرو۔ یہاں تک تو خدمت و تعظیم و ادب کی تعلیم تھی۔

اس کے علاوہ حق تعالیٰ نے والدین کا ایسا حق بھی رکھا ہے جس کی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو خبر نہیں ہوتی وہ کیا ہے؟ دُعا —— ! چنانچہ ارشاد ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّیَانِیْ صَغِیْرًا

دُعا بھی ایسی تعلیم فرمائی ہے جس میں اولاد کے زمانہ احتیاج کو یاد دلایا ہے کہ اس طرح دُعا کرو کہ اے پروردگار میرے والدین پر رحم کیجئے جیسا کہ انہوں

نے بچپن میں مجھے پالا (اور شفقت و رحمت سے) پرورش کیا ہے۔ اس میں بتلا دیا کہ والدین کے زمانۂ احتیاج میں تم اپنے زمانۂ احتیاج کو یاد کرو کہ کبھی تم بھی نہایت کمزور و ضعیف تھے نہ اپنے ہاتھ سے کھا سکتے تھے نہ پی سکتے تھے۔ نہ چلنے پھرنے کی طاقت تھی۔ پھر بھی والدین نے اُس وقت کس محبت و شفقت سے تمہارے ناز نخرے اٹھائے اور کس شفقت سے پالا کہ آج تم اس قابل ہوئے کہ دوسروں کی خدمت کرو۔ اب تم اُن کی ضعیفی میں بات بات پر کیوں جھلاتے ہو پھر الفضل للمتقدم تمہارے اندر جو آج خدمت کی صلاحیت آگئی ہے اس میں تو والدین کو دخل ہے اور اُن کی خادمیت میں تم کو کوئی دخل نہ تھا، مگر با اینہمہ وہ تو تمہاری خدمت سے ایک دن بھی نہ گھبرائے اور تم گھبرا گئے۔

اس پر مجھے ایک بنئے کی حکایت یاد آئی۔ وہ حکایت یہ ہے کہ ایک بنیا اپنے بچہ کو گود میں لئے ہوئے بیٹھا تھا کہ فصیل پر ایک کوّا آکر بیٹھا۔ لڑکے نے پوچھا ابا یہ کیا ہے۔ کہا بیٹا کوّا۔ لڑکے نے پھر تھوڑی دیر میں یہی سوال کیا کہ ابا یہ کیا ہے کہا بیٹا کوّا۔ تھوڑی دیر میں پھر وہی سوال کیا اور بنیا برابر جواب دیتا رہا۔ اور گنتی میں بھی لکھتا رہا۔ لڑکے نے سو دفعہ پوچھا اور اُس نے سو ہی دفعہ جواب دیا اور روزنامچہ میں لکھ لیا۔ بات گئی گذری ہوئی۔ ایک زمانہ میں وہ وقت آیا کہ لڑکا جوان ہو کر دکان کا مالک ہوا اور بنیا بوڑھا ہو گیا۔ اب بنئے نے ایک دن لڑکے سے یہی سوال کیا کہ بیٹا فصیل پر کیا بیٹھا ہے۔ اُس نے پہلی بار تو نرمی سے کہہ دیا کہ ابا کوّا ہے۔ تھوڑی دیر میں پھر سوال کیا۔ اس دفعہ ذرا اُس نے تیزی سے کہا کہ کوّا ہے۔ تیسری دفعہ پھر پوچھا تو غصہ میں جواب دیا کوّا ہے۔ چوتھی بار اُس

نے پھر پوچھا تو بیٹا کہتا ہے کہ تمہاری تو عقل جاتی رہی بس ایک بات کی رٹ ہی لگ گئی۔ بڈھے نے کہا، ارے منیم جی ذرا میرے روزنامچہ کی بہی لانا کیونکہ وہ بہی اب تک قائم تھی (پرانی بہی) بہی نہ تھی۔ اس نے کھول کر دکھلایا کہ صاحبزادے تم جب بچہ سے تھے تو تم نے سو دفعہ یہی سوال کیا تھا اور میں نے ہر دفعہ محبت سے جواب دیا تھا کہ بیٹا کوا ہے۔ مجھے سو بار میں بھی تم پر غصہ نہیں آیا اور تم تین ہی دفعہ میں جھلانے لگے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ بچوں کی باتیں پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے ان سے ناگواری نہیں ہوتی اور بوڑھوں کی باتیں پیاری نہیں لگتیں اس لئے گراں گزرتی ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ یہ سچ ہے۔ بے شک بچوں کی باتیں اُن کی ناسمجھی اور بھولے پن کی وجہ سے طبعاً اچھی لگتی ہیں۔ تو بوڑھوں کی باتیں ناسمجھی کی وجہ سے عقلاً گراں نہ ہونا چاہئیں کیونکہ کم عقلی دونوں میں مشترک ہے۔ پس اگر وہاں محبت کی وجہ سے طبعاً ناگواری نہیں ہوتی تو یہاں ادب، وتعظیم کی وجہ سے عقلاً ناگواری نہ ہونا چاہئے شریعت یہ نہیں کہتی کہ طبعی ناگواری بھی نہ ہو بلکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر بوڑھے ماں باپ کی باتوں سے طبعاً ناگواری ہو تو اُس کو ظاہر نہ کرنا چاہئے۔ عقل سے کام لے کر اُن کو معذور سمجھنا چاہئے۔ اس طرح سے عقلی ناگواری نہ ہو گی۔ چنانچہ حق تعالےٰ کی کیسی عنایت ہے چونکہ وہ جانتے ہیں کہ انسان میں طبعاً بوڑھے آدمی کی بے ڈھنگی بات سے تغیر آہی جاتا ہے۔ اس لئے آگے فرماتے ہیں۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا۔

یعنی حق تعالیٰ تمہارے دلوں کے حال کو خوب جانتے ہیں (کہ تم کو بعض دفعہ طبعاً ناگواری ضرور ہوگی اس لئے اُس کے متعلق قانون بتلاتے ہیں کہ) اگر تم صالح ہوگے (یعنی اس طبعی اقتضا پر عمل نہ کروگے) تو حق تعالیٰ معذرت کرنے والوں کو بخش دیں گے۔

اس میں بتلا دیا گیا کہ امور طبعیہ پر مواخذہ نہیں بلکہ اُن کے مقتضا پر عمل کرنے سے مواخذہ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب کہ عمداً اس پر عمل کیا جائے اور اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہوکر کسی وقت کوئی کلمہ بے جا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کرلی جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ لِلْاَوَّابِیْنَ میں للتوابین سے ایک فائدہ مہمہ زائدہ ہے۔ وہ یہ کہ توابین میں صرف معذرت پر دلالت ہے اور اوابین میں خاص تعلق پر دلالت ہے یعنی جو حالت محبت وخدمت کی پہلے تھی وہی اختیار کرلی۔ مطلب یہ کہ فوراً ہی معذرت کرلی جائے تو مواخذہ نہ ہوگا۔

نیز رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِکُمْ میں بڑی رحمت کا اظہار کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ تو دل کو دیکھتے ہیں۔ اگر تمہارے دل میں اختیاراً وعقلاً ادب وتعظیم کی صفت موجود ہو اور ظاہر میں کسی وقت غلطی سے سختی ہوجائے تو اس پر مواخذہ نہ ہوگا۔

ناظرِ قلبیم گر خاشع بود ۔۔۔ گرچہ گفت لفظ نا خاضع بود

خدا تعالیٰ تو دل کو دیکھتے ہیں اگرچہ کسی وقت غلطی سے نامناسب لفظ ادا ہوجاوے۔

ما بروں را ننگریم و قال را　　　ما دروں را بنگریم و حال را

ہم ظاہری حالت اور قال کو نہیں دیکھتے ہم باطن کو اور حال کو دیکھتے ہیں۔

اہتمام مغفرت کی ضرورت

تیسرا شخص جس پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بد دعا فرمائی ہے وہ ہے جس نے رمضان کا بابرکت زمانہ پایا اور گناہوں سے اپنی مغفرت نہ کرائی۔ یہی جزو مجھے زیادہ مقصود ہے کہ اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں پر وعید فرمائی ہے جو رمضان میں بھی اپنی مغفرت کا سامان نہ کریں۔ صاحبو! اب رمضان ختم ہونے کو آیا ہے (کیونکہ آج تیس تاریخ ہے) اور نہ معلوم اب تک ہم نے اس کو کس حالت میں گزارا ہے۔ اب یہ تھوڑا سا وقت باقی ہے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اس میں بھی اگر ہم اپنی اصلاح کر لیں تو سرخرو جنگیہ ہو سکتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی شان یہ ہے ؎

دگر خشم گیرد بکردار زشت　　　چو باز آمدی ماجرا در نوشت

کہ بندہ گناہ کرکے جس وقت بھی رجوع کرنا چاہے وہ اسی وقت سب قصہ ختم کر دیتے ہیں اور توبہ قبول کر لیتے ہیں۔ پس ہم کو سب گناہوں سے اسی وقت دل سے توبہ کر لینی چاہیے جس کی حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ گناہوں پر ندامت و معذرت ظاہر کریں اور جو حقوق واجب الادا ہیں فی الحال اُن کے ادا کا عزم کریں اور فی الحال ان کے ادا کا اہتمام کریں اور آیندہ کے لئے گناہوں سے بچنے کا پختہ ارادہ کریں۔

اب میں دوسری حدیث پڑھتا ہوں جس کو ایک تفسیر یعنی لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ سے مناسبت ہے اس کے راوی غالباً حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں اور مخرج بیہقی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب رمضان ختم ہوتا ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ ملائکہ سے دریافت فرماتے ہیں۔

يَا مَلٰئِكَتِيْ مَا اَجْرُ مَنْ وَفّٰى عَمَلَهٗ قَالُوْا رَبَّنَا جَزَاءُهٗ

اَنْ يُّوَفّٰى اَجْرَهٗ فَيَقُوْلُ الرَّبُّ تَعَالٰى اِنَّ عِبَادِيْ وَاِمَائِيْ

قَدْ وَفَّوْا اَيْ فَرِيْضَتَهُمْ وَخَرَجُوْا يَعِجُّوْنَ بِالتَّكْبِيْرِ وَالثَّنَاءِ عَلَيَّ

اُشْهِدُوْا اَنِّيْ غَفَرْتُ لَهُمْ فَيَرْجِعُوْنَ مَغْفُوْرًا لَّهُمْ وَ

يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (اوکما قال)

یعنی اے فرشتو! بتلاؤ اس مزدور کی مزدوری کیا ہونا چاہیئے جس نے اپنا کام پورا کر لیا۔ وہ عرض کرتے ہیں خداوندا اس کو پوری مزدوری ملنا چاہیئے۔ اس پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بندوں اور بندیوں نے اپنے فرض روزے پورے کر لئے اور اب وہ تکبیر و ثنا پکارتے ہوئے نکلے ہیں۔ گواہ رہو میں نے ان کو بخش دیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پھر سب عیدگاہ کے نمازی بخشے بخشائے لوٹتے ہیں اور حق تعالیٰ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔ یہ وقت کل کو آنے والا ہے۔ تو اب ہمارے سامنے دو وقت ہیں۔ ایک تو یہ رمضان کا تتمہ ہے جو بہت کم رہ گیا ہے۔ اس میں سامان مغفرت نہ کرنے پر تو وعید ہے۔ اس لئے ہم کو اس کا حق ادا کرنا چاہیئے اور اس میں توبہ و استغفار و عزم طاعات سے مغفرت نہ کرنے پر تو وعید ہے۔ اس لئے ہم کو

اس کا حق ادا کرنا چاہیے اور اس میں توبہ و استغفار و عزم طاعات سے مغفرت کا مستحق ہو جانا چاہیے اور دوسرا وقت کل کو آنے والا ہے اس میں بھی دعا مغفرت کرنا اور مذلت و خلوص کی ایسی حالت بنانا چاہیے جس سے اجر کامل کے مستحق ہو جائیں۔

چند اشکالات کے جواب

اب میں اس حدیث کے متعلق چند ضروری باتیں عرض کر کے بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں

اس حدیث پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں اِنَّ عِبَادِیْ وَاِمَائِیْ قَدْ قَضَوْا فَرِیْضَتَہُمْ وَخَرَجُوْا وارد ہوا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ خرجوا کا مرجع عبادی وامائی دونوں ہیں۔ تو اس سے عورتوں کا بھی عیدگاہ کی طرف نکلنا ثابت ہوا۔

جواب یہ ہے کہ ہاں اصل تو یہی ہے کہ عورتیں بھی عیدگاہ میں جائیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں عیدگاہ میں جاتی تھیں۔ مگر اب فتنہ کی وجہ سے اُن کو روک دیا گیا۔ کیونکہ اتنے بڑے مجمع میں اُن کا نکلنا فتنہ سے خالی نہیں۔ مگر نماز عید کا جو ثواب حدیث میں مذکور ہے وہ عورتوں کو بھی ملے گا کیونکہ شرعی قاعدہ ہے کہ جو عمل کسی عذر کی وجہ سے نہ ہو سکے اُس کا اجر ساقط نہیں ہوتا۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ یہاں لفظ خرجوا وارد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عید کی نماز شہر سے باہر ہونا چاہیے۔ شہر کے اندر نہ ہونا چاہیے تو اب جو لوگ شہر کے اندر عید کی نماز پڑھتے ہیں کیا اُن کے لئے یہ فضیلت نہ ہوگی۔ اس کا بھی یہی جواب ہے کہ اگر شہر میں عید کی نماز بلا عذر پڑھی جاتی

ہے تو یہ خلاف سنت ہے اور اگر بعذر ہے تو ان کو بھی وہی ثواب ملے گا جو شہر سے باہر پڑھنے میں ملتا ہے اور ان کا عدم خروج اگر کسی کی بے راہی سے ہے تو اس کا وبال ان لوگوں پر ہوگا۔ جن کی وجہ سے یہ لوگ خروج سے معذور ہیں۔ اور اگر حدیث میں خروج من البیت مراد ہو، تو یہ تو ہر حال میں متحقق ہو گا۔

تیسرے اس حدیث میں خَرَجُوا يَعُجُّونَ إِلَى بِالْمُصَلَّىٰ عَاجٍ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذکر بالجہر[1] بلا کراہتہ مشروع ہے مگر اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ ایک، تو ذکر کا جہر ہے اور ایک ذکر کی اذان ہے۔ تو جہر بالذکر کا ثبوت تو احادیث میں ہے مگر ذکر کی اذان کا کہیں ثبوت نہیں۔

یہ لطیفہ نواب صدیق حسن خاں صاحب کے صاحبزادے نورالحسن خاں نے فرمایا تھا۔ ایک بار وہ کسی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ جب امام

---

[1] قلت: في عموم دلالته على ذلك نظر وانما يفيد ان الجهر بالذكر مشروع في هذا اليوم ونحوه كيوم الاضحىٰ، وقد صرح فقهاؤنا ان الجهر قد ثبت في هذا الايام بالنص حتى خلاف القياس فلا يقاس عليه غيره ۱۲ اخط قلت عموم هذه الدلالة بانضمام مقدمة وهي ان يوم الفطر ليس كيوم الاضحىٰ عند ابي حنيفة بل هو كسائر الايام في الاخفاء بالذكر ومع ذلك ورد فيه الجهر فيثبت بذلك الجهر في سائر الاوقات لكن ليس كيوم الاضحىٰ فان الجهر فيه قربة مقصودة ولا كذلك سائر الايام التي منه يوم الفطر فليس فيها قربة مقصودة لكنه مع ذلك مشروع۔ اشرف۔

نے ولا الضالین کہا تو بعض غیر مقلدین نے بڑے زور سے آمین کہی۔ نواب صاحب کے بیٹے بھی موجود تھے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے، تو ان چلانے والوں کو بلایا۔ وہ اپنے دل میں خوش ہوئے ہوں گے کہ نواب زادہ بھی ہم ہی جیسے ہوں گے۔ ان کو ہمارا جہر پسند ہوا ہو گا۔ ضرور کچھ انعام دیں گے۔ جب یہ قریب پہنچے تو ایک چپت رسید کیا اور کہا کہ آمین بالجہر تو حدیث میں آئی ہے مگر آمین کی اذان کون سی حدیث میں آئی ہے۔ ———

——— واقعی بعضے لوگ اتنے زور سے آمین کہتے ہیں، جیسے لڑ رہے ہوں ———!

ہمارے سب سے چھوٹے بھائی جن کو ہم نے عربی پڑھائی تھی، وہ ایک دفعہ قنوج میرے ساتھ گئے وہاں جمعہ کی نماز میں کچھ غیر مقلد بھی شریک تھے جنہوں نے آواز ملا کر اتنے زور سے آمین کہی کہ سننے والوں کو توحش ہوتا تھا۔ نماز کے بعد میرے بھائی کہنے لگے کہ آمین تو دعا ہے اور دعا کا خاص لب و لہجہ عاجزی و نیازمندی کا ہوتا ہے جس کا ان لوگوں میں پتہ بھی نہیں۔ ان کے لہجہ سے تو دعا کی شان نہیں معلوم ہوتی۔ یہ بات مجھے بہت پسند آئی۔ واقعی اس جہر شدید کے ممنوع ہونے کو یہی بات کافی ہے کہ اس میں دعا کا لہجہ نہیں ہوتا۔

ایک انگریز نے بھی اس بات کو سمجھا۔ کسی جگہ مقلدوں اور غیر مقلدوں کا جھگڑا تھا۔ انگریز موقعہ پر تحقیقات کو خود آیا اور یہ فیصلہ لکھا کہ آمین کی تین قسمیں ہیں۔ ایک بالجہریہ تو سنت ہے احادیث سے ثابت ہے۔ ایک بالسریہ بھی سنت ہے احادیث سے ثابت ہے۔ ایک بالشر جس سے مشتعل کرنا

مقصود ہوتا ہے۔ یہ قابل رد کئے کے ہے۔ اور ان لوگوں کی آمین تیسری قسم کی ہے
لہٰذا قابل رد کئے کے ہے۔

مسلمانوں کے لئے کتنے افسوس کی جگہ ہے کہ ہمارے دینی معاملات کا فیصلہ کفار کرتے ہیں۔ خود آپس میں ہم سے تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر تماشا یہ ہے کہ وہ ہمارے واقعات کی حقیقت کو ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں جو اسی طرح ذکر جہر میں بھی ایک تو جہر کا درجہ ہے اور ایک اس کی اذان کا درجہ ہے تو اس اذان کا کہیں ثبوت نہیں۔

شاہجہانپور میں ایک ڈپٹی صاحب ذاکر تھے اور ایک بزرگ سے بیعت تھے۔ وہ ایسا جہر کرتے تھے کہ سارے محلہ والے تنگ تھے۔ وہ بندۂ خدا رات کو دو بجے سے جو ذکر کی اذان دیتے تو صبح تک محلہ والوں کو سونا دشوار ہو جاتا۔ پھر وہ مجھ سے رجوع ہوئے تو میں نے اس جہر سے روک دیا۔ پھر تو لوگ مجھے دعا دیتے تھے۔

پھر اہل جہر میں بھی بعض لوگ تو رسیلی آواز سے جہر کرتے ہیں۔ اس سے تشویش نہیں ہوتی اور بعضوں کی آواز بہت سخت ہوتی ہے۔ اُس سے دماغ پر چوٹ سی لگتی ہے۔ بہر حال نفس جہر ممنوع نہیں بلکہ احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں بھی ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں جو اربعوا علی انفسکم آیا ہے اُس سے نفس جہر کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اربعوا خود بتلا رہا ہے کہ صحابہ اُس وقت مشقت و تعب کے ساتھ ذکر کر رہے تھے اُس کو روکا گیا ہے کیونکہ اربعوا کے معنی ہیں ارفقوا

یعنی نرمی کرو۔ تو اگر جہر نرمی سے ہو تو وہ ممنوع نہیں۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ مشقت تو عبادت میں مطلوب ہے پھر اس مشقت سے کیوں منع فرمایا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مشقت ایک تو مقاصد میں ہوتی ہے ایک طرق میں۔ تو مقاصد میں تو مشقت باعث اجر ہے اور طریق میں مشقت برداشت کرنا موجب اجر نہیں۔ دوسرے جب کہ اس کا طریق بھی ہو مثلاً ذکر مقصود ہے تو نفس ذکر میں جو مشقت ہو، جیسے دو ہزار کی جگہ چار ہزار دفعہ ذکر کیا جائے یہ مشقت ثواب کو موجب ہے اور ایک مشقت یہ ہے کہ خواہ مخواہ آواز اور خاص ہیئت سے ذکر کیا جائے۔ سو یہ محض طریق ہے اس میں مشقت موجب ثواب نہیں۔

میرے ایک دوست اس میں اطلاق کے مدعی تھے۔ وہ مشقت کو مطلقاً موجب اجر سمجھتے تھے خواہ مقاصد میں ہو یا طرق میں۔ تو میں نے کہا بہت اچھا پھر آپ وضو کے لئے یہاں سے پانی نہ لیا کریں بلکہ جلال آباد سے جا کر لایا کریں کیونکہ اس میں مشقت زیادہ ہے۔ بس اس پر آنکھیں کھل گئیں اور سمجھ گئے۔

تو ممکن ہے کہ صحابہ نے جہر مفرط کیا ہو جس سے مشقت ہو رہی ہو یا جہر تو معتدل ہو مگر وہ مشقت جہر کو موجب اجر سمجھ رہے ہوں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ جہر من حیث ہو جہر عبادت نہیں اور اگر مقصود تو ذکر کو سمجھیں اور جہر کو کسی مصلحت سے اختیار کریں جیسے دفع خواطر و حصول جمعیت وغیرہ۔ کیونکہ تجربہ ہے کہ ذکر جہری میں وساوس کم آتے ہیں اور سکون قلب بھی زیادہ حاصل ہوتا ہے تو یہ صورت ممنوع نہیں بشرطیکہ اور کوئی عارض مانع

نہ ہو۔

بہرحال فیصلہ یہ ہوا کہ جہر مفرط تو مطلقاً ناجائز ہے جس سے خود کو مشقت ہو یا دوسروں کو۔ اور جہر معتدل میں تفصیل ہے۔ اگر خود جہر کو بقصد ثواب اختیار کرے تو یہ بھی ناجائز اور بدعت ہے الا فیما ورد الشرع بالجہر فیہ کالحج بالتلبیۃ والجہر بالتکبیرات التشریق ونحوھا ۱۲۔ اور اگر مقصود نفس ذکر ہو اور جہر اعتدال سے ہو اور اختیار للمصلحت ہو تو وہ بدعت نہیں بلکہ ایسا جہر شریعت سے ماذون فیہ بلکہ احادیث میں وارد ہے۔ چنانچہ یعجون الی اللہ عاء سے اسی حدیث میں جہر کا ثبوت ہو رہا ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ عید کے روز سب کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ فیرجعون مغفورًا لھم ویبدل اللہ سیئاتھم حسنات ط اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ مغفرت تبدیل سیئات سب حاضرین عید کے لئے عام ہو کہ سب کو دونوں باتیں حاصل ہوتی ہوں۔ سب کی مغفرت بھی ہوتی ہو اور گناہ بھی سب کے نیکیوں سے بدلتے ہوں۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ یہاں دو صیغے اس لئے اختیار کئے گئے کہ مجمع میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ خواص مقربین اور مجرمین۔ تو خواص کے لئے تبدیل سیئات یا حسنات ہوتی ہے اور مجرمین کے لئے مغفرت ہے۔

خلاصۂ بیان

خلاصۂ بیان یہ ہوا کہ اس وقت میں نے دو حدیثیں پڑھی ہیں۔ ایک میں ان لوگوں پر وعید ہے جو رمضان میں اپنی مغفرت اور بخشوانے کا اہتمام نہ کریں۔ دوسری ان لوگوں کے لئے بشارت اور عید ہے

جو روزے پورے کرکے عیدگاہ میں خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تعظیم کا حق ادا کریں گے۔ تو ایک میں عید کا ذکر ہے اور ایک میں وعید کا۔ اس لئے میں اس وعظ کا نام بھی العید والوعید رکھتا ہوں۔ پس جو لوگ رمضان کی حرمت میں کمی کر چکے ہیں وہ اس تھوڑے سے باقی ماندہ وقت میں اس کی تلافی کرلیں کہ اصل میں کل کو انہی کی عید ہے جس نے رمضان میں خدا تعالیٰ کو راضی کرلیا۔ مجرم کی کیا عید ہے پھر کل کو دعا و خلوص کے ساتھ نماز عید اس طرح پڑھیں جس سے مغفرت و اجر کامل کے اہل بن جائیں۔ پھر انشاء اللہ بخشے بخشائے گھر کو جائیں گے۔

مگر اس کے لئے کچھ شرائط ہیں جن میں سے ایک تو اخلاص فی العمل والدعا ہے۔ دوسرے عزم طاعت ہے کہ آئندہ کے لئے طاعتِ خداوندی کا پختہ ارادہ ہو۔ حتی الامکان کوئی نافرمانی نہ کریں گے اور طاعات کو ہمیشہ بجالائیں گے اور عزم طاعت کی علامت صدور طاعت ہے کہ اس سے طاعات صادر ہونے لگیں۔ پس اگر کسی سے عید کی نماز کے بعد طاعات کا صدور نہ ہوا۔ تو یہ سمجھا جاوے گا کہ اس نے طاعات کا عزم ہی نہ کیا۔ اور بدون عزم طاعات کے توبہ کاملہ متحقق نہیں ہوتی۔ تو مغفرت کا بھی اس کے لئے وعدہ نہیں۔ یہ وعدہ انہی کے لئے ہے جو طاعت کا عزم کریں۔ جس کے بعد صدور طاعات عادۃً لازم ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ مبادا بعض لوگ عید کی نماز پڑھ کر سال بھر کو اعمال سے فارغ اور بے فکر ہو جائیں کہ اب تو بخشے گئے۔ اگلے سال پھر عید کی نماز پڑھ لیں گے۔ درمیان کے گناہ اس سے معاف ہو جائیں گے۔ تو یاد رکھو جو شخص ابھی سے یہ نیت کئے ہوئے ہے اس کو توبہ حاصل نہ ہوگی نہ اس

کے لئے وعدۂ مغفرت ہے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہمارے روزے قبول فرمائیں اور ان میں جو کچھ کوتاہی ہوئی ہو اُس کو معاف فرمادیں اور اس بقیہ وقت رمضان میں ہم کو مغفرت کا مستحق بنا دیں اور کل کو اجر کامل عطا فرمائیں۔ آمین وصلی اللّٰہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی مکمل و مستند

سوانح حیات

سیرت اشرف

(جو بذات خود ایک بہترین وعظ ہے)

حضرت تھانوی کے نقش حیات مرتبہ مفتی عبدالرحمٰن خاں کے متعلق ارباب بصیرت نے حسب ذیل تبصرے فرمائے ہیں جن سے اس کی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے :۔

۱۔ مولانا عبدالباری صاحب ندوی (مجاز حضرت تھانوی) لکھتے ہیں کہ "اشرف السوانح" کے اشرف ہونے کے باوجود جامعیت اور انتخابی خصوصیات کی بنا پر "سیرت اشرف" ہی اشرف رہی۔

۲۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی مدیر "صدق جدید" لکھنؤ لکھتے ہیں کہ مؤلف سیرت اشرف کی چابک دستی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مختلف تصویروں کی مدد سے ایک ایسی تصویر کھینچ دی ہے کہ اس پر گمان اصل صورت کا ہونے لگتا ہے۔ اس سے ایک دلچسپ، جامع اور مستند کتاب کا اضافہ ہو گیا ہے۔

۳۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مدیر "معارف" اعظم گڑھ لکھتے ہیں کہ اس کتاب

کی سب سے بڑی خوبی اس کی جامعیت اور ترتیب ہے۔ حضرت تھانویؒ کے متعلق جن معلومات کے لیے بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تنہا اس کتاب میں مل جاتے ہیں۔

۴۔ مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب اب تک کی ساری محنتوں اور کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ مؤلف نے بڑی کامیابی کے ساتھ حضرت تھانویؒ کی سیرت اور اصول تزکیہ و تربیت کو اجاگر کر دیا ہے۔ کتاب بڑی جامع ہے۔

۵۔ مولانا محمد اسحاق مدیر "الاعتصام" لاہور لکھتے ہیں کہ "سیرت اشرف" ایک معلوماتی اضافہ ہے جس میں مخلص مؤلف نے حضرت کی زندگی میں پیش آمدہ اہم واقعات کی پوری نشاندہی کر دی ہے۔

۶۔ مولانا ماہر القادری مدیر فاران کراچی لکھتے ہیں کہ فاضل مؤلف نے صاحب سیرت کی زندگی اور کمال کے کسی گوشہ کو شرح و گفتگو کے بغیر نہیں چھوڑا۔ اس راحت پسند زمانہ میں اس قدر جانفشانی تحقیق اور عرق ریزی کے ساتھ عام طور پر دور حاضر کے مشاہیر کے سوانح حیات شاذ و نادر ہی مرتب کئے جاتے ہیں۔

۷۔ جناب حمید نظامی صاحب۔ مدیر روزنامہ نوائے وقت لاہور لکھتے ہیں کہ اس ضخیم کتاب میں حضرت مولانا کی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق مفصل معلومات جمع کر دی گئی ہیں گویا ان کے متعلق ایک مختصر سا انسائیکلوپیڈیا ہے جس کے لئے مؤلف حضرت کے عقیدت مندوں کی طرف سے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

حجم ۱۱۷۶ صفحات　بڑا سائز ۸/۲۶×۲۰　رنگین گرد پوش　قیمت بارہ روپے

ملنے کا پتہ: **مکتبہ اشرف المعارف چہلیک ملتان شہر** (مغربی پاکستان)

منشی عبدالرحمٰن خاں کے دیگر قابلِ قدر علمی کارنامے

۱۔ تعارفِ قرآنی

اس میں قرآن پاک کا خود قرآن حکیم ہی کی زبانی تعارف کرایا گیا ہے اور قرآن کے نام، کام اور پیغام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

۲۔ بصائرِ قرآنی

اس میں قریباً دو سو موضوعات پر قرآن پاک سے اقوال، امثال، ترغیبات ترہیبات نہایت خوش اسلوبی سے دلنشیں پیرایہ میں جمع کئے گئے ہیں۔ قیمت دو روپے

۳۔ احکامِ قرآنی

اس میں قرآنی دستورِ حیات کو نہایت احسن اور آسان طریق سے تفصیلاً پیش کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپے ۵۰ پیسے۔

۴۔ داستانِ عمل

یہ ایسے سبق آموز، ایمان افروز اور حیرت انگیز تاریخی واقعات کا مرقع ہے جن کا بصیرت و کردار کی تعمیر کے لئے اسلام ہر انسان سے تقاضا کرتا ہے۔

قیمت چھ روپے

۵۔ اخلاق و آداب

اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں مہد سے لحد تک کے اصول و آداب زندگی اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ اس کا کوئی رُخ اور کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پایا اس کتاب کا ہر مسلمان کے گھر ہونا ازبس ضروری ہے۔

قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ اشرف المعارف چہلیک ملتان شہر (مغربی پاکستان)

۶۔ مشاہدات و واردات

اس میں نہایت اچھوتے انداز میں اپنے تجربات مشاہدات اور واردات کی روشنی میں اہم دینی اور ملی مسائل اور قومی رہنماؤں اور جماعتوں کا صحیح جائزہ لیا گیا ہے۔ قیمت چھ روپے

۷۔ فتنۂ پرویز و حجیت حدیث

اس میں فتنۂ انکار حدیث پر منکرین حدیث کے دلائل کی روشنی میں بحث کر کے اس فتنہ کے آغاز، اثرات، عواقب، نتائج اور تاریخ کی وضاحت کی گئی ہے

قیمت تین روپے

۸۔ حقائق و معارف

یہ ایسے تعمیری اشعار کا انتخاب ہے جو زندگی کے اعلیٰ اقدار سے تعلق رکھتے ہیں اور دل کے تاروں پر زخمہ زنی کئے بغیر نہیں رہتے قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے

۹۔ نغمۂ مسیحا

ایسی اصلاحی، اخلاقی اور اسلامی نظموں کا دلکش مجموعہ جو تعمیری رجحانات کا علمبردار ہے اور درس عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

۱۰۔ اقبال اور ملا

رسالہ اقبال اور ملا میں علماء حق پر جو فرسودہ اور رکیک حملے کئے گئے ہیں اس میں ان کا علامہ اقبال کے صحیح افکار کی ضرب کلیمی سے بصیرت افروز جواب دیا گیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

۱۱۔ تعمیر پاکستان اور علماء ربانی

تاریخی انکشافات کے اس مرقع میں قائد اعظم کی دینی تربیت پر پہلی مرتبہ روشنی ڈالی گئی ہے اور تعمیر پاکستان کے سلسلہ میں علماء حق کے تاریخی کارناموں اور جماعت اسلامی کی تخریبی کارروائیوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے

مغربی تہذیب کے مکروہ خدوخال کا بہترین نقشہ

انسانیت حیوانیت کی راہ پر

مرتبہ منشی عبدالرحمن خاں

انسان جس کو باری تعالیٰ نے زیور انسانیت سے آراستہ فرما کر اپنا نائب بنایا تھا آج وہ انسانیت کے دائرہ سے نکل کر حیوانیت و بہیمیت کی راہ پر گامزن ہے اور انسانیت قدم قدم پہ ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ "تہذیب" فرنگ نے اپنے ارتقائی دور میں انسانیت کو برائیوں کے جو تحفے بخشے ہیں اور اخلاق سوزی، بدکاری اور بے دینی کے جو متعدی جراثیم بکھیرے ہیں اس کتاب میں

ان کا تجزیہ کیا گیا ہے اور حکمائے مغرب کی اسناد اور ان کے اعداد وشمار سے ثابت کیا گیا ہے کہ اُن کی تہذیب معاشرے کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں

اس میں جمع کردہ معلومات حیرت انگیز ہی نہیں ہولناک بھی ہیں۔ عمدہ کتابت، نفیس طباعت، رنگین سرورق، قیمت چار روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ اشرف المعارف چہلیک ملتان شہر

(مغربی پاکستان)